صرف ۵ منٹ میں صحت پانے کے 40 قیمتی راز

www.urdudigest.pk

# اُردو ڈائجسٹ

مسلسل اشاعت کے ۵۲ ویں سال

جنوری 2012ء

# دس جدید تصوّرات

جو دُنیا بدل کر رکھ دیں گے

مدینے میں پہلے مسلم سفیر روردا

حضرت مصعب بن عمیرؓ کی روح پرور داستان

ایک سازش جسے امریکی اپنا بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں

پاکستان کی 40 نامور اور مؤثر ترین خواتین

PDFBOOKSFREE.PK

مستقبل کی انوکھی کتاب کہانی

اُردو کا سرمایۂ افتخار، مختار مسعود

صاحبِ آوازِ دوست

## اس شمارے میں کیا کہاں ہے


| | | | |
|---|---|---|---|
| اداریہ | ۱۹ | تبدیلی کا آئینی راستہ | الطاف حسن قریشی |
| تجزیہ | ۲۰ | سیاسی بھونچال کی گڑگڑاہٹ | الطاف حسن قریشی |
| تاریخ کے جھروکے سے | ۳۸ | حضرت مصعب بن عمیرؓ | ارشاد الرحمٰن |
| | ۴۴ | خلافتِ راشدہ کا ایک جج | آباد شاہ پوری |
| | ۴۸ | گورنر کا عبرت ناک انجام | ڈاکٹر محمد مزمل احسن شیخ |
| سچے واقعات | ۵۰ | پکا ایمان | حبیب اشرف صبوحی |
| زمانۂ قدیم سے | ۵۶ | ۱۲ مہینوں کے نام کیسے پڑے | رانا محمد شاہد |
| سچی داستان | ۵۹ | ۳۰ سال بعد گھر واپسی | نازیہ گیلانی |
| مقبول کالم | ۶۵ | گوشۂ ست رنگ | نوید اسلام صدیقی |
| نفسیات | ۱۱۱ | ذہنی دباؤ بُرا ہے تو اچھا بھی | تحسین بانو |
| پیشین گوئی | ۱۲۳ | امریکہ خانہ جنگی کا شکار ہونے والا ہے | سلیم حیدر |
| طنز و مزاح | ۱۲۷ | جج ہنس بھی سکتا ہے | جسٹس ایم۔ آر کیانی |

## اس شمارے میں کیا کہاں ہے


| | | | |
|---|---|---|---|
| طب و تحقیق | ۱۳۵ | ہر پل آسانیاں اور نئی تحقیق | طاہرہ اعجاز ڈنگہ |
| تاریخ | ۱۴۱ | سدِ ذوالقرنین | محمود جمال |
| تحقیق | ۱۴۹ | کتاب کہانی | عاطف مرزا |
| تازہ سرف | ۱۵۷ | نیا سال، نئے ارادے، نئے خواب | فریدہ خانم |
| کہانیاں | ۱۶۸ | ہوائی سفر | بشریٰ رحمٰن |
| | ۱۸۴ | کبھی کے دن بڑے | کنول ریاض |
| | ۱۹۲ | ادھوری کہانی | نجمہ ثاقب |
| | ۲۰۰ | انگلی میں پھنسی انگوٹھی | ایکتا |
| | ۲۰۹ | پانی | نیلم احمد بشیر |
| | ۲۱۷ | کرنل کا کوٹ | صبا شفیق |
| حالاتِ حاضرہ | ۲۲۵ | بال ٹھاکرے کے گھر میں دھماکا | عمر وسیم |
| تصوف | ۲۲۸ | کمال تقویٰ پیدا کرنے والی ۱۰ باتیں | حافظ افروغ احسن |



چوہدری عثمان ایجنسی
Mob: 0345-3812251, 0315-7554[illegible]


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# سیاسی بھونچال کی گرگراہٹ

**آج سے ۴۰ سال پہلے ہمارا ملک دولخت ہوا اور جن غلطیوں اور مدہوشیوں کے باعث یہ تاریخ شکن حادثہ پیش آیا، وہ آج بھی دہرائی جارہی ہیں۔ تبھی ہم وقفے وقفے سے سیاسی زلزلوں کی زد میں آتے جارہے ہیں۔ تازہ ترین حالات کا تجزیہ، الطاف حسن قریشی کے قلم سے**

وہ ۱۶ دسمبر کی قیاس آرائیوں میں لپٹی ہوئی ایک شام تھی جب وزیراعظم سید یوسف رضا گیلانی نے پیپلز پارٹی کی پارلیمانی کمیٹی سے خطاب کیا جس میں ۲۳ سالہ نوجوان بلاول بھی شریک تھا۔ اس میں دھمکی دی گئی کہ پیپلز پارٹی اور جمہوریت کے خلاف جو سازشیں ہورہی ہیں، اُن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔ اُن کا ارشاد تھا کہ ہم گئے تو باقی کچھ نہ بچے گا 'پارلیمنٹ رہے گی نہ حکومت'۔ وہ اسی لب و لہجے میں ایک روز پہلے سینیٹ میں بھی خطاب فرما چکے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے کوئی بڑا دھماکہ ہونے والا ہو، کیونکہ عدالتِ عظمیٰ نے این آر او مقدمے میں حکومت کی طرف سے نظرثانی کی اپیل مسترد کر دی تھی اور سارے مقدمات کھول دینے کے احکام جاری کرنے کے علاوہ حکومت کے مختلف عہدے داروں سے یہ جواب بھی یکم جنوری ۲۰۱۲ء کو طلب کرلیا تھا کہ اب تک عدلیہ کے گزشتہ احکام پر عمل کیوں نہیں ہوا۔ اب وزیراعظم کو اِس اہم سوال کا جواب دینا ہے کہ انہوں نے صدر زرداری کے خلاف سوئس عدالتوں میں جو مقدمات چل رہے تھے، اُنہیں عدالتِ عظمیٰ کا فیصلہ آجانے کے بعد دوبارہ کھولنے کے لیے خط لکھنے میں لیت و لعل سے کیوں کام لیا گیا۔ نظرثانی کی اپیل میں عدالتی ضابطوں کے برخلاف حکومت کی طرف سے بار اعوان پیش ہوئے تھے جنہوں نے صحیح معنوں میں عدالت کی معاونت کرنے کے بجائے اپنے رویے سے اس پر عدم اعتماد کا اظہار کیا۔ کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک کربلا دل میں لے کے بیٹھے ہیں۔

یکم دسمبر ۲۰۱۱ء کی صبح عدالتِ عظمیٰ کے نورکنی بینچ نے میموگیٹ کے ایشو پر جناب نواز شریف کی آئینی درخواست کی ابتدائی سماعت شروع کی، اس کے مندرجات کی جانچ پڑتال پر تین گھنٹے صرف کیے اور اٹارنی جنرل مولوی انوار الحق کا نقطہ نظر معلوم کرنے کے بعد فاضل چیف جسٹس نے اسے باقاعدہ سماعت کے لیے منظور کرلیا اور مقدمے کے تمام فریقوں کو ۱۵ دسمبر تک اپنے جوابات داخل کرنے کا حکم دیا جن میں صدرِ مملکت کے علاوہ آرمی چیف اور آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل بھی شامل تھے۔ یہ ہماری تاریخ کا ایک انتہائی انوکھا واقعہ تھا کہ فوج اور انٹیلی جنس کے سربراہوں کو وفاق کے علاوہ نوٹس جاری کیے گئے جو اُن کو ایک آزاد حیثیت دینے کے مترادف ہے۔ آگے چل کر وزارتِ دفاع نے ایک بیان میں کہہ بھی دیا کہ اُن کا فوج اور آئی ایس آئی پر کوئی کنٹرول نہیں۔ فاضل عدالت نے جناب نواز شریف سے استفسار کیا کہ آپ اس مقدمے کی خود پیروی کریں گے یا فخر و بھائی پیش ہوں گے۔ اُن کا جواب تھا کہ اُن کی طبیعت ٹھیک نہیں، اس لیے میں آج خود پیروی کروں گا۔ بینچ کے سربراہ نے پوچھا کہ جب دفاع اور قومی سلامتی کی پارلیمانی کمیٹی اِس معاملے کی تفتیش کر رہی ہے، تو آپ ہمارے پاس کیوں آگئے ہیں۔ میاں صاحب نے صراحت کے ساتھ بتایا کہ ماضی میں پارلیمنٹ کی کسی قرارداد پر عمل درآمد نہیں ہوا اور مجھے خدشہ ہے کہ وہ پارلیمانی کمیٹی جسے تفتیش کا قانونی اختیار نہیں اور جس میں پیپلز پارٹی کی اکثریت ہے، وہ شاید معاملے کی غیر جانب دارانہ تحقیقات نہ کر سکے۔ اس پر ایک فاضل جج نے حوالہ دیا کہ صدر نکسن کے خلاف واٹر گیٹ کی تحقیقات بیک وقت عدلیہ اور کانگریس میں ہوئی تھی۔

☆☆☆

فاضل عدالت نے ایک دیانت دار اور باصلاحیت ریٹائرڈ اعلیٰ پولیس افسر جناب طارق کھوسہ کی سربراہی میں یک رکنی تحقیقاتی کمیشن بھی قائم کیا اور سابق سفیر جناب حسین حقانی کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل کرنے کا بھی حکم دیا۔ محترمہ عاصمہ جہانگیر نے جناب حقانی کی طرف سے عدالتی حکم واپس لینے کی درخواست دائر کی کہ میرے مؤکل کو صفائی کا موقع دیے بغیر جو حکم صادر کیا گیا ہے، وہ آئین میں دیے گئے بنیادی حقوق کے منافی ہے۔ اُن کی یہ درخواست بعد ازاں اپیل میں تبدیل کر دی گئی۔ سابق وزیر قانون اور سینیٹر بابر اعوان نے وفاقی وزیر قانون جناب مولا بخش چانڈیو اور کچھ دوسرے ارکانِ کابینہ اور وفاقی سیکرٹری قانون کی موجودگی میں سرکاری دفتر کی عمارت میں نہایت شعلہ بار پریس کانفرنس کی اور جوشِ خطابت میں عدالتی حکم کی تحقیر اور تذلیل کرتے ہوئے الزام لگایا کہ عدالت نے جانب داری سے کام لیا ہے اور وفاق کا موقف سنے بغیر مقدمے کے فریقوں کو نوٹس جاری کر دیے گئے ہیں جبکہ اسے اِس 'فرمائشی' درخواست کو سننے کا اختیار ہے ہی نہیں۔ یہ بھی کہا کہ اس عدالتی حکم سے پارلیمنٹ کی بالادستی پامال ہوئی ہے اور جمہوری نظام کو بہت ضعف پہنچا ہے۔ سابق اور موجودہ وزرائے قانون عدالتِ عظمیٰ کی آزادی اور وقار پر کاری ضرب لگاتے اور اس پر اپنے عدم اعتماد کا اظہار کرتے رہے۔ بابر اعوان روانی مطبع میں یہ بھی کہہ گئے کہ چوتھے تابوت میں کیلیں ٹھونکی جارہی ہیں۔ اُنہوں نے کمیشن کی تشکیل اور جناب طارق کھوسہ پر بے رحم تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اُن کے ایک بھائی سپریم کورٹ کے جج اور ایک بھائی پنجاب کے چیف سیکرٹری ہیں۔ ان کے عتاب میں سپریم کورٹ کے ایک فاضل جسٹس بھی آگئے جو بینچ میں بھی نہیں تھے۔ اِن کے بارے میں کہا کہ ان کا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے جو بھٹو صاحب کے عدالتی قتل میں شریک تھا۔ اس پریس کانفرنس پر تمام سنجیدہ طبقے سخت مضطرب ہوئے کہ سرِعام عدالتِ عظمیٰ کی توہین کی جارہی ہے اور سندھی عصبیت کے شعلے بھڑکائے جارہے ہیں۔ اخبار نویسوں نے اس پریس کانفرنس کے بارے میں جناب وزیراعظم سے پوچھا تو اُنہوں نے اپنے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا کہ "یہ میرے قانونی ماہرین کی رائے ہے"۔

عدلیہ اور ایگزیکٹو کے درمیان بڑھتی ہوئی کشمکش کے ساتھ ساتھ امریکہ اور پاکستان کے تعلقات میں اچانک شدید کھچاؤ پیدا ہوتا گیا۔ پاکستان میں سلالہ چیک پوسٹ پر نیٹو افواج کے دستے دو گھنٹے فائرنگ کرتے رہے جس کے نتیجے میں پاک فوج کے چوبیس افسر اور جوان شہید اور متعدد زخمی ہوئے۔ اس وحشیانہ حملے کے بعد عسکری قیادت نے امریکہ کے طرۂ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غرور پر وار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جنرل اشفاق پرویز کیانی کے اشارے پر وزیراعظم نے فوری طور پر کابینہ کی دفاعی کمیٹی کا اجلاس طلب کیا جس میں اعلیٰ ترین فوجی اور سول قائدین شریک ہوئے اور طویل غور وخوض کے بعد اس فیصلے تک پہنچے کہ نیٹو افواج کے کمانڈر کی طرف سے باقاعدہ معافی نامہ آنے تک نیٹو افواج کی سپلائی لائن بند رکھی جائے' شمسی ایئربیس ۱۱ دسمبر تک امریکہ سے خالی کرا لیا جائے اور یونائیٹڈ اسٹیٹس سے تعلقات کے نئے قواعد وضوابط طے کیے جائیں۔ آرمی چیف نے مقامی کمانڈرز کو جارحیت کا منہ توڑ جواب دینے کا اختیار دے دیا جو پوری دنیا کے لیے ایک سخت پیغام تھا۔ دراصل فوجی قیادت کو اپنے حکمرانوں کے غلامانہ رویوں کے خلاف شکایات ۲۰۰۹ء ہی میں پیدا ہو گئی تھیں اور ۲۰۱۱ء میں اس وقت شدید تناؤ پیدا ہو گیا جب اعلیٰ سیاسی قیادت نے سی آئی اے کے ایجنٹ اور دو پاکستانیوں کے قاتل ریمنڈ ڈیوس کی رہائی کے لیے دباؤ ڈالا تھا اور فوجی قیادت کو ملکی مفاد کی قیمت پر اس کی بات ماننا پڑی تھی۔ ہر قیمت پر امریکی خوشنودی حاصل کرنے کی حکومتی پالیسی کے باعث ۲ مئی کا ہولناک واقعہ پیش آیا جو امریکی حکومت کی طرف سے پاک فوج کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دینے کے مترادف تھا۔ اِن غیر معمولی المناک اور پُرخطر لمحات میں صدرِ پاکستان نے واشنگٹن پوسٹ میں اسامہ بن لادن کی موت پر اوباما انتظامیہ کو مبارک باد پیش کی' جبکہ ہمارے وزیراعظم صاحب نے اسے 'عظیم فتح' قرار دیا۔ فوج کا ادارہ اپنے 'مہربانوں' کی 'عنایات ہائے بے جا' پر انگاروں پر لوٹ رہا تھا اور اس کے شدید کرب میں میمو گیٹ اسکینڈل نے ایک نہایت دردناک اضافہ کر دیا۔

☆☆☆

میمو گیٹ کا انکشاف پاکستانی نژاد امریکی بزنس مین منصور اعجاز کے اس آرٹیکل میں ہوا جو برطانیہ کے ایک مؤقر جریدے 'فنانشل ٹائمز' میں ۱۸ اکتوبر کی اشاعت میں شامل تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ پاکستان کے ایک سینئر ڈپلومیٹ نے اپنے 'باس' کی منظوری سے میرے ذریعے ایک میمورنڈم امریکی فوج کے اعلیٰ ترین کمانڈر ایڈمرل مائیک مولن تک پہنچانے کے لیے ۹ مئی کو رابطہ قائم کیا اور مسودے کا متن مجھے وقفے وقفے سے ڈکٹیٹ کرایا گیا۔ میں نے وہ دستاویز صدر اوباما کے سابق قومی سلامتی کے مشیر جنرل جیمز جونز کے ذریعے ۱۱ مئی کو ایڈمرل مولن تک پہنچا دی۔ اس میمورنڈم کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ پاک فوج منتخب حکومت کو ہٹا دینا چاہتی ہے اور امریکہ اسے اس اقدام سے باز رکھے۔ اس میمو میں پاکستان کی اعلیٰ قیادت کی طرف سے یہ یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ فوج کو اس اقدام سے روک دینے کے عوض قومی سلامتی کی ایک 'نئی ٹیم' سامنے لائی جائے گی جو فوج کی تطہیر کرے گی اور ایٹمی اثاثوں کا ایک ایسا قابلِ عمل فریم ورک وجود میں لائے گی جو امریکی مفادات کا تحفظ کرے گا۔ ہماری قومی سلامتی کے خلاف اس قدر خوفناک سازش کے باوجود حیرت کی بات یہ تھی کہ ہماری حکومت نے ۱۸ اکتوبر کے فوراً بعد کوئی ردِعمل نہیں دیا جیسے وہ اس انکشاف سے سکتے میں آ گئی ہو۔ دو ہفتے بعد دفترِ خارجہ اور ایوانِ صدر کی طرف سے ایک مختصر اور بے جان سی تردید آئی۔ اس دوران آرمی چیف کی ہدایت پر ڈی جی آئی ایس آئی منصور اعجاز سے ملاقات کرنے لندن گئے اور جو ثبوت اُنہیں فراہم کیے گئے' ان کی بنیاد پر خفیہ ایجنسی کے سربراہ کی یہ رائے بنی کہ میمو کی تیاری میں سفیرِ پاکستان جناب حسین حقانی کا بھی ہاتھ ہے۔ اُنہوں نے واپس آ کر جنرل کیانی کو بریفنگ دی ' تو اُنہیں قدرتی طور پر بہت صدمہ پہنچا اور ایک اُمڈتے ہوئے خطرے کا احساس ہوا۔ اِس نہایت گہرے احساس کے



ساتھ جب وہ نومبر کے وسط میں ایوانِ صدر گئے تو اُنہوں نے فوج کے سپریم کمانڈر سے ملاقات میں اپنی پی کیپ پہنے رکھی اور چھڑی اپنے ساتھ رکھی۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہے تھے۔ غالباً جناب حسین حقانی کو پاکستان بلانے کا فیصلہ ہوا۔ دو روز بعد جو اجلاس ایوانِ وزیراعظم میں ہوا اس میں صدرِ مملکت کے علاوہ' آرمی چیف' ڈی جی آئی ایس آئی اور سفیرِ پاکستان جناب حقانی بھی پانچ منٹ کے لیے شریک ہوئے۔ اُن سے وزیراعظم نے استعفیٰ طلب کر کے تحقیقات کا حکم دے دیا اور اس کی ذمے داری قومی سلامتی کی پارلیمانی کمیٹی کے سپرد کر دی۔ ایک حد درجہ ذہین اور کارآمد شخص میمو گیٹ کی بھینٹ چڑھ گیا۔

پیپلز پارٹی کی قیادت نے معاملات کی سنگینی کا احساس کیے بغیر میمو گیٹ کے بارے میں ایک انتہائی غیر سنجیدہ طرزِ عمل اختیار کیا اور یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ وہ کاغذ کا ایک پرزہ اور جھوٹ کا پلندا ہے جس کی سرے سے کوئی اہمیت نہیں' مگر جب آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی اور ڈی جی آئی ایس آئی نے ۱۵ دسمبر کو عدالتِ عظمیٰ میں اپنے حلفیہ بیانات انا رنی جنرل کے ذریعے جمع کرائے' تو وہ بڑی حد تک وفاقِ پاکستان کے موقف سے متصادم تھے۔ اُن میں کہا گیا تھا کہ میمو گیٹ ایک حقیقت ہے جو قومی سلامتی کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے اور اس نے فوج کے مورال پر منفی اثرات مرتب کیے ہیں' اس لیے عدالتِ عظمیٰ کو یہ معلوم کرنا چاہیے کہ اس کے پس پردہ کونسی شخصیتیں کارفرما ہیں۔ ڈی جی آئی ایس آئی نے اس بیانِ حلفی میں یہ اضافہ کیا کہ عدالت کو اعجاز منصور کو بھی طلب کرنا چاہیے اور ڈیٹا حاصل کرنے کے بعد اس کا فرنزک معائنہ کرانا چاہیے۔ وفاقی حکومت نے یہ موقف پیش کیا کہ عدالتِ عظمیٰ کو میاں نواز شریف اور اُن کے رفقاء کی آئینی درخواست کی سماعت کا اختیار حاصل نہیں اور اسے برطانوی جریدے انڈی پینڈنٹ کی اس رپورٹ کی تحقیقات کرنی چاہیے کہ ڈی جی آئی ایس آئی لیفٹیننٹ جنرل احمد شجاع پاشا وزیراعظم کی اجازت کے بغیر عرب ممالک میں صدر زرداری کو اقتدار سے ہٹانے کی منظوری لینے کیوں گئے تھے اور منصور اعجاز سے ملنے لندن کیوں گئے تھے۔ بدقسمتی سے عدالتِ عظمیٰ میں سول اور فوجی قیادت ایک دوسرے کے مدِمقابل کھڑی تھیں جس نے پورے ملک میں ایک ہلچل سی مچا دی جبکہ ۶ دسمبر کی سرد رات انوکھے واقعات کا ایک اور سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

☆☆☆

انوکھے واقعات کا یہ سلسلہ مختلف اسباب عوامل کا شاخسانہ تھا۔ صدر زرداری جو پونے چار سال سے ملک میں سیاہ و سپید کے مالک چلے آ رہے تھے' اُنہوں نے اقتدار پر قابض رہنے کے لیے دستور کو باندی پاس کیا' اسمبلیوں کو ربڑ اسٹمپ بنائے رکھا' بھاری رشوتوں اور بڑے بڑے کمیشنوں کے ذریعے قومی ادارے کھوکھلے کر دیے اور ملکی معیشت کے جہاز میں بہت بڑا شگاف ڈال دیا۔ اُمورِ مملکت کا سارا بوجھ خود اُٹھا لینے کی وجہ سے اُن کی صحت خراب رہنے لگی۔ وہ فوج اور آئی ایس آئی سے خائف تھے' چنانچہ اُنہوں نے ۲۰۰۸ء میں ایک نوٹیفکیشن کے ذریعے آئی ایس آئی کو وزارتِ داخلہ یعنی جناب رحمان ملک کی تحویل میں اس وقت دے ڈالا جب وزیراعظم پہلی بار واشنگٹن روانہ ہوئے' لیکن فوجی قیادت کے دباؤ پر اُنہیں یہ حکم چند گھنٹوں کے اندر اندر واپس لینا پڑا تھا۔ اسی طرح جب ۲۰۰۸ء میں ممبئی میں بڑے پیمانے پر دہشت گردی ہوئی' تو بھارت نے اس کا الزام آئی ایس آئی پر لگایا۔ ہماری حکومت نے اس حساس اور نازک صورتِ حال کا اندازہ کیے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بغیر اپنی خفیہ ایجنسی کے سربراہ کو نئی دہلی جانے کی ہدایت کر دی۔ اس پر بھی فوجی قیادت کو مداخلت کرنا پڑی، لیکن جب کور کمانڈرز کی طرف سے شدید ردعمل آیا اور قومی حلقوں نے شدید احتجاج کیا تو امریکی انتظامیہ نے پاکستان کے عوام کی خواہشات کا احترام کرنے کی فقط زبانی یقین دہانی کرائی۔ پیپلز پارٹی کے ابتدائی ۲/ برسوں میں امریکی حکومت کو اس کی حکومت نااہلی اور بدعنوانی کا پورا اندازہ ہو گیا تھا اور اس نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں جنرل کیانی پر مکمل اعتماد کرنے کی پالیسی اختیار کی اور پاکستان کی سیاسی قیادت پر آرمی چیف کی ملازمت میں تین سال کی توسیع دینے کے لیے سخت دباؤ ڈالا۔ جناب وزیراعظم کو رات گئے گھریلو کپڑوں میں ٹیلی ویژن پر آ کر جنرل کیانی کے عہدے میں توسیع کا اعلان کرنا پڑا۔ اس کے باوجود سول ملٹری تعلقات میں بداعتمادی کی لہریں اُٹھتی رہیں اور اسی زہرناک فضا میں اچانک میموگیٹ کا اسکینڈل سامنے آیا جس میں جناب صدر زرداری کا نام بھی لیا گیا تھا۔ اِن پے در پے واقعات سے اُن کی نیندیں حرام ہو گئیں اور امریکی جریدے فارن پالیسی نے انہی دنوں یہ رپورٹ بھی شائع کر دی کہ صدر اوباما نے جب سلالہ چیک پوسٹ پر حملے پر اظہارِ افسوس کے لیے فون کیا، تو وہ بے ربط باتیں کر رہے تھے۔

اس انتہائی کشیدہ صورتِ حال میں صدر زرداری ۶ دسمبر کی شب علاج کے لیے اچانک دبئی روانہ ہو گئے اور یہ بھی ارشاد فرما گئے کہ اُنہیں پاکستان کے کسی ہسپتال پر اعتبار نہیں۔ دبئی کے امریکی ہسپتال میں اُنہیں آئی سی یو میں داخل کیا گیا اور اُن کی روانگی اور صحت کے بارے میں ایوانِ صدر اور ایوانِ وزیراعظم کے ترجمان متضاد بیانات دیتے رہے۔ حضرت بابر اعوان نے فاضل چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے روبرو بیان کیا کہ صدرِ مملکت کی گردن میں کلاؤٹ ہے۔ اس پر اُنہوں نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ نواب اکبر بگٹی کو بھی یہی مرض لاحق تھا۔ بعد میں اعوان صاحب اپنی بات ہی سے مکر گئے۔ جناب وزیراعظم نے اپنی طرف سے دانائی اور صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جناب صدرِ مملکت کی صحت کسی قدر خراب تھی اور وہ دبئی جانے کے لیے تیار نہیں تھے، لیکن اُن کے خاندان اور میں نے اُن کو علاج کے لیے باہر جانے پر مجبور کیا، کیونکہ پاکستان کے ہسپتالوں میں اُن کی جان کو خطرہ تھا اور اسی لیے وہ اپنے والد کی عیادت کے لیے پر نہیں جا سکے تھے۔ اس گفتگو سے ثابت ہوا کہ حکومت اپنے صدر کی حفاظت کرنے میں ناکام رہی ہے۔ معروف طریقے کے مطابق صدرِ مملکت کی صحت کے بارے میں روزانہ ایک اعلامیہ جاری کیا جانا چاہیے تھا، لیکن حکومت اور پیپلز پارٹی کی نااہلی، بے بصیرتی اور داخلی کشمکش نے معمول کی بات کو بہت بڑے بحران میں ڈھال دیا۔ تب وزیراعظم ہاؤس میں آرمی چیف اور وزیراعظم تین گھنٹے تک سر جوڑ کر بیٹھے رہے جبکہ باہر بے یقینی کی دھند گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اس منظر نامے نے قوم کو احساس دلایا کہ آج ۱۶ دسمبر ہے۔ وہی ۱۶ دسمبر جب سقوطِ ڈھاکہ کی خونیں شفق پورے اُفق پر پھیل گئی تھی۔

☆☆☆

وزیراعظم اور آرمی چیف کی ملاقات کے دوران دبئی سے جناب صدر زرداری کا فون آیا اور اُن کی جنرل کیانی سے بھی مختصر سی بات چیت ہوئی۔ پیپلز پارٹی نے اس تاثر کو ہوا دی کہ معاملات طے پا گئے ہیں۔ انہی دنوں امریکہ سے بے طلب جنرل جیمز جونز کا حلفی بیان آ گیا کہ میموگیٹ سے جناب حسین حقانی کا کوئی تعلق نہیں۔ محترمہ عاصمہ جہانگیر نے اسے عدالتِ عظمیٰ میں داخل کرایا اور وزیراعظم نے اعلان فرمایا کہ میمو ایشو اب دم توڑ گیا ہے اور اب کسی تحقیقات کی



ضرورت نہیں رہی۔ عوام نے کچھ دیر سکھ کا سانس لیا، لیکن ۱۸ دسمبر کی شام یہ خبر گردش کرنے لگی کہ صدرِ مملکت آدھی شب کراچی لینڈ کرنے والے ہیں۔ اُن کی اچانک آمد سے یہ تاثر قائم ہوا کہ یہ اس مفاہمت کا نتیجہ ہے جو صدرِ مملکت اور آرمی چیف کے درمیان ایک رات پہلے ہو چکی ہے، مگر یہ خوف کسی قدر سایہ فگن رہا کہ کہیں یہ سراب نہ ہو اور مصلحت کے تحت خوش فہمی کا ایک خوبصورت جال بُنا گیا ہو۔

۱۹ دسمبر کی صبح جب عدالتِ عظمیٰ کے نورکنی بینچ نے میموگیٹ مقدمے کی دوبارہ سماعت شروع کی، تو پورا منظرنامہ ہی تبدیل ہونے لگا۔ فاضل چیف جسٹس نے سب سے پہلے اٹارنی جنرل سے پوچھا کہ بابر اعوان اور وزیر قانون مولا بخش چانڈیو نے پی آئی ڈی میں جو پریس کانفرنس کی تھی، وہ حکومت کا موقف تھا یا اُن کی ذاتی رائے۔ اگر یہ اُن کی ذاتی رائے تھی، تو انہوں نے عدلیہ کے خلاف جو توہین آمیز گفتگو کی، اس کے خلاف جناب وزیراعظم نے کیا اقدامات کیے۔ اُنہیں ہدایت کی گئی کہ وہ آج دوپہر تک وزیراعظم کی طرف سے حلفیہ بیان داخل کرائیں۔ فاضل عدالت نے محترمہ عاصمہ جہانگیر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ سینئر ایڈووکیٹ کی حیثیت سے ہمیں آپ سے توقع تھی کہ اس پریس کانفرنس کے حوالے سے توہینِ عدالت کی درخواست دائر کریں گی۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ میں وہ پریس کانفرنس دیکھ نہیں سکی تھی اور ہم سب پر فاضل عدالت کا احترام واجب ہے اور فاضل عدالت کو توہینِ عدالت قرار دینے کا اختیار ہے۔ اس کے فوراً ہی بعد یہ عجب معاملہ ہوا کہ جب وہ عدالت سے باہر آئیں تو اُنہوں نے بڑے تند و تیز لہجے میں کہا کہ عدالتِ عظمیٰ کو یہ تحقیق کرنی چاہیے کہ ڈی جی آئی ایس آئی کس لیے منصور اعجاز سے ملنے لندن گئے تھے۔

☆☆☆

۱۹ دسمبر کو دورانِ سماعت فاضل چیف جسٹس اور بینچ کے دوسرے فاضل جج صاحبان نے چند بڑے بنیادی نکات کا احاطہ کیا جن کا ہمارے سیاسی، قانونی اور عدالتی نظام کے مستقبل سے گہرا تعلق ہے۔ پہلا یہ کہ ہم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم، عوام کی حمایت اور آئین کی طاقت کے ساتھ بیٹھے ہیں اور بالادستی پارلیمنٹ کو نہیں دستورِ پاکستان کو حاصل ہے اور مملکت کے تمام ادارے جس کے تابع ہیں۔ دوسرا یہ کہ فاضل چیف جسٹس نے اس بنیادی اصول کا اعادہ فرمایا کہ جو بھی ہے اور جہاں بھی ہے، وہ یہ جان لے کہ اسے آئین اور قانون کی اطاعت کرنا ہوگی۔ تیسرا اہم نکتہ صدر آصف زرداری کے حوالے سے زیرِ بحث آیا کہ اُن کی طرف سے بیانِ حلفی جمع نہ کرانے کا قانون کی نظر میں واضح مطلب یہ ہوگا کہ اُن کے خلاف جو الزام لگایا گیا ہے، وہ اسے درست مانتے ہیں۔ چوتھا یہ کہ فاضل عدالت نے آرمی چیف کے حلفیہ بیان کو بہت اہم قرار دیا اور تمام فریقوں کو اس کے ہر نکتے کا جواب دینے کی ہدایت کی گئی۔ پانچویں اہم بات یہ سامنے آئی کہ فاضل عدالت نے میمو کے اندر استعمال ہونے والے لفظ 'ہم' پر سوال اُٹھایا کہ اس میں ایک سے زیادہ شخص شامل ہیں جن کا تعین ضروری ہے۔ چھٹا اہم اشارہ یہ ملا کہ فاضل عدالت میموکیس کو التوا میں ڈالنا نہیں چاہتی اور اس نے جواب الجواب داخل کرانے کے لیے صرف تین روز کی مہلت دی تھی۔

جنرل کیانی جن کے حلفی بیان کو فاضل عدالت نے اہمیت دی ہے، اس کے چار کلیدی نکات یہ ہیں۔ (۱) اُن حقائق اور حالات کا مکمل جائزہ جن میں میمو کا خاکہ تیار کیا گیا اور اُسے جاری کیا گیا۔ (۲) ڈی جی آئی ایس آئی کی ابتدائی تفتیش



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے بعد اس امر کی کافی شہادت دستیاب ہے کہ میمو ایک وجود رکھتا ہے اور اسے ایڈمرل مولن تک پہنچایا گیا ہے۔ (۳) بہت اہم یہ ہے کہ ٹیکسٹ میسجز اور ٹیلی فون کالز سے اس شبہے کو بڑی تقویت ملتی ہے کہ حسین حقانی کا میمو کے ساتھ ایک تعلق ہے۔ (۴) میمو معاملے کا ہماری قومی سلامتی پر ایک گہرا اثر محسوس کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعے ٹروپس کا مورال گرانے کی کوشش ہوئی ہے جو پاکستان کی خودمختاری' سیاسی آزادی اور علاقائی سلامتی میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں۔

آرمی چیف نے فاضل عدالت میمو گیٹ کی ہمہ پہلو تفتیش کرنے کی درخواست کی۔ ۲۲ دسمبر کی شام تک سبھی فریقوں نے جواب الجواب داخل کرا دیے جبکہ صدرِ پاکستان کی طرف سے کوئی بیانِ حلفی جمع نہیں کرایا گیا اور حکومت نے یہ موقف اختیار کیا کہ وفاق کے جواب میں شامل ہے۔ منصور اعجاز نے اپنے حلفی بیان میں کہا کہ مجھے حسین حقانی نے میمو وقفے وقفے سے لکھوایا تھا جس کے تمام ثبوت موجود ہیں اور میں فاضل عدالت کے روبرو پیش ہونے کے لیے تیار ہوں۔ جناب حسین حقانی جن کی اپنی وکیل عاصمہ جہانگیر سے ملاقات نہیں ہو پا رہی تھی' اس کا فاضل عدالت نے انتظام کیا اور تین گھنٹوں کی ملاقات کے بعد اُن کی طرف سے یہ حلفی بیان داخل کرایا گیا کہ میرا میمو سے کوئی تعلق نہیں اور مجھے منصور اعجاز اور ڈی جی آئی ایس آئی کی مبینہ ملاقات پر بھی شبہ ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ اس معاملے کی تحقیقات ہونی چاہئیں اور سپریم کورٹ کو آئینی درخواست کی سماعت کا حق حاصل ہے۔ وفاق کے بیانِ حلفیہ میں عدالتِ عظمیٰ کے اختیار کو چیلنج کیا اور اس نکتے پر زور دیا کہ میمو گیٹ کوئی وجود ہی نہیں رکھتا' اس لیے تفتیش کی حاجت نہیں۔ مختلف دلائل سننے کے بعد فاضل بینچ نے اس رائے کا اظہار کیا کہ اگر تمام فریق اس پر متفق ہوں تو معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ایک عدالتی کمیشن تشکیل دیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

اسی روز ایک طرف عدالتِ عظمیٰ میں ایک نہایت حساس مقدمہ زیرِ سماعت تھا اور آئین اور قانون کی بالادستی پر بات ہو رہی تھی' تو دوسری طرف جناب وزیرِ اعظم پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹس اور قومی اسمبلی میں 'تاریخ ساز' خیالات کا بہت گھن گرج کے ساتھ اظہار فرما رہے تھے جو اُن کے معتدل مزاج سے یکسر ہٹا ہوا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ منتخب حکومت کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں' فوج خود کو ریاست کے اندر ریاست نہ سمجھے' کیونکہ وزارتِ دفاع سمیت تمام ادارے میرے اور پارلیمنٹ کے تابع ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ عوامی حمایت کے بغیر کوئی جنگ نہیں جیتی جا سکتی' انہیں تنخواہیں قومی خزانے سے دی جاتی ہیں اور ہم نے مشکل وقت میں فوج کا ساتھ دیا' اگر کوئی سمجھتا ہے کہ حکومت کے ماتحت نہیں وہ غلطی پر ہے۔ اُنہوں نے آتش بداں لہجے میں کہا کہ ہم پرویز دینے کا الزام لگایا گیا' ہمیں بتایا جائے کہ اسامہ بن لادن جو چھ سال ایبٹ آباد میں رہا' اُسے کس نے ویزہ دیا تھا۔ اُنہوں نے اپنی تقریر کا اختتام اس بات پر کیا کہ عوام فیصلہ کریں کہ اُنہیں جمہوریت چاہیے یا آمریت اور ہم حکومت میں رہیں یا اپوزیشن میں عوام کے حقوق کی جنگ لڑتے رہیں گے۔ آخر میں یہ مژدہ بھی سنایا کہ میں نوکری پیشہ وزیرِ اعظم نہیں' میری وزارتِ عظمیٰ کا دورانیہ وزیرِ اعظم بھٹو کے دورانیے سے بھی زیادہ ہے۔ اُن کا ارشاد تھا کہ ہمیں قائدِ اعظم نے ایک آزاد اور خودمختار پاکستان دیا تھا' ہم اگر آزادی کی حفاظت نہ کر سکیں اور عوام کی خدمت نہ بجا لائیں تو ہمیں ایوانوں میں بیٹھنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ آئندہ نوجوانوں کو ملکی قیادت کرنا ہے۔ میمو گیٹ کے حوالے سے اُنہوں نے کہا کہ عدالتی کمیشن بننا چاہیے۔



جناب وزیرِ اعظم کی ان تقریروں نے ایک تلاطم برپا کر دیا اور سیاسی بھونچال کی گرگراہٹ صاف سنائی دینے لگی۔ بعض تجزیہ نگار کہتے ہیں کہ حکومت نے بیک وقت فوج اور عدلیہ کے خلاف طبلِ جنگ بجا دیا ہے جس کے نتائج بڑے خطرناک نکل سکتے ہیں۔ دراصل ہمارے بیشتر حکمران وہی غلطیاں کرتے آئے ہیں جو ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء میں سقوطِ مشرقی پاکستان پر منتج ہوئی تھیں۔ آج کے حالات بظاہر بڑے مختلف ہیں کیونکہ ہمیں جغرافیائی وحدت بھی میسر ہے اور ہمیں ایک آزاد عدلیہ اور ایک آزاد میڈیا بھی دستیاب ہے اور ہمارے عوام سیاسی اعتبار سے پہلے کے مقابلے میں بہت باشعور ہیں۔ ان کے علاوہ تمام سیاسی جماعتیں جمہوریت کی علمبردار اور فوجی ٹیک اوور کے سخت خلاف ہیں اور ہماری موجودہ فوجی قیادت نے اپنا دامن سیاست میں آلودہ نہیں ہونے دیا۔ جنرل کیانی ایک دھیمے اور سردبار عسکری قائد ہیں اور عالمی تناظر میں پاکستان کی قومی سلامتی کو لاحق خطرات کے آگے ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنے ہوئے ہیں۔ امریکی سی آئی اے کا جو ایک نیٹ ورک جنرل مشرف اور زرداری حکومت کے ابتدائی برسوں میں قائم ہو گیا تھا کہ اس کی بیخ کنی میں ہماری آئی ایس آئی نے جو عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے اس کی عوام کے اندر بڑی پذیرائی پائی جاتی ہے۔ ان تمام تر مثبت پہلوؤں کے باوجود پیپلز پارٹی کی مخلوط حکومت نے ملکی معیشت کو جس حال تک پہنچا دیا ہے' اس میں اکنامک ایمرجنسی کا نفاذ ایک حد تک ناگزیر ہو گیا ہے۔ اسی طرح حکومت اور فوج کے درمیان سخت محاذ آرائی کا ماحول پیدا کر دیا گیا ہے' وہ ایک مخدوش مستقبل کی تصویر پیش کرتا ہے۔ جناب وزیرِ اعظم نے اپنی جوالا مکھی تقریر میں پارلیمنٹ کی بالادستی کا بار بار ذکر کیا اور یہ تاثر دینے کی سرتوڑ کوشش کی کہ اُن کی حکومت نے سارے فیصلے پارلیمنٹ کی راہنمائی میں کیے ہیں' جبکہ سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ آج کا سیاسی' معاشی اور انتظامی بحران پیدا ہی اس لیے ہوا ہے کہ فردِ واحد نے اس بلند و بالا ایوان کو ربڑ اسٹمپ بنا دیا تھا اور تمام فیصلے علی بابا اور چالیس چور کر رہے تھے۔ اُنہوں نے ریاست کے اندر ریاست کا بہت شور مچایا اور فوج کو ہدفِ تنقید بنایا جبکہ ہماری خودسر اور قانون شکن حکومت نے ہی ریاست کے اندر اپنے مفادات کی ریاست قائم کر رکھی ہے' جس کے باعث اچھی حکمرانی کا پورا چہرہ مسخ ہو گیا ہے۔ ریاستی ادارے کنگال ہو گئے اور عوام حکومت کے جانے کی دعائیں مانگنے لگے۔ پارلیمنٹ کی قراردادوں' عدالتِ عظمیٰ کے فیصلوں اور عوام کی فلاح و بہبود کے بنیادی تقاضوں کی جو درگت حکمران جماعتوں نے بنائی' اس کی مثال ہماری تاریخ میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے اور آج اس طرزِ عمل کے خوفناک نتائج سامنے آ رہے ہیں۔

☆☆☆

پیپلز پارٹی کو اس وقت دو بڑے ایشوز کا سامنا ہے۔ ایک میمو گیٹ کا مقدمہ اور دوسرا وقت سے پہلے عام انتخابات کا مطالبہ۔ ان سے توجہ ہٹانے کے لیے غالباً جارحانہ انداز اختیار کرنے کی حکمتِ عملی وضع کی گئی' جس کے تحت جناب وزیرِ اعظم نے بعض حقائق بیان کرتے ہوئے فوج پر تابڑ توڑ حملے کیے اور یہ کہ قوم کے اندر تشویش کی لہر دوڑا دی کہ جمہوریت کو خطرات لاحق ہیں اور منتخب حکومت کی بساط لپیٹی جا رہی ہے۔ حکومت سے باہر تمام سیاسی جماعتوں نے وزیرِ اعظم کی تقریر کو غیر ذمے داری کا مظہر قرار دیا۔ جناب عمران خان کے خیال میں یہ سپریم کورٹ پر دباؤ بڑھانے کا ایک حربہ تھا کیونکہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جب پیپلز پارٹی احتساب کے شکنجے میں آتی ہے' تو اسے جمہوریت خطرے میں دکھائی دینے لگتی ہے اور



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کون کر رہا ہے۔ وزیراعظم کی طرف سے فوج کے خلاف ایک انتہائی اشتعال انگیز تقریر کے باوجود آرمی چیف نے اسی روز مہمند ایجنسی میں اعلیٰ افسروں سے خطاب کرتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ یہ تاثر غلط ہے کہ فوج اقتدار پر قابض ہونا چاہتی ہے۔ اُنہوں نے مزید واضح کیا کہ ہمارا ادارہ جمہوریت کی حمایت کرتا رہے گا اور آئین کے تحت اپنی ذمے داریاں ادا کرے گا۔ اُن کا خیال تھا کہ ایسی افواہیں اصل مسائل سے توجہ ہٹانے کے لیے پھیلائی جا رہی ہیں جو ملک میں درپیش خطرات میں اضافہ کر سکتی ہیں۔ اُنہوں نے قومی سلامتی کو لاحق خطرات کے بارے میں گہری تشویش کا اظہار کیا اور زور دیا کہ اس پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا۔ اُن کے اس خطاب سے وہ ماحول خوشگوار ہو جانا چاہیے جو پیپلز پارٹی کی لغو اور بے بنیاد باتوں سے پیدا ہوا ہے۔ فاضل چیف جسٹس نے بھی میمو گیٹ کے مقدمے کی سماعت کے دوران اس عزم کا اعادہ کیا کہ عدلیہ کسی غیر آئینی یا ماورائے آئین ذرائع سے حکومت کی تبدیلی کو کسی طور قبول نہیں کرے گی۔

حکومت، عدالتِ عظمیٰ اور فوجی قیادت کو پینترے بدل بدل کر چیلنج کر رہی ہے اور اصلاحِ احوال کے لیے آمادہ نہیں۔ اس عاقبت نااندیش اور مہلک روش کے خلاف عوام کے اندر تبدیلی کی ایک زبردست اُمنگ پیدا ہوئی ہے جس کی قیادت اپنے اپنے دائروں میں جناب نواز شریف اور عمران خان کر رہے ہیں جن کی تحریکِ انصاف میں لوگ جوق در جوق شامل ہونے لگے ہیں اور ایک نیا خوشگوار سیاسی منظر نامہ اُبھرنے لگا ہے، مگر ڈر یہ ہے کہ حکومت فوج کے خلاف کوئی غلط قدم نہ اُٹھا بیٹھے اور سیاسی زلزلے کی جو گرگراہٹ سننے میں آ رہی ہے، وہ ہمارے قومی وجود کے لیے خطرہ نہ بن جائے۔ اس وقت پوری سیاسی اور مذہبی قیادت کو غیر معمولی بردباری سے کام لینا ہوگا کہ اُنہیں اپنی فوج کو مذموم امریکی عزائم کے خلاف حمایت بھی فراہم کرنی ہے اور عوام کو انتہائی کرپٹ حکومت سے نجات بھی دلانا اور قومی سلامتی کا تحفظ بھی کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے پہلی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ صدر، وزیراعظم اور آرمی چیف کے درمیان بنیادی معاملات پر حقیقی مفاہمت پیدا کی جائے۔ اُن کے درمیان یہ طے پائے کہ میمو گیٹ کی عدالتی کمیشن کے ذریعے تفتیش کا عمل مکمل ہونے دیا جائے، اور جو حقائق سامنے آئیں، ان کی روشنی میں قومی سلامتی کے حوالے سے کی ایک ہمہ پہلو پالیسی وضع کی جائے اور ذمے دار عناصر کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے۔ ایک برطانوی خبر رساں ایجنسی نے یہ اطلاع دی ہے کہ فوجی قیادت صدر زرداری سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صدرِ مملکت اب خود ایک مسئلہ بن چکے ہیں اور اُن کی حکومت ناقابلِ برداشت۔ اس کے باجود حکومت کی تبدیلی کے لیے غیر آئینی راستے کا انتخاب یقیناً تباہ کن ہو گا۔ اس آن مناسب ترین راستہ یہ ہوگا کہ حکومت کو وقت سے پہلے انتخابات کی افادیت پر قائل کیا جائے۔ عدالتِ عظمیٰ نے الیکشن کمیشن کو ۲۳ فروری ۲۰۱۲ء تک انتخابی فہرستیں تیار کرنے کا بڑی سختی سے حکم دیا ہے، اس میں مقررہ مدت سے پہلے انتخابات کا ایک واضح اشارہ ملتا ہے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ ہماری سیاسی جماعتوں کو قومی اسمبلی کی معیاد پانچ سال سے کم کر کے چار سال مقرر کرنے پر اتفاق کر لینا چاہیے۔ اس کے علاوہ سقوطِ مشرقی پاکستان جیسے حادثات سے محفوظ رہنے کے لیے تمام اسٹیک ہولڈرز کے لیے حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ کا مطالعہ لازمی قرار دیا جائے اور ان اصلاحات کو نافذ کرنے کے لیے سنجیدگی سے ہونا چاہیے جن کی سفارشات رپورٹ میں بڑی تفصیل سے درج ہیں۔ اس عظیم الشان کام کے بعد سیاسی بھونچال آنا بند ہو جائیں گے۔




بچوں اور نوجوانوں کے لیے

قرآن حکیم کا آسان ترجمہ اور تفسیر

قرآن پاک کا نہایت سلیس اور بامحاورہ ترجمہ

جلد اوّل: سورۃ الفاتحہ تا سورۃ آل عمران  جلد دوم: سورۃ النساء تا سورۃ الانعام

جلد سوم: سورۃ الاعراف

نہایت آسان، سادہ زبان اور دل نشین انداز بیان میں قرآن کی تفسیر، جس سے دین کو سمجھنا بہت آسان ہو جاتا ہے

اسکول اور کالج/یونی ورسٹی کے طلبہ کے لیے نہایت موزوں..... ہر قسم کے فقہی اختلافات سے پاک

عشق رسول ﷺ سے منور

بچوں اور نوجوانوں کے لیے لکھی گئی اُردو زبان کی پہلی تفسیر

الفاظ پر اعراب تاکہ پڑھنے والے کا تلفظ درست رہے

جدید سائنسی تقاضوں سے ہم آہنگ..... موجودہ دور کی مثالوں سے آراستہ

ہدیہ فی جلد: 155 روپے

ملنے کا پتا:

- بک لینڈ۔ ۱۶۔ اُردو بازار لاہور فون: 042-7124656
- بک لینڈ۔ H-177، پہلی منزل، اقبال روڈ کمیٹی چوک، راولپنڈی فون: 051-5773341
- چاند کمپنی (رجسٹرڈ)۔ ۱۷۔ اُردو بازار لاہور فون: 042-7244114
- ادارۂ اسلامیات، انارکلی لاہور


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## SHORT TENDER NOTICE

Sealed item rates/percentage rates tenders based on MRS 4th Quarter (October to December) 2011, of District Nankana Sahib are invited from the approved Government Contractors of HUD&PHE Department who have got their names enlisted/renewed for the current financial year 2011-12. The tenders documents will be issued by the Divisional Head Clerk of this office during the office hours on production of earnest money in the shape of the deposit at call from any scheduled Bank in the name of Executive Engineer PHE Division Nankana Sahib and written request accompanied with attested copies of enlistment/renewal letter, renewal fee deposit receipt, license of Pakistan Engineering Council for the calendar year 2011-12,Contractors/Firms authority letter, NIC of Contractors/Firms managing partner, partnership deed, registered power of attorneys or sole proprietor ship certificate and cash payment of non refundable tender fee as admissible under the rules . All the interested contractors/firms are required to bring with them, the original enlistment/renewal letter of HUD &PHE Department. Proof of deposit of enlistment /renewal fee, partnership deed/sole proprietor ship or power of attorneys duly registered by the Sub Registrar and PEC license for the calendar year 2011-12 for verification, failing which the tender documents will not be issued.

The tender shall be issued up to 07.01.2012 during the office hours and will be received /opened in the office of the undersigned on 09.01.2012 at 2.00 PM in the presence of tendering contractors/firms or their authorized representative who like to be present. The conditional tenders / telegraphic tenders/tenders received by post will not be entertained. The undersigned reserves the right to reject any or all the tenders without assigning any reason thereof.

As per Government of the Punjab Finance Department Notification No. Ro (tech) FDI -2/83 (IV) (P) dated 06.04.2005, in case the total tendered amount is lesser than 5% of approved estimate (DNIT) amount, the lowest bidder will have to deposit an additional performance security from any scheduled Bank equal to the tendered amount below the estimated cost within 15 days of issuance of notice or within expiry period of the bid, whichever is earlier. Failing which the earnest money deposited by the bidder will be forfeited and the tender will be re-invited.

| Sr. No | Name of Work | Estimated Cost. (Rs.in Million) | Earnest Money | Time Limit. | T.S.No & Date. |
|---|---|---|---|---|---|
| 1. | **Construction of Water Supply Scheme at Chak No.50/R.B Tawana Tehsil Shah Kot & District Nankana Sahib.**<br>i) ESR and trial boring 1 Job<br>ii) T/W boring 1 No. 0.5 Cusec Discharge<br>iii) Pump House Size 12'x12'<br>iv) Pumping Machinery 1 set.<br>v) Rising Main/Distribution system 8"i/d ,6"i/d AC Pipe & 4",3"PVC Pipe.<br>vi) Hypo Chlorinator 1 Job | 9.644 | 192900 | 6 Months | SE No.1211 dt:19.12. 2011 |
| 2. | **Rural Water Supply & Drainage Scheme Sathiali at Chak No.25/ R.B Tehsil Shah Kot District Nankana Sahib.**<br>Construction of drain brick pavement and sullage carrier. | 11.530 | 230600 | 9 Months | SE No.1215 dt:19.12. 2011 |
| 3. | **Rural Water Supply & Drainage Scheme Dharowali at Chak No.33 /R.B Tehsil Shah Kot District Nankana Sahib.**<br>Construction of drain brick pavement , sullage carrier and oxidation pond. | 7.315 | 146300 | 6 Months | EE No.1149 dt:19.12. 2011 |
| 4. | **Rural Water Supply & Drainage Scheme Kotla Kalan at Chak No.43/R.B Tehsil Sangla Hill District Nankana Sahib.**<br>Construction of drain brick pavement , sullage carrier and oxidation pond. | 7.647 | 152940 | 6 Months | SE No.1218 dt:19.12. 2011 |
| 5. | **Rural Water Supply & Drainage Scheme Islam Nagar at Chak No.81/ R.B Tehsil Shah Kot District Nankana Sahib.**<br>Construction of drain brick pavement , sullage carrier and oxidation pond. | 11.099 | 221800 | 9 Months | SE No.1221 dt:19.12. 2011 |
| 6. | **Rural Water Supply & Drainage Scheme at Thothian Kalan Chak No.10 /R.B Tehsil Shah Kot District Nankana Sahib.**<br>Construction of drain brick pavement , sullage carrier and oxidation pond. | 6.966 | 139320 | 6 Months | SE No.1152 dt:19.12. 2011 |
| 7. | **Rural Water Supply & Drainage Scheme at Derah & Tibi Jahar Chak No.29/ R.B Tehsil Sangla Hill District Nankana Sahib.**<br>Construction of drain brick pavement , sullage carrier and oxidation pond. | 12.368 | 247360 | 9 Months | SE No.1224 dt:19.12. 2011 |
| 8. | **Water Supply & Drainage Scheme at Chak No.24/ R.B Kalan & Khurd Tehsil Shah Kot District Nankana Sahib.**<br>i) ESR and trial boring 1 Job<br>ii) T/W boring 1 No. 0.5 Cusec Discharge<br>iii) Pump House Size 12'x12'<br>iv) Pumping Machinery 1 set.<br>v) Rising Main/Distribution system,6"i/d AC Pipe & 4",3"PVC Pipe.<br>vi) OHR 20000 Gallons<br>vii) Hypo Chlorinator 1 Job<br>viii) Construction of drain brick pavement , sullage carrier and oxidation pond | 22.106 | 442120 | 9 Months | SE No.1227 dt:19.12. 2011 |
| 9. | **Rural Water Supply & Drainage Scheme at Titran Wala Chak No.115 /R.B Tehsil Sangla Hill District Nankana Sahib.**<br>Construction of drain brick pavement , sullage carrier and oxidation pond. | 7.261 | 145220 | 6 Months | EE No.1155 Dt:19.12. 2011 |
| 10. | **Water Supply & Drainage Scheme at Ratian Chak No.5 /R.B Maijran Arrian Tehsil Shah Kot District Naukana Sahib.**<br>Construction of drain brick pavement , sullage carrier and oxidation pond.<br>i) ESR and trial boring 1 Job<br>ii) T/W boring 1 No. 0.5 Cusec Discharge<br>iii) Pump House Size 12'x12'<br>iv) Pumping Machinery 1 set.<br>v) Rising Main/Distribution system, 6"i/d AC Pipe & 4",3"PVC Pipe.<br>vi) OHR 20000 Gallons<br>vii) Hypo Chlorinator 1 Job | 16.631 | 332600 | 9 Months | SE No.1230 dt:19.12. 2011 |
| 11. | **Provision of Drainage Scheme at Kot Shah Muhammad District Nankana Sahib.**<br>Construction of drain PCC in street , sullage carrier, culverts and outfall structure. | 9.708 | 194160 | 6 Months | SE No.1233 dt:19.12. 2011. |

Executive Engineer
Public Health Engg: Division
Nankana Sahib.

**IPL: 15059**

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

**گاڑی** جس تیزی سے ماڈل ٹاؤن کی طرف رواں تھی، زندگی کی رفتار اس سے بھی کہیں تیز رہی ہوگی، تبھی تو ۱۹۶۳ء میں قائم ہونے والی مائنگ کمپنی، گلاس انڈسٹری میں اور پھر پاکستان کے ایک بڑے صنعتی گروپ میں ڈھل گئی۔ اکثر بڑے کاموں اور بڑی کامیابیوں کے لیے بڑی صلاحیتوں سے زیادہ بڑے خواب اہم ہوتے ہیں جو اس منزل پر پہنچاتے ہیں۔

اس لمحے ہماری منزل ماڈل ٹاؤن کے ایل بلاک میں واقع وہ گھر تھا جس کے ماتھے پہ ۵۰/ل لکھا ہے۔ بے شک یہ غنی گروپ کا صدر دفتر ہے۔ یہاں پاکستان کے صفِ اول کے گلاس برانڈ کے ساتھ ساتھ غنی آٹوموبائلز کے دفاتر قائم ہیں۔ گروپ کے چیف ایگزیکٹو آفیسر امتیاز احمد خان سے ملاقات کا وقت ۱۱ بجے طے تھا۔ ہم تیزی سے فاصلہ طے کر رہے تھے حالانکہ ایسی تیزی کبھی کبھی فاصلے بڑھانے کا باعث بھی بن جاتی ہے۔

غنی گلاس انڈسٹریز کا آغاز وعروج بذات خود ایک دلچسپ داستان ہے۔ جس کا ایک سرا لاہور کے گورنر ہاؤس سے ملا ہوا ہے جہاں ایک محنتی اور دیانت دار سرکاری ملازم نے اپنے بچے کے لیے سرکاری نوکری کی خواہش کا اظہار کیا اور گورنر ہاؤس کے خاص مکین اور تب کے گورنر ملک امیر محمد خاں نے کہا ''نوکری میں کیا رکھا ہے یہ ساری عمر نوکری ہی کرتا رہے گا''۔ کوئی اور دور ہوتا، یہی فرمائش ہوتی تو ممکن ہے ''اللہ کریسی'' کا تاریخی جواب ملتا۔ مگر امیر محمد خاں نے ایک انوکھا کام کیا۔ اپنی سوچ اور تعلق کا اظہار یوں کیا کہ کان لیز پہ دینے کا اہتمام کیا۔ اگر صرف نصیحت اور مشورہ ملتا اور عملاً کچھ نہ ہوتا تو آج غنی گروپ اور صفِ اول کی غنی گلاس انڈسٹریز بھی شاید وجود میں نہ آتی مگر ساتھ ہی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کانیں تو بے شمار لوگوں کے پاس پہلے بھی تھیں اور اب بھی ہیں۔ کہیں جدی پشتی، کہیں لیز پر، کہیں حصہ داری میں مگر وہ سب تو نہ انڈسٹری میں آئے، نہ صنعت کار ہوئے، آخر اس خاندان میں کچھ تو ایسا خاص رہا ہوگا کہ جس کی وجہ سے اللہ نے اپنی رحمت کا سایہ ان پر کر دیا اور وہ دوسروں کی فیکٹریوں کو راک سالٹ، کول اور سلیکا سینڈ جیسا خام مال فراہم کرتے کرتے، گلاس سازی میں آگئے اور اپنی محنت، دیانت اور ذہانت کے بل پہ صفِ اول میں شمار ہونے لگے۔

عجیب بات یہ ہوئی کہ ملاقات روایتی تعارف کے بغیر ہی شروع ہوگئی۔ تبلیغ اور تبلیغی مصروفیات کا ذکر اس قدر غالب آگیا کہ ہمارا پہلا سوال انہی میں دب گیا۔ ہم نے گفتگو کو خاموشی سے ہونے دیا۔ جب تھوڑا سا وقفہ آیا تو شریکِ گفتگو ہوگیا۔ ''غنی گلاس انڈسٹریز کا ویژن بہت مختلف ہے۔'' میں نے صاف ستھرے شلوار سوٹ پہ بلیک کوٹ پہنے امتیاز صاحب سے پوچھا تھا۔ انھوں نے اپنی گول ٹوپی نرمی سے سر پہ جماتے ہوئے کہا ''ہمارا ویژن، ہماری زندگی اور سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔ جو اقدار ہم اپنی ذاتی زندگی میں پسند کرتے ہیں، ہماری کوشش ہے کہ کمپنی بھی انہی خطوط پہ چلے۔ ہم اپنی دنیا کے لیے ہی نہیں آخرت کے لیے بھی اپنے بزنس اور تجارت کو اہمیت دیتے ہیں۔''

میں نے بات کو تھوڑا گھمانے کی کوشش کی۔ بے شک منفرد ہے یہ ویژن اور مختلف بھی مگر اس میں تو تبلیغی جماعت کے مخصوص الفاظ تک آگئے ہیں۔ وہ مسکرائے، انھوں نے مجھے دیوار پہ لگے ایک فوٹو پرنٹ کو بار بار پڑھتے پایا تھا۔ بے شک وہ پرنٹ میرے ہاتھ میں بھی تھا۔ عاطف نے بڑی محنت کر کے کمپنی کے بارے میں تمام معلومات جمع کر کے مجھے دی تھیں اور میں نے تبھی سوچا کہ دوسرا سوال یہی کرنا ہے کہ اپنے خیالات کو کمپنی ویژن میں منتقل کرنا لوگوں کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔

آپ نے اس مشکل کو آسان کیسے کیا؟

بے شک دیوار پہ چسپاں کاغذ پہ لکھے ویژن کی بجائے کوئی خوب صورت فریم ہونا چاہیے تھا۔ شاید کسی روز جنید امتیاز یہ کام کر لیں جو ان کے صاحبزادے ہیں اور ملاقات کے اختتام پہ دبئی سے پہنچے تھے۔ دو روز پہلے جب میں نے ان سے رابطہ کیا تو پتا چلا کہ میرا فون تو دبئی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے اس ہوٹل میں جا ملا ہے۔ جہاں انھیں لاہور سے اچانک پہنچنا پڑا تھا۔ غنی گلاس کی ایک جدید فیکٹری اور پلانٹ دبئی میں بھی کام کر رہا ہے۔ میں نے جنید کو ایک مؤدب بیٹا اور باخبر منتظم پایا۔ اس روز انھوں نے دبئی سے ہی عاصم صاحب کے ذمے لگایا اور اس ملاقات کو ممکن بنایا۔

کاغذ پر لکھا تھا، غنی گلاس کا Ultimate Purpose ''ادارے کا مقصد زندگی کے ہر شعبے میں حضورؐ کے طریقے کو زندہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک مثالی نمونہ لوگوں کے سامنے پیش کرنا ہے تاکہ زندگی کے تمام شعبوں کے لوگ اپنے اپنے شعبے میں حضورؐ کی محنت کو اپنی محنت بنائیں۔'' اگلی سطر میں پھر انگریزی کی سرخی تھی Purpose of Vision اور اُردو میں لکھا تھا:

☆ حضورؐ کے امتی ہونے کا احساسِ ذمے داری

☆ شعبہ تجارت میں تجربہ اور مہارت

☆ شعبہ تجارت میں شدتِ ضرورت

امتیاز صاحب نے یقیناً دیانت دار تاجروں کے حوالے سے آنحضورؐ کے فرمان کو پڑھ رکھا ہوگا کہ وہ جنت میں انبیا کے ساتھ ہوں گے تبھی تو کہہ رہے تھے کہ تجارت میں آنحضورؐ اور ان کے تیار کردہ لوگوں کی پیروی کرنا ضروری ہے۔ حضرت ابوبکرؓ مکہ میں ریشم کے کپڑے کا بیوپار کرتے تھے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ بعد کے سالوں میں تجارت کے اسلامی اصولوں کی وجہ سے ارب پتی تاجر بنے تھے۔ میں نے سوچا کہ امتیاز صاحب حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کے ماڈل پر چل رہے ہیں کیونکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ تو ایمان لانے کے بعد اور بعد میں خلافت کی ذمے داریوں کے دوران زیادہ تجارتی سرگرمیوں کے لیے وقت ہی نہیں نکال پاتے تھے۔ اس لیے دُنیاوی اساسوں کے مالک نہ رہے تھے ہاں جب حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے خوب تجارت کی یہاں تک کہ اللہ نے رزق کے سارے دروازے ان کی طرف کھول دیے۔ اس لیے وہ روتے تھے کہ یہ مال کبھی آزمائش بھی ٹھہرتا ہے۔

۵۰ سالوں کے سفر کے بعد غنی گلاس کے پاس مشروبات کے لیے استعمال ہونے والی شیشے کی بوتلوں (Glass Container) کی ملک بھر کی مارکیٹ کا ۷۳ فیصد حصہ ہے اور فارماسوٹیکل انڈسٹریز میں ۸۶٪ حصہ یا مارکیٹ شیئر ''یہ حصہ پانا اتنا آسان تو نہیں رہا ہوگا۔''

امتیاز صاحب ایک لمحے کو چونکے پھر بولے ''اللہ آسانیاں دیتے ہیں۔ ہم نے طے کیا تھا کہ اگر ملٹی نیشنل کمپنیاں شفاف طرزِ عمل، پورے ٹیکس اور دیانت داری کے ساتھ اپنا کلچر بناتی ہیں تو ہم بھی اپنا کلچر بنائیں گے۔ ایک ملٹی نیشنل کمپنی کو تو میں خود جانتا ہوں کہ ۴ سال تک اپنی پراڈکٹ رجسٹرڈ نہیں کرا پائے کہ انھوں نے غلط راستہ اختیار نہ کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔''

سماجی ذمے داریوں اور چیریٹی کے حوالے سے گفتگو آگے بڑھی تو امتیاز صاحب نے کہا، پاکستان اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ یہاں بڑے بڑے صنعت کار سماجی بھلائی کے کاموں میں بے حد دلچسپی لیتے ہیں۔ ہم بھی ازمیر میں میسج فاؤنڈیشن کے نام سے سکول چلا رہے ہیں۔ پسرور میں بھی ایک سکول ہے۔ ڈسپنسری کا بھی اہتمام کیا ہے۔ اس سلسلے کو دراز کرنے کا ارادہ ہے۔ امتیاز صاحب کے بارے میں مجھے علم ہوا تھا کہ وہ جیلوں میں قید، قیدیوں کی تعلیم اور رہائی کے لیے بھی کوشاں رہتے اور

آنے والے دِنوں میں دینی مدارس کے عملے کے لیے ٹیکنیکل تعلیم کا منصوبہ بنا رہے ہیں تاکہ ان کے باعزت رزق کا انتظام ہو سکے۔ ان کا خیال تھا یہ سارا کام عبادت ہے۔ کاروبار و تجارت، عبادت اور ہر اچھے کام کی بنیاد میں دین موجود ہے۔ دین ہمیں کم وسیلہ لوگوں کی مدد کے لیے کہتا ہے۔ اہلِ زر کو کمزور مالی حیثیت والوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ زندگی میں چیزوں کے مثبت پہلوؤں کو دیکھنا چاہیے۔ یہی ترقی کا باعث بنتا ہے۔

اچھی سوچ، اچھی تعلیم جتنی بڑھے گی، ملک اتنا ہی آگے بڑھے گا۔ یہاں کے لوگوں میں اداروں میں پھلنے پھولنے کے بہت امکانات ہیں۔ اللہ سے جڑے رہنے اور اس کی باتیں ماننے میں خیر ہے۔ ہمارے تو سارے کاروبار میں یہ خیر آئی ہی تب، جب ہم اللہ سے جڑ گئے۔

غنی گلاس انڈسٹریز کے ۴ گلاس پلانٹ ہیں جن کی سالانہ پیداوار ۳ لاکھ ٹن ہے۔ یہ گروپ فلوٹ گلاس، کینٹینر گلاس بنانے میں سرفہرست یا نمبر ون سمجھا جاتا ہے۔ راک سالٹ، کول، سلیکا سینڈ کی مائننگ سے تجارتی زندگی کا آغاز کرنے والا یہ گروپ اب آٹوموبائیلز کی صنعت میں بھی آ چکا ہے۔ غنی موٹر سائیکل، غنی رکشا، غنی پک اپ رکشا ان کی معروف مصنوعات ہیں۔ آفس کی ایک دیوار پہ غنی آٹوموبائیلز کا کیلنڈر بھی آویزاں تھا، حالانکہ اس سادہ سے دفتر میں وہ تصاویر بھی کسی فریم میں ہو سکتی تھیں۔ سوال یہ تھا کہ گلاس سے موٹر سائیکل کی تیاری کا سفر کیسے؟

''ہم آٹوموبائلز میں ایسے نہیں آئے۔'' امتیاز صاحب نے پہلے حیرت سے میرا سوال سنا تھا۔ ایسی ہی ہی حیرت کا سامنا گزشتہ ماہ پاکستان کی صفِ اول کی کنسلٹنگ کمپنی اباکس کے چیف ایگزیکٹو آفیسر اسد علی خاں کو ہوا تھا۔ وہ تو باقاعدہ کہہ اٹھے تھے ''میرے اور میری کمپنی کے بارے میں آپ خوب پڑھ کر اور تیار ہو کر آئے ہیں۔''

''ہم پہلے مائنر سے خام مال دوسری انڈسٹریز کو سپلائی کرتے تھے۔ پھر خود گلاس انڈسٹری کی طرف آئے۔ یہاں کامیابی کے بعد ہم ٹیکسٹائل کے بزنس میں گئے۔ تب سبھی یہی کرتے تھے۔ ٹیکسٹائل کے عروج کا زمانہ تھا۔ پھر وہ شعبہ زوال کا شکار ہو گیا۔ ہمارا بھی سلک یونٹ تھا، ہم نے اسے آٹو موبائلز میں بدل لیا۔'' ویسے بھی غنی گروپ میں Sick Units کو خریدنے، زندہ کرنے اور عمدگی سے چلانے کی قابلیت پہلے سے مستحکم ہو چکی تھی۔ اسی لیے فلوٹ گلاس کے بانیوں میں سمجھا جانے والا یہ گروپ فلوٹ گلاس کی مارکیٹ میں ۸۲٪ فیصد حصے کا مالک ہے اور ۲۳٪ سے زائد ممالک میں فلوٹ گلاس برآمد کرتا ہے۔ ''آپ ان معدودے چند بزنس گروپس میں سے ہیں جن کے پاس ایک ہزار سے زاید کارپوریٹ کسٹمر ہیں اور وہ بھی مطمئن۔'' ''یہ اللہ کا بہت احسان ہے۔'' امتیاز صاحب نے پھر سے کہنا شروع کیا ''جو اللہ کا کام کرتا ہے۔ اللہ اس کا کام کرتا ہے۔''

میں نے حیرت سے کہا، آپ تو سنا ہے کام چھوڑ کر چلے پر چلے جاتے ہیں بلکہ سنا ہے ابھی برازیل، چلی وغیرہ سے ہو کر آئے ہیں کوئی ایک سال کا تبلیغی دورہ کر کے۔

''ہاں بالکل'' انھوں نے تصدیق کی۔ میرے تو سارے فیملی والے اس کام میں ہیں اور ہم اکثر جاتے ہیں۔ کام بھی چلتا رہتا ہے بلکہ جب سے ہم اللہ کے کام میں پڑے ہیں اور رسولؐ کی محنت کو اپنی محنت بنایا اور اس پر کام کیا ہے کہ یہ محنت اُمت میں کیسے آ جائے تو ہمارے کام میں تو برکت بے حد نمایاں ہو گئی ہے۔ ''تو کیا اس برکت کے لیے اگر آپ کے ملازمین بھی لمبے لمبے چلّوں اور دوروں پہ جانا چاہیں تو۔''

''ہاں گئی جاتے ہیں۔'' انھوں نے اسی جوش و خروش سے جواب دیا۔

''تو کیا آپ اُنہیں تنخواہ پوری دیتے ہیں اس دوران.....'' میرا اگلا سوال فطری تھا۔

بولے ''نہیں تنخواہ تو نہیں دیتے بلا تنخواہ جاتے ہیں۔ اولاد، بیوی، بچے سب کو اللہ کے آسرے پر چھوڑ جاتے ہیں۔'' سوال تو کئی سارے ذہن میں آ رہے اور بعض تو اصرار بھی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر رہے تھے مگر بات پھر کسی اور طرف نکل جاتی۔ ہم تو ان کا بزنس ماڈل دیکھنے آئے تھے۔ جاننے آئے تھے کہ دینی پس منظر رکھنے والے لوگ کس طرح بزنس کرتے ہیں۔ کیسے نئی روایت کو جنم دیتے ہیں۔ خود مثال بنتے ہیں یا معاشرے کے چلن کا شکار ہو کر کانِ نمک کا حصہ بن جاتے ہیں۔

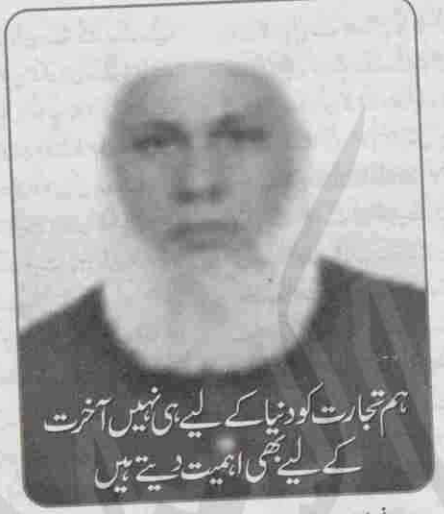

غنی گلاس انڈسٹریز کے سی ای او امتیاز احمد خاں

طیب صاحب نے بہت نفاست اور معصومیت سے اچانک کہا ''امتیاز صاحب لگتا ہے آپ تو روزے سے ہیں۔'' انھوں نے فوراً پی۔اے کو بلایا اور کہا ''میں واقعی روزے سے ہوں، مہمانوں کے لیے چائے لاؤ۔ میں کہنا بھول گیا تھا۔''

ہم تو سوچ رہے تھے کہ کچھ دیر بعد ازخود چائے آ جائے گی مگر ۲ گھنٹے گزر گئے۔ طیب صاحب نے خوب سب کی نمائندگی کر دی۔

امتیاز صاحب ایک بار پھر تبلیغی سرگرمیوں کے فضائل بتا رہے تھے۔ جب میں نے پوچھا ''کیا آپ نئے ملازمین کے انٹرویو کرتے ہوئے یہ تعلق اور خوبی بھی دیکھتے ہیں''۔ وہ بات کی تہہ کو پہنچے اور بولے ''نہیں۔''

''ملازمت دیتے وقت تو ہم اس کی اہلیت اور قابلیت ہی دیکھتے ہیں۔ وہ بغیر ڈاڑھی والا بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد تربیت کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ اس میں بھی زبردستی نہیں ہوتی میں خود لیکچر اور بیان کرتا ہوں۔ مسجد میں تربیت ہوتی ہے۔ ہمارے ملازمین کی ایک بڑی تعداد نماز پڑھتی ہے''۔ اس کا مشاہدہ ہم نے ظہر کی نماز میں کر بھی لیا۔

دفتر کے ایک کمرے میں بنی مسجد نمازیوں سے بھری تھی۔ نماز کے بعد تبلیغی نصاب سے بیان بھی ہوا۔

جدید علم اور مہارتوں کی اہمیت بزنس میں کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ نئے سسٹمز، نئی پریکٹسز تبھی وجود میں آتی ہیں، اسی لیے میں نے پوچھا، امتیاز صاحب آپ خود کو جدید علوم اور ٹیکنالوجی سے کیسے آگاہ رکھتے ہیں؟ کیا سیمینارز اور ورکشاپس میں جاتے ہیں، جیسے دوسرے سی۔ای۔اوز جاتے ہیں۔ ان کا جواب میری توقع سے مختلف تھا۔ بولے ''باہر کے دوروں کے دوران اپنی معلومات کے اضافے اور تربیت کا موقع ملتا ہے۔ ہم دنیا کی تمام بڑی بڑی نمائشوں میں شرکت کرتے ہیں۔ ۲۳ ممالک کو گلاس برآمد کر رہے ہیں''۔ میں تو اس لیے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ ان کی کمپنی ماحول دوست حکمتِ عملی پر عمل پیرا ہے۔ کارپوریٹ سوشل ریسپانسبلٹی سمجھتی ہے۔ یقیناً ایچ۔آر کی بڑی بڑی کانفرنسوں اور سیمینارز میں بھی جاتے ہوں گے۔

غنی گروپ کی مینجمنٹ اب آہستہ آہستہ نئی نسل میں منتقل ہو رہی ہے، اس لیے جاننا ضروری تھا کہ یہ مراحل کیسے طے ہو رہے ہیں۔ جواب ایک حیران کن انکشاف تھا۔ سنا ہے بڑے کاروباری گروپ خاص طور پر میمن اور چنیوٹی شیخ برادری اس پر عمل پیرا ہے۔ امتیاز صاحب نے بتایا ''ہمارے خاندان کے بچے جب کاروبار میں آتے ہیں تو نچلی سطح سے آغاز کرایا جاتا ہے۔ ہم ۴ بھائی ہیں۔ ۳ بھائی گلاس انڈسٹری سے وابستہ ہیں۔ بڑے بھائی مائننگ



میں ہیں۔ میرے ۲ بچے بھی اب میرے ساتھ ہیں۔ ایک دبئی کے پلانٹ کو دیکھ رہا ہے۔ جنید میرے ساتھ ہے۔ ہمارے برادران لاء اور ان کے بچے بھی اسی طرح بزنس میں آگے بڑھے ہیں۔''

امتیاز صاحب کے صاحبزادے جنید خاں جو اب گروپ کی مارکیٹنگ دیکھتے ہیں، کو یہ تحریر لکھتے ہوئے رات گئے میں نے کال ملائی اور پوچھا آپ نے ابا کو کب جوائن کیا۔ بولے ''۹۶ء میں مگر انٹرویو تو میرا نہیں تھا پھر۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا بس کنفرم کرنا ہے، آپ نے کس پوزیشن سے کام شروع کیا۔ جواب دلچسپ تھا ''کلرک کی جاب کی پورے ۶ ماہ تک۔ اوٹیول کر کے آیا تھا۔ ہفتے کے ۵۰۰ روپے ملتے تھے''۔ سپروائزر کون تھا آپ کا۔ جنید نے قہقہہ لگایا۔ ''کیا یاد کرا دیا ہے، ایک لڑکا ہوتا تھا حماد۔ وہ میرا سپروائزر تھا۔'' آج کل کیا ذمے داری ہے، میں نے مزید وضاحت چاہی۔ انھوں نے بتایا ''اب پورے گروپ کی مارکیٹنگ دیکھتا ہوں۔''

یہ سن کر میں نے انھیں بتایا کہ ہم بھی پچھلے دو دنوں سے نیٹ پر امتیاز صاحب کی تصویریں دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس روز انھوں نے ہمارے فوٹوگرافر کے ساتھ ساتھ ہمارا بھی دل توڑ دیا۔ تصویر بنانے ہی نہیں دی۔ اب سوچیں، تصویر کے بنا انٹرویو کیسے آئے۔

پتا پہ پوت کے مصداق وہ بولے ''ایک بار فوٹو کے بغیر انٹرویو دے کر دیکھیں۔'' میں نے ہنستے ہوئے بتایا کہ ایک تصویر تو ہم نے ڈھونڈ لی ہے جس میں وہ کسی عرب شیخ کو بریفنگ دے رہے ہیں۔

اب آپ تھوڑی زحمت کریں، ان کا کوئی پاسپورٹ والا فوٹو ہی دلا دیں۔ اور وہ بھی انھیں بتائے بغیر۔ انھوں نے صبح کا وعدہ کیا۔ اب دیکھئے کیا گزرتی ہے صبح ہونے تک۔ تصویر مل گئی تو جنید کا شکریہ۔ نہ ملی تو میں نے پہلے ہی پوچھ لیا تھا کہ آپ نے تبلیغی کلچر اور مزاج کب اختیار کیا۔ بولے ''کہاں اختیار کیا ہے۔ بس ایسے ہی ڈراما ہے۔'' یاد رہے جنید ماشاء اللہ طویل قامت ہی نہیں طویل ڈاڑھی کے مالک بھی ہیں۔ ہم نے تو ان کو اچھا میزبان اور اچھا انسان پایا۔

ہمارے دنیا بھر میں ایک ہزار سے زاید مطمئن کارپوریٹ کسٹمر ہیں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# حضرت مصعب بن عمیرؓ

شہرِ نبی کے پہلے سفیر

خالد محمد خالد
ترجمہ: ارشاد الرحمن

ناز و نعم کی زندگی تج کر اسلام کی آغوش میں آنے والے ایک بلند پایہ صحابی کا روح پرور تذکرہ

مکہ میں انہی کو سب سے زیادہ خوشبو لگانا پسند تھا۔ ناز و نعم میں پیدا ہوئے اور اسی فضا میں پرورش پا کر جوانی تک پہنچے۔ شاید مکہ کے نوجوانوں میں کسی کو اپنے والدین کی محبت و شفقت اس حد تک میسر نہ آئی ہو جس قدر حضرت مصعب بن عمیرؓ کو ملی۔

قریش کا یہ قابلِ توجہ نوجوان گفتگو کو دلچسپی اور انہماک سے سنتا۔ اسی لیے کم عمری کے باوجود مکی مجلسوں اور محفلوں کی زینت بن گیا۔ ہر مجلس کے شرکاء کی یہ خواہش ہوتی کہ مصعبؓ ان کی محفل میں بیٹھے۔ وجہ یہ تھی کہ حسن و عقلمندی مصعبؓ کی وہ دو خوبیاں تھیں جو دلوں اور دروں کو وا کر دیتیں۔

یہ بھرپور عنفوانِ جوان، ناز و نعمت کا پروردہ، مکہ کا نوخیز حسین اور اس کی مجلسوں اور محفلوں کا نگینہ..... کیا یہ ممکن تھا کہ وہ ایمان و جاں سپاری کی تاریخی داستانوں میں سے ایک داستان بن جائے؟

ایک روز اس جوان نے بھی وہ بات سنی جو اہلِ مکہ، جناب محمد الامین ﷺ کے بارے میں کہہ رہے تھے "محمد کہتا ہے کہ اللہ نے اسے بشیر و نذیر رسول بنا کر بھیجا ہے اور اللہ واحد الاحد کی عبادت کی طرف بلانے کی ذمے داری سونپی ہے۔"

ان دنوں اہلِ مکہ کو صبح و شام اس بات کے سوا کوئی اور غم تھا ہی نہیں، کرنے کو کوئی اور بات تھی ہی نہیں سوائے اس کے کہ وہ رسول ﷺ اور آپؐ کے دین کے متعلق محوِ گفتگو رہتے۔

آپؐ نے جو باتیں اہلِ مکہ سے سنیں، ان میں یہ بات بھی تھی کہ رسول ﷺ اور مسلمان قریش مکہ کی مشغولیات، فضولیات اور ایذا و تکالیف سے دُور کوہِ صفا کے اوپر ارقم بن ابی ارقم کے گھر جمع ہوتے ہیں۔ حضرت مصعبؓ نے یہ سنا تو انتظار و تردّد کیے بغیر شام کو دارِ ارقم جا پہنچے۔ آپؐ کی تمنائیں اور نگاہیں تو پہلے ہی وہاں پہنچ چکی تھیں۔ وہاں رسول ﷺ اپنے صحابہؓ سے ملتے، ان کے سامنے قرآن کی تلاوت کرتے اور انہیں نماز پڑھاتے تھے۔

حضرت مصعبؓ ابھی جا کر بیٹھے ہی تھے کہ آیاتِ قرآن قلبِ رسول ﷺ سے لبِ رسول ﷺ پہ تاباں ہونا شروع ہو گئیں۔ یہ آیات کانوں سے ٹکراتیں اور اپنا راستہ بناتی ہوئی دلوں میں اتر جاتیں۔ یہاں تک کہ ابنِ عمیرؓ کے دل کی گہرائیوں میں بھی اتر گئیں۔ دل پر پڑا پردہ اپنی جگہ سے ہٹنا شروع ہو گیا۔

ادھر رسول ﷺ نے اپنا دستِ شفقت و برکت آگے بڑھایا اور جذبات کی آتش سے بھڑکتے اور دھڑکتے دل کو چھوا تو سکون و راحت کی شعاعیں دل کی گہرائیوں میں اتر گئیں۔ جو نوجوان ایمان و اسلام لے آیا تھا، وہ پلک جھپکنے میں اس طرح نمایاں ہوا کہ حکمت اس کی عمر سے دگنا نظر آنے لگی۔ اس کے اندر عزم و ارادے کی وہ قوت بھی آ گئی جو وقت کا دھارا بدل ڈالنے پر قادر تھی۔

☆☆

حضرت مصعبؓ کی والدہ خناس بنت مالک غیر معمولی شخصیت کی مالک تھی۔ اس کی دہشت انگیزی بھی حد کو پہنچی ہوئی تھی۔ جب حضرت مصعبؓ اسلام لائے تو روئے زمین پر ماں کے علاوہ کوئی قوت ایسی نہ تھی جس سے وہ بچتے یا خوف کھاتے۔ اگرچہ قریش مکہ نے اپنے بتوں اور اشراف کا سارا زور لگا کر حضرت مصعبؓ کو ڈرانا اور بھگانا چاہا مگر آپؓ کسی سے مرعوب ہوئے نہ خوفزدہ۔ لیکن ماں کا جھگڑا ہی ایسا خطرہ تھا جس کا سامنا کرنے کی آپؓ قوت نہیں رکھتے تھے۔ لہٰذا آپؓ نے اس پر فوری غور و فکر کیا اور اس فیصلے پر پہنچے کہ جب تک اللہ تعالیٰ معاملے کا فیصلہ نہیں کرتا، وہ اپنے اسلام کو چھپائے رکھیں گے۔

پھر دارِ ارقم آتے اور بارگاہ رسول ﷺ میں بیٹھتے رہے۔ آپؓ اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھے تاکہ ماں کے غضب سے بچ سکیں جسے ابھی تک آپؓ کے اسلام لانے کی خبر نہیں ہوئی تھی۔

مگر مکہ.....! اور خصوصاً ان دنوں..... اُن دنوں تو وہاں کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ قریش کے جاسوس و کارندے ہر راستے پر موجود ہوتے، نرم گرم ریت پر پڑنے والے نشان کے پیچھے ایک قدم اور ہوتا۔

یہی ہوا کہ حضرت مصعبؓ چھپ چھپا کر دارِ ارقم میں داخل ہو رہے تھے، عثمان بن طلحہ نے آپؓ کو دیکھ لیا۔ اس کے بعد دیکھا کہ آپؓ جناب محمد ﷺ کی طرح نماز پڑھ رہے ہیں، عثمان صحرا کی آندھی اور بگولوں سے بھی تیز نکلے اور فوراً اُم مصعب کو جا خبر دی، جو پوری حقیقت کے ساتھ مکہ میں پھیل گئی۔

حضرت مصعبؓ تب اپنی والدہ، خاندان اور سردارانِ مکہ کے درمیان کھڑے حق و ثبات کی یقینی کیفیت میں اس قرآن کی تلاوت کر رہے تھے جس کے ذریعے رسول ﷺ نے اپنے صحابہؓ کے دلوں کو دھو ڈالا اور انہیں حکمت و عزت اور عدل و تقویٰ سے بھر دیا تھا۔

ماں نے چاہا کہ ایک زبردست تھپڑ لگا کر آپؓ کو خاموش کرا دے مگر تیر کی مانند حضرت مصعبؓ کی جانب بڑھنے والا ہاتھ فوراً اس نور کے سامنے ڈھیلا پڑ گیا جس نے آپؓ کے چہرے کی چمک دمک میں رعب و جلال کو یوں بڑھا دیا گویا بیٹے کا احترام ماں کے اوپر فرض ہو گیا ہے۔ ہاتھ سکون کے ساتھ وہیں رک گیا۔

جس طرح ماں کی ممتا کا یہ تقاضا تھا کہ وہ بیٹے کے چہرے پر مارنے اور اسے تکلیف دینے سے رک جائے، اسی طرح یہ بھی اس کے بس میں تھا کہ وہ ان معبودوں کی محبت میں جوشِ غضب سے بھڑک اٹھے جنھیں بیٹے نے چھوڑ دیا تھا۔

ماں انھیں گھر کے ایک گوشے میں لے گئی اور وہاں بند کر کے تالا لگا دیا۔ پھر حضرت مصعبؓ اسی قید میں رہے، حتیٰ کہ کچھ مومنین نے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ جب آپؓ نے ان لوگوں کے یہاں سے چلے جانے کی خبر سنی تو خود کو آزاد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ماں اور اپنے چوکیداروں کو غافل پا کر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ وہاں اپنے مہاجر بھائیوں کے ساتھ کچھ عرصہ رہے، پھر ان کے ساتھ مکہ آ گئے۔ پھر دوبارہ حکمِ رسول اللہ ﷺ پر دیگر مسلمانوں کی معیت میں حبشہ ہجرت کر گئے۔

حضرت مصعبؓ کا ماں کے ساتھ آخری ٹکراؤ اس وقت ہوا جب ماں نے واپسی پر دوبارہ آپؓ کو محبوس کرنے کی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوشش کی۔ حضرت مصعبؓ نے اس وقت قسم کھائی کہ اگر تم ایسا کرو گی تو میں ہر اس شخص کو قتل کر ڈالوں گا جس سے تم میرے خلاف مدد لوگی۔

ماں، بیٹے کے عزم وارادے سے واقف تھی کہ وہ جب کسی کام کا عزم کر لے، تو اسے کر گزرتا ہے، لہٰذا اس نے روتے ہوئے اسے چھوڑ دیا۔ بیٹے نے بھی روتے ہوئے ماں کو چھوڑ دیا۔ ایک دوسرے کو چھوڑتے وقت ماں کی جانب سے کفر اور اپنے بیٹے کی جانب سے اسلام پر قائم رہنے کا عجیب عزم واصرار سامنے آیا۔

ماں نے گھر سے نکلتے وقت کہا ''جاؤ اپنی مرضی کرو، میں دوبارہ تیرے پاس آؤں تو میں تیری ماں نہیں ہوں گی''۔

بیٹا، ماں کے قریب ہوا اور کہنے لگا ''ماں.....! میں تیرا خیر خواہ ہوں، میرے دل میں تیرے لیے نرم جذبات ہیں، تو یہ گواہی دے ڈال کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔''

ماں نے غضب ناک کیفیت میں جواب دیا ''ستاروں کی قسم.....! میں تیرے دین میں داخل نہیں ہوں گی۔ یہ تو میری رائے کو بے وقعت اور عقل کو کمزور کر دے گا۔''

پھر حضرت مصعبؓ نعمتوں بھری زندگی پر فقر وتنگ دستی کو ترجیح دیتے ہوئے باہر نکل آئے اور خوش لباس وخوشبو پسند جوان یوں نظر آنے لگا کہ کھردرے کپڑے کی قمیص زیب تن کیے ہوتا۔ ایک دن کھا لیتا تو کئی روز بھوکوں رہتا، لیکن عقیدے کی بلندی اور نور الٰہی سے منور خوبصورت روح نے ان کے اندر دوسرا ہی انسان پیدا کر دیا تھا۔ ایسا انسان جو اپنے جلال سے آنکھوں کو خیرہ کر دے اور دلوں پر اپنی دھاک بٹھا دے۔

ایک روز آپ مسلمانوں کے پاس آئے جو رسول اللہ ﷺ کے گرد وپیش مجلس آرا تھے۔ ان لوگوں نے حضرت مصعبؓ کو دیکھتے ہی سر اور نگاہیں جھکا لیں۔ بعض کی تو آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ ان کی یہ کیفیت کیوں ہو گئی تھی؟

اس لیے کہ وہ آپؓ کو اس حالت میں دیکھ رہے تھے کہ آپؓ پیوند لگی بوسیدہ قمیص پہنے ہیں۔ صحابہؓ نے تو آپؓ کے اسلام سے قبل آپؓ کی جو تصویر دیکھی تھی وہ تو کچھ اور تھی، اس وقت تو آپؓ کے کپڑے باغ کے پھولوں کے مانند چمکدار اور عطر بیز ہوا کرتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ دیر تک آپؓ کو حکمت وعزت اور محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ پھر آپ ﷺ کے مبارک لبوں پر رعب دار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''میں نے مصعبؓ کو دیکھا ہے کہ مکہ میں والدین کا کوئی بیٹا ایسا نہ تھا جو اس سے بڑھ کر نعمتوں سے بہرہ اندوز ہوتا ہو۔ لیکن مصعبؓ نے ہر چیز کو اللہ ورسول کی محبت میں خیر باد کہا ہے۔''

☆☆

یہی وہ دن ہیں جب رسول اکرم ﷺ نے ایک بہت بڑی مہم کے لیے آپؓ کو منتخب فرمایا آپؓ مدینہ میں اسلام کے پہلے سفیر ہوں گے اور ان انصار مدینہ کو دینی تعلیم دیں گے جو عقبہ کے مقام پر رسول اللہ ﷺ کی بیعت کر چکے تھے۔ ان کے علاوہ دیگر لوگوں کو بھی دعوتِ اسلام دے کر حلقۂ دین میں داخل کریں گے۔

ان دنوں رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو عمر ومرتبہ میں حضرت مصعبؓ سے بڑے اور رسول اللہ ﷺ کے زیادہ قرابت دار تھے۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے حضرت مصعب الخیرؓ کو اس کام کے لیے منتخب کیا۔ حضرت مصعبؓ کو بھی خوب معلوم تھا کہ انتہائی خطرناک معاملہ ان کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ اس مدینہ میں اسلام کو پھیلانے اور بڑھانے کا معاملہ ان کے سامنے رکھا گیا ہے جو عنقریب دارالہجرت قرار پانے اور دعوت و داعیان اور غازیان وفاتحین کا مرکز بننے والا ہے۔

حضرت مصعبؓ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو مکمل طور پر سمجھ چکے تھے۔ آپؓ جان گئے تھے کہ رسول اللہ ﷺ اللہ کے داعی اور اس دین کی طرف دعوت دینے والے ہیں جو انسانیت کو ہدایت اور صراط مستقیم کی طرف لے جاتا ہے۔

حضرت مصعبؓ اسی وقت حضرت اسعدؓ بن زرارہ کی مہمان داری میں اُٹھتے اور قبائل ومجالس اور بستیوں پر چھا جاتے ہیں۔ آپؓ لوگوں کے پاس اپنے رب کی کتاب لے



کر جاتے۔ اور بڑی دلسوزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اس جملے کو بیان کرتے ہیں۔ ترجمہ ''اللہ ہی واحد معبود ہے۔''

حضرت مصعبؓ نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ بہترین دانش وکمال اخلاق کا سہارا لیتے ہوئے اس امانت کا بار اُٹھایا۔ آپؓ نے اپنے زہد وترفع اور اخلاص کے زور پر اہل مدینہ کے دلوں کو فتح کر لیا اور وہ فوج در فوج دین میں اترنا شروع ہو گئے۔

جس دن رسول اللہ ﷺ نے آپؓ کو مدینہ بھیجا تھا، وہاں ان ۱۲/ آدمیوں کے علاوہ کوئی اور مسلمان نہیں تھا جنھوں نے عقبہ کے مقام پر نبی ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ لیکن حضرت مصعبؓ کو ان کے درمیان آئے ابھی چند ماہ گزرے تھے کہ اہل مدینہ نے اللہ ورسول کی دعوت پر لبیک کہہ دیا۔

بیعتِ عقبہ کے بعد آنے والے حج میں مسلمانانِ مدینہ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اپنی نمائندگی کے لیے جو وفد مکہ بھیجا اس کے شرکاء کی تعداد مرد وخواتین سمیت ۷۰ تھی۔ وہ نبی ﷺ کی طرف سے ارسال کردہ معلم حضرت مصعبؓ بن عمیر کی قیادت میں مکہ آئے۔

حضرت مصعبؓ نے اپنی فطری دانائی اور جاں کاہی کے ساتھ ثابت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں کیوں منتخب کیا تھا۔ آپؓ کو بارہا ایسے حالات سے سابقہ پڑا کہ اگر آپؓ کی تیز ترین ذہانت اور عظیم ترین روحانی قوت ساتھ نہ ہوتی تو خود آپؓ اور رفقاء کو اس کا بہت بڑا خمیازہ بھگتنا پڑتا۔

ایک روز آپؓ مدینہ میں لوگوں کو وعظ کر رہے تھے کہ اچانک بنی الاشہل کے ایک سردار، اُسید بن حضیر نے وہاں آ کر اپنا نیزہ گاڑ دیا۔ وہ اس آدمی کے خلاف غیظ وغضب سے بھڑک اٹھا تھا جو اس کی قوم کو کفر سے برگشتہ کر رہا تھا۔ انھیں اپنے معبود کو چھوڑنے کی تبلیغ کر رہا اور صرف ایک اللہ کے بارے میں بتا رہا تھا جس کے متعلق انھیں اس سے قبل کوئی علم تھا نہ وہ اس سے مانوس تھے۔

حضرت مصعبؓ کے ساتھ بیٹھے مسلمانوں نے غیظ و غضب سے بھڑکتے اُسید بن حضیر کو دیکھا تو سہم گئے لیکن حضرت مصعبؓ سکون واطمینان سے اللہ کی توحید کا اظہار کرتے رہے۔ اُسید غصّے کی آگ میں جلتے ہوئے حضرت مصعبؓ کے سامنے کھڑا ہو گیا، پھر حضرت مصعبؓ اور حضرت اسعدؓ بن زرارہ کو مخاطب کر کے کہنے لگا ''تمہیں ہمارے محلے میں کون لایا، تم ہمارے کمزور لوگوں کو بے وقوف بناتے ہو؟ اگر زندگی چاہتے ہو تو یہاں سے چلے جاؤ.....!''

لیکن ادھر سمندر کی قوت وروانی کے مانند اور سپیدۂ سحر کے نمودار ہونے کی طرح حضرت مصعبؓ کے چہرے پر خوشی کے آثار تاباں ہوئے۔ وہ بزبان شیریں مقال گویا ہوئے:

''کیا آپ بیٹھ کر سنیں گے نہیں؟ اگر آپ کو ہمارا معاملہ اچھا لگے تو اسے مان لیجیے گا۔ ناگوار گزرے تو ہم مزید کوئی بات نہیں کریں گے۔''

اللہ اکبر.....! اس چیز کا آغاز کتنا دلکش تھا جس کا اختتام عنقریب باسعادت ہونے والا تھا! اُسید ایک دانا وبینا آدمی تھے اور ادھر حضرت مصعبؓ نے ان کے ضمیر پر دستک دے ڈالی تھی کہ وہ صرف یہ کلام سن لیں اور کچھ نہ کریں۔ اگر وہ اس پر مطمئن ہوں تو اچھی بات! ورنہ وہ ان کا محلہ چھوڑ کر چلے جائیں گے اور کسی دوسرے قبیلے کنبے کے پاس جا کر اپنی بات کریں گے جسے وہ تکلیف پہنچائیں نہ ان سے تکلیف اُٹھائیں۔

اُسید نے جواب دیا ''تم نے بات تو انصاف کی کہی۔'' یہ کہہ کر اپنا نیزہ زمین پر پھینکا اور بیٹھ گئے۔ حضرت مصعبؓ تلاوتِ قرآن پاک کرنے لگے۔ اُنہوں نے اس دعوتِ جانفزا کی تفسیر پیش کرنا شروع کی ہی تھی جو جناب محمد ﷺ بن عبداللہ پیش کر رہے تھے کہ اُسید کے خوابیدہ جذبات بیدار ہونا شروع ہو گئے۔ حضرت مصعبؓ نے بات مکمل کی تو اُسید بن حضیر باآواز بلند کہہ اُٹھے ''یہ بات کس قدر حسین اور حق ہے..... اس آدمی کو کیا کرنا چاہیے جو اس دین میں داخل ہونا چاہتا ہو؟''

حضرت مصعبؓ نے کہا ''وہ اپنے کپڑے اور بدن پاک صاف کرے اور یہ شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔''

اُسید وہاں سے غائب ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد آئے تو



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سر کے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ وہ پھر کھڑے ہو کر یہ اعلان کرنے لگے کہ ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔''

یہ خبر روشنی کی طرح پھیل گئی..... اب سعدؓ بن معاذ آئے، یہ بھی مصعبؓ کے سامنے ہتھیار ڈال کر مسلمان ہو گئے ہیں، پھر سعدؓ بن عبادہ آتے اور نعمت اسلام سے بہرہ ور ہو جاتے ہیں۔

اُدھر اہلِ مدینہ آپس میں ایک دوسرے سے کہہ رہے ہیں، اگر اُسیدؓ بن حضیر، سعدؓ بن معاذ اور سعدؓ بن عبادہ اسلام لے آئے تو ہم کس لیے پیچھے رہ گئے۔ آؤ مصعبؓ کے پاس چلتے ہیں تا کہ ان کے ہاتھ پر ہم بھی ایمان لے آئیں۔ یہ لوگ باتیں کر رہے تھے کہ مصعبؓ کے منہ سے جو بات بھی نکلے، حق ہوتی ہے.....!

☆☆

اس طرح اوّلین سفیر رسول ﷺ مدینہ منورہ میں بے مثال کامیابی سے ہمکنار ہوئے..... ایسی کامیابی جوان کے شایانِ شان تھی اور وہ اس کے اہل تھے۔

اب مہ و سال گزرنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ مدینہ ہجرت کر جاتے ہیں۔ اُدھر قریش اپنے سینوں میں حسد و بغض کی آگ جلا رہے ہیں۔ وہ اپنے باطل کو حق ثابت کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہیں تا کہ اللہ کے نیک بندوں کو ظالمانہ انداز میں کچل کر رکھ دیں۔

پھر غزوۂ بدر برپا ہوتا ہے جو ہوش گوش رکھنے والے قریشیوں کے لیے ایک سبق چھوڑ جاتا ہے جس سے وہ آتشِ انتقام میں جلنے لگے۔ نتیجے میں غزوۂ اُحد برپا ہوتا ہے۔ مسلمان بھی تیار ہو کر میدانِ جنگ میں آجاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ صفوں کے وسط میں کھڑے ہو کر مومنوں کے چہروں کو متلاشی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ آپ ﷺ ایسے شخص کی تلاش میں ہیں جسے جنگ کا پرچم تھمائیں۔ آپ ﷺ حضرت مصعب الخیرؓ کو پکارتے ہیں۔ حضرت مصعبؓ آگے بڑھتے اور علم تھام لیتے ہیں۔

اب خوفناک معرکہ برپا ہوتا ہے۔ قتل و غارت کا مقابلہ تیز ہو جاتا ہے۔ کچھ تیر انداز جب دیکھتے ہیں کہ مشرکین میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے تو وہ فرمانِ رسول ﷺ کی پروا نہ کرتے ہوئے مخالفت کرتے اور پہاڑ کی چوٹی پر سے اپنی جگہ چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کا یہ عمل مسلمانوں کی فتح فوراً شکست میں بدل دیتا ہے۔ اچانک قریش کے گھوڑ سوار پہاڑ کی بالائی جانب سے حملہ آور ہوتے ہیں اور خونخوار و تشنہ لب تلواریں مسلمانوں کو گہرا گھاؤ لگاتی ہیں۔ جب قریش دیکھتے ہیں کہ انتشار و بددلی نے مسلمان لشکر کی صفوں کو توڑ ڈالا تو وہ رسول اللہ ﷺ تک پہنچنے کے لیے حملہ کرتے ہیں۔

حضرت مصعبؓ پیش آمدہ خطرہ بھانپ لیتے ہیں۔ آپؓ علم بلند کرتے اور چنگھاڑتے ہوئے شیر کی مانند نعرۂ تکبیر لگاتے ہیں۔ پھر دائیں بائیں دُور تک دشمن کی صفوں میں گھس جاتے ہیں۔ آپؓ کو یہ شدید فکر لاحق ہے کہ بنفسِ نفیس دشمنوں کی نظروں کو رسول اللہ ﷺ سے پھیر دیں۔ اس دوران آپؓ تنہا ایک لشکر ثابت ہوتے ہیں۔ اللہ اکبر..... حضرت مصعبؓ تنہا ایسے لڑتے ہیں گویا آپؓ طاقت و قوت کا پہاڑ، لشکر جرار ہوں۔

اُدھر اس تنہا جان پر دشمن کی جمعیت حملہ آور ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس شخص کے اوپر سے گزر کر رسول اللہ ﷺ تک جا پہنچیں۔ حضرت مصعبؓ کی زندگی کے اس فیصلہ کن لمحے کی روداد کا بیان ہم ایک عینی شاہد پر چھوڑتے ہیں۔ معروف سیرت نگار ''ابن سعد'' لکھتے ہیں ''ہمیں ابراہیم بن محمد بن شرجیل عبدری اپنے باپ کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ انہوں نے کہا ''اُحد کے روز مصعبؓ نے علم اُٹھایا۔ جب مسلمانوں کے قدم اُکھڑ گئے تو مصعبؓ ثابت قدم رہے۔ مشرکین کا ایک گھڑ سوار ابن قمیہ اُن پر حملہ آور ہوا اور تلوار کا وار کر کے ان کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا۔ مصعبؓ کہہ رہے تھے:

''اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں، ان سے قبل بھی تو رسول گزر چکے ہیں''۔

پھر اُنہوں نے علم اپنے بائیں ہاتھ میں تھام لیا اور اس پر جھک گئے۔ ابن قمیہ نے اس ہاتھ پر وار کر کے اسے بھی کاٹ ڈالا۔ اب مصعبؓ علم کو سینے کے ساتھ لگا کر اپنے



بازوؤں کی گرفت میں لیے جھکے کھڑے اور کہہ رہے ہیں:

''اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں، ان سے قبل بھی تو رسول گزر چکے ہیں''۔

اب ابن قمیہ تیسری بار نیزہ سے حملہ آور ہوا، اس نے نیزہ مارا اور نیزہ مصعبؓ کے جسم میں دھنس گیا، مصعبؓ گرے اور علم بھی بازوؤں کی گرفت سے نکل کر گر گیا۔''

مصعبؓ گر گئے..... اور..... علم گر گیا.....!

زیورِ شہادت گر گیا، کوکبِ شہداء گر گیا.....!

حضرت مصعبؓ گرے مگر ایمان و جاں سپاری کے معرکہ میں شجاعت و بسالت کی بے نظیر تاریخ رقم کرنے کے بعد۔ ان کا خیال تھا کہ اگر وہ گرے تو رسول اللہ ﷺ کے قتل تک پہنچنے کی راہ محافظین و مدافعین سے خالی ہو جائے گی۔ لیکن وہ اپنے اوپر آنے والی اس مصیبت پر رسول اللہ ﷺ سے فرطِ محبت اور آپ ﷺ کی زندگی کو معرضِ خطرہ میں دیکھ کر صبر کا یوں اظہار کر چکے تھے:

''اور محمدؐ اللہ کے رسولؐ ہیں، ان سے قبل بھی تو رسول گزر چکے ہیں''۔

بعد میں حضرت مصعبؓ کے ان الفاظ کو مکمل کر کے قرآن کا جز بنا دیا گیا جس کی تا قیامت بار بار تلاوت ہوتی رہے گی۔

☆☆

رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ اس ارضِ معرکہ کا جائزہ لیتے ہیں تو حضرت حمزہؓ کے المناک و غم انگیز واقعہ کے باوجود جس سے قلبِ رسول حزین و ملول ہو کر رہ گیا تھا کہ مشرکین نے ان کی نعش کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور ان اصحابِ رسول اور رفقائے رسول ﷺ کی نعشوں سے ارضِ معرکہ کے بھر جانے کے باوجود جن میں سے ہر ایک طہارت و صداقت اور روشنی کا پیکر عالم تھا، جی ہاں! اس سب کچھ کے باوجود رسول اللہ ﷺ اپنے اوّلین سفیر کے جسد کے قریب جا کر ٹھہرے۔ آپ ﷺ انھیں الوداع اور ان کی خوبیاں بیان کر رہے تھے..... اللہ اکبر!

رسول اللہ ﷺ حضرت مصعب بن عمیرؓ کے پاس



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسلامی تاریخ سے عدل گستری کی بے نظیر مثال

# خلافتِ راشدہ کا ایک جج

حضرت قاضی شریح کے نزدیک رونا مظلومیت کا ثبوت نہیں،
یوسفؑ کے بھائی بھی باپ کے پاس روتے گئے تھے

آبادشاہ پوری

حضرت عمرؓ بن خطاب کا عہدِ خلافت ہے۔ عمرؓ کسی شخص سے ایک گھوڑا خریدتے ہیں، اس شرط پر کہ پسند آ گیا تو رکھ لیں گے، ورنہ واپس کر دیں گے۔ گھوڑا ایک سوار کو جانچنے کے لیے دیتے ہیں اور وہ سواری میں چوٹ کھا کر لنگڑا ہو جاتا ہے۔ عمرؓ گھوڑا واپس کرنا چاہتے ہیں مگر مالک لینے سے انکار کر دیتا ہے۔ دونوں شریح بن حارث کو ثالث مقرر کرتے ہیں۔ شریح فیصلہ کرتے ہیں ''جو گھوڑا خریدا ہے، اُسے رکھو یا جس حالت میں لیا تھا، اسی حالت میں واپس کرو۔'' عمرؓ فیصلہ ہی تسلیم نہیں کرتے بلکہ شریح کو کوفہ کا جج بھی مقرر کر دیتے ہیں کہ ایسا دقیقہ رس، ذکی، طباع، حدیث و فقہ کا ماہر اور بے خوف انسان شخص ایسے ہی بلند پایہ منصب کا اہل ہو سکتا ہے۔

قاضی شریح اپنی ذمے داریاں اتنی خوبی، قابلیت اور دیانت کے ساتھ انجام دیتے ہیں کہ اموی خلیفہ عبدالملک کے زمانے تک مسلسل ساٹھ برس اس منصبِ جلیلہ پر فائز رہتے ہیں۔ اسلام کی تاریخ میں اُن کا شمار سب سے بڑے قضاۃ میں ہوتا ہے۔ ان کے بعض فیصلوں پر تو اسلام کی تاریخِ عدل بجا طور پر ناز کر سکتی ہے۔

☆☆

حضرت علیؓ کا دورِ خلافت ہے۔ دارالخلافہ مدینے سے کوفے منتقل ہو چکا۔ شریح اسلامی مملکت کے چیف جسٹس ہیں۔ امیر المؤمنین علیؓ اور ایک یہودی کا تنازع ان کی عدالت میں پیش ہوتا ہے۔ امیر المؤمنین کی زرہ کہیں گر پڑی تھی اور اس یہودی کے ہاتھ لگ گئی۔ امیر المؤمنین کو پتا چلتا ہے تو اس سے زرہ کا مطالبہ کرتے ہیں، مگر یہودی کہتا ہے کہ زرہ میری ہے، چنانچہ دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ امیر المؤمنین عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ چیف جسٹس شریح

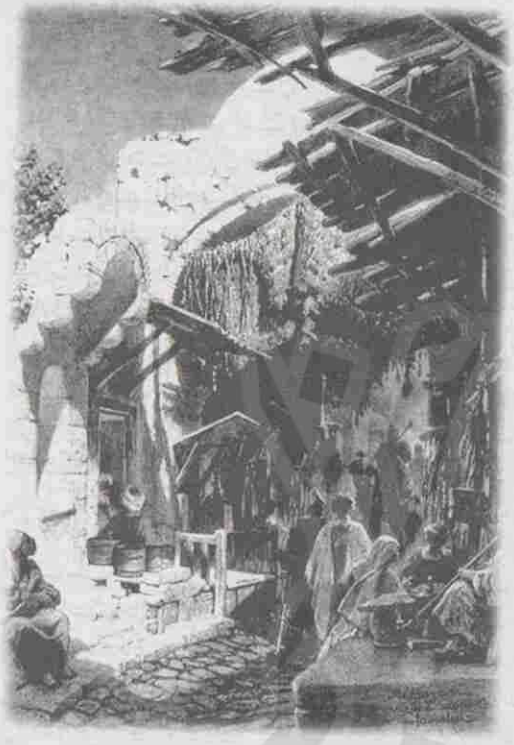

فریقین کے بیان لیتے ہیں۔ یہودی اپنے بیان میں کہتا ہے کہ زرہ میری ہے اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ میرے قبضے میں ہے۔ چیف جسٹس شریح، امیر المؤمنین سے اپنے دعوے کے ثبوت میں گواہ پیش کرنے کو کہتے ہیں۔ وہ دو گواہ پیش کرتے ہیں: حسنؓ اور قنبرؓ۔ چیف جسٹس شریح کہتے ہیں کہ قنبرؓ کی شہادت تو قبول کرتا ہوں لیکن حسنؓ کی شہادت قابلِ قبول نہیں۔

امیر المؤمنین کہتے ہیں کہ آپ حسنؓ کی شہادت کو مسترد کرتے ہیں! کیا آپؒ نے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نہیں سنا کہ حسنؓ اور حسینؓ جنتی نوجوانوں کے سردار ہیں۔ چیف جسٹس شریح کہتے ہیں ''سنا ہے، مگر میرے نزدیک باپ کے حق میں بیٹے کی شہادت معتبر نہیں۔''

دوسرا شاہد نہ ہونے کی وجہ سے امیر المؤمنین کا دعویٰ خارج کر دیا گیا۔ امیر المؤمنین نہ تو کوئی آرڈی نینس جاری کرتے اور نہ کسی قانون کی پناہ ڈھونڈتے ہیں بلکہ اس فیصلے کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔

یہودی اس فیصلے سے بے حد متاثر ہوتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ ایک شخص صاحبِ اقتدار ہونے کے باوجود زرہ اس سے نہیں چھینتا بلکہ عدالت کے دروازے پر دستک دیتا اور مدعی کی حیثیت سے اس کے سامنے جاتا ہے۔ پھر عدالت اس کے ساتھ کوئی امتیازی برتاؤ نہیں کرتی، مدعی اور مدعا علیہ دونوں یکساں حالت میں اس کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ عدالتی کارروائی میں بھی کوئی خاص اہتمام نہیں ہوتا، روزمرہ کی سی کارروائی ہوتی ہے اور عدالتی طریق کار کے عین مطابق۔ پھر عدالت کا جج امیر المؤمنین کے خلاف فیصلہ صادر کرتا اور امیر المؤمنین بے چون و چرا اس فیصلے کے آگے سر جھکا دیتا ہے۔ اسلامی عدالت کا بے لوث عدل اور امیر المؤمنین کا منصفانہ کردار اس کے دل میں کھب جاتا ہے۔ وہ وہیں عدالت میں پکار اُٹھتا ہے کہ ''زرہ امیر المؤمنین ہی کی ہے اور جس دین کا ماننے والا قاضی، امیر المؤمنین کے خلاف فیصلہ صادر کرتا ہے اور امیر المؤمنین اس فیصلے کو بلا حیل و حجت تسلیم کر لیتا ہے، وہ یقیناً سچا ہے۔''

امیر المؤمنین اس یہودی کے اسلام قبول کر لینے پر اتنے مسرور و شاداں ہوتے ہیں کہ بطور یادگار اپنی زرہ اسے دے دیتے ہیں۔

☆☆

عدل گستری کا ایک منظر اور ملاحظہ فرمائیے:



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عدالت کا اجلاس ہو رہا ہے۔ اپنے عہد کے بلند پایہ عالم اشعث بن قیس تشریف لاتے ہیں۔ جسٹس شریح اُٹھ کھڑے ہوتے اور کہتے ہیں، ہمارے شیخ اور سردار، خوش آمدید! پھر اُنہیں اپنے پہلو میں بٹھا لیتے ہیں۔ اِتنے میں ایک شخص داخل ہوتا ہے، وضع قطع اور لباس وغیرہ بتا رہے ہیں کہ کوئی عامی ہے۔ وہ اشعث کے خلاف دعویٰ دائر کرتا اور عدالت سے انصاف چاہتا ہے۔ جسٹس شریح اِس کا بیان لیتے ہیں۔ جونہی سارا واقعہ سنتے ہیں، اُن کی نگاہیں بدل جاتی ہیں اور اشعث کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اشعث! یہاں سے اُٹھو، مدعی کے پاس کھڑے ہو جاؤ اور جواب دعویٰ پیش کرو۔''

اشعث جسٹس شریح کے اِس طرزِ عمل پر چونک پڑتے اور کہتے ہیں ''میں یہیں بیٹھ کر اِن باتوں کا جواب دوں گا۔''

جسٹس شریح کی باوقار اور بلند آواز عدالت میں گونجتی ہے ''فوراً کھڑے ہو جاؤ ورنہ میں کسی کو حکم دوں گا کہ وہ تمہیں اُٹھا دے۔''

عدالت میں سناٹا طاری ہے۔ اشعث چپ چاپ اُٹھتے اور مدعی کے ساتھ جا کر کھڑے ہوتے ہیں۔

☆☆

ایک جج کو عدل و انصاف کی راہ سے کئی اُمور منحرف کر سکتے ہیں..... مثلاً اعلیٰ حکام کا دباؤ، اُن کا لحاظ، عزیز و اقارب کا پاس، سفارش، رشوت اور ظاہر فریبی۔ لیکن جن دنوں کا ذکر ہو رہا ہے، تب عدالت پر اعلیٰ حکام یا خود سربراہِ مملکت کے دباؤ کا کبھی تصور تک سایہ افگن نہیں ہوا۔ رہا لحاظ اور مروّت، تو اوپر کے مناظر شاہد ہیں کہ جسٹس شریح عدل و انصاف کے باب میں کسی کا لحاظ نہیں کرتے۔ اگر امیر المؤمنین کی پیش کردہ شہادت بھی ناقص ہو، تو اُن کا دعویٰ مسترد کر دیتے ہیں۔ اپنے ایک دوست اور وقت کے بڑے قابلِ احترام عالم کو بھی بھری عدالت میں مدعی کے دوش بدوش جا کھڑے ہونے کا حکم صادر کرتے اور ان کی طرف سے نادانستہ گریز کا اظہار دیکھ کر جبراً اُٹھانے کی دھمکی دیتے ہیں۔

عزیز و اقارب کا پاس بھی عموماً عدل کی راہ میں حائل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے دور میں کوئی عادل جج کسی ایسے مقدمے کی سماعت نہیں کرتا جس کا تعلق اُس کے اپنے عزیز و اقارب یا دوست احباب سے ہو۔ خود فریق مخالف بھی ایسی صورت میں خواہش مند ہوتا ہے کہ مقدمہ کسی دوسری عدالت میں منتقل ہو جائے، لیکن اُس زمانے میں اِس بنیاد پر انتقالِ مقدمہ کا دستور نہیں تھا۔ دوسرے ججوں کی طرح جسٹس شریح کی عدالت میں بھی اُن کے اپنے عزیزوں اور دوستوں کے مقدمات پیش ہوتے اور ان کا فیصلہ کرنے میں وہ کسی تعلق کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اگر ان کا بیٹا بھی قانون کی زد میں آ جاتا تو اس کی پروا نہیں کرتے۔

ایک مرتبہ ان کا صاحبزادہ کسی ملزم کی ضمانت دیتا ہے۔ ملزم بھاگ جاتا ہے۔ جسٹس شریح ملزم کے بدلے میں اپنے بیٹے کو جیل بھیج دیتے ہیں۔

ایک بار ان کا اردلی کسی شخص کو کوڑے مارتا ہے۔ مضروب ان کی عدالت میں استغاثہ دائر کرتا ہے اور وہ اردلی کو مضروب کے ہاتھوں کوڑے لگواتے ہیں۔

ایک مرتبہ ان کے خاندان کا ایک فرد کسی شخص پر ظلمِ ناروا کرتا ہے۔ جسٹس شریح اُسے ایک ستون سے بندھوا دیتے ہیں۔ عدالت برخاست ہو جاتی ہے اور جانے لگتے ہیں تو وہ عزیز کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مگر شریح یہ کہہ کر چلے جاتے ہیں ''مجھ سے کہنے سننے کی حاجت نہیں، تمہیں حق نے قید کیا ہے۔''

☆☆

ایک مرتبہ ان کے صاحبزادے کا چند دوسرے اشخاص سے کسی حق کے بارے میں تنازع ہو گیا۔ لڑکا اُنہیں سارے واقعات بتا کر پوچھتا ہے، اگر مقدمے میں کامیابی کی اُمید ہو تو میں دعویٰ کر دوں یا خاموش رہوں؟ شریح مشورہ دیتے ہیں کہ مقدمہ دائر کر دو۔ مقدمہ اُنہی کے سامنے پیش ہوتا ہے اور وہ بیٹے کے خلاف فیصلہ دیتے ہیں۔ گھر آتے ہیں تو بیٹا کہتا ہے، میں نے آپ سے مشورہ نہ کیا ہوتا، تو اس فیصلے پر مجھے شکایت نہ ہوتی۔ مگر آپ نے خود ہی مقدمہ دائر کرنے کا مشورہ دیا اور خود ہی میرے خلاف فیصلہ صادر کر دیا۔ اِس طرح مجھے ذلیل و رسوا کیا۔ جسٹس شریح کا جواب انصاف کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ کہتے ہیں:

''جانِ پدر! تم مجھے دُنیا جہان سے عزیز ہو، لیکن اللہ مجھے عزیز تر ہے۔ مجھے اُن لوگوں کا حق نظر آیا تھا۔ اگر میں تمہیں بتا دیتا تو تم اُن سے صلح کر لیتے اور یوں اُن کا حق مارا جاتا۔''

رشوت بھی حق و عدل کی راہ میں سب سے بڑی رُکاوٹ ہے۔ عدالتوں اور سرکاری دفتروں میں اِس کا چلن ہر زمانے میں رہا ہے۔ رشوت کی ایک مہذب صورت ہدیہ و تحائف ہیں۔ اہلِ معاملہ اپنے جائز و ناجائز اُمور پورے کرنے کے لیے عموماً اُنہی کا سہارا لیتے ہیں۔ جسٹس شریح کے پاس بھی ہدیہ و تحائف آتے۔ ہدیہ تو وہ قبول کر لیتے مگر رشوت سے بچنے کی خاطر فوراً ہدیہ دینے والے کو اپنی جانب سے ہدیہ دے دیتے۔

جج اور قاضی بسا اوقات بہ ظاہر فریب میں آ جاتے ہیں۔ حقیقت کی تہ تک پہنچنے کے لیے نہایت گہری بصیرت اور عمیق نظر کی ضرورت ہے۔ جسٹس شریح بے حد دقیقہ رس ہیں اور اہلِ مقدمہ کی ظاہری حالت سے کبھی متاثر نہیں ہوتے۔ ایک عورت ایک مرد کے خلاف مقدمہ دائر کرتی ہے۔ عدالت میں آتی ہے تو زار و قطار رونے لگتی ہے۔ امام شعبیؒ بھی موجود ہیں۔ وہ شریح سے کہتے ہیں ''یہ عورت مظلوم معلوم ہوتی ہے۔'' شریح کہتے ہیں ''رونا مظلومیت کا ثبوت نہیں۔ یوسفؑ کے بھائی بھی باپ کے پاس روتے گئے تھے۔''

جسٹس شریح مقدمے کی گہرائیوں میں اُترتے اور شہادتوں کو خوب جانچتے پرکھتے ہیں۔ تاہم مقدمے کا انحصار چونکہ شہادتوں پر ہوتا ہے، اِس لیے جب دیکھتے کہ گواہ مشکوک ہیں، مگر ان کی ظاہری صداقت پر گرفت نہیں کی جا سکتی تو گواہوں سے کہتے کہ میں نے تمہیں طلب نہیں کیا، تم جانا چاہتے ہو تو میں نہیں روکتا، تمہاری گواہی سے میرا دامن محفوظ ہو جائے گا، تم بھی اپنے آپ کو بچاؤ۔ اگر گواہ جھوٹی گواہی سے پھر بھی باز نہیں آتے تو چونکہ جج کسی گواہ کو شہادت دینے سے نہیں روک سکتا، اِس لیے جسٹس شریح مجبوراً اُس کی شہادت پر فیصلہ کر دیتے۔ تاہم جس فریق کے حق میں فیصلہ ہوتا، اُس سے کہہ دیتے کہ تم اِس معاملے میں ظالم ہو، لیکن مقدمے کا فیصلہ مجھے اپنے خیال و گمان پر نہیں ثبوت کے مطابق کرنا ہے۔ اِس لیے یہ بات اپنی جگہ رہ جاتی ہے کہ جو چیز خدا نے تم پر حرام کی، میرا فیصلہ اُسے حلال نہیں کر سکتا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دورِ جاہلیت کا ناقابلِ فراموش واقعہ

# گورنر کا عبرتناک انجام

جب اہلِ مکہ نے پہلی مرتبہ اللہ تعالیٰ کے نافرمانوں کو نیست و نابود ہوتے دیکھا

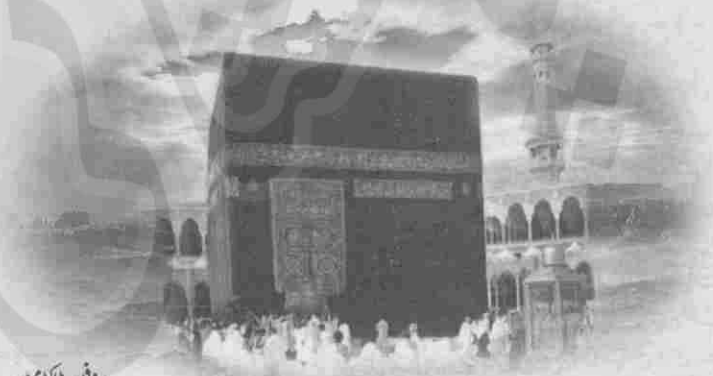

پروفیسر ڈاکٹر محمد مسزل احسن شیخ

**گورنر** تو گورنر ہوتا ہے، چاہے کسی ملک کا بھی ہو۔ یہاں جس گورنر کا ذکر ہے، اس کا نام تھا ابرہہ۔ ملک یمن میں اسے حبشہ کے بادشاہ نے گورنر مقرر کیا تھا۔ اس وقت جمہوریت نہیں تھی اور نہ ہی جماعتیں ہوتی تھیں کہ قومی خزانہ لُوٹ کھسوٹ کر اپنے بینک بھریں۔ لیکن اس وقت بینک بھی نہیں تھے۔

ابرہہ نے دیکھا کہ ہر سال لوگ بیت اللہ کا حج کرنے ملک عرب کے شہر مکہ مکرمہ جاتے ہیں۔ ابرہہ نے سوچا کہ کیوں نہ وہ بھی ایسا ہی عبادت خانہ بنائے۔ لوگ دور دور سے آئیں گے اور یوں اس کی مشہوری ہوگی۔ ٹیکس لگائیں گے تو آمدنی بھی ہوگی۔ ہر دور کے لیڈروں کی سوچ یہی رہی ہے۔

اب ابرہہ نے کثیر رقم خرچ کر کے بڑا ہی خوبصورت عبادت خانہ صنعا شہر میں تعمیر کرایا۔ اس نے لوگوں کو حکم دیا کہ ہر سال وہاں آؤ۔ لوگ کسی گورنر کے حکم پر تو عبادت



نہیں کرتے۔ لطیفہ یہ ہوا کہ کسی من چلے نے اس نقلی معبد میں غلاظت پھیلا دی۔ اسی دوران ایک عرب قافلہ صنعا کے باہر ٹھہرا۔ سوئے اتفاق کھانا پکانے کی وجہ سے ایندھن کی آگ بھڑک اٹھی اور وہ عمارت آگ کی لپیٹ میں جل کر راکھ ہوگئی۔

اس پر گورنر ابرہہ مشتعل ہوا۔ سخت طیش میں اس نے سوچا کہ عربوں کا خانہ کعبہ ڈھا دیا جائے۔ یہ خیال آتے ہی وہ فوج کے ساتھ ہاتھی لے کر مکہ کی طرف بڑھا۔ ہمارے رسول پاک سیدنا محمد ﷺ کے دادا سردار عبدالمطلب اس زمانے میں خانہ کعبہ کے متولی تھے۔ انھوں نے حملے کی خبر سنی تو تباہی سے محفوظ رہنے کی خاطر اہلِ مکہ کو لے کر پہاڑ پر چڑھ گئے۔

اتفاق یہ ہوا کہ سردار عبدالمطلب کے اونٹ ابرہہ کے سپاہیوں نے پکڑ لیے۔ انہوں نے ابرہہ سے جا کر اپنے اونٹ مانگے تو وہ بڑا حیران ہوا۔ اس پر آپ نے فرمایا ''اونٹ اللہ کے فضل سے ہمارے ہیں لہٰذا وہی واپس طلب کر رہے ہیں۔ خانہ کعبہ اللہ کا گھر ہے، وہی اس کی حفاظت کرے گا۔''

بہرحال ابرہہ حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا تو اللہ تعالیٰ نے پرندوں کے جُھنڈ کے جُھنڈ بھیجے جنھوں نے اپنی چونچوں اور پنجوں سے فوج اور ہاتھیوں پر کنکر برسائے۔ اللہ کی قدرت ہر کنکر سے فوجی اور ہاتھی یوں مرا جیسے مشین گن سے چھلنی کر دیا گیا ہو۔ یہاں تک کہ سوائے ایک سپاہی کے کوئی فوجی اور ہاتھی نہ بچا۔ اس آخری سپاہی نے بھی جب جا کر سارے لشکر کی بربادی کی خبر دی، تو اس کے سر پر مسلط پرندے نے کنکر گرایا۔ وہ بھی ہاتھی سمیت اس طرح ہوگیا جیسے کھایا ہوا بھس ریزہ ریزہ ہو جائے۔

اللہ نے اپنے گھر کے دشمن تباہ کرنے کے لیے نہ فوجیں بھیجیں نہ لشکر، نہ ہاتھیوں کے مقابلے کے لیے ہاتھی، بلکہ پرندوں سے اسے بُرے انجام سے دوچار کر کے نافرمانوں اور باغیوں کو پیغام دیا کہ وہ خدائی لشکر کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

یہ عبرت ناک واقعہ اتنا عام ہوا کہ عرب اسے ہاتھیوں والا سال (عام الفیل) کہنے لگے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ واقعہ ختم نبوت کے تاجدار امام الانبیاء سیدنا محمد ﷺ کی پیدائش مبارک سے پچاس دن قبل پیش آیا تھا۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ آنے والی مبارک ہستی کے دشمنوں کو اللہ اسی طرح نیست و نابود کرتا رہے گا۔

ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمیں اللہ نے اپنے محبوب پاکؐ کا کلمہ بھی نصیب فرمایا اور اُن کے ذریعے قرآن مجید جیسی آخری مبارک آسمانی کتاب عطا فرمائی تاکہ ہم اس پر عمل پیرا ہو کر دُنیا و آخرت میں کامیاب ہوں۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم نہ قرآن پاک تلاوت کرتے نہ عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اسی باعث ذلت و رسوائی سے دوچار ہیں۔ اللہ ہمیں پکا مسلمان، سچا پاکستانی اور بہت ہی اچھا مومن بنائے۔ (آمین)

قرآن مجید نے اس دل چسپ، عبرت ناک اور وحشت اثر واقعے کو سورہ الفیل پارہ ۳۰ میں بیان فرمایا ہے۔ دشمنوں نے پورا زور لگایا کہ اسلام کو پھیلنے نہ دیا جائے۔ تب اللہ نے اپنے محبوب پاک ﷺ کو یوں دلاسا دیا اور دل جوئی کی:

''کیا آپؐ نے نہیں دیکھا کہ کس طرح کا سلوک کیا ہم نے ہاتھیوں والوں سے (۱) اور ہم نے اُن کے داؤ کو برباد نہ کر دیا۔ (۲) اور ہم نے بھیجے ان پر پرندوں کے جُھنڈ کے جُھنڈ (۳) ہم نے گرائے ان پر کنکر پتھروں کے (۴) پس اس نے کر دیا انہیں کھائے ہوئے بھس کی مانند (۵) آج اسی انجام سے دوچار ہونے والے ہیں اللہ کے باغی بشرطیکہ ہم صحیح ایمان والے بن جائیں''۔

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# پکا ایمان

حبیب اشرف صبوحی

اللہ تعالیٰ پر ایمان اور پختگی کے چشم کشا واقعات

## اتنی بڑی رقم کہاں سے آئی؟

میری والدہ صاحبہ بڑی عبادت گزار اور اللہ پر توکل کرنے والی، بڑی سلیقہ شعار اور باہمت خاتون تھیں۔ والد صاحب کی تنخواہ بہت کم تھی، لیکن والدہ صاحبہ نے اس مختصر تنخواہ میں بھی ہم بہن بھائیوں کی تعلیم و تربیت کی اور کبھی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ناشکری نہیں کی۔ میں اپنی والدہ صاحبہ کے چند واقعات لکھ رہا ہوں، جن سے ان کی عظیم شخصیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ میرے والد صاحب ڈاک خانے میں ملازم تھے۔ بڑی قلیل تنخواہ تھی، بس گزر بسر کسی نہ کسی طریقے سے ہو رہی تھی۔ والدہ صاحبہ اکثر والد صاحب سے کہتی تھیں کہ اگر کسی مہینے گھر کے اخراجات سے کچھ پیسے بچ جائیں تو گھر کا فلاں فلاں کام ہو جائے، لیکن اخراجات ہر مہینے کسی نہ کسی وجہ سے بڑھ جاتے تھے۔

ایک روز والد صاحب شام کو دفتر سے گھر آئے اور والدہ صاحبہ کو خاموشی سے ایک بڑی رقم دی اور کہا ''یہ رقم اپنے استعمال میں لاؤ اور جتنے بھی کام رکے ہوئے ہیں، کر لو۔ یہ سب رقم تمہاری ہے۔ ماضی کے جتنے بھی گلے شکوے ہیں اور خواہشات ہیں، اس سے پوری کر لو۔''

والدہ صاحبہ نے خوشی سے پوچھا ''اتنی بڑی رقم کہاں سے آئی ہے؟''

والد صاحب نے بتایا ''آج ایک صاحب آئے تھے، کافی دیر میرے پاس بیٹھے رہے، جب جانے لگے تو یہ رقم میرے پاس بھولے سے چھوڑ گئے۔ میں نے یہ رقم چھپا لی۔ کچھ دیر بعد وہ صاحب گھبرائے ہوئے میرے پاس آئے اور کہا ''میں اپنا ایک تھیلا جس میں کچھ رقم تھی، یہاں تو نہیں بھول گیا؟''

میں نے کہا ''آپ کہیں اور بھول آئے ہوں گے۔ تو وہ صاحب چلے گئے۔''

والدہ صاحبہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ رقم اس طریقے سے آئی ہے تو ایک دم ان کا رنگ غم اور پریشانی سے سفید ہو گیا۔ وہ والد صاحب سے کہنے لگیں ''تم نے اتنی بڑی بے ایمانی کیسے کی؟'' یہ بات تمہیں زیب نہیں دیتی۔ میں یہ رقم نہیں لوں گی، اس رقم کو واپس کر کے آؤ۔''

والد صاحب نے کہا ''اس عمل کا گناہ اور ثواب میرے ذمے ہے، بس تم اس رقم کو استعمال کرو۔''

والدہ صاحبہ نے بڑی سختی سے انکار کیا اور کہا ''میں یہ رقم استعمال نہیں کروں گی۔ میرا ضمیر گوارا نہیں کرتا۔''

جب والد صاحب نے دیکھا کہ وہ بہت زیادہ پریشان ہو گئی ہیں تو کہا ''میں مذاق کر رہا تھا اور تمہیں آزمانا چاہتا تھا۔ دراصل آج ڈاک خانے کی گاڑی نقد رقم لینے نہیں آئی۔ اس وجہ سے میں یہ رقم گھر لے آیا کہ کہیں ڈاک خانے سے رقم چوری نہ ہو جائے۔ یہ سرکاری امانت ہے۔ صبح واپس لے جاؤں گا۔'' والدہ صاحبہ نے سنا تو سکھ کا سانس لیا اور رقم حفاظت سے رکھ لی۔

## نانی کا اٹیچی کیس

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک بار والدہ صاحبہ ایک شادی میں شرکت کے لیے لاہور سے کراچی گئیں۔ اپنے کپڑے، شادی میں دینے کے لیے زیور اور پیسے ایک اٹیچی کیس میں رکھ لئے۔ جب کراچی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچیں تو دیکھا کہ اٹیچی کیس غائب ہے۔ وہ بڑی پریشان ہوئیں۔ معلوم یہ ہوا کہ جب صبح اذان کے وقت ٹرین حیدر آباد پہنچی تو ایک فیملی جو لاہور سے بیٹھی تھی، جلدی میں اپنے سامان کے ساتھ والدہ صاحبہ کا اٹیچی کیس بھی لے گئی۔

والدہ صاحبہ کہنے لگیں ''مجھے اللہ پر بھروسا ہے کہ میرا سامان اِن شاء اللہ مل جائے گا۔''

میرا بھانجا اسٹیشن پر والدہ صاحبہ کو لینے آیا ہوا تھا، اس نے کہا ''میں حیدر آباد جاتا ہوں۔ آپ مجھے اٹیچی کیس کی چابی دے دیں۔ میں اِن شاء اللہ آپ کا سامان واپس لے کر آتا ہوں۔'' میری والدہ نے کہا کہ اس فیملی نے یہ بتایا تھا کہ اگلے روز ان کے بھائی کی شادی ہے۔ ان کا بھائی ڈاکٹر ہے اور لطیف آباد میں ان کی رہائش ہے۔

میرا بھانجا حیدر آباد دوسرے روز پہنچا اور اپنے ایک دوست کے گھر گیا اور اس سے کہا کہ ایک فیملی ہماری نانی کا اٹیچی کیس لے آئی ہے، میں وہ واپس لینے آیا ہوں، تم میری مدد کرو۔

دوست نے کہا ''ہم صبح لطیف آباد میں تمام ڈیکوریشن والوں کے پاس جاتے اور ان سے پوچھتے ہیں کہ آپ نے کسی ڈاکٹر صاحب کے گھر دعوتی سامان پہنچایا ہے۔''

صبح کو وہ دونوں اپنے مشن پر نکلے اور تمام ڈیکوریشن والوں سے معلوم کیا، لیکن کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ دوسرے روز وہ لطیف آباد کے تمام نکاح خواہوں سے ملے اور پوچھا کہ آپ نے کسی ڈاکٹر صاحب کا نکاح پڑھایا ہے؟ آخر ایک نکاح خواں نے بتایا کہ میں نے فلاں پتے پر ایک نکاح پڑھایا اور لڑکا ڈاکٹر ہے۔ یہ لوگ نکاح خواں سے ڈاکٹر کا پتا لے کر اس کے گھر گئے اور پوچھا کہ کیا آپ کے کچھ رشتے دار لاہور سے فلاں ٹرین سے فلاں وقت پر آئے ہیں؟

ڈاکٹر صاحب نے بتایا ''ہاں آئے ہیں۔''

میرے بھانجے نے کہا کہ وہ غلطی سے اپنے سامان کے ساتھ میری نانی کا اٹیچی کیس بھی لے آئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے چونک کر کہا ''لائے تو ہیں، آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ وہ اٹیچی کیس آپ ہی کا ہے؟''

میرے بھانجے نے اٹیچی کیس کی چابی ان صاحب کو دی اور کہا ''اسے لگا کر دیکھ لیں، اگر یہ چابی اٹیچی کیس کو لگ جاتی ہے تو وہ ہماری ہے اور اس میں فلاں فلاں سامان بھی ہے۔''

ڈاکٹر صاحب نے اٹیچی کیس میں جب چابی لگائی تو وہ لگ گئی، اس لئے انھوں نے اٹیچی کیس میرے بھانجے کو دے دیا۔ اس طرح وہ اٹیچی کیس با حفاظت والدہ صاحبہ تک پہنچ گیا، یہ ان کا اللہ پر بھروسا، نیک نیتی اور حق حلال کی کمائی کا نتیجہ تھا کہ سامان بخیریت مل گیا۔

## والدہ، برقع اور پرس

ایک بار ایک عزیز کی شادی کے سلسلے میں والدہ صاحبہ کو لے کر پرل کانٹی نینٹل ہوٹل جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ہمارے ایک قریبی عزیز ملنے آئے۔ انھوں نے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

والدہ کو ایک بڑی رقم دی اور کہا کہ یہ امانت ہے اور جب مجھے ضرورت ہوگی میں لے لوں گا۔ جب تقریب ختم ہوئی اور ہم واپسی کے لئے کار پارکنگ میں آئے تو والدہ صاحبہ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے اوڑھنے کے لئے برقع درست کرنے لگیں اور اپنا پرس جس میں کافی رقم تھی، ایک سکوٹر کی سیٹ پر رکھ دیا۔ برقع ٹھیک کرنے کے بعد انھیں پرس اٹھانا یاد نہ رہا اور وہ گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ جب آدھا راستہ طے ہو گیا تو میں نے ایک جگہ پٹرول بھروانے کے لئے گاڑی روکی۔ پٹرول ڈلوایا تو میں نے والدہ صاحبہ سے کہا کہ آپ اپنے پرس میں سے کچھ پیسے دے دیں۔ اس پر انھیں یاد آیا کہ وہ اپنا پرس تو وہیں بھول آئی ہیں جہاں انھوں نے برقع درست کیا تھا۔

میں نے پریشانی سے کہا ''اس میں تو کافی رقم تھی، اب وہ پرس کہاں ملے گا۔''

وہ کہنے لگیں ''مجھے اللہ کی ذات پر اُمید ہے کہ وہ پرس کہیں نہیں جائے گا۔'' جب ہم آدھے گھنٹے بعد وہاں پہنچے تو دیکھا کہ پرس اسی جگہ اسکوٹر کی سیٹ پر رکھا ہوا تھا اور رقم بھی پوری تھی حالانکہ اس دوران بے شمار لوگ کار پارکنگ میں آئے ہوں گے، لیکن کسی کی پرس پر نظر نہیں پڑی۔ اسے اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی سمجھ لیں۔

## مجھے کس بات کی فکر ہے؟

ایک اور کردار جس نے مجھے بہت متاثر کیا وہ میرے دفتر میں کام کرنے والے چاچا عزیز تھے۔ وہ گزشتہ چھ سات سال سے میرے آفس میں ایک چوکیدار کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ چار چوکیدار اور بھی تھے۔ یہ چوکیدار مجھ سے سفارشیں کراتے اور مجھ سے پوچھتے کہ صاحب! ہماری نوکری کب پکی ہوگی اور ہمارا مستقبل کیسے روشن ہوگا؟ لیکن چاچا عزیز نے نہ تو کبھی مجھ سے یہ بات پوچھی اور نہ کبھی سفارش کروائی۔

میں نے ایک دن چاچا عزیز سے پوچھا ''آپ نے مجھ سے کبھی نوکری کے بارے میں نہیں پوچھا اور نہ اپنے پکے ہونے کی کبھی سفارش کروائی۔''

اس سوال پر انھوں نے جو جواب دیا وہ میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ انھوں نے کہا ''صاحب! اللہ تعالیٰ جہاں رحیم و کریم ہے وہاں رزاق بھی ہے۔ رزق دینے کا کام اس نے اپنے ذمے لے رکھا ہے، لہٰذا ہم کون ہوتے ہیں کہ اس کے کام میں دخل دیں۔ اگر اس نے رزق میں کمی کرنی ہوگی تو کر دے گا اور اگر بڑھانا ہوگا تو بڑھا دے گا۔ میری عمر ۵۰ سال ہوگئی ہے۔ آج تک میں بھوکا نہیں سویا۔ میری ساری ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں۔ مجھے کس بات کی فکر ہے؟''

چاچا عزیز کا یہ جواب سن کر میں اتنا متاثر ہوا کہ بتا نہیں سکتا۔ ایک غریب اور ان پڑھ شخص کا اللہ تعالیٰ پر اتنا بھروسا اور اتنا ایمان۔

اتنی زیادہ تنخواہ اور سہولتیں میسر ہونے کے باوجود ہم پریشان اور تنگ دست رہتے ہیں اور اضافے کی خواہش رہتی ہے۔ کتنے آسودہ ہیں وہ لوگ جو قناعت پسند ہیں اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ پر توکل رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی ان کو مایوس نہیں کرتے۔

## اُس شخص کو کیسے بھول جاؤں

کافی عرصے پہلے کی بات ہے کہ میں آٹا اور ضروریاتِ زندگی کی دیگر چیزیں خریدنے بازار گیا تو میں سوچنے لگا کہ اگر کوئی مزدور مل جائے اور یہ سامان اٹھا کر میرے گھر تک چھوڑ آئے تو مسئلہ حل ہو جائے۔ میں مزدور کو تلاش کرتا رہا۔ آخر میں ایک مزدور جیسے آدمی کو ایک دکان پر بیٹھا ہوا دیکھا۔ میں نے اسے بتایا کہ کچھ سامان اٹھا کر فلاں جگہ پہنچانا ہے اور سامان کی تفصیل بھی بتائی۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر میرے ساتھ چل دیا اور سامان اٹھا کر میرے گھر چھوڑ دیا۔ میں نے اس کی مزدوری ادا کرنی چاہی تو اس نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ میں نے یہ خیال کیا کہ شاید پیسے کم ہیں۔ اوپر سے گرمی کا موسم اور رمضان کا مہینا بھی ہے۔ میں نے اس



کی مزدوری دگنی کر دی۔ اس بار بھی اس آدمی نے انکار میں سر ہلایا۔ تیسری بار میں نے ۳ گنا زیادہ پیسے دینے چاہے اور سوچا کہ یقیناً اب وہ انھیں خوشی سے قبول کر لے گا، لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی، جب اس نے تیسری بار بھی پیسے لینے سے انکار کر دیا۔

اب مجھے اس پر غصہ آگیا۔ میں نے کہا ''بھائی! میں تمہاری اجرت سے ۳ گنا پیسے زیادہ دے رہا ہوں، لیکن تم پھر بھی خوش نہیں ہو۔ آخر تم چاہتے کیا ہو؟''

اس آدمی نے جواب دیا ''بھائی میں مزدور نہیں ہوں۔ میں تو صرف خدمتِ خلق کے ایک جذبے سے کام کرتا ہوں۔ آپ نے کہا کہ یہ سامان اٹھا لو، میں اٹھا لایا۔ یہ پیسے کسی حاجت مند کو دے دیجئے گا۔''

دوسرے روز جب میں بازار گیا تو میں نے اس دکان دار سے پوچھا، جس کی دکان پر وہ مزدور بیٹھا ہوا ملا تھا کہ وہ شخص کون تھا۔ اس نے مجھ سے اجرت نہیں لی اور خدمتِ خلق کے جذبے کے تحت میرا کام کیا۔

دکان دار نے بتایا ''وہ شخص ہمارے گاؤں کا امیر ترین آدمی ہے۔ اس میں خدمتِ خلق کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ وہ ہر شخص کے کام آتا ہے اور ضرورت مندوں کی مالی مدد بھی کرتا ہے۔ طبیعت میں انتہائی انکسار اور عاجزی ہے، اس لئے وہ کپڑے بھی بہت معمولی پہنتا ہے، تاکہ تکبّر نہ آجائے۔ اس کے دروازے ہر ضرورت مند کے لئے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔'' دکان دار سے یہ باتیں سن کر میں بڑا حیران اور متاثر ہوا اور سوچتا رہا کہ اس نفسانفسی کے دور میں ایسے انسان کا ہونا کسی نعمت سے کم نہیں ہے۔ میں اس شخص کو کبھی نہیں بھول سکتا۔

## دہشت گرد عورت

یہ آج سے تقریباً سولہ سترہ سال پہلے کی بات ہے کہ میرے ایک عزیز نے امریکا سے میرے لیے ایئر فریشنر بھیجے۔ اس وقت تک پاکستان میں ایئر فریشنر کا رواج نہیں تھا اور نہ کوئی اسے جانتا تھا۔ ایئر فریشنر کے ڈبوں پر بڑے خوب صورت نقش نگار بنے ہوئے تھے۔ ہم نے انھیں اپنے گھر میں استعمال کیا اور ان کے ڈبے کچرے میں ڈال دیے۔ صبح ملازمہ آئی تو اس کوڑے کو باہر لے جا کر بڑے کچرے کے ڈرم میں پھینکنے لگی تو اسے وہ نقش نگار والے ڈبے بہت پسند آئے۔ اس نے باقی کوڑا تو پھینک دیا، لیکن وہ ڈبے نہیں پھینکے اور انھیں ایک کالے پولی تھین بیگ میں لپیٹ لیا۔ پھر اس پیکٹ کو ہمارے گھر کے سامنے لگے ہوئے پودوں میں چھپا کر رکھ دیا۔

ہماری ایک پڑوسن جو کہ سامنے گھر میں رہتی تھی، اس نے جب دیکھا کہ ایک برقع پوش عورت نہایت تیزی سے آئی اور ایک کالے پولی تھین بیگ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز ہمارے گھر کی کیاری میں رکھ کر چلی گئی تو فوراً اس کے ذہن میں خیال آیا کہ یہ کوئی دہشت گرد عورت ہے اور دہشت گردی کی نیت سے یہ پیکٹ رکھ کر گئی ہے۔ اس نے فوری طور پر ہمارے گھر آکر اطلاع دی کہ فوراً گھر خالی کر دو اور آس پڑوس کے گھروں کو بھی کہا کہ سب لوگ اپنے گھر خالی کر دیں۔ پورے محلے میں دہشت پھیل گئی۔ ہر شخص پریشان ہو گیا۔ اس زمانے میں بم دھماکوں کے واقعات اکثر ہو رہے تھے۔ عوام کو مطلع کیا جا رہا تھا کہ اگر کوئی مشتبہ چیز یا کسی شخص کو دیکھیں تو فوری طور پر پولیس کو اطلاع کریں۔ ہماری پڑوسن نے پولیس کو فون کر دیا۔ پولیس نے سول ڈیفنس کے محکمے کو فون کر دیا اور وہاں سے اخبارات کے دفتروں تک یہ خبر پہنچ گئی۔

سول ڈیفنس والوں نے آتے ہی محلے کے تمام گھر خالی کروا دیے اور کسی ناگہانی آفت اور تکلیف سے بچنے کے لیے سب انتظامات کر لیے۔ اسی دوران وہ عورت برقع پہنے ہوئے تیزی سے ایک گھر سے نکلی۔ اسے دیکھتے ہی ہماری پڑوسن نے نعرہ لگایا کہ یہی وہ عورت ہے، جس نے کیاری میں مشتبہ پیکٹ رکھا تھا۔ اس عورت کو پکڑ لیا گیا۔ اس بے چاری نے گھبرا کر کہا ''صاحب جی میں تو کام کرنے والی ہوں اور گھروں میں کام کرتی ہوں۔ جب میں کوڑا پھینکنے لگی تو یہ رنگین ڈبے مجھے پسند آئے اور



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انھیں میں نے ہی بیگ میں لپیٹ کر رکھا تھا۔''

اس بات پر تمام لوگوں پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا اور وہ خاتون بہت شرمندہ ہوئیں کہ بغیر تحقیق کے سب کو تنگ کیا۔

## آنکھوں پہ یقین نہیں آیا

بچپن کی بات ہے، ہمارے پڑوس میں ایک یتیم لڑکا صفدر اپنے چچا کے پاس رہتا تھا۔ پڑھنے لکھنے کا اسے بالکل شوق نہیں تھا۔ سارا دن پتنگ بازی اور دوسرے فضول کاموں میں گزارتا اور شرارتیں کرتا تھا۔ اس کے چچا اور ان کے گھر والے اس سے بہت پریشان رہتے تھے۔ میٹرک میں دو بار فیل ہونے کے بعد جب تیسری مرتبہ بڑی مشکل سے اس نے میٹرک پاس کیا تو اسے ایک دفتر میں نوکری دلوا دی گئی، چند سالوں کے بعد وہ اپنے چچا کے ہاں سے چلا گیا اور دوستوں کے ساتھ رہنے لگا۔ میری جب بھی اس سے ملاقات ہوتی تو وہ بڑی غیر سنجیدہ باتیں کرتا اور کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑتا تھا۔ پھر سنا کہ اس نے شادی کر لی ہے۔ بیوی بچوں کو لے کر کبھی وہ ہمارے گھر بھی آتا، کبھی کسی تقریب میں اس سے ملاقات ہو جاتی تھی، لیکن اس نے کبھی یہ نہیں بتایا کہ اس کا عہدہ کیا ہے اور وہ کہاں کام کرتا ہے۔ اس کے کپڑے نہایت سادہ اور باتیں بڑی مضحکہ خیز ہوتی تھیں۔ اس کے گھر جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ میرے علم میں یہی بات تھی کہ اس نے میٹرک سے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی، اس لیے یہی خیال تھا کہ وہ کہیں معمولی عہدے پر ملازم ہوگا۔

چند مہینے پہلے صفدر کی بہن کا راولپنڈی میں انتقال ہو گیا۔ میں نے سوچا صفدر سے تعزیت کی جائے۔ اس کے چچا سے گھر کا پتا معلوم کیا تو انھوں نے بتایا ''جم خانہ کلب کے سامنے واپڈا کے ملازمین کے گھر ہیں۔ وہیں جا کر کسی سے پوچھ لینا۔'' جب میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک طرف چھوٹے عملے کے کوارٹرز اور دوسری طرف اعلیٰ افسران کی کوٹھیاں تھیں۔ میں چھوٹے اسٹاف کے کوارٹرز کی طرف گیا اور استقبالیہ سے صفدر کے گھر کا پتا معلوم کیا تو مجھے بتایا گیا کہ وہ بڑی کوٹھیوں کی طرف رہتے ہیں۔ جب میں اس طرف گیا تو وہاں کے استقبالیہ کلرک سے صفدر صاحب کا پتا معلوم کیا۔

اس نے انٹر کام پر صفدر صاحب سے رابطہ کیا اور میرے بارے میں بتایا۔ وہاں سے جواب آیا ''ان صاحب کو بھیج دو۔'' جب میں اس کے گھر کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ مین گیٹ پر لگی ہوئی تختی پر ''مرزا صفدر بیگ، ڈائریکٹر جنرل'' لکھا ہوا ہے۔ مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آیا کہ جس شخص کو میں ایک معمولی ملازم سمجھ رہا تھا، وہ اتنا بڑا افسر نکلا اور طبیعت میں اتنی سادگی اور انکسار۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ تم اتنے بڑے عہدے تک کیسے پہنچے، کیوں کہ ہمارے زمانے میں آپ صرف میٹرک پاس تھے۔

صفدر نے بتایا ''جب میں نے نوکری کی تو دفتر میں میرا ایک ساتھی تھا، جو دفتر کے کام سے جیسے ہی فارغ ہوتا تو کورس کی کتابیں پڑھنے لگ جاتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ انٹر کا امتحان دے رہا ہے اور اس نے مجھ سے کچھ ایسی باتیں کیں کہ مجھے بھی پڑھائی سے دلچسپی ہو گئی۔ ہم دونوں نے ساتھ ہی انٹر کا امتحان دیا اور اچھے نمبروں سے پاس ہو گئے۔ اس کے بعد ہم مسلسل تعلیم حاصل کرتے رہے اور اللہ کا شکر ہے کہ آج میں اس مقام پر پہنچ گیا ہوں۔''

میں نے اس سے کہا ''اتنے بڑے عہدے پر ہوتے ہوئے بھی تم نے کبھی تکبر نہیں کیا اور نہ اپنے عہدے کے بارے میں کسی کو بتایا۔''

صفدر نے کہا ''میں ڈائریکٹر جنرل اپنے دفتر میں ہوں اور دفتر سے باہر وہی پرانا صفدر، ایک عام سا شخص، انسان اپنے اخلاق اور کردار سے پہچانا جاتا ہے، عہدے سے نہیں۔''

میں یہ سوچتا ہوں کہ تعلیم سے انسان میں کتنی تبدیلی آ جاتی ہے۔ اس کردار کو میں کبھی نہیں بھلا سکا۔




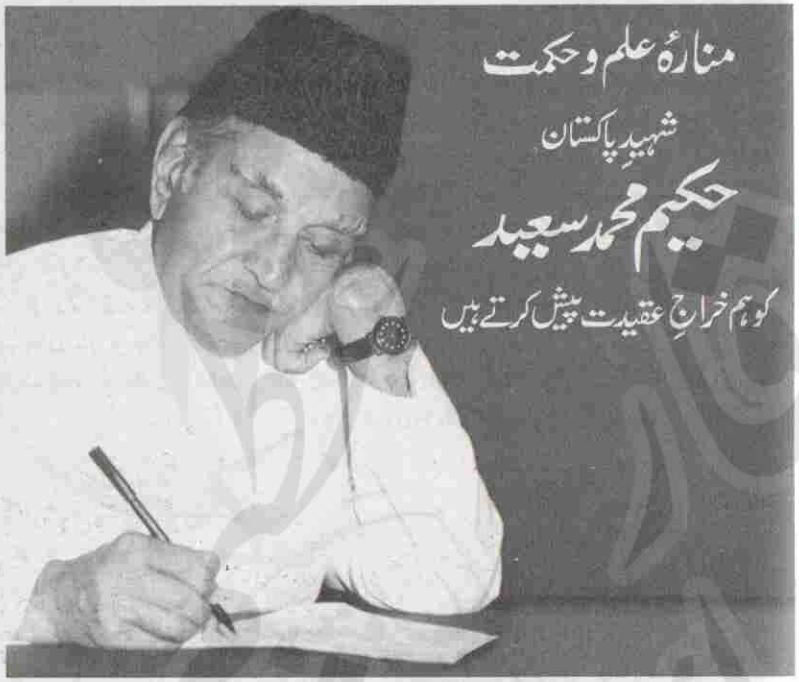


بانیِ مدینۃ الحکمہ۔ شہرِ علم و حکمت، بانی چانسلر ہمدرد یونیورسٹی

شہید حکیم محمد سعید پہلے گورنر سندھ جنہوں نے اپنے دور میں متعدد جامعات کو چارٹر عطا کئے تاکہ نوجوانانِ وطن کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کئے جاسکیں۔

ان کی یاد ہمارے دلوں میں قائم و دائم رہے گی۔

ایم۔ جلال دین اینڈ برادرس

شاہراہِ عراق، صدر، کراچی

فون:- 35212758 - 35210350 - 35660444

Adarts


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قدیم دور کی نشانی

# ۱۲ مہینوں کے نام کیسے پڑے؟

تاریخ کے جھروکوں میں جھانکنے کا موقع دینے والی دلچسپ داستان

سال کے ۳۶۵ دن ۱۲ مہینے رکھتے ہیں۔ ان میں کوئی ۳۰، کوئی ۳۱ اور کوئی ۲۸ یا ۲۹ دن کا ہوتا ہے۔ ان مہینوں کے نام کس طرح رکھے گئے، یہ داستان دلچسپ پس منظر رکھتی ہے۔

رانا محمد شاہد

## جنوری

عیسوی سال کے پہلے مہینے کا نام، رومیوں کے ایک دیوتا جانس (Janus) کے نام پر رکھا گیا۔ جانس دیوتا کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی پوجا صرف جنگ کے دنوں میں کی جاتی تھی، امن میں نہیں۔ دیوتا کے دو سر تھے، جن سے وہ بیک وقت آگے پیچھے دیکھ سکتا تھا۔ اس مہینے کا نام جانس یوں رکھا گیا کہ جس طرح دیوتا اپنے دوسروں کی وجہ سے آگے پیچھے دیکھ سکتا ہے، اسی طرح انسان بھی جنوری میں اپنے ماضی و حال کا جائزہ لیتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جنوری کا لفظ لاطینی زبان کے لفظ جنوا (Janua) سے اخذ کیا گیا جس کا مطلب ہے ''دروازہ''۔ یوں جنوری کا مطلب ہوا ''سال کا دروازہ''۔ ماہ جنوری ۳۱ دنوں پر مشتمل ہے۔

## فروری

ایک زمانے میں فروری سال کا آخری اور دسمبر دوسرا مہینا سمجھا جاتا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کے دور میں فروری سال کا دوسرا مہینا قرار پایا۔ یہ مہینا اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ سب سے کم یعنی ۲۸ دن رکھتا ہے جبکہ لیپ (Leap) کے سال میں فروری کے ۲۹ دن ہوتے ہیں۔ چنانچہ لیپ کا سال ۳۶۶ دنوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہر چوتھا سال لیپ کا سال ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سورج کرۂ ارض کے گرد اپنے مدار کا سفر ۳۶۵ ۱/۴ دنوں میں طے کرتا ہے۔ لیکن ۳ سال کے دوران اس کا ہر سال ۳۶۵ دنوں کا ہی شمار ہوتا ہے جبکہ چوتھے سال میں ۱/۴ حصے جمع کریں تو یہ ایک دن کے برابر بن جاتا ہے۔ یوں ایک دن زیادہ جمع کر کے یہ ۳۶۶ دن کا یعنی لیپ کا سال کہلاتا ہے۔ لفظ فروری بھی لاطینی زبان فیبرام (Februum) سے اخذ کیا گیا جس کا مطلب ہے ''پاکیزگی کا ذریعہ''۔

## مارچ

اس مہینے کا نام رومی دیوتا مارس (Mars) کے نام پر رکھا گیا۔ مارس کو اُردو میں مریخ کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ دیوتا بڑا خطرناک تھا۔ رومی دیومالا کے مطابق اس کے رتھ میں انتہائی منہ زور گھوڑے جتے ہوئے، رتھ میں دیوتا نیزہ تھامے کھڑا ہوتا۔ نیزے کی انی کا رُخ آسمان کی طرف تھا۔ دوسرے ہاتھ میں ڈھال ہوتی۔ دیوتا کا چہرہ آسمان کی طرف اٹھا ہوتا۔ اہلِ روم اسے سب سے طاقتور دیوتا سمجھتے تھے۔ ان کے عقیدے کے مطابق بارش، بجلی، بادل اور گرج چمک سب مارس دیوتا کے ہاتھ میں تھا۔ یہ مہینا بھی ۳۱ دنوں پر مشتمل ہے۔ لفظ مارچ لاطینی زبان کے لفظ مارٹیس (Martius) سے اخذ کیا گیا۔ اسی لفظ سے سیارہ مریخ کا نام (Mars) بھی بنایا گیا۔ مارچ کے مہینے میں عموماً موسمِ بہار کا آغاز ہوتا ہے۔

## اپریل

یہ مہینا ۳۰ دنوں پر مشتمل ہے۔ اپریل لاطینی لفظ، اپریلس (Aprilis) سے بنا ہے۔ اس کا مطلب ہے کھولنے والا، آغاز کرنے والا۔ اس مہینے میں چونکہ نئے پودوں اور درختوں کی نشوونما کا آغاز ہوتا ہے، چنانچہ اسے کسی دیوی یا دیوتا نہیں بلکہ بہار کے فرشتے سے منسوب کیا گیا۔

## مئی

یہ سال کا پانچواں مہینا ہے۔ ۳۱ دن رکھتا ہے۔ اس مہینے میں بھی بہار کے کچھ اثرات باقی ہوتے ہیں۔ لفظ مئی انگریزی زبان میں فرانسیسی لفظ مائی (MAI) سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ لاطینی زبان کے لفظ مائیس (Maius) سے اخذ شدہ ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس مہینے کا نام ایک رومی دیوی میا (Maia) کے نام پر رکھا گیا۔ رومیوں کے نزدیک اس وسیع و عریض زمین کو دیوتا نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ اس دیوتا کی سات بیٹیاں تھیں جن میں میا دیوی کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔

## جون

سال کا چھٹا مہینا اور اس میں ۳۰ دن ہوتے ہیں۔ لفظ جون بھی انگریزی زبان میں فرانسیسی زبان کے ایک



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سچا واقعہ

# ۳۰ سال بعد گھر واپسی

خدا کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں،
تبھی برسوں کے بچھڑے اچانک
ایک دوسرے سے آن ملے!

نازیہ گیلانی

لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے بہت زیادہ کام کیے تو رومی لوگ اس کے اتنے گرویدہ ہوگئے کہ اسے آگسٹس کے نام سے پکارا جانے لگا۔ اس نام کا مطلب ہے، دانا، دانشمند۔ چنانچہ اس مہینے کو آگسٹس کے نام پر اگست کہا گیا۔

## ستمبر

۳۰ دن رکھتا ہے۔ لاطینی زبان کے لفظ سیپٹ (Sept) سے بنا جس کا مطلب ہے ''ساتواں۔'' اس لیے ستمبر کا مطلب ہے ''ساتواں مہینا''۔ مگر پھر کیلنڈر کی نئی ترتیب سامنے آئی تو یہ نویں درجے پر چلا گیا۔

## اکتوبر

لاطینی میں آٹھ کو اوکٹو (Octo) کہا جاتا ہے۔ اسی سے سال کے آٹھویں مہینے کا نام اکتوبر رکھا گیا۔ اکتوبر کا مطلب ہے ''آٹھواں مہینا''۔ اس میں ۳۱ دن ہوتے ہیں۔ اب یہ دسواں مہینا ہے۔

## نومبر

اس میں ۳۰ دن ہوتے ہیں۔ لاطینی زبان میں ۹ کو نووم (Novum) کہتے ہیں۔ اسی نام سے مہینے کا نام نکلا۔ نومبر کا مطلب ہے ''نواں مہینا''۔ ستمبر کو ساتواں، اکتوبر کو آٹھواں اور نومبر کو نواں مہینا اس وقت کہا گیا جب جنوری اور فروری کے مہینے سال میں شامل نہیں تھے۔ بعد میں ان مہینوں کے نام تو وہی رہے البتہ ستمبر نواں، اکتوبر دسواں اور نومبر گیارھواں مہینا بن گئے۔

## دسمبر

یہ مہینا ۳۱ دن رکھتا ہے۔ لاطینی زبان کی گنتی میں دس کا مطلب ہے دسم (Decem)۔ اس لفظ کی مناسبت سے دسویں مہینے کو دسمبر کہا گیا۔ اب یہ سال کا بارھواں مہینا ہے۔

نام بھی ایک دیوی جونو (Juno) کے نام پر رکھا گیا۔ البتہ بعض لوگوں کے نزدیک یہ نام روم کے مشہور شخص جونی لیس کے نام پر رکھا گیا۔ جونو دیوتاؤں کے سردار جیوپیٹر کی بیٹی تھی جبکہ جونی لیس ایک بے رحم اور سفاک انسان تھا۔

## جولائی

اس مہینے میں ۳۱ دن ہوتے ہیں۔ جون کی طرح یہ بھی ایک گرم مہینا ہے۔ بلکہ بعض اوقات حبس اور شدید گرمی اسے جون سے بھی گرم بنا دیتی ہے۔ اس مہینے کا نام دیوی دیوتا نہیں بلکہ روم کے ایک مشہور حکمران جولیس سیزر کے نام پر رکھا گیا۔ ایک زمانے میں یہ پانچواں مہینا تھا۔ جولیس سیزر قدیم روم کا مشہور شہنشاہ تھا۔ مشہور شاعر و ڈراما نگار ولیم شیکسپیئر نے ''جولیس سیزر'' پر ایک ڈراما بھی لکھا۔

## اگست

سال کا آٹھواں مہینا۔ اس میں ۳۱ دن ہوتے ہیں۔ پہلے یہ چھٹا مہینا تھا کیونکہ تب سال کا آغاز مارچ سے کیا جاتا تھا اور کل دس مہینے ہوتے یعنی مارچ تا دسمبر۔ وہ اس طرح کہ قمری سال اور شمسی سال کے مہینوں میں فرق ہوتا تھا۔ قمری سال کے تو بارہ مہینے ہوتے تھے جبکہ شمسی سال کے ۱۰ ماہ بنتے تھے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے دو مہینوں کا اضافہ کیا گیا..... جنوری اور فروری۔ یوں شمسی سال میں بھی ۱۲ مہینے ہوگئے۔

شمسی سال میں اضافے کے بعد اگست کا نام ایک قدیم رومی شہنشاہ آگسٹس (Augustus) کے نام پر رکھا گیا۔ (اس مہینے میں پہلے ۲۹ دن تھے، بعد میں جولیس سیزر نے ۲ دن کا اضافہ کر کے ۳۱ دنوں کا مہینا کر دیا)۔ پہلے رومی شہنشاہ آگسٹس کا نام کچھ اور تھا۔ جب اس نے

مہینوں کے انگریزی نام اس وقت وجود میں آئے جب انسان جاہلیت کا شکار اور کفر میں ڈوبا ہوا تھا۔ آج لوگ دیوی دیوتاؤں کی حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ وہ انہیں محض تصوراتی ہستیاں سمجھتے اور ایک خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ چونکہ ان مہینوں کے نام صدیوں سے یہی چلے آ رہے ہیں، اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ اس تاریک دور کی یاد دلاتے ہیں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

۴۵ سالہ لیونارڈ فونگ امریکی شہر، لاس اینجلس میں اشیائے صرف کی دکان کا مالک تھا۔ اس کے والدین ہانگ کانگ سے امریکہ آئے تھے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ لیونارڈ نے لاس اینجلس میں تعلیم و تربیت پائی اور ورثے میں باپ کی دکان پائی۔ ۱۹۷۰ء میں اس نے ہانگ کانگ میں مقیم ایک دوشیزہ، سوزین سے شادی کر لی۔ اس بندھن سے دو بیٹے تولد ہوئے۔

یہ ۱۹۸۰ء کے موسم گرما کی بات ہے، لیونارڈ ایک دن اپنے بیٹے، چھ سالہ ڈینئل فونگ کو بھی اپنی دکان میں لے گیا۔ وہاں ڈینئل نے پہلے تو کچھ ٹافیاں مزے سے کھائیں، پھر گیند سے کھیلنے لگا۔ اسی دوران تین امریکی دکان میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے بندوق تانی ہوئی تھی۔

ڈینئل یاد کرتے ہوئے بتاتا ہے ''مسلح آدمی نے میرے والد کو حکم دیا کہ ساری رقم اس کے حوالے کر دو۔ میری والدہ نیچے پڑی تجوری سے رقم نکالنے کے لیے جھکی۔ ڈاکو سمجھا کہ وہ کوئی ہتھیار نکال رہی ہے۔ چنانچہ اس نے والدہ کو گولی مار دی۔ جب میرے والد اسے بچانے بڑھے، تو اس کو بھی اڑا دیا گیا''۔

دو دن بعد پولیس نے قاتل، ویسلی بائیس کو گرفتار کر لیا۔ اس نے اقرار کیا کہ اسی نے لیونارڈ اور سوزین کے علاوہ ایک تیسرے شخص ریمنڈ ویسکوز کو قتل کیا ہے۔ ریمنڈ برگر فروخت کرنے والی ایک دکان چلاتا تھا اور دوران ڈکیتی مارا گیا۔ ویسلی پر مقدمہ چلا۔ کچلی عدالت نے اسے پھانسی کی سزا دی۔ تاہم عدالت عالیہ نے سزا عمر قید میں بدل دی اور وہ جیل چلا گیا۔

☆☆

جب ماں باپ دنیا سے گزر گئے، تو یہ سوال پیدا ہوا کہ ان کے بیٹوں، ۶ر سالہ ڈینئل اور ۴ر سالہ لیونارڈ جونیئر کی پرورش و نگہداشت کون کرے گا؟ اس دوران مقتول لیونارڈ کے والدین گھر پہنچ چکے تھے۔ سوزین کی والدہ، پوپو بھی پچھلے ہی سال ہانگ کانگ سے امریکہ بیٹی کے پاس چلی آئی تھی۔

چینی تہذیب و ثقافت کی رو سے اگر کسی جوڑے کے بچے لاوارث ہو جائیں، تو وہ عموماً دادا دادی کے سپرد ہوتے ہیں۔ اسی لیے ڈینئل اور لیونارڈ بھی اپنے دادا دادی، ینگ ینگ اور سوئی ٹونگ کے ساتھ رہنے لگے۔ دونوں بچے ان سے خوب واقف تھے، اس لیے انھیں نئے گھر اور ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔

لیکن دونوں پوتوں کو علم نہ تھا کہ یہ ان کا عارضی ٹھکانہ ہے۔ دراصل سوئی ٹونگ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ڈینئل اور لیونارڈ اس کی بیٹی، سو اور داماد، ٹامی کے گھر پلے بڑھیں۔ اس وقت والدین کا حکم حرفِ آخر ہوتا تھا، چنانچہ سو کو ہامی بھرنی پڑی۔ یوں دونوں لڑکے اپنا مختصر سامان لیے ٹورنٹو، کینیڈا روانہ ہو گئے جہاں ان کی پھوپھی مقیم تھی۔

ڈینئل اور لیونارڈ موسم سرما میں ٹورنٹو پہنچے۔ وہاں ایک نئی مگر مصائب سے پُر زندگی ان کی منتظر تھی۔ جلد ہی لڑکوں کو علم ہو گیا کہ اس کے سرپرست دونوں کی آمد پر ناخوش ہیں۔ دراصل وہ ایک چھوٹے فلیٹ میں رہتے تھے۔ جب لڑکے آئے، تو انھیں بڑے فلیٹ میں منتقل ہونا پڑا تاکہ ان کی جگہ بھی نکل سکے۔ اس طرح آغاز ہی اخراجات میں اضافے سے ہوا۔

اگلے چند سال میں ڈینئل و لیونارڈ کے دادا دادی چل بسے۔ یوں معلوم ماضی سے ان کا رابطہ ٹوٹ گیا کیونکہ سو بڑی لڑاکا عورت تھی، چنانچہ خاندان میں کوئی اس سے ملنا پسند نہ کرتا۔ توقع کے مطابق سو نے دونوں لڑکوں کو بوجھ سمجھا اور بات بے بات یتیموں کو ڈانٹتی رہتی۔ کبھی کبھی چپت بھی لگا دیتی۔ جب سو کے بچے اودھم مچاتے یا کوئی غلط حرکت کرتے، تو سزا انہی کو ملتی۔ اٹھتے بیٹھتے کہا جاتا کہ وہ احمق اور بے وقوف ہیں جنھیں کوئی پسند نہیں کرتا۔ اگر کھانے کی میز پر پہنچتے ہوئے انھیں پانچ دس منٹ دیر ہو جاتی، تو بھائیوں کو بھوکا رہنا پڑتا۔ غرض



ماں باپ کے رخصت ہوتے ہی دونوں بچوں کو کٹھن حالات سے واسطہ پڑ گیا۔

سو اور ٹامی اچھے سرپرست ثابت نہیں ہوئے۔ انھوں نے اپنے بچوں کو تو ہر قسم کی آسائشیں دیں مگر بھتیجوں سے یوں برتاؤ کیا جیسے وہ اجنبی ہوں۔ چنانچہ انھیں بچا کھچا کھانے کو ملتا اور پہننے کو اترن! اس عالم کسمپرسی میں دونوں بھائی عنفوان شباب میں داخل ہو گئے۔ سو اور ٹامی نے انھیں اسکول داخل کرانے کی زحمت نہ کی، لہٰذا وہ گلیوں میں آوارہ پھرنے اور اسکیٹ بورڈ چلانے لگے۔

دونوں بھائیوں نے دوستوں سے پہلی بار سنا کہ ان کے والدین تو انھیں بڑی محبت دیتے اور ناز اٹھاتے ہیں۔ بیشتر لڑکوں کے پاس اپنے گھروں کا چابیاں تھیں تاکہ اگر وہ رات گئے گھر جائیں، تو اندر داخل ہونے میں مشکل پیش نہ آئے۔ لیکن دونوں بھائی رات دس بجے کے بعد گھر داخل نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ دروازے بند کر دیے جاتے۔ چنانچہ وہ رات کسی دوست کے ہاں یا اسکیٹ بورڈ چلاتے گزارتے۔

۱۹۸۹ء میں جب ڈینئل سترہ سال کا تھا، تو اپنے پھوپھا سے جھگڑ بیٹھا۔ اس نے پھر اپنا مختصر سامان اٹھایا اور ہمیشہ کے لیے گھر سے نکل گیا۔ اس نے اگلے چند ماہ دوستوں کے ہاں گزارے۔ جب ۱۸ سال کا ہوا، تو اسے امریکی حکومت کی طرف سے دو لاکھ ڈالر (تقریباً پونے دو کروڑ روپے) مل گئے۔

پھوپھو سو نے دراصل کسی کمزور لمحے بھتیجے کو بتا دیا تھا کہ امریکی حکومت نے اس کے باپ کا گھر اور دکان نیلام کر کے رقم اپنے پاس رکھ لی تھی۔ اس رقم کا اب نصف نصف حصہ دونوں بھائیوں کو بالغ ہونے پر ملنا تھا۔ لہٰذا اب یہ رقم پا کر ڈینئل خاصا امیر ہو گیا۔ پہلے اس نے ہائی اسکول کیا، پھر کینیڈین شہر، وینکوور کی ایملی کار یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور آرٹ و ڈیزائن میں ڈگری لی۔ اس ڈگری کی بدولت اسے قابل رشک ملازمت مل گئی۔

جب لیونارڈ ۱۶ر سال کا تھا، تو وہ بھی اپنے پھوپھا سے لڑ پڑا۔ چنانچہ اس نے بھی گھر چھوڑا اور اپنے ایک دوست کے ہاں منتقل ہو گیا۔ بعد ازاں وہ اپنے بھائی کے پاس کینیڈین صوبے برٹش کولمبیا چلا گیا۔ وہیں اس نے اپنی تعلیم مکمل کی اور مقامی یونیورسٹی سے فوٹوگرافی کی ڈگری پائی۔

لیونارڈ پھر نیویارک پہنچا اور اپنے دو لاکھ ڈالروں کے مدد سے وہاں چھوٹا سا اسٹوڈیو کھول لیا۔

یوں والد کی چھوڑی جائیداد نے دونوں بے یارو مددگار بھائیوں کو اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر خوشحال زندگی گزار سکیں۔ انھیں بھی داد دینی چاہیے کہ لڑکپن میں کٹھن زندگی گزارنے کے باوجود وہ مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث نہیں ہوئے۔ رقم ملتے ہی انھوں نے خود کو تعلیم یافتہ بنایا اور یوں معاشرے کے کارآمد شہری بن گئے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## ایک چشم کشا انکشاف

ستمبر ۲۰۱۰ء کی بات ہے، ایک شام لیونارڈ نے فارغ وقت انٹرنیٹ پر سرفنگ کرتے گزارنے کا پروگرام بنایا۔ گوگل پر سرچنگ کرتے ہوئے اسے خیال آیا کہ کیوں نہ وہ اپنا نام لکھ کر دیکھے۔ یہ دیکھ کر اس کی حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا کہ اس کے سامنے باپ کا نام، لیونارڈ فونگ (سینئر) آ گیا۔

دراصل یہ اس کے والدین کے قاتل، جان ویسلے کی اپیل سے متعلق امریکی سپریم کورٹ کی دستاویز تھی۔ لیونارڈ کو یہ تو علم تھا کہ اس کے والدین قتل کیے گئے تھے، مگر اب پہلی بار اسے قاتل کا نام معلوم ہوا۔ لہٰذا اس نے دستاویز بغور پڑھی اور جرم کی تفصیل سے آگاہ ہوا۔ دستاویز نے ایک اور انکشاف کیا: ''جب دکان میں گولی چلی تو اس کی نانی بھی موجود تھی جو زخمی ہوگئی۔ وہ لیونارڈ کی یادداشت میں ''پوپو'' کے عرف سے محفوظ تھی۔ تاہم اس کا اصل نام یک شون وونگ تھا۔

دستاویز سے پتا چلا کہ ویسلے نے اس کے کولھے میں گولی ماری تھی۔ اسے پھر زخمی حالت میں اسپتال پہنچا دیا گیا۔ لیونارڈ نے فوراً بھائی کو فون کیا اور اسے ساری تفصیل سے آگاہ کر کے پوچھا ''کیا نانی دکان میں موجود تھیں؟'' ڈینئل کو اپنی نانی کے متعلق کچھ یاد نہ تھا۔

☆☆

پچھلے سال ایک تقریب میں لیونارڈ کی ملاقات ایک خوبصورت چینی دوشیزہ، جینفر سے ہوئی تھی۔ وہ اقوام متحدہ میں کام کرتی تھی۔ دونوں پہلی نظر میں ایک دوسرے سے متاثر ہوئے اور پھر ملاقاتیں کرنے لگے۔ آخرکار انھوں نے ۲۰۱۰ء میں شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اکتوبر ۲۰۱۰ء میں لیونارڈ کی ۳۳ رویں سالگرہ آئی۔ اس موقع پر جینفر نے منگیتر کو ایک گراں قدر تحفے سے نوازا۔ دراصل پچھلے دو ہفتے سے وہ لاس اینجلس میں چینی قبرستانوں کے ریکارڈ چھانتی رہی تھی۔ آخرکار لڑکی کی محنت رنگ لائی۔ اسے نہ صرف یہ معلوم ہوا کہ لیونارڈ کے والدین کہاں دفن ہیں، بلکہ یہ بھی پتا چلا کہ اس کا آبائی گھر کدھر واقع ہے۔

دسمبر ۲۰۱۰ء میں کرسمس کی چھٹیاں ہوئیں، تو لیونارڈ نے اپنے آبائی گھر جانے کا فیصلہ کیا تاکہ پرانی یادیں تازہ کر سکے۔ لاس اینجلس پہنچ کر پہلے اس نے والدین کی قبروں پر حاضری دی تاکہ ''اندرونی طور پر کچھ امن و سکون حاصل کر سکے۔'' بعدازاں اپنے آبائی گھر کا پتا تھامے وہ آخر منزل تک پہنچ گیا۔

لیونارڈ کو گھر جس شکل میں یاد تھا، وہی اس کے سامنے آئی۔ تاہم اُسے آس پاس وہ تالاب نظر نہیں آیا جس کے کنارے وہ اکثر کھیلا کرتا تھا۔ اس نے پھر اندر سے گھر دیکھنے کا منصوبہ بنایا۔ اُسے یقین تھا کہ موجودہ مالکان اس کی یہ چھوٹی سی خواہش پوری کر دیں گے۔ چنانچہ اس نے صدر دروازے پر لگی گھنٹی بجا دی۔

صحن کی طرف کھلنے والی ایک کھڑکی کھلی اور ایک بوڑھی چینی عورت کا چہرہ نمودار ہوا۔ اس نے چینی زبان ہی میں اسے کچھ کہا۔ لیونارڈ گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انگریزی میں بولا ''میں جب چھوٹا سا تھا، تو یہاں رہتا تھا۔''

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر اس عورت نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں دریافت کیا ''تم ڈینئل ہو؟''

''ڈینئل میرا بڑا بھائی ہے۔ میں لیونارڈ ہوں۔''

یہ سنتے ہی بوڑھی عورت بآواز بلند گھر میں کسی کو آوازیں دینے لگی۔ پھر اندر خاصا شور بلند ہوا۔ تھوڑی دیر بعد برآمدے کا دروازہ کھلا اور دو خواتین باہر آئیں۔ ایک نے بتایا ''میں تمھاری ممانی ہوں اور یہ نانی!''

''پوپو'' پھر دوڑ کر اپنے نواسے سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔ وہ پھر اسے لیے اندر پہنچی اور تفصیل سے اپنی داستان سنائی۔ ہوا یہ کہ جب تک نانی صحت یاب ہوئی، اس کی بیٹی اور داماد کی جائیداد نیلام ہوگئی نیز دونوں نواسے ٹورنٹو بھجوا دیے گئے۔ یوں اس کا نواسوں سے رابطہ ٹوٹ گیا۔

یہ یک شون کی خوش قسمتی ہے کہ اسی دوران اس کا

خاوند، سوئی ٹونگ اپنی جمع پونجی سمیٹ کر امریکہ پہنچ گیا۔ کچھ عرصہ بعد اس نے بیوی کے اصرار پر داماد کا گھر خرید لیا۔ دراصل پوپو کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن اس کے نواسے گھر ضرور واپس آئیں گے۔ یوں وہ انھیں دیکھ کر خوشی سے سرشار ہو جائے گی۔

سوئی ٹونگ نے اُسے ٹورنٹو میں اپنی بیٹی کے گھر کا پتا بتا دیا تھا۔ لیکن سوجس نئے گھر میں منتقل ہوئی، اس کا پتا پوپو کو نہ مل سکا۔ پھر جب سوئی ٹونگ دنیا سے رخصت ہوا، تو انگریزی زبان صحیح طرح نہ بولنے کے سبب نانا نانی اپنے نواسوں کے متعلق کینیڈین حکومت سے معلومات حاصل نہ کر سکے۔

رفتہ رفتہ نانا نانی کے دونوں بیٹے بھی امریکہ چلے آئے۔ جب وہ امریکی بود و باش سے ہم آہنگ ہو گئے، تو انھوں نے والدین سے اصرار کیا کہ یہ قدیمی گھر بیچ کر نیا خریدا جائے۔ تاہم نانا نانی نے ان کا مطالبہ مسترد کر دیا۔ دراصل دونوں سمجھتے تھے کہ ایک دن ضرور ان کے نواسے اپنے گھر پلٹیں گے۔ چنانچہ انھوں نے گھر کی حالت جوں کی توں رکھی۔

ڈینئل نے بعدازاں گھر دیکھا، تو بول اٹھا ''ارے گھر کا باورچی خانہ تو بالکل نہیں بدلا، میرے بچپن میں بھی یہ ایسا ہی تھا۔''

لیونارڈ نے اپنا موبائل نکالا، بھائی کا نمبر ملایا اور بولا ''ڈینئل! تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ اس وقت میں کن لوگوں کے ساتھ کہاں کھڑا ہوں۔'' جب بڑے بھائی کو حقیقت حال معلوم ہوئی، تو وہ بھی خوشی سے نہال ہو گیا۔ اس نے اسی وقت لاس اینجلس کی ٹکٹ کٹوا لی۔

پوپو نے نواسے کو وہ تاریخی تصویر دکھائی جس میں ۲ رسالہ لیونارڈ اور ۴ رسالہ ڈینئل موجود تھے۔ اس دوران ان کے گھر دور و قریب سے مختلف رشتے دار آنے لگے۔ دراصل پچھلے ہی دن نواسوں کی راہ تکتا نانا جان سے گزر گیا تھا۔ یوں آنے والے رشتہ داروں کو غم و خوشی کے ملے جلے تاثرات سے آشنا ہونا پڑا۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ ربِ کائنات کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں! اس نے نواسوں سے ازحد محبت کرنے والی نانی کو مایوس نہیں کیا اور آخرکار ان سے ملا ہی دیا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

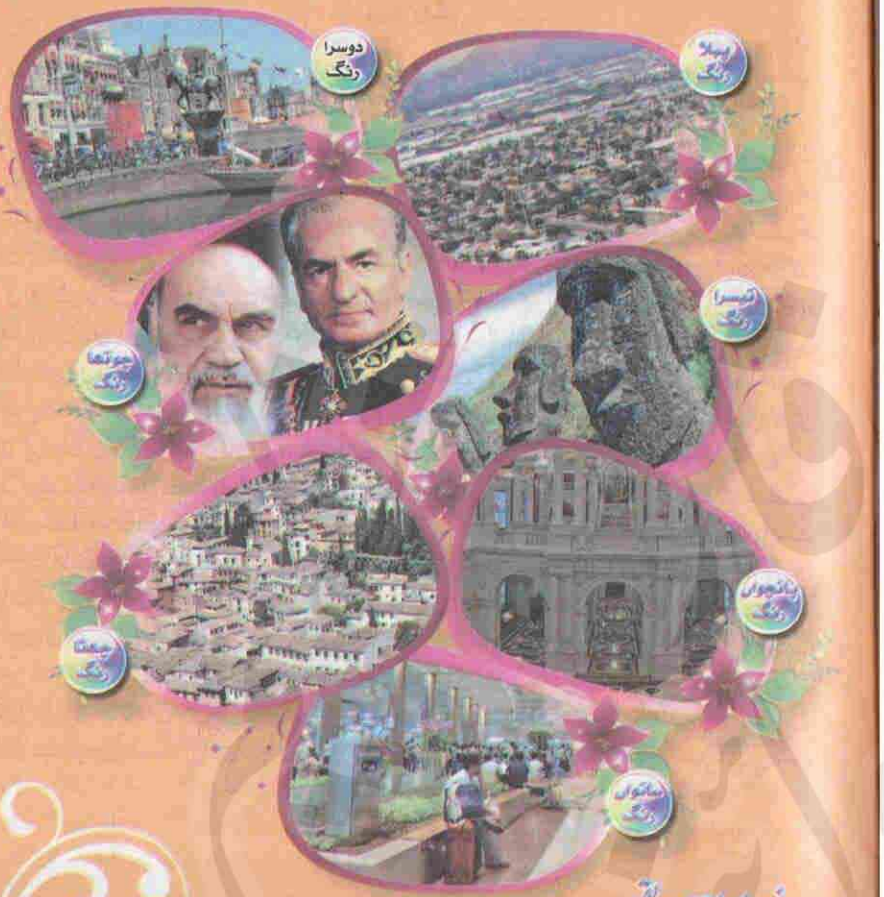


نوید اسلام صدیقی

اُردو ڈائجسٹ کا ایک مقبول سلسلہ سات رنگ، سات تحریریں

# گوشۂ ست رنگ

زندگی کی خوبصورتیوں اور حقیقتوں کو مختصر مختصر آپ تک پہنچانے کی
یہ کوشش اپنی تازگی، ندرت اور جستجو کے باعث پسند کی جاتی ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہلا رنگ

# وہ وادی جہاں حضورؐ نے اپنا بچپن گزارا

میں بڑی مدت سے منصوبہ بنا رہا تھا کہ کسی وقت ریاض سے بنوسعد کے علاقے کو دیکھنے جاؤں جہاں رسول اللہ ﷺ نے اپنا بچپن گزارا تھا چنانچہ اپنے ایک دوست کی کار میں طائف پہنچ گیا۔ یہ پہاڑی علاقہ ہے اور بالکل زرخیز نہیں۔ پہاڑوں پر کھیتی باڑی بھی زیادہ نہیں ہوتی۔ پہاڑی وادیوں اور نشیب میں کہیں کہیں تھوڑی سی جگہ پر زراعت ہوسکتی ہے۔ یہاں خاردار جھاڑیاں بھی کم ہی ہیں۔ لوگوں کا ذریعۂ معاش اونٹوں اور بکریوں سے حاصل ہونے والی آمدنی ہے۔ وہ ان کا دودھ پیتے، ان کی کھال سے فائدہ اٹھاتے، کبھی کبھار ان کو ذبح کر کے ان کا گوشت کھاتے ہیں۔ اگر قسمت ساتھ دے اور بارش ہو جائے تو کچھ کھیتی باڑی کی صورت نکل آتی ہے جس سے گیہوں کی فصل حاصل ہوتی ہے۔

بنوسعد کے علاقے میں قبیلہ سعد بن بکر دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ خاندان اصل میں بنو ہوازن کی ایک شاخ ہے۔ یہ وہی قبیلہ ہے جس نے حنین کے میدان میں حضرت محمدؐ رسول خدا کا مقابلہ کیا تھا۔ یہاں کا موسم اور آب و ہوا نہایت صحت افزا تھی۔ ہر سال کچھ عورتیں مکہ مکرمہ آتیں اور وہاں کے خوشحال اور امیر قریشی گھرانوں کے شیرخوار بچوں کو لے جاتیں۔ دو سال انھیں دودھ پلاتیں، پھر واپس پہنچا دیتیں اور بچے کے والدین سے حسب توفیق انعام واکرام حاصل کرتیں۔

چودہ سو سال قبل ایک دن انہی دس بدوی خواتین کا قافلہ مکہ مکرمہ روانہ ہوا۔ قافلے میں ایک خاتون حلیمہؓ بنت ابی ذویب بھی تھیں۔ ان کے خاوند کا نام حارث بن عبدالعزیٰ تھا۔ دونوں میاں بیوی قبیلہ بنوسعد بن بکر سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی دو بیٹیاں انیسہ اور شیما تھیں اور ایک بیٹا عبداللہ تھا جو سب سے چھوٹا بچہ تھا۔ جب اللہ کے نبیؐ حلیمہ سعدیہ کی چھاتی سے دودھ پیتے تو یہی عبداللہ رضاعی بھائی کے طور پر ان کی گود میں تھے۔

جب قافلہ مکہ پہنچا تو تمام خواتین دودھ پینے والے بچوں کی تلاش میں نکل گئیں۔ حلیمہ سعدیہ آپؐ کی والدہ سیدہ آمنہ کے پاس گئیں اور ان سے آپؐ کو گود لے لیا۔ سیدہ آمنہ خوش تھیں کہ ان کا بیٹا دیہات کی صاف و شفاف آب و ہوا میں نشوونما پائے گا اور بنوسعد کی خالص اور فصیح و بلیغ عربی ہوش سنبھالتے ہی آپؐ کے کانوں میں پڑے گی۔ آپؐ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا ''میں تم میں سب سے زیادہ شستہ اور صحیح عربی بولنے والا ہوں، میں قریشی ہوں اور قبیلہ بنوسعد میں، میں نے دودھ پیا۔ (جو فصاحت و بلاغت میں ایک اعلیٰ مقام کا حامل ہے۔)''

گاڑی کا ڈرائیور علی العتیمی ہمیں علاقے کی تاریخ سے بھی آگاہ کرتا گیا۔ ایک وقت تھا جب یہاں قبائل میں جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ ایک قبیلے کا فرد، دوسرے علاقے میں نہیں جا سکتا تھا۔ آلِ سعود کی حکومت قائم ہونے کے بعد یہاں امن و امان قائم ہوگیا۔ دور پہاڑیوں کی چوٹیوں پر ہمیں بکریاں چرتی نظر آرہی تھیں۔ سیدہ حلیمہؓ کے گاؤں کا نام شوحطہ ہے جو ایک وادی میں آباد ہوا، مکہ سے ۱۶۰ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔

اس وادی پر گویا ابرِ رحمت چھایا ہوا تھا۔ بہت سکون اور اطمینان کی فضا تھی۔ یہ کوئی بڑی وادی نہیں، پندرہ سے بیس ایکڑ پر محیط ہوگی۔ سیدہ حلیمہ کے گاؤں کے حالات اب وہ نہیں رہے جو کبھی تھے۔ اس واقعے کو ۱۴۰۰ سال سے زائد گزر چکے۔ پتھروں کے نشانات ہیں۔ چھوٹی موٹی چار دیواریاں ہیں۔ کسی نے سفیدی سے شکستہ خط میں لکھا ہوا تھا ''بیت حلیمہ''۔ یہ نہایت چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ غالباً بارش کے وقت ہی ان میں رہا جاتا ہوگا اور باقی وقت خیموں میں۔ سیدہ حلیمہؓ کے گھر والی جگہ کی اگر پیمائش کی جائے تو کُل دس پندرہ مرلے سے زائد نہ ہوگی۔ کسی پاکستانی نے اس جگہ مسجد بنانے کی کوشش کی مگر اعلیٰ حکام نے غالباً بدعات اور خرافات کے ڈر سے اسے مکمل نہ ہونے دیا۔ تاہم پتھروں کے نشانات سے محراب اور مسجد کی نشاندہی موجود ہے۔

میں بار بار اس وادی کی طرف دیکھتا، اس کے ذرے ذرے پر غور کرتا کہ سبحان اللہ! یہ وہی جگہ ہے جہاں اللہ کے رسولؐ نے اپنا بچپن گزارا۔ میں اِدھر اُدھر چل کر اس سرزمین کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا جہاں آپؐ نے چلنا شروع کیا۔ ننھے سے محمدؐ سے آپؐ کی رضاعی بہن شیما کتنا پیار کرتی ہوگی۔ آپؐ کو گود میں اٹھاتی، لوریاں سناتی، کھلاتی پلاتی اور ناز اٹھاتی ہوگی۔ سیدہ حلیمہؓ کے بقول آپؐ دوسرے بچوں کے مقابلے میں اس تیزی سے بڑھ رہے تھے کہ دو سال پورے ہوتے ہوتے خاصے بڑے معلوم ہونے لگے۔ (الرحیق المختوم)

سیدہ حلیمہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ میری چھاتی کی دائیں جانب سے ہی دودھ پیتے اور جب میں بائیں جانب آگے کرتی تو آپؐ منہ ہٹا لیتے، مجھے اس پر حیرت ہوتی۔ سیدہ حلیمہؓ کو کیا معلوم تھا کہ یہ وہ بچہ ہے جو بڑا ہو کر قناعت کا معلم، مساوات کا علمبردار اور عدل انصاف کا پیکر بنے گا۔

ایک دن گھر سے قدرے دُور آپؐ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ حضرت جبرائیل علیہ السّلام نے آپؐ کو پکڑ کر زمین پر لٹا دیا۔ سینہ چاک کر کے دل نکالا اور اس میں سے خون کا ایک لوتھڑا نکال کر فرمایا ''یہ تم سے شیطان کا حصہ تھا۔'' پھر دل ایک طشت میں زم زم کے پانی سے دھویا اور پھر اسے واپس اس کی جگہ جوڑ دیا۔ اُدھر بچے دوڑ کر اپنی والدہ سیدہ حلیمہؓ کے پاس پہنچے اور کہنے لگے کہ محمدؐ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ گھر والے بھاگم بھاگ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ آپؐ کا رنگ اُترا ہوا تھا۔ سیدنا انسؓ بن مالک جو اس حدیث کے راوی ہیں، فرماتے ہیں ''میں سلائی کے نشانات آپؐ کے سینہ مبارک پر دیکھا کرتا تھا۔''

ہم نے اس وادی میں کم و بیش دو گھنٹے کا وقت گزارا۔ بلاشبہ یہ میری زندگی کا بہت یادگار سفر تھا۔ یہاں اِس قدر لطف آیا کہ واپس آنے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر مغرب کے بعد امام و خطیب حرم شیخ عبدالرحمٰن السدیس کے ساتھ ملاقات طے تھی، اِس لیے قطعاً نہ چاہتے ہوئے بھی ہم نے وہاں سے واپسی کے لیے رختِ سفر باندھا۔

(عبدالمالک مجاہد)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# یورپ کا گنجان ترین ملک

ہالینڈ ایک ننھا سا ملک، رقبہ، پونے تیرہ ہزار مربع میل، گویا بنگلہ دیش کا ایک چوتھائی۔ آبادی ایک کروڑ سے کچھ زیادہ۔ گویا یورپ کا گنجان ترین ملک۔ اس ملک کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ اس کی سطح زمین سمندر سے نیچی ہے۔ گویا یہاں کے باسی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں تو چند سو سال میں سارا ملک سمندر کی نذر ہو جائے لیکن یوں نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہاں کے لوگ بڑے جفاکش، بڑے محنتی ہیں۔ انھوں نے سیکڑوں بند باندھ کر ملک کو بچائے رکھا ہے۔ یہی نہیں وہ سمندر سے ہر سال کچھ علاقہ جیت بھی لیتے ہیں۔ اس کا طریقہ حیران کُن اور بظاہر دشوار ہے۔ ساحل سے کچھ دور سمندر کے اندر بند باندھتے اور سمندر کا پانی باہر نکالتے ہیں۔ نشیبی زمین میں مٹی اور پتھر ڈالتے ہیں۔ سطح ہموار ہوتی ہے اور اس پر نئی بستی آباد ہو جاتی ہے۔

سہ پہر کے وقت اپنے میزبان کودی صاحب اور بیگم کودی اور ان کے دو نہایت تیز طرار بچوں کے ساتھ امسٹرڈم کی نہروں کی سیر کی۔ اس شہر میں جو سیاح آئیں، ان میں ۸۵ فیصد نہروں کی سیر کو اپنا اولین فرض کہتے ہیں۔ سیاحوں کے لیے بے شمار خوبصورت موٹر لانچ کشتیاں موجود ہیں، ان کی چھت شفاف پلاسٹک کی ہوتی ہے۔ چاروں طرف بھی شیشوں کی جگہ پلاسٹک کے بڑے بڑے ٹکڑے لگے ہوئے ہیں۔ کشتی کے اندر حرارت کا انتظام ہوتا ہے تاکہ باہر خواہ کتنی ہی ٹھنڈ کیوں نہ ہو، سیاحوں کو تکلیف نہ ہو اور وہ اندر گرم فضا میں بیٹھ کر شفاف پلاسٹک میں سے ہر چیز کا نظارہ کر سکیں۔

امسٹرڈم کی کچھ نہریں سیدھی ہیں، کچھ ہلالی شکل کی۔ امیر طبقے کے مکان نہر کے کنارے واقع ہیں۔ یہ نہریں دریائے ایمسٹل (Amstel) سے نکالی گئی ہیں۔ یہ ایک حسین دریا ہے جو مختلف موسموں اور مقامات پر نت نئے روپ میں جلوہ افروز ہوتا ہے۔

نہروں کی سیر کرتے کرتے کئی قابلِ دید چیزیں آتی ہیں۔ مثلاً دو ڈھائی سو سال پرانے مکان۔ اسی سیر کے دوران میں ''اشکِ منار'' نظر آتا ہے۔ کہتے ہیں جن دنوں بادبانی جہازوں کا دور دورہ تھا، جہاز کسی لمبے سفر کو روانہ ہوتے تو یہاں ملاحوں کی بیویاں اور محبوبائیں اتنا روتیں کہ منار کے پتھر گیلے ہو جاتے کیونکہ وہ نہیں جانتی تھیں کہ ان کے شوہر اور عشاق کب لوٹیں گے۔ اسی سیر کے دوران امسٹرڈم کی عظیم الشان بندرگاہ نظر آتی ہے جہاں بے شمار بڑے بڑے سمندری جہاز کھڑے ہوتے ہیں۔

(ڈاکٹر عبدالسلام خورشید)





# اسرار کی دھند میں لپٹے سیکڑوں مجسمے

''موآئی'' (Moai) مجسموں کی جائے وقوع ''ایسٹر آئی لینڈ'' ہے۔ یہ جزیرہ لاطینی امریکہ کے ملک چلی کے مغربی ساحل سے ۳۶۸۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع اور وسطی اور جنوبی بحیرۂ اوقیانوس میں تکونی شکل میں پھیلے ان ایک ہزار چھوٹے بڑے جزائر کے علاقے میں شامل ہے، جسے جغرافیائی اصطلاح میں پولی نیشیا (Polynesia) کہا جاتا ہے۔ ۶۳ مربع میل پر محیط ایسٹر آئی لینڈ کو سب سے دُور افتادہ جزیرہ ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ دُنیا کے آباد علاقوں سے انتہائی دُور ایسٹر آئی لینڈ میں دسویں صدی سے سولہویں صدی کے درمیان تراشے گئے دیوپیکر چہروں والے موآئی مجسموں کی موجودگی ابھی تک ایک سربستہ راز ہے۔

## دریافت اور وجہ تسمیہ

۵ اپریل ۱۷۲۲ء کو ایسٹر کے مذہبی تہوار کے دن ولندیزی جہازراں اور سیاح ''جیکب روگی وین'' نے اس جزیرے پر قدم رکھا۔ وہ مہذب دنیا کا پہلا یورپی فرد تھا جس نے تقریباً تیرہ صدیوں تک باقی دنیا سے لاعلم رہنے والے اس آباد جزیرے کو دریافت کیا اور گم نامی میں چھپے نادر اور انوکھے موآئی مجسموں کو شہرتِ دوام بخشی۔

ایسٹر کی مناسبت سے جزیرے کا نام ایسٹر آئی لینڈ مشہور ہو گیا۔ لاکھوں سال کے آتش فشانی عمل سے تقریباً تکونی شکل میں تشکیل پانے والے اس جزیرے کو مقامی افراد اپنی زبان میں ''زمین کی ناف'' (Navel of the world) بھی کہتے ہیں۔ مقامی افراد یہاں موجود چٹانوں سے تراشے بلند و بالا مجسموں کو ''موآئی'' کہتے ہیں، جس کے معنی مجسمہ، بت یا مورتی کے ہیں۔

جزیرے کے الگ تھلگ ہونے کی بنا پر خلائی تحقیق کے امریکی ادارے ناسا (NASA) نے جزیرے میں فضائی مستقر قائم کر رکھا ہے۔ مقامی افراد کا خیال ہے کہ سمندر کی خاموشیوں میں گھرے جزیرے پر بلند و بالا موآئی مجسموں کی تخلیق یقیناً کسی دوسری دنیا کی خلائی مخلوق نے انجام دی ہوگی، چنانچہ ناسا نے ایک مرتبہ پھر شاید

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انہی خلابازوں کو کرۂ ارض پر خوش آمدید کہنے کے لیے ایسٹر آئی لینڈ کا مقام منتخب کیا ہے۔

ایسٹر آئی لینڈ پر تقریباً پندرہ سو سال تک پولی نیشیائی خطے کے مختلف مذہبی نظریات اور خیالات کے حامل قبائل آباد رہے ہیں۔ اسی بنا پر دنیا سے طویل عرصے تک الگ تھلگ رہنے کے باوجود یہ قبائل چھوٹے چھوٹے گروہوں کی شکل میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا بھی رہے ہیں۔ البتہ ثقافتی لحاظ سے یہ تمام گروہ ایک ہی سوچ کے مالک تھے، چونکہ ان قبائل کا مذہبی تانابانا زیادہ تر دیومالائی کرداروں کے گرد گھومتا تھا، لہٰذا مقامی لوگوں کی زبانی روایات کے مطابق اس جنگ و جدل کا بنیادی سبب مذہبی

نا اتفاقی ہی تھی، جس کی سب سے اہم وجہ مانا (MANA) دیوتا تھا، جو عزت، طاقت اور خوشحالی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

روایات کے مطابق جس کا تخلیق کردہ مجسمہ سب سے بلند ہوتا وہ ''مانا'' کی خوشنودی حاصل کر لیتا۔ یعنی مجسموں کی اونچائی عقیدت کا پیمانہ تھی۔ یاد رہے، پولی نیشیائی خطے کی مذہبی روایات میں چونکہ ابھی تک دیوتا کے سر اور چہرے ہی کو بزرگی کی علامت سمجھا جاتا ہے، لہٰذا اس وقت کے مذہبی گروہوں نے اپنے پیشواؤں کی ہدایت پر ''مانا'' دیوتا سمیت مختلف مذہبی راہ نماؤں اور علاقائی سرداروں کے دیوپیکر چہرے اور ناف تک کے مجسمے تخلیق کرنا شروع کر دیے۔ وہی جو آج موآئی مجسموں کی شکل میں پولی نیشیائی خطے کی ثقافت کا اہم ترین حوالہ بن چکے۔ ماہرین آثارِ قدیمہ کی تحقیق کے مطابق تیسری صدی عیسوی میں انسان نے اس جزیرے پر قدم رکھا تھا۔

موآئی مجسمے سنگ تراشی کے نادر و نایاب اسلوب یک تھوی (MONOLITHIC) کے شاہکار ہیں۔ اس اسلوب میں پتھر کے ایک ہی ٹکڑے پر بنا کسی جوڑ کے فن پارہ تراشا، کھودا، یا ابھارا جاتا ہے۔ یہ مجسمے چاروں طرف ساحلی کناروں پر اس طرح ایستادہ ہیں، جیسے جزیرے کی حفاظت پر مامور ہوں۔ تاہم دریافت کے وقت زیادہ تر مجسمے منہ کے بل گرے ہوئے تھے اور بیشتر کی گردنیں ٹوٹی ہوئی تھیں، جن کی تعداد پچاس کے لگ بھگ تھی۔ بعدازاں ان مجسموں کو طویل عرصے میں مرمت کر کے ماہرین کی نگرانی میں دوبارہ اپنے مقام پر کھڑا کیا گیا۔ جزیرے میں مجموعی طور پر دریافت شدہ مجسموں کی تعداد ۸۸۷ ہے۔ تمام مجسمے مردوں کے تصوراتی چہروں کے بجائے حقیقی انسانی چہروں کی نقل ہیں۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ دریافت شدہ کسی بھی مجسمے کی ٹانگیں اور ناف سے نیچے کا دھڑ نہیں بنایا گیا۔

۹۵ فیصد موآئی مجسمے ۴۰ ہزار سالہ قدیم آتش فشاں پہاڑ سے خارج شدہ لاوے اور سخت چٹانوں میں تبدیل ہونے والی راکھ (Tuff) استعمال کر کے بنائے گئے۔ جزیرے کے جنوب مغرب میں واقع اس مقام پر ابھی بھی پہاڑ کی ڈھلوانی سطح پر ۳۹۷ مجسمے تیار حالت میں پڑے ملے ہیں، جو شائد اپنے مطلوبہ مقام پر منتقل نہ کیے جا سکے۔ ان تمام مجسموں کا دھڑ چھاتی تک زمین سے باہر ہے جبکہ دھڑ کا بقیہ حصہ ناف تک زمین میں پیوست ہے۔

جزیرے میں پھیلے تمام مجسموں کی اوسط اونچائی ۱۳ فٹ اور وزن ۱۴ ٹن ہے۔ ایک مجسمہ ایسا بھی پایا گیا جس کی لمبائی ۷۲ فٹ اور وزن ۱۸۵ ٹن کے لگ بھگ ہے۔ ان تمام مجسموں میں صرف ایک مجسمہ ایسا ہے جس کے چہرے پر ڈاڑھی تراشی گئی ہے۔ دریافت شدہ مجسموں



میں مخصوص انداز میں بنے ایسے مجسمے بھی ملے ہیں جن کے سروں پر پگڑی، سر بند یا ٹوپی جیسے گول پتھر رکھے گئے تھے۔

۱۷۲۲ء میں جب جزیرہ دریافت ہوا، اس سے قبل ایسٹر آئی لینڈ مکمل طور پر دنیا کی نظروں سے اوجھل تھا۔ مقامی قبائلی افراد ''راپانیو'' کے علاوہ کسی نے بھی یہاں قدم نہیں رکھا تھا، اور نہ ہی کسی قسم کے آہنی اوزار یا دوسری مشینری کی موجودگی کا تصور تھا۔ ان قوی ہیکل مجسموں کو جس مقام پر تخلیق کیا گیا، وہ آتش فشاں پہاڑ کے دہانے کی اندرونی ڈھلوان ہے، اس ڈھلوان سے بھاری بھرکم مجسموں کو باہر لانا اور پھر بظاہر بغیر کسی بیرونی مدد کے جزیرے کے کناروں پر لا کر زمین میں کھڑا کرنا ابھی تک سربستہ راز ہے۔

(عتیق احمد عزمی)

## چوتھا رنگ

### ایران..... واحد پُرسکون جزیرہ

آج سے ۳۰ سال پہلے خود کو سائرس اعظم کا وارث کہنے والا شاہ اپنے تمام جاہ و جلال، محلات اور سلطنت چھوڑ کر یوں فرار ہوا کہ دوبارہ اسے وطن کی مٹی دیکھنی بھی نصیب نہ ہوئی۔ مگر یہ تو اختتام تھا، اس سے صرف دو چار سال پہلے یہی شاہ بزعم خود عظمت کے سنگھاسن پر مسند آرا تھا۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی کی ایک صبح وادی پاسارگاہ میں ہزاروں لوگ جمع تھے۔ ایک شاندار جشن شاہی منایا جانے والا تھا۔ سائرس اعظم کی قبر سے کچھ فاصلے پر ایک چبوترا بنایا گیا جس کے آگے ٹی۔ وی کیمرے اور روشنیاں نصب تھیں۔ اچانک پوری وادی ہیلی کاپٹر کے پروں کے شور سے گونجنے لگی۔ دروازہ کھلا اور شاہ معظم شہنشاہ محمد رضا شاہ پہلوی آریا مہر زرق برق لباس میں اُترے۔ شہنشاہِ ایران نے وزراء کے جلو میں چبوترے کا رخ کیا اور سائرس کی قبر کی طرف منہ کر کے بلند آواز میں گویا ہوئے ''اے کوروش اعظم! اے باشاہوں کے بادشاہ، اے اخامنشی

یہ شاہِ ایران کا نکتۂ عروج تھا۔ مارچ ۱۹۵۰ء میں پاکستان کا پہلا دورہ کرنے والا محمد رضا شاہ جو امور مملکت جاننے اور سیکھنے آیا، اب دو عشروں بعد بزعم خود دنیا کا ذہین ترین حکمران بن چکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ڈھائی ہزار سالہ شہنشاہیت کا وارث اور امین ہے۔ امریکی اس کی پشت پر تھے اور عرب صحافی برملا شاہ کو مشرق وسطیٰ میں امریکہ کا پولیس مین قرار دیتے۔ شاہ کا دعویٰ تھا کہ اس نے ایرانیوں کو جدید اور مہذب دنیا سے روشناس کرایا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ عوام کو وہ سب کچھ میسر ہے جس سے مغربی دنیا کے بہت سے باسی بھی محروم ہیں۔ شاہ ایران کو ایک دن سوجھی کہ اپنے ملک کو مزید قدیم بادشاہت بنایا جائے۔ اس نے کیلنڈر میں ایک ہزار پینتیس برسوں کا اضافہ کردیا۔ یہ عجیب وغریب اقدام ایرانیوں کی اکثریت کو نہ بھایا۔ آخر صرف سات برسوں بعد اسے منسوخ کرنا پڑا۔

جب آیت اللہ خمینی نے شاہ کے خلاف آواز اٹھائی تو انھیں جلا وطن کردیا گیا۔ شاہ کی حکومت کا خیال تھا کہ امام خمینی کی جبری جلا وطنی سے انھیں اپنی مرضی کا منظر نامہ ترتیب دینے میں مدد ملے گی۔ باہر جا کر امام کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوگیا۔ اب اعتدال پسند اور مغرب سے

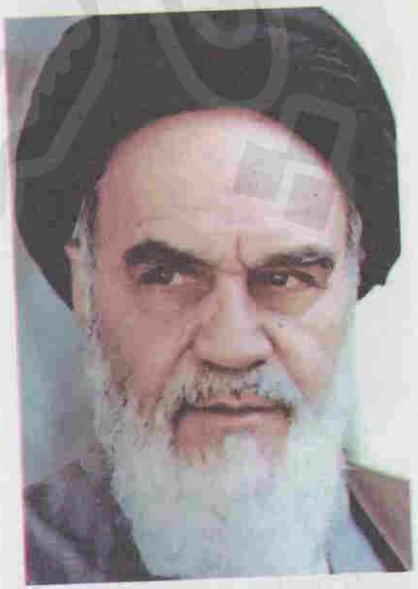

متاثر حلقے میں بھی ان کی آواز پہنچنے لگی۔ امام خمینی کے خط اور کیسٹیں ایران میں خفیہ طور پر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتی رہیں۔ جلد ہی ہر گلی اور ہر کوچے سے مرگ بر شاہ کی آواز آنے لگی۔ روزانہ جلوس نکلتے، پولیس کا لاٹھی چارج اور پھر گولیاں بھی مظاہرین کو نہ روک سکیں۔

تحریک آگے بڑھتی رہی، مگر شاہ اور اس کی پشت پناہ امریکی حکومت اس سے بے خبر تھی۔ ۱۹۷۸ء کے آخر میں ایک امریکی اخبار نے سی۔ آئی۔ اے کے ماہرین کا تجزیہ شائع کیا۔ اس کے مطابق ''ایران میں کہیں انقلاب ہے نہ آغاز انقلاب کے کوئی آثار۔'' اسی اخبار میں امریکہ کے ایک اور باخبر محکمے کی پیش گوئی بھی شائع ہوئی کہ اگلے دس برسوں تک شاہ کو ایران سے کوئی مائی کا لال نہیں ہٹا سکتا۔ اس سے کچھ پہلے خود امریکی صدر جمی کارٹر کہہ چکے تھے کہ مشرق وسطیٰ کے پرشور سمندر میں ایران واحد پرسکون اور خاموش جزیرہ ہے جہاں تلاطم کے کوئی آثار نہیں۔ ادھر امریکی اور ایرانی حکومتی ماہرین کے تجزیوں سے بے نیاز ایرانی عوام مسلسل آگے بڑھتے گئے۔ چند ماہ کے دوران درجنوں حکومتیں بدلی گئیں مگر حالات قابو میں نہ آسکے۔

آخر وہ دن آہی گیا۔ جنوری میں امریکی ترجمان کا بیان آیا: ''شاہ کے بہی خواہ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ شاہ کو ملک چھوڑ کر چھٹی پر چلا جانا چاہیے۔'' سولہ جنوری کو دو بجے ریڈیو کی خبروں میں اچانک اعلان کیا گیا: ''شہنشاہ آج دوپہر ایک بج کر تیس منٹ پر تہران سے روانہ ہوگئے۔'' یوں ایران کی ڈھائی ہزار سالہ بادشاہت جس کا پہلا بادشاہ سائرس اعظم اور آخری محمد رضا شاہ پہلوی تھا، اپنے انجام کو پہنچی۔ شاہ ایران سینتیس سال حکومت کرنے کے بعد ایران کے عوام کے لیے قصۂ پارینہ بن گیا۔

(محمد عامر خاکوانی)

## پانچواں رنگ

## امریکہ میں گزرے چند دن

امریکہ کا کیپیٹل ہل یقیناً اپنی خوبصورتی، صناعی اور مہارت کا بڑا شاہکار ہے جب کہ اس کے مقابل لائبریری آف کانگریس، جس کا دنیا کی بڑی لائبریریوں میں شمار ہوتا ہے، دیکھ کر دل اور دماغ میں علم کے سوتے



پھوٹنے لگتے ہیں۔ لائبریری آف کانگریس کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ امریکہ میں اب تک چھپنے والی تمام کتابیں اس لائبریری میں موجود ہیں۔ جو سیاح لائبریری دیکھنا چاہے، اسے استقبالیہ پر ایک کاغذ دیا جاتا

ہے جس میں آدھ گھنٹے سے لے کر تین گھنٹے کے دورانیے کے لیے مصروفیات کی تفصیل درج ہوتی ہے کہ وہ اپنے قیمتی وقت کو کیسے استعمال کرے اور کیا چیزیں دیکھنا نہ بھولے۔ میں پرشکوہ لائبریری دیکھنے کے بعد مرکزی راہداری میں چوبی نشست پر بیٹھ گیا اور اس کی خوبصورتی تکنے لگا۔ بیسیوں فٹ اونچی چھت پر دنیا کے عظیم مفکروں اور دانش وروں کے نام لکھے دیکھے لیکن ان میں کوئی بھی مسلم نہیں تھا۔

امریکہ میں یہ بات مشہور ہے کہ اگر آپ تنہائی محسوس کریں اور دوستی کرنا چاہیں تو کتے سے بڑھ کر آپ کا کوئی رفیق نہیں۔ امیر اور متوسط امریکی دونوں کے ہاں شوق یکساں ہیں۔ امریکی مرد ہو یا خوبصورت خاتون ،چہل قدمی کرتے ، بازاروں میں چلتے کشادہ دلی اور مسکراہٹ کے ساتھ آپ کو سلام کرتے ہیں۔ امریکی دن بھر اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ ہفتہ وار تعطیل میں نوجوانوں کے دم سے ہی شبینہ کلبوں میں رونقیں ہوتی ہیں۔ نوجوانوں کی اکثریت اپنی نوکری، محبوبہ اور اپنے پیشہ ورانہ کام کے علاوہ دنیا کے بارے میں کوئی معلومات نہیں رکھتے۔ شبینہ کلبوں کی نرم و دل گیر ہلکی سرخ روشنی، موسیقی کے شور، بیئر کے خمار اور شراب کی مستی کے بعد دنیا کے مسائل سے کیسے دل چسپی رہ سکتی ہے تاہم کھانے پینے کی اشیا سے لے کر اشیائے ضروریہ پر بڑھتے ٹیکسوں سے امریکی عوام کی کمر جھک چکی ہے اور انھیں صرف یہی پریشانی لاحق رہتی ہے۔

اگرچہ عوام کے دلوں میں کسی کے خلاف کوئی کینہ، کدورت یا بغض نہیں اور وہ لوگ جلد دوست بن جاتے ہیں۔ میرے لیے یہ بات باعثِ حیرت تھی کہ مجھے کئی عام امریکیوں نے جن میں پروفیسر، انجینئر، صحافی مرد وخواتین شامل تھے، کئی بار پرخلوص کھانے کی دعوت دی۔ میں نے انھیں بتایا کہ ہم لوگوں کو اپنی مہمان نوازی پر فخر ہے اور جب کبھی ہم دوست کنجوسی کا مظاہرہ کریں تو ہم اس کنجوس محفل کو امریکی محفل کہتے ہیں، پھر ہر شخص اپنے کھانے کی قیمت خود ادا کرتا ہے۔ یہ سن کر امریکی قہقہے لگاتے۔ امریکی سفید فام، سیاہ فاموں کے بارے میں زیادہ اچھی رائے نہیں رکھتے۔ جس علاقے میں سیاہ فام کاروبار شروع کردیں، اس علاقے کی ساکھ کا حال پاکستانی معیشت جیسا ہوجاتا ہے۔ امریکہ میں بسنے والے پاکستانی بھی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اکثر کالوں کے اطوار کے بارے میں شکایت کرتے ہیں۔

میں نے واشنگٹن سے ورجینیا، ورجینیا سے نیویارک اور نیوجرسی تک کا سفر کئی بار ریل اور بس کے ذریعے کیا۔ آپ گھر بیٹھے آن لائن اپنی نشست محفوظ کرائیں یا اسٹیشن سے ٹکٹ خریدیں۔ دورانِ سفر انٹرنیٹ، وائی فائی کے ذریعے اپنے شغل میں مصروف رہیں۔ امریکہ میں موٹرویز کا شاندار جال بچھا ہوا ہے۔ قدرت نے اسے جنگلات اور پانی کی لازوال قدرتی دولت سے بھی نواز رکھا ہے۔ جنگلات کا بہترین مصرف یہ ہے کہ زیادہ تر شاندار گھر بھی سردی سے بچاؤ کے لیے لکڑی سے بنائے جاتے ہیں جبکہ پانی کا بہترین مصرف بجلی کا حصول ہے۔ وہ کئی ہزار میگاواٹ بجلی ضائع کر دیتے ہیں۔

امریکہ کا مشہور ٹائیسن (Tyson) خریداری مرکز دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ تب معلوم ہوا کہ سرمایہ داری نظام میں طبقۂ اشرافیہ کے لیے کتنی مہنگی چیزیں بنائی گئی ہیں جہاں ہزاروں ڈالر کے جوتے اور کپڑے موجود تھے اور لینے والوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ایک خریداری مرکز سے گزرتے ہوئے جگہ جگہ ''مساج سینٹر'' دیکھے۔ امریکی معاشرے میں ڈالر سخت محنت سے کمائے جاتے ہیں اور انسان دن بھر مشین کی طرح کام میں جتا رہتا ہے، کام کے دوران بیٹھنے کا تصور ہی نہیں لہٰذا یہاں اگر اس طرح کی مالش نہ کرائی جائے تو انسانی مشین کام کرنے کے قابل نہیں رہتی۔ یہ جان کر مجھے بے ساختہ تنویر سپرا کا یہ شعر یاد آیا ؎

اے رات مجھے ماں کی طرح گود میں لے لے
دن بھر کی مشقت سے بدن ٹوٹ رہا ہے

دولت دُگنی کرنے کے مرض نے امریکہ کو ہلکان کر رکھا ہے۔ جدید سرمایہ دارانہ نظام نے ملازمین (غلاموں) کو بلیک بیری، لیپ ٹاپ اور آئی پیڈ کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے اور انسانی جوہر کو سرمائے کے بیلنے میں پیل پیل کر اپنے سرمائے کا حجم بڑھاتا ہے۔ محنت کشوں کو مونگ پھلی کے دانے پر ٹرخا دیا جاتا ہے۔ اوسط امریکی زندگی بھر بینکوں کے قرض سے گھر گاڑی خریدتا اور معمولی عیاشی پر قناعت کرتا ہے۔ اس معاشرے میں انسانی قدر ''شے'' سے زیادہ نہ بڑھ سکی۔

امریکہ میں مقیم پاکستانی زیادہ تر پٹرول پمپوں، پیزا تیار اور فروخت کرنے والی دکانوں پر کام کرتے یا ٹیکسی چلاتے ہیں۔ تاہم امریکہ میں کام کرنے والے پاکستانی اور کشمیری وہاں کے معاشی نظام میں ڈھل چکے۔ انصاف اور امن و امان کی بہترین صورت حال نے انھیں آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔ ایک پاکستانی جو پیزا تیار اور فروخت کرنے والی کئی دکانوں کے مالک ہیں، نے بتایا کہ یہاں کے قوانین سخت ہیں۔ کھانے پینے کی اشیا میں ملاوٹ کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، غیر معیاری ہونے پر بھی کڑی سزائیں ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ تنازعات کا حل عدالتوں سے جلد ہو جاتا ہے اور ہفتوں کے اندر اندر انصاف ملتا ہے۔ جب ان سے میں نے سوال کیا کہ امریکی معاشرے میں اتنی خوبیاں موجود ہیں تو خامی کیا ہے؟ ان کا کہنا تھا کہ بس یہ کلمہ نہیں پڑھتے۔ (موصوف ارب پتی ہیں اور سؤر کے گوشت سے پیزا بناتے ہیں۔ ہر سال کروڑوں روپے کی زکوٰۃ نکالتے ہیں۔)

مجھے قیام کے دوران پاکستانی کمیونٹی کی جانب سے بڑی پاکستانی مساجد دیکھنے کا موقع فراہم کیا گیا۔ یہ مساجد مکمل اور کمیونٹی سینٹر زیادہ تھے۔ کھیل کے لیے بڑے بڑے کمرے مخصوص ہیں جہاں مسلمان بچے نماز کے بعد کھیلتے۔ تاہم مجھے یہ بات محسوس ہوئی کہ وہاں بھی مختلف مسالک کی مساجد قائم ہیں اور دوسرے مسلک کے لوگ مجبوراً وہاں نماز ادا کرتے ہیں۔ امریکہ میں مسجد کی تعمیر کے لیے زمین حاصل اور تعمیر کرنا بڑا کٹھن کام ہے جس کے لیے بہت سا سرمایہ درکار ہوتا ہے۔ مجھے بعض پاکستانیوں نے بتایا کہ جن علاقوں میں مساجد نہیں، وہاں عیسائیوں کے گرجا گھروں میں مسلمان نماز جمعہ اور عیدین کی نمازیں ادا کرتے ہیں۔



مجھے امریکہ میں کئی ایشیائیوں کے ساتھ ٹیکسی میں سفر اور بات چیت کا موقع ملا۔ ان میں بنگلہ دیش، پاکستان اور بھارت کے لوگ زیادہ ملے، جو ٹیکسیاں چلاتے ہیں۔ پاکستانیوں نے بہت خلوص سے اپنی زبان میں بات چیت کی اور اپنائیت کا مظاہرہ کیا لیکن ان تمام ملکوں میں ایک بات مشترک نکلی کہ سب نے میٹر بند کر کے مجھ سے ''ٹھیکا'' کیا اور زائد کرایہ وصول کیا۔ حالانکہ مجھے بتایا گیا کہ میٹر کے بغیر سواری سے کرایہ وصول کرنا قانوناً جرم ہے۔ شکایت پر ٹیکسی کا اجازت نامہ منسوخ کر دیا جاتا ہے، ٹیکسیوں پر شکایت کرنے کے لیے نمبر بھی لکھا ہوتا ہے۔

ایک دن ایک امریکی نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کو امریکہ میں سب سے زیادہ متاثر کس چیز نے کیا؟ میرا کہنا تھا کہ امریکہ کی خوبصورت ملنسار لڑکیاں، عمارات، تعمیرات اور حیران اس چیز نے کہ امریکہ میں بھی بھکاری ہیں۔

(عابد خورشید)

## چھٹا رنگ

# غرناطہ کے گلی کوچوں میں

۱۹۸۰ء میں غرناطہ کی سیاحت کے ایک دفتر میں مسلمانوں کے کسی مرکز کا پتا دریافت کرنے گیا۔ ایک بڑے بوسیدہ سے رجسٹر کو الٹ پلٹ کرنے کے بعد وہاں پر موجود شخص نے مجھے ایک پتا لکھوایا۔ یہ پتا میں نے ایک ٹیکسی والے کو دکھایا اور وہ مجھے بہت سی پیچ در پیچ گلیوں سے گزار کر ایک گلی میں واقع ایک پرانے مکان پر لے گیا۔ مکان کے اندر داخل ہوا تو ایک بڑے تھال کے گرد دنیا کے مختلف ممالک کے تقریباً پندرہ افراد روایتی اسلامی لباس جبے اور قبائیں پہنے کھانے بیٹھے تھے۔ انہوں نے تعارف سے پہلے ہی مجھے کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دے ڈالی۔ میں بھی کھانے کے تھال کے گرد حلقہ باندھے مجمع میں شامل ہو گیا۔ اس مجمع میں برطانیہ کے انگریز، مراکش کے عرب اور خود غرناطہ کے نومسلم شامل تھے۔ مجھے حیرت ہوئی جب تعارف کے بعد ایک شریکِ محفل نے میرے ساتھ پشتو میں بات شروع کی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب پاکستان میں مکمل امن تھا اور ساری دنیا کے سیاحوں کے لیے سوات، پشاور اور افغانستان ایک جنت بنا ہوا تھا۔ اکثریت ان لوگوں پر مشتمل تھی جن کو عرف عام میں ہپی (Hippy) کہتے تھے۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ایک نومسلم ساتھی نے مجھے غرناطہ کی سیر کی دعوت دی اور کہا کہ گلی کوچوں میں پیدل چل کر مجھے زیادہ خوشی ہوگی، انھوں نے مجھے غرناطہ کی ایک خصوصیت یہ بتائی کہ سارے مکانات پر باہر سے سفیدی کرائی گئی ہے۔ یہ اسلامی دور کی یادگار ہے۔ دوسری خصوصیت اس نے یہ بتائی کہ کھڑکیوں کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اونچائی قد آدم سے اوپر ہے۔ یہ بھی مکانات میں روایتی پردے کے اہتمام کی باقی ماندہ علامتوں میں سے ہے۔

ہم غرناطہ کے گلی کوچوں سے ہوتے کھلی شاہراہ پر پہنچے۔ یہاں کئی جگہ میرے ساتھی نے راستے میں کچھ لوگوں سے دعا سلام کی اور مجھے یوں لگا جیسے میں مسلم اندلس میں گھوم رہا ہوں جہاں مسلمان اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ میرے ساتھی نے بتایا کہ غرناطہ میں اندلسی نومسلموں کی تعداد ۳۰۰ر ہے لیکن رات کے وقت جب ہم سڑکوں پر گھومتے پھرتے آپس میں ملتے اور دعا سلام کرتے ہیں تو اجنبیوں کو یوں لگتا ہے جیسے پورا شہر مسلم آبادی سے بھرا ہوا ہے۔

آپس میں گفتگو کرتے ہم کھانا کھانے کے لیے ایک ریستوران میں بیٹھ گئے۔ اندلسیوں کی سرزمین پر غرناطہ میں ایک مسلمان نوجوان کی رفاقت سے مسرت کے جذبات سے میرا دل ابل رہا تھا۔ میرا ساتھی مجھے بتا رہا تھا کہ اسلام پتھر کی طرح جامد وجود نہیں بلکہ یہ ایک ہرے بھرے درخت کی طرح زندہ وجود ہے۔ اگر اسے نچلے تنے سے بھی کاٹا جائے تو اس کی جڑوں سے نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ اندلسی نوجوان کو یقین تھا کہ اندلس کی سرزمین پر اسلام کے جس تناور درخت کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کی گئی تھی، وہ کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ اس درخت کی جڑیں اندلس کی سرزمین میں عمیق گہرائی تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس سے انشاء اللہ نئی شاخیں پھوٹیں گی اور برگ و بار لائیں گی۔ اندلسی نوجوان کا یقین اتنا راسخ تھا کہ مجھے اقبال کا یہ شعر یاد آنے لگا ؎

دانۂ راکہ درآغوش زمین است ہنوز
شاخ در شاخ و برومندو جوان منی بینم

(اس دانے کو جو ابھی زمین کی آغوش میں چھپا ہوا ہے۔ شاخ در شاخ اور ثمر بار اور جوان دیکھ رہا ہوں)۔

(قاضی حسین احمد)

## ساتواں رنگ

# سیئول (پاکستان کے لیے ایک مثال)

ہم سیئول شہر کے اہم تجارتی مرکز کے عین درمیان کھڑے تھے، شام رات میں ڈھل چکی تھی۔ ہر طرف لوگوں کا ازدحام تھا۔ کھوے سے کھوا چل رہا تھا۔ بازار میں اس قدر بھیڑ، یوں محسوس ہوتا تھا، گویا کوریا کی تمام آبادی خریداری کے لیے نکل کھڑی ہوئی ہے۔ لیکن خریداری کرنے والے صرف کوریائی باشندے ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر ملک کے چہرے پہچانے جا سکتے تھے۔ ہم اس کاروباری مرکز میں کھڑے بڑے مرکزِ خریداری کے سامنے اس ورلڈ فنانس سینٹر کو تلاش کر رہے تھے، جس کا ایک اچھا خاصا تعلق پاکستان کے سب سے بڑے شہر اور تجارتی مرکز کراچی سے تھا۔

۱۹۶۰ء کی دہائی میں جب پاکستانی معیشت زوروں پر تھی، اس کی صنعتی ترقی کی مثالیں ہر ملک اور پڑھے لکھے فورم پر دی جاتی تھیں۔ جنوبی کوریا کے ماہرین اقتصادیات پاکستانی ترقی کی رفتار اور انداز سے اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ اس پانچ سالہ منصوبے کے مطالعے کے لیے اسلام آباد آئے، ملک کے شہر شہر پھرے اور سب کچھ دیکھ کر انھوں نے اس پانچ سالہ منصوبے کی طرز پر جنوبی کوریا میں بھی معاشی منصوبہ بندی کا فیصلہ کیا۔ خصوصاً جب انھوں نے کراچی کی پُررونق فضا، یہاں کا سکون اور کاروباری انداز دیکھا تو یہ بھی فیصلہ کیا کہ اپنے دارالحکومت سیئول کے مرکزی تجارتی مرکز کو کراچی کی طرز پر بنائیں گے اور اس کا نام ''ورلڈ فنانس سینٹر'' رکھیں گے۔ جنوبی کوریا نے یہ دونوں منصوبے مکمل کیے۔ یعنی سینٹر بھی بنایا اور پانچ سالہ منصوبے کی طرز پر انتہائی تیز رفتار ترقی کی اور شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ آج جنوبی کوریا کا نام اقتصادی دنیا میں ترقی اور استحکام کے ہم پلہ ہے۔

دنیا کے کئی عظیم شہروں کی طرح سیئول بھی ایک بڑے دریا پر واقع ہے۔ یہ شہر تقریباً چھ سو مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے۔ اسے دریائے ہین (Han) نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ دونوں حصے دریا کے کنارے واقع ہیں۔ شہر ایک بلند پہاڑی پر ہے اور باہر سے دیکھنے سے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے وادی کاٹ کر اسے تعمیر کیا گیا۔ دریائے ہین اب کشتی رانی کے لیے استعمال نہیں ہوتا جبکہ پہلے یہ دونوں کناروں کے درمیان سفر کا اہم ترین ذریعہ تھا۔ جنوبی کوریا کی بڑھتی ٹیکنالوجی نے ایک اور زبردست کارنامہ انجام دیا۔ سات مختلف جگہوں پر دریا کے نیچے ''انڈر پاسز'' تعمیر کیے گئے ہیں، جو دریائے ہین کی چوڑائی کے مطابق اکثر جگہوں پر بارہ کلومیٹر طویل ہیں۔ ان ''انڈر پاسز'' سے گزرنا ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ یہ زیرِزمین سرنگیں مکمل طور پر روشن رہتی ہیں اور ذرا ذرا سے فاصلے پر خطرے سے نمٹنے کے لیے ضروری سامان بھی موجود ہے۔

سیئول ہوائی اڈے سے شہر تک کا راستہ شاید ہی کسی یورپی یا امریکی شہر کی تعمیر و ترقی سے کم ہو۔ چونکہ تعمیرات بالکل نئی تھیں، اس لیے ان کا حسن اور چمک عجیب تاثر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دے رہی تھی۔ مرکزی شاہراہوں سے گزرتے ہوئے سیئول کا پہلا تعارف حاصل کیا۔ تیس، چالیس منزلہ عمارت نظر آنا عام سی بات ہے، شہر میں گاڑیوں کی آمدورفت زیادہ تھی لیکن روانی اور نظم وضبط غضب کا تھا۔ ہمیں بعد میں بتایا گیا کہ کوریائی حکام نے بڑے بڑے شہروں خاص طور پر لندن، نیویارک، پیرس، برلن وغیرہ کے نظامِ آمدورفت کا بغور جائزہ لیا کیونکہ وہ سیئول کو ایک بڑا اور اہم عالمی تجارتی مرکز بنا رہے تھے۔ سیئول میں نظام آمدورفت کی تعطلی کی کیفیت انتہائی پرہجوم اوقات میں بھی کم کم ہی دیکھنے میں آئی کیونکہ ہر علاقے میں متبادل راستے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ سیئول کے زیرِزمین راستے کا دنیا کے مصروف ترین زیرِزمین ریلویز میں شمار ہوتا ہے۔

دنیا کے تمام بڑے شہروں کے رواج کے مطابق سیئول شہر درحقیقت ایک ''میگا سٹی'' ہے، جس کی آبادی ایک کروڑ سے زیادہ ہے لیکن ہمیں یہ کچھ زیادہ محسوس نہیں ہوئی، کیونکہ اول تو یہاں کا شہری نظام انتہائی منظم ہے، انھوں نے آبادی کے اضافے کو شہر کے پھیلاؤ کے ساتھ منسلک کردیا ہے۔ یعنی آبادی بڑھنے کے ساتھ شہری سہولتوں، مثلاً شاہراہوں کی تعمیر، فلائی اوورز اور سب سے بڑھ کر مکانات میں اضافے کو ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے۔ سیئول دنیا کے دس بڑے شہروں میں شامل ہے، لیکن جنوبی کوریا کی کل آبادی کا جو ہمیں ڈھائی کروڑ سے کچھ زائد بتائی گئی، نصف سے زیادہ اس پر کسی نہ کسی طور پر انحصار کرتا ہے۔ ۱۹۶۰ء کا زمانہ گزر چکا اور یہ ۲۰۱۱ء ہے۔ ہمارے خیال میں اب ہمیں چاہیے کہ ہم بھی اپنا احتساب کرتے ہوئے کوریا کی مضبوط، مستحکم اور عوام شناس اقتصادی پالیسیوں پر غور کریں۔

سیئول شہر کی تاریخ تقریباً دو ہزار سال پر محیط ہے یعنی یہ ایک انتہائی قدیم شہر ہے۔ ۱۹۶۰ء تک یہ ایک پرانا شہر تھا، جہاں مچھیروں اور چھوٹے تاجروں کی بہتات تھی، کراچی کی طرح۔ لیکن آج یہ ایک بین الاقوامی شہر بن چکا یعنی قدامت سے جدیدیت کے درمیان کل پچاس سال کا قلیل وقفہ ہے۔ شاید ہی کوئی ملٹی نیشنل کمپنی ہو، جو یہاں موجود نہیں، اس کے اپنے ادارے سام سنگ، ایل جی اور ہنڈائی دنیا کے عظیم اداروں میں شمار ہوتے ہیں۔

سیئول کا فضائی جائزہ لینے کے لیے ہم ساتھیوں کے ہمراہ شہر سے کوئی پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع سیئول ٹاور پہنچ گئے۔ یہ ایک بلند پہاڑی پر بنایا گیا ہے اور اس پر جانے کا راستہ بھی پہاڑی کاٹ کر بنایا گیا۔ جو ایک چھوٹے سے جنگل کے درمیان سے گزرتا ہے۔ سیئول ٹاور حسبِ معمول کوریائی ٹیکنالوجی سے مزین ہے۔ انتہائی اعلیٰ درجے کی خودکار کمرانما لفٹیں، منزل بہ منزل ریستوران، پھر آخری منزل، جو ایک سو فٹ سے زیادہ بلندی پر واقع تھی، شہر کا نظارہ کرنے کے لیے بہترین معیار کی دوربینیں، جن سے پورا سیئول شہر سامنے تھا۔ شہر کی وسعت، بلند و بالا عمارتیں، دریا، پہاڑیاں، بازار، دفاتر، حد یہ کہ وہاں چلتے پھرتے لوگ بھی سامنے تھے۔ اتوار کا دن تھا اور سیئول ٹاور پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ اقتصادی طور پر مضبوط ملکوں کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ نہ صرف ان کے شہری کام کے پانچ دنوں میں دل لگا کر کام کرتے اور پیسہ کماتے ہیں بلکہ تعطیل کے دن کو چھٹی کی طرح مناتے بھی ہیں۔ یعنی بھرپور سیر وتفریح جس کے دوران ان کے کھلتے چہروں اور مچلتی امنگوں سے ملک کی خوش حالی ظاہر ہوتی ہے۔

سیئول کے سب وے نظام کا ذرا تفصیل سے ذکر نہ کرنا زیادتی ہوگی کہ یہ کسی بھی ایشیائی شہر کا سب سے بہترین زیرِزمین ریلوے نظام ہے۔ سیئول میں داخل ہونے سے لے کر روانگی تک، جو احساس ذہن پر پوری طرح چھایا رہا، وہ ٹیکنالوجی کی تکرار تھی، یوں محسوس ہوتا، گویا اس شہر میں ہر چیز، حد یہ کہ انسان بھی ٹیکنالوجی کے تحت چل رہے ہیں۔ غالباً یہ جنوبی کوریا کی انتہائی تیز رفتار ترقی کا کرشمہ ہے۔ صرف ڈھائی کروڑ آبادی سے دنیا کی پہلی دس اقتصادی قوتوں میں شامل ہونا جبکہ ان کے پاس

کوئی خاص معدنیات جیسے تیل یا سونا وغیرہ بھی نہیں، محض اپنے فن و ہنر، تعلیم و تربیت اور محنت وجدت سے مختصر مدت میں لینے والے کے بجائے دینے والا ہاتھ بن جانا، کوئی معمولی کارنامہ نہیں اور وہ بھی ایک ایسی پس ماندہ ایشیائی قوم کے لیے، جو نہ تو اپنی تاریخ پر فخر کر سکتی ہے اور نہ ہی تہذیب پر لیکن اس کی موجودہ اور آنے والی نسلیں یقیناً اس معاملے میں کسی بھی قوم سے کمتر نہ ہوں گی۔

ہم نے اس غیر معمولی کارنامے کی کچھ جھلکیاں اس وقت دیکھیں جب دیوہیکل ملٹی نیشنل سام سنگ کے صدر دفتر اور اس کے صنعتی علاقے کا دورہ کیا۔ سام سنگ کا شمار دنیا کی پہلی پانچ عظیم ملٹی نیشنل کمپنیوں میں ہوتا ہے اور صرف محاورتاً نہیں، وہ حقیقت میں سوئی سے لے کر جہاز کے انجن اور ایٹمی پلانٹ کے پرزہ جات تک بناتا ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی چھوٹا بڑا گھر ہو جہاں برقی اشیا استعمال کی جاتی ہوں اور اس کے نام کی پہچان نہ ہو۔ اس کے پاس بیک وقت معیار اور تعداد موجود ہے۔ ہم نے خاص طور پر وہ شعبہ دیکھا جس میں آنے والے کل کی مصنوعات رکھی گئی تھیں۔ اندازہ ہوا کہ قومیں، جو آج اور کل کی لیڈر ہوں گی، وہ صرف اپنے قدرتی وسائل اور افرادی قوت کی برتری کا ڈھنڈورا ہی نہیں پیٹتیں بلکہ تعلیم و تحقیق میں خاموشی و لگن سے مصروفِ عمل ہیں۔

ہماری قیام گاہ سے اسی کلومیٹر کے فاصلے پر سیئول کا نیا ہوائی اڈہ تھا۔ ہم نے روانگی کے وقت ایک وین کرائے پر حاصل کی اور صبح آٹھ بجے ہی روانہ ہوگئے کہ پرواز ایک بجے تھی۔ شہر سے نکلتے ہی اندازہ ہوا کہ سیئول کے اطراف کتنے حسین مقام واقع ہیں۔ سال بھر بارش کا موسم، معتدل آب و ہوا اور پھر پہاڑی مقام سب نے مل کر علاقے کو عجب حسن عطا کیا تھا۔ سڑک کے دونوں کناروں پر جنگلات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ، جگہ جگہ پھول اور پودوں کی بہتات، گویا تمام سفر تازگی کا سفر بن گیا۔ سیئول کا نیا ہوائی اڈہ لینچون ہے۔ یہیں سے اب تمام بین الاقوامی اور اندرونِ ملک پروازیں آتی جاتی ہیں۔ سیئول سے ٹوکیو تک آپ کو مال اور تجارت کے سوا شاید ہی کوئی دوسرا موضوع ملے، اسی لیے اس علاقے کے دوسرے ہوائی اڈوں کی طرح سیئول کے اس ہوائی اڈے پر بھی تاجروں کی بہتات تھی۔ سیئول میں سیاح کم اور تاجر زیادہ آرہے تھے۔ ہر ایک کے کان سے سیل فون لگا تھا اور ایکسپورٹ امپورٹ کے جانے پہچانے الفاظ کانوں میں بار بار سنائی دے رہے تھے۔

دو گھنٹے تک ہم ہوائی اڈے ہی کے نظارے دیکھتے رہے۔ لینچون ہوائی اڈہ یقیناً دنیا کے مصروف ترین ہوائی اڈوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ بلاشبہ خطے میں شاید ہی کوئی اور اس کی وسعت اور خوب صورتی کا مقابلہ کر سکے کہ گزشتہ پانچ برسوں سے اسے ہی دنیا کا بہترین ہوائی اڈہ مانا جارہا ہے۔ ترقی، تیز رفتاری اور ٹیکنالوجی کی وہ تکرار جو تسلسل سے پورے دورے کے دوران بصر میں گھومتی رہی، واپسی کے سفر تک بھی معدوم نہ ہوئی، بلکہ آج بھی آنکھوں میں کسی گہرے نقش کی طرح جمی بیٹھی ہے۔

(منور مرزا)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مستقبل کا منظر نامہ دکھانے والے

سجاد احمد

# رس انقلابی تصورات

مزاج شناس ٹی وی آپ کا مزاج سمجھ کر خود ہی مطلوبہ پروگرام حاضر کر دے گا

آنے والے سالوں میں آپ "ضمیر ماپ پیما" دیکھنے والے ہیں

انسان اور مشین کا ادغام حقیقت بن رہا ہے

جو جلد یا بدیر عملی جامہ پہن کر ہماری زندگیوں میں مزید آسانیاں پیدا کریں گے

موبائل فون، انٹرنیٹ، برق رفتار ریل..... یہ اور ایسی ہی دورِ جدید کی کئی اشیا ساٹھ ستر سال پہلے کے زمانے میں پہنچ جائیں تو لوگ انھیں عجوبہ بلکہ شاید کوئی خطرناک شے سمجھیں لیکن آج پانچ چھ سال کے بچے بھی خود اعتمادی سے انھیں برتتے ہیں۔

ساٹھ ستر برس قبل سائنس و ٹیکنالوجی کی رفتار ترقی خاصی سست تھی لیکن اب بڑی تیزی سے نت نئی سائنسی و تکنیکی ایجادات سامنے آرہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب ایک نسل ہی ان ایجادات کو عملی شکل میں ڈھلتا دیکھ لیتی ہے جو پہلے محض تصور یا خیال تک محدود ہوں۔ ذیل میں ایسی ہی دس انقلابی اور بظاہر ناقابلِ یقین ایجادات کا تذکرہ پیش ہے جو عالمِ وجود میں آنے کے بعد ہمیں مزید سہولتیں دیں گی اور ہماری زندگیاں آسان بنائیں گی۔

## ۱۔ انسان اور مشین کا ادغام

انسانی جسم کا کوئی عضو مشینی بنانا اب مشکل نہیں رہا لیکن اس کے دھاتی حصے پر جلد جمانا (Grafting) بڑا کٹھن مرحلہ ہے۔ اسی عمل کو آسان بنانے کی خاطر یونیورسٹی کالج، لندن کے محققوں نے ہرن کے سینگوں کا باریک بینی سے مطالعہ کیا۔ انھوں نے دریافت کیا کہ جلد کی بافت (ٹشو) کے لمبے ریشے سینگوں کی بھربھری ہڈی میں پیوست ہیں۔ یوں وہ اپنی جگہ اچھی طرح جم جاتے ہیں۔ مزید براں یوں جلد چاروں طرف سے سینگوں کو گھیر لیتی ہے اور انھیں چھوت (انفیکشن) ہونے کا خطرہ نہیں رہتا۔

مصنوعی مشینی اعضا عموماً کٹی جانے والی جگہ، ٹھنٹھ پر جمائے یا باندھے جاتے ہیں۔ چنانچہ مشینی ہاتھ کو حرکت دی جائے یا مشینی ٹانگ سے چلیں، تو ٹھنٹھ اور عضو کے درمیان رگڑ جنم لیتی ہے۔ یہی رگڑ پھر مختلف جگہ تکلیف پیدا کرتی ہے۔ اسی خرابی پر قابو پانے کے لیے یونیورسٹی کالج کے ماہرین نے ایک نئی تکنیک، Intraosseous Transcuntaneous Amputation Prosthesis ایجاد کر لی۔

اس تکنیک میں ٹائیٹینم سے بنی سلاخ براہ راست ہڈی میں گاڑی جاتی ہے۔ پھر مشینی عضو اس سلاخ سے جوڑا جاتا ہے۔ اس سلاخ کی سطح پر چھوٹے چھوٹے عضو ہوتے ہیں تاکہ متعلقہ جگہ کی جلد رفتہ رفتہ اس میں پیوست ہو جائے۔ یہ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ترکیب بھی ماہرین نے ہرن کے سینگ دیکھ کر سیکھی۔

یہ ایجاد اُس حیرت انگیز سائنسی شعبے، بائیومیکٹرونکس (Biomechatronics) کی ایک مثال ہے جو بتدریج نشوونما پا رہی ہے۔ یہ سائنس دراصل حیاتیات، میکانیات (مکینکس) اور الیکٹرونکس کا امتزاج ہے تاکہ معذوروں کے لیے مشینی اعضا تخلیق کیے جا سکیں۔

لیزرے گیون ماہر مستقبلیات اور یورپی کمیشن کی سائنسی مشیر ہیں۔ ان کا کہنا ہے ”یہ تو عیاں ہے کہ ترقی یافتہ مشینی اعضا معذوروں کو چلنے پھرنے اور کام کرنے کے قابل بنا دیں گے لیکن ایک وقت آئے گا کہ انسان ازخود فطری اعضا کٹوا کر مشینی اعضا لگوائے گا۔ وجہ یہ ہے کہ ان کی بدولت وہ مخصوص کام بہ سہولت کر سکے گا۔ یوں تب وہ مشینی انسان یا سائی بورگ بن سکتا ہے لیکن یہ عین ممکن ہے کہ معاشرے کے بعض طبقے ان نئی قسم کے انسانوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں۔“

## ۲۔ ہر شے میں ڈھلتا مادہ

مشہور ہالی وڈ فلم، ٹرمینیٹر میں ولن کو ایسی مائع دھات

سے بنا دکھایا گیا جو کسی بھی ٹھوس شے میں بدل سکتا ہے۔ ماضی میں یہ محض تصور تھا، مگر مستقبل میں حقیقت کا روپ دھار سکتا ہے۔ امریکی اور یورپی سائنس دانوں نے لیبارٹریوں میں ایسا ہی مادہ، ابتدائی خلیے (Protocells) تیار کر لیا ہے۔

گو یہ مادہ دھات سے نہیں بنا اور نہ ہی مذموم عزائم رکھتا ہے لیکن یہ حساسیت رکھتا ہے، حرکت کرتا، تبدیل ہوتا اور ایک دوسرے سے مل کر مختلف اشیا میں ڈھل سکتا ہے۔

ابتدائی خلیے ننھی منی شے ہیں جو لیبارٹری میں مخصوص سالمات ملا کر تخلیق ہوئے۔ ایک اعتبار سے وہ زندہ خلیوں کے قریب ہیں، وہ یوں کہ روشنی اور ایک دوسرے کی طرف بڑھتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ مردہ ہیں۔ دراصل مختلف سالماتی اجزا کی ترکیبوں سے ایسے متفرق خلیے بنانا ممکن ہے جو مختلف کام انجام دے سکیں۔ مثلاً ایسے ابتدائی خلیے تخلیق کیے جائیں جو عمارتی مسالے میں شامل ہو کر خطرناک سبز مکانی (گرین ہاؤس) گیس، کاربن ڈائی آکسائیڈ جذب کر سکیں۔ اس قسم کا روغن (پینٹ) اگلے تین چار سال میں ایجاد ہو جائے گا۔

## ۳۔ کینسر مار ذراتی عاجل

لیبارٹریوں میں ذراتی عاجل مشین Accelerator کے ذریعے مختلف ایٹموں کی رفتار انتہائی تیز کر کے انھیں باہم ٹکرایا جاتا ہے لیکن اب ماہرین چاہتے ہیں کہ اسی مشین کے ذریعے سرطان (کینسر) کا بھی علاج کیا جائے۔

ریڈیوتھراپی میں ایکسرے شعاعوں کے ذریعے کینسری خلیے جلائے جاتے ہیں مگر یہ شعاعیں اردگرد کی صحت مند بافتوں کو بھی جلا ڈالتی ہیں۔ اب محقق چاہتے ہیں کہ ذراتی عاجل کے ذریعے پروٹونوں اور کاربن آئینوں کی شعاعیں پیدا کی جائیں۔ یہ شعاعیں کینسری خلیوں کے ڈی این اے کو نشانہ بنائیں گی تاکہ وہ موت کا سفر شروع کر دیں۔ ذراتی عاجل سے نکلنے والی شعاع کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عین ہدف پر لگے گی، یوں اردگرد کی بافتوں کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ پھر یہ بھی ممکن ہو گا کہ طاقتور شعاع پھینکی جا سکے۔

کینسر مار ذراتی عاجل کی تحقیق سے وابستہ ڈاکٹر ٹومائیرز کہتے ہیں ”اس وقت ماہرین ایسا (ایٹمی) ذرہ تلاش کر رہے ہیں جس کی شعاع کینسری خلیے ختم کرنے میں سب سے زیادہ کارگر ثابت ہو۔“ یہ طبی سائنس ابھی بدستور زیر تحقیق ہے تاہم یورپ، امریکہ اور جاپان میں ایسی عمارتیں بننے لگی ہیں جہاں متعلقہ ذراتی عاجل رکھے جا سکیں۔



## ۴۔ سہ العبادی چھپائی

فرض کیجیے آپ کو انٹرنیٹ پر اپنے بچے کے لیے ایک جوتے کا ڈیزائن پسند آیا۔ اب آپ کو جوتا خریدنے کے لیے دکان پر جانے کی ضرورت نہیں، بس وہ ڈیزائن ڈاؤن لوڈ کیجیے اور اُسے سہ العبادی چھاپے خانے (3D Printer)



کو دے دیجیے۔ پھر اُسے متعلقہ سامان مثلاً چمڑا، کپڑا، گوند، دھاگہ وغیرہ فراہم کیجیے اور ایک گھنٹے میں بنا بنایا جوتا لے لیجیے۔

یہ منظر نامہ ابھی تو تصور ہے لیکن مستقبل میں حقیقت کا چولا پہن لے گا۔ تب ایسے سہ العبادی چھاپے خانے وجود میں آئیں گے جو متعلقہ مواد کے ذریعے ہر وہ شے بنا سکیں گے جنھیں ہم عام استعمال میں لاتے ہیں، مثلاً جوتے، عینک، قلم، آئینہ، پلیٹ، گلاس وغیرہ۔ ان چھاپہ خانوں کی خاصیت یہ ہو گی کہ ہم اپنی مرضی اور سہولت کے مطابق یہ اشیا تخلیق کریں گے۔

ان چھاپہ خانوں کی اہمیت دنیائے طب میں واضح ہو گی۔ تب ممکن ہو گا کہ ان انوکھی مشینوں کو متعلقہ سامان (خام مال) فراہم کریں اور وہ کنٹیکٹ لینز یا ٹائٹینیم سے بنے دھاتی اعضا تیار کر دیں۔ یوں زخمی ہونے کی صورت میں انسان فوراً گھر بیٹھے زندگی بچاؤ اشیا تیار کر لیں گے اور قیمتی جانیں ضائع نہیں ہوں گی۔

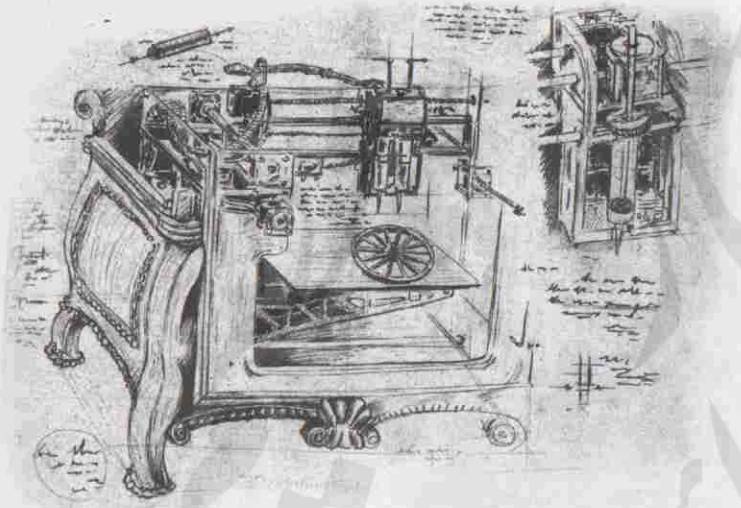

## ۵۔ حاضر کمپیوٹنگ

روزمرہ استعمال کی ہماری عام اشیا میں سینسروں (Sensors) کی موجودگی بڑھ رہی ہے۔ مثلاً اب لباس میں سینسر لگائے جاتے ہیں تاکہ وہ ہماری صحت کی حالت نوٹ کر سکیں۔ اسی طرح کاروں میں لگے سینسر اندرونی درجہ حرارت نوٹ کرتے ہیں۔ ماہرین کی رو سے سینسر حاضر کمپیوٹنگ (Ubiquitous Computing) کے اولین فرستادہ ہیں۔ آنے والے دور میں سینسروں سے بھی زیادہ حساس آلات بنیں گے جو تقریباً ہر شے میں نصب ہوں گے۔ یوں تب حاضر کمپیوٹنگ واقعی ہر جگہ موجود ہو گی۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مستقبل میں تو یہ بھی ممکن ہوگا کہ حساس آلات بولنے چالنے کے قابل ہو جائیں۔ مثلاً گھر کا فریج آپ کو موبائل پر یہ پیغام بھجوائے کہ دودھ ختم ہو گیا ہے یا پھر کوئی حادثہ ہو تو آپ کی کار فوراً ایمرجنسی کو مطلع کر دے۔ امریکہ میں ایم۔آئی۔ٹی میڈیا لیب کے ڈائریکٹر کمپیوٹنگ، میخائل بلیشاس کہتے ہیں کہ اگلے دس برس میں اسی قسم کے سینسر آ جائیں گے۔

بعد ازاں مشین اور انسان کو مدغم کرنے کی کوشش ہوگی تاکہ دونوں نیٹ ورک کا حصہ بن جائیں۔ تب سینسر ہمارے دماغ میں نصب ہوں گے اور مختلف کاموں کے سلسلے میں ہم سے گفت و شنید کریں گے۔ تاہم ایسا مشینی انسان سامنے آنے میں ایک سو سال لگ سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت ممکن ہوگا کہ انسان پلک جھپکنے میں اہم فیصلے کر سکیں کیونکہ تب ہماری ذہانت بہت بڑھ جائے گی۔

## ۶۔ حیاتیاتی چار......صاف ایندھن

پچھلے تین سو برس میں انسانوں نے درخت کاٹنے، رکازی ایندھن جلانے اور زمین کھودنے کے ذریعے فضا میں "۳۵۰ ارب ٹن" کاربن ڈائی آکسائیڈ بھجوائی ہے۔ اس مقدار کے وزن کا اندازہ یوں لگائیے کہ یہ سوا نو کروڑ ایئربسوں ۳۸۰/ایس کے برابر ہے۔ چنانچہ اب پوری دنیا میں سائنس دان ایسے طریقے تلاش کر رہے ہیں جن کے ذریعے مستقبل میں کم سے کم کاربن ڈائی آکسائیڈ فضا میں جائے۔

ایک طریقہ کار "کاربن علیحدگی" "Sequestering" ہے۔ اس طریقے میں کاربن ڈائی آکسائیڈ زیر زمین مقید کی جاتی ہے لیکن گیس کو زیر زمین پہنچانا بڑا مہنگا اور ایندھن خرچ عمل ہے۔

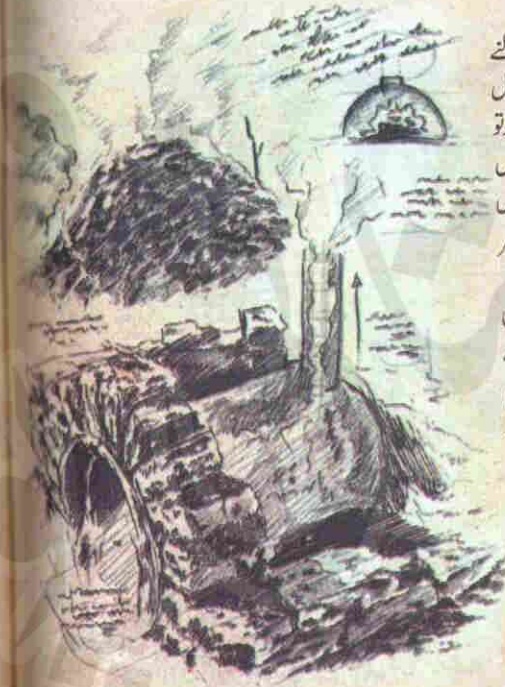

اب ماہرین نے دریافت کیا ہے کہ "حیاتیاتی چار" (Biochar) جلایا جائے، تو یہ کاربن ڈائی آکسائیڈ



خارج نہیں کرتا، بلکہ اُسے ہزاروں برس کے لیے مٹی میں دبا دیتا ہے۔ حیاتیاتی چار دراصل کوئلے (کاربن) کی ایک قسم ہے تاہم اب تک اسے بطور ایندھن استعمال نہیں کیا گیا۔ یوں اب اس نئے ماحول دوست ایندھن کو استعمال میں لانے کے لیے مغرب میں مطلوبہ اقدامات کیے جا رہے ہیں۔



## ۸۔ ضمیر ناپ پیما

سائنس داں عرصہ دراز سے انسان کے جوہر شعور کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں، کیونکہ یہی ہمیں اشرف المخلوقات کا اعلیٰ درجہ عطا کرتا ہے۔ اس گتھی کا حل ہمارے سر میں موجود ڈیڑھ کلو وزنی جیلی نما خاکی مادے میں پوشیدہ ہے۔ گو



ای۔ای۔جی اور ایف ایم آر آئی اسکینر سرگرم دماغ کے متعلق خاصی معلومات فراہم کر رہے ہیں لیکن ہم شعور کو سمجھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

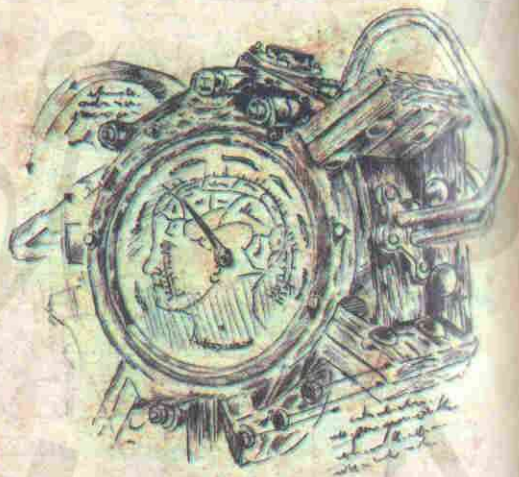

برطانوی پروفیسر مارکس ڈو ساؤتے بھی شعور کی گہرائیوں میں جھانک رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے "ابھی ہماری تحقیق اسی مقام پر ہے جب نئی نئی دوربین ایجاد ہوئی تھی۔ تب لوگ اس قابل ہوئے کہ زمین کے باہر بھی جھانک سکیں لیکن سائنس و ٹیکنالوجی کی رفتار دیکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ ہم اگلے پندرہ تا بیس برس میں "ضمیر ناپ پیما" (Consciousometer) ایجاد کر لیں گے۔"

ضمیر ناپ پیما کی ایجاد کے بعد ممکن ہوگا کہ کوما میں گئے ایک مریض اور ایسے انسان کے مابین فرق کیا جا سکے جو حرکت تو نہیں کر سکتا، مگر وہ بیدار ہوتا ہے اور اس کے حواس ٹھیک ہوتے ہیں۔ مزید براں اس کے ذریعے یہ اندازہ لگایا جا سکے گا کہ کوئی جانور یا کمپیوٹر ضمیر رکھتا ہے یا نہیں! ایسی صورت میں جانوروں پر ہونے والے تجربات کے سلسلے میں نئے قوانین بنیں گے۔

## ۷۔ بڑھاپے کا خاتمہ

ذرا سوچیے، اگر انسان اپنی عمر ٹھہرانے میں کامیاب رہے بلکہ از سر نو جوان ہو جائے تو طبی سائنس میں انقلاب آ جائے گا۔ ماہرین طب کا کہنا ہے کہ انسان پر بڑھاپا تب طاری ہوتا ہے جب انسانی جسم میں مختلف جسمانی نقائص جمع ہو جائیں۔ تب انسانی جسم صحیح طرح کام انجام نہیں دے پاتا اور زوال پذیر ہونے لگتا ہے۔ اب ماہرین طب انہی نقائص کو سمجھ کر ایسے طریقے اور علاج دریافت کر رہے ہیں کہ انھیں ختم کیا جا سکے۔

مثلاً ماہرین کا ایک مدعا یہ ہے کہ "خیطی ذرے" (Mitochondria) کو زوال پذیر ہونے سے بچایا جائے۔ ہر خلیے میں یہی خیطی ذرہ اُسے توانائی فراہم کرتا ہے۔ (گویا وہ خلیے کا بجلی گھر ہوا) اسی طرح ماہرین چاہتے ہیں کہ ایسا طریقہ دریافت ہو کہ ہمارا مامونی نظام ان خلیوں میں نہ پھنس جائے جو امراض کے





Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خلاف جنگ نہیں لڑتے۔

اسی طرح جسم انسانی میں بعض ایسے اعضا ہیں جن کے خلیے مر جائیں تو ان کی جگہ نئے پیدا نہیں ہوتے۔ مثلاً عضلاتِ قلب اور ہماری ہڈیوں سے جڑے اعصاب لیکن اب بنیادی خلوی (Stem Cell) علاج کے ذریعے مردہ خلیوں کی جگہ نئے خلیے لانا ممکن ہے۔

بڑھاپا روک طریق علاج دریافت کرنے میں امریکی ڈاکٹر، اوبرے ڈی گرے نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ابتدائی طور پر ماہرین چاہتے ہیں کہ بڑھاپا روک دیا جائے۔ بعدازاں انسان کو دوبارہ جوان بنا دینے والے طریق ایجاد ہوں گے۔ ظاہر ہے، شروع میں یہ علاج بہت مہنگے ہوں گے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کا سستا ہونا یقینی ہے۔

## ۹۔ کوانٹم کمپیوٹر

پچھلے پانچ برس میں تیز ترین کمپیوٹر اس لیے سامنے آئے ہیں کہ ہر دو سال بعد مائیکرو چپ میں ٹرانزسٹروں کی تعداد دگنی ہو جاتی ہے۔ یہ عمل اصطلاح میں ''مورے کا قانون'' کہلاتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے، ایک وقت ایسا آئے گا کہ مائیکرو چپ میں مزید ٹرانزسٹر لگانا ممکن نہیں رہے گا۔ اسی

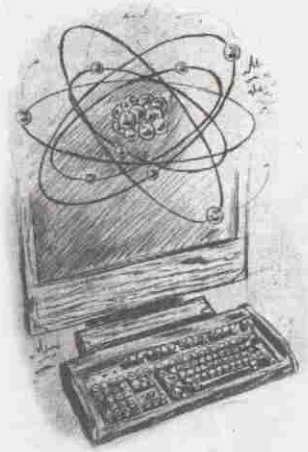

صورت میں کوانٹم کمپیوٹر ہمارے کام آئیں گے کہ موجودہ کمپیوٹروں سے کہیں زیادہ تیز رفتار ہوں گے۔

دراصل کوانٹم میکانیات کی رو سے ایٹم حیرت انگیز طور پر بیک وقت دو حالتوں میں ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ آج کل کے کمپیوٹروں میں تو سادہ انداز میں 1۔ ایس اور 0۔ ایس طریقے سے معلومات بھری (یعنی Encode کی) جاتی ہیں لیکن ایٹم جتنے ننھے پروسیسر بیک وقت 1 اور 0 بھر کر کام کریں گے۔ یوں ایسے تیز ترین کوانٹم کمپیوٹر جنم لیں گے جو بڑی پھرتی سے مشکل ترین مسائل بھی حل کریں گے۔

لیکن ابھی کوانٹم کمپیوٹروں کی تیاری ابتدائی مرحلے میں ہے۔ تاہم کیلی فورنیا یونیورسٹی کے ماہرین نے کوانٹم چپ ایجاد کر لی ہے جو ان کمپیوٹروں میں مائیکرو چپ کی جگہ لگے گی۔ کوانٹم کمپیوٹروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوگی کہ وہ نینو پیمانے (Nanoscale) پر کام کریں گے۔ نینو پیمانے پر کام کرنا انتہائی کٹھن اور پیچیدہ ہے اور بھی کوانٹم کمپیوٹر خوب کام آئیں گے۔

## ۱۰۔ مزاج سمجھنے والا ٹیلی ویژن

آج دفتر میں وقت بہت مصروف گزرا اور آپ تھکن سے چُور ہیں۔ اب آپ کی خواہش ہے کہ ٹی۔ وی پر مزاحیہ پروگرام دیکھیں تاکہ مزاج خوشگوار ہو سکے۔ لیکن آپ بیس منٹ تک چینل بدلتے رہے اور ایسا کوئی پروگرام نہیں ملا جس سے آپ بہ آرام بیٹھ کر لطف اندوز ہو سکیں۔ تنگ آ کر آپ نے ریموٹ ہی پھینک دیا۔

مردوزن کی یہی تکلیف مدِنظر رکھ کر سائنس داں ایسا ٹی۔ وی تیار کرنے میں لگے ہوئے ہیں جو آپ کا مزاج سمجھ کر فوراً مطلوبہ پروگرام حاضر کر دے۔ سب سے پہلے مزاج شناس ٹی۔ وی پر لگا کیمرا چہرے کے تاثرات اور جسمانی ہیت سے اندازہ لگائے گا کہ آپ کیسا پروگرام دیکھنے کے متمنی ہیں۔ وہ پھر اپنی ڈسک میں جمع شدہ ہزاروں پروگراموں میں سے من پسند آپ کے سامنے لے آئے گا۔ ٹیلی ویژن دیکھنے کا مستقبل یہی ہے۔

ناصر محمود شیخ

# اور فراز کتنی محبتیں چاہئیں تجھے

اقوام متحدہ کے مواصلات سے متعلقہ ادارے ''انٹرنیشنل کمیونیکیشن یونین'' کے اعداد و شمار کے مطابق موبائل فون استعمال کرنے والوں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ ایس ایم ایس (شارٹ میسج سروس) کے ذریعے پیغام رسانی کا طریقہ زیادہ مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ اس سروس نے کبوتروں کے ذریعے پیغامات بھیجنے کے ساتھ ساتھ سالگرہ کارڈ اور عید کارڈز کی فروخت کے کاروبار کی ایسی تیسی کر ڈالی ہے۔ دنیا بھر میں فی سیکنڈ دو لاکھ ایس ایم ایس کا تبادلہ ہوتا ہے۔

دنیا کے کسی ادارے کے پاس مس کالز کرنے والوں کا کوئی ریکارڈ نہیں لیکن غالب امکان یہی ہے کہ سب سے زیادہ ''مس کال'' کرنے والے صارفین کا تعلق پاکستان سے ہے۔ چونکہ بیروزگاروں کی تعداد میں دن بدن سنگین اضافہ ہو رہا ہے لہٰذا آمدن اور موبائل فون میں ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی پریشانیاں اور ''دکھڑے'' سنانے یا روزگار کے حصول کے حوالے سے معلومات حاصل کرنے کے لیے کم تعلیم یافتہ ''مس کال'' اور تعلیم یافتہ ایس ایم ایس کا ہی سہارا لیتے ہیں۔ موبائل کمپنیوں نے ایس ایم ایس سروس کو اتنا سستا اور ''بے توقیر'' کر دیا ہے کہ نوجوان نسل کے نمائندے دن بھر اس سروس سے انتقام لینے میں ہی مصروف نظر آتے ہیں۔ ہر وقت ان کی انگلیاں موبائل سیٹ پر متحرک اور تھرکتی نظر آتی ہیں۔

احمد فراز رومانوی اور محبت کی شاعری کے حوالے سے ادب کی تاریخ کا اہم نام ہے۔ ان کا شمار اُن ہستیوں میں ہوتا ہے جنھوں نے زندگی میں تو بے مثال شہرت حاصل کی لیکن وفات کے بعد ان کی لازوال ''بدنامی'' کا نیا باب کھل گیا۔ ایس ایم ایس سروس میں گردش کرنے والے نت نئے اشعار میں فراز کا نام اس قدر عمدگی سے شامل کیا جا رہا ہے کہ پڑھنے والا حیران کن صورت حال سے دوچار ہو جاتا ہے۔ فراز نے تو اپنے چاہنے والوں کا زندگی میں شکریہ اس شعر کے ذریعے ادا کر دیا تھا۔

اور فراز چاہئیں کتنی محبتیں تجھے
ماؤں نے ترے نام پہ بچوں کا نام رکھ دیا

اور آج کل کی ایس ایم ایس شاعری بچوں کے ناموں کے بجائے فراز کو کہاں کہاں رکھ رہی ہے۔

چلو فراز اب موسم کا مزہ چکھیں
تمام دوائیں بچوں کی پہنچ سے دور رکھیں

•

وہ ہمیں بے وفا کہتے ہیں تو کہتے رہیں فراز
اماں کہتی ہیں جو کہتا ہے وہ خود ہوتا ہے

•

یہ تُو کیا سفید کُرتے میں پھر رہا ہے فراز
اَج کالا جوڑا پا ساڈی فرمیش تے

•

ہم بھی بکنے گئے تھے بازارِ محبت میں فراز
کیا پتا تھا ۸ بجے سارے بازار ہی بند ہوتے ہیں

•

ہم تو اُڑتی چڑیا کے بھی پَر گن لیتے ہیں فراز
اس میں مشکل ہے کیا دو ہی تو ہوتے ہیں

•

اِتنا سن کر ہی ہمارا دل ٹوٹ گیا فراز
The number u have dialed is
on another call

•

فراز تمھارے جانے سے دل بہت روتا ہے
اوپر پنکھا چلتا ہے نیچے منا سوتا ہے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

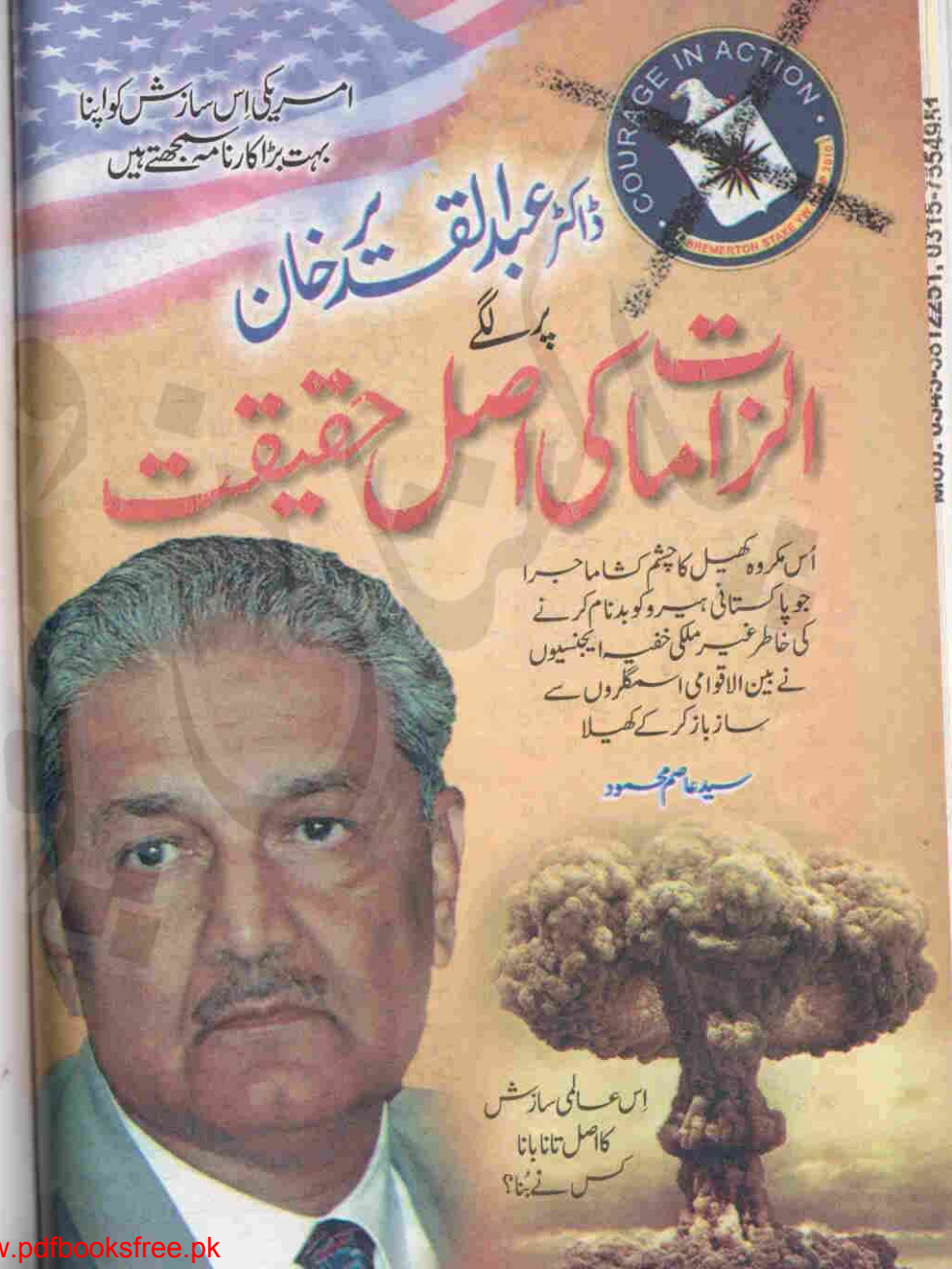

امریکی اس سازش کو اپنا بہت بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں

# ڈاکٹر عبدالقدیر خان پر لگے الزامات کی اصل حقیقت

اس مکروہ کھیل کا چشم کشا ماجرا جو پاکستانی ہیرو کو بدنام کرنے کی خاطر غیر ملکی خفیہ ایجنسیوں نے بین الاقوامی اسمگلروں سے ساز باز کر کے کھیلا

سید عاصم محمود




یہ ۵ر فروری ۲۰۰۴ء کی بات ہے، امریکی سی آئی اے کے سربراہ، جارج ٹینٹ نے جارج ٹاؤن یونیورسٹی، واشنگٹن میں اساتذہ اور طلبہ و طالبات سے خطاب کیا۔ تقریر کے آخر میں ٹینٹ نے حاضرین کو بتایا ''پچھلے سال میں نے کانگریس میں سالانہ خطاب کے دوران واضح کیا تھا کہ بین الاقوامی نجی ٹھیکے دار ایٹم بم بنانے کے آلات لیبیا سمیت مختلف ممالک کو فروخت کر رہے ہیں۔ تب میں نے ان لوگوں کے نام خفیہ رکھے تھے۔ لیکن آج میں بتانا چاہتا ہوں کہ بنیادی طور پر میری مراد ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے تھی۔ ڈاکٹر خان کا نیٹ ورک گزشتہ کئی برس سے مختلف ملکوں کو ایٹمی آلات و پرزے فراہم کر رہا تھا تاکہ وہ بھی ایٹم بم بنا سکیں۔ لیکن پاکستان سے آنے والی خبروں سے عیاں ہے کہ ڈاکٹر خان کے نیٹ ورک کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اب ان کے بہت سے ساتھی زیرِ حراست ہیں۔''

دراصل پچھلے ہی دن ۴ر فروری کو ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے قومی ٹیلی ویژن پر آ کر یہ اقرار کیا تھا کہ وہ مختلف ممالک کو ایٹمی ساز و سامان فروخت کرنے کے لیے ایک خود ساختہ نیٹ ورک چلا رہے تھے۔ لیکن جیسا کہ بعد میں انکشاف ہوا، حقیقت میں امریکی اور برطانوی ایجنسیوں نے بڑی عیاری سے یہ سازش تیار کی تھی کہ ڈاکٹر عبدالقدیر ہی نہیں پاکستان کو بھی پوری دنیا میں بدنام کر دیا جائے۔

مغربی میڈیا نے تب شور مچا دیا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر اپنے مخصوص کارندوں کے ذریعے پوری دنیا میں خوفناک تباہی پھیلانے والے ہتھیار پھیلا رہے ہیں۔ انھیں ''موت کا ہرکارہ'' اور ''دنیا کا سب سے خطرناک ایٹمی سمگلر'' جیسے گھٹیا القابات دیے گئے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر کی کردار کشی اور بدنامی میں مغربی طاقتوں کے بااثر پاکستانی ایجنٹوں نے بھی حصہ لیا۔ یوں انھوں نے ایک ایسے عظیم پاکستانی کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی جس نے پاکستان کی بقا کے لیے اپنا تن من دھن سب کچھ وار دیا تھا۔ لیکن یہ خوشی کا مقام ہے کہ تمام تر کردار کشی کے باوجود آج بھی پاکستانی عوام ڈاکٹر صاحب کو ہیرو، نجات دہندہ اور عظیم محبِ وطن سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقدیر کے خلاف ہونے والی سازش میں اسلام دشمن غیر ملکی طاقتیں ہی نہیں دورِ جدید کے میر جعفر اور میر صادق بھی شریک تھے۔

## سقوطِ ڈھاکا کے دلدوز مناظر

دسمبر ۱۹۷۱ء میں ڈاکٹر عبدالقدیر بیلجیئم میں پی ایچ ڈی کر رہے تھے کہ پاکستان دولخت ہونے کا حادثہ پیش آیا۔ تب انھوں نے ٹی۔وی پر یہ دلدوز مناظر دیکھے کہ بھارتی فوجی ہتھیار ڈالنے والے پاکستانی فوجیوں کو قطار بنوائے اور لاتیں مارتے لیے جا رہے ہیں۔ یہ المناک منظر ڈاکٹر صاحب کے دل پر ایسے نقش ہوئے کہ وہ انھیں ساری عمر نہ بھول پائے۔

۱۸ر مئی ۱۹۷۴ء کو بھارت نے ایٹمی دھماکا کیا، تو یک دم اس کا پلہ بھاری ہو گیا۔ اس امر نے پاکستانی حکومت و فوج کو بے حد تشویش میں مبتلا کر دیا۔ چنانچہ وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے فیصلہ کیا کہ پاکستان بھی ایٹم بم بنائے گا۔ اس سلسلے میں پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کا کہنا تھا کہ پلوٹونیم بم بنایا جائے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ پاکستان کے پاس کوئی ایٹمی بجلی گھر نہ تھا جہاں پلوٹونیم جنم لیتا ہے۔

اس مسئلہ کو ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے حل کیا۔ انھوں نے پاکستانی حکومت کو تجویز دی کہ یورینیم بم بنایا جائے۔ اس وقت تک ڈاکٹر صاحب یورینیم افزودگی کے ماہر بن چکے تھے۔ اس طریقِ کار کی خصوصیت یہ ہے کہ یوں ایٹمی بجلی گھر بنائے بغیر صرف سینٹری فیوج مشینیں لگا کر یورینیم ایٹم بم بنایا جا سکتا ہے۔ جب اعلیٰ سیاسی و فوجی قیادت کو یہ افادیت سمجھ آئی، تو ڈاکٹر صاحب کو کام شروع کرنے کا اشارہ کر دیا گیا۔

دسمبر ۱۹۷۴ء میں ڈاکٹر عبدالقدیر نے ایٹمی توانائی کمیشن کے سربراہ، منیر احمد خان کو مجوزہ افزودگی پلانٹ کا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

منصوبہ سمجھایا اور واپس ہالینڈ چلے گئے جہاں وہ جرمن، ولندیزی اور برطانوی حکومتوں کی ملکیت کمپنی، یورینکو سے بحیثیت سینیئر سائنس دان وابستہ تھے۔ اس زمانے میں یورینکو ولندیزی قصبے المینو میں یورینیم افزودگی پلانٹ تعمیر کررہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اس منصوبے میں بھرپور طریقے سے شریک تھے۔

۲۱ر دسمبر ۱۹۷۵ء کو ڈاکٹر صاحب اہل وعیال کے ہمراہ پھر چھٹیاں منانے پاکستان آئے۔ جب انھوں نے افزودگی کے سلسلے میں رفتارِکار کا جائزہ لیا، تو نتیجہ صفر نکلا۔ دراصل ایٹمی توانائی کمیشن پلوٹونیم ایٹم بم پر کام کرنا چاہتا تھا، اسی لیے ادارے کے ماہرین یورینیم ایٹم بم کے منصوبے میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔

پاکستان آمد پر جب ڈاکٹر صاحب نے وزیراعظم سے شکایت لگائی تو انھوں نے پیش کش کی کہ آپ پاکستان رک کر یہ منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔ یہ ایک بڑا مشکل فیصلہ تھا، کیونکہ ہالینڈ میں ڈاکٹر صاحب پُرکشش تنخواہ پر ملازم تھے، نیز ان کی بیگم بھی ولندیزی تھیں۔ ہالینڈ میں اس خاندان کو جو سہولیات اور مراعات میسر تھیں، وہ یقیناً پاکستان میں ملنا محال تھیں۔ لیکن جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ڈاکٹر صاحب نے پاکستان کی خدمت کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

جون ۱۹۷۶ء میں بحیثیت مشیر ان کا ایٹمی توانائی کمیشن میں تقرر ہوا۔ لیکن وہی حسد کا جذبہ آڑے آیا اور انھیں اپنے منصوبے کے سلسلے میں کئی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ تب ان کی تنخواہ صرف ۳ر ہزار روپے تھی۔ جب حالات حد سے باہر ہوگئے تو ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے دوبارہ وزیراعظم کو صورت حال سے مطلع کیا۔ چنانچہ یورینیم افزودگی کے لیے ایٹمی توانائی کمیشن سے آزاد ایک نئے منصوبے ''پروجیکٹ ۴۰۶'' کا آغاز ہوا۔ اس کے سربراہ ڈاکٹر صاحب مقرر ہوئے۔ جبکہ ایک نگران بورڈ بھی تشکیل پایا جس کے ارکان اے۔ جی۔ ایم قاضی، آغا شاہی اور غلام اسحاق خان تھے۔

اس وقت تک لیبیا کے مقتول حکمران، کرنل قذافی ایٹم بم بنانے کے لیے پاکستان کو ۲۰ر کروڑ ڈالر فراہم کرچکے تھے جو اس زمانے میں زرِکثیر تھا۔ عالم اسلام کو متحد و مضبوط بنانے کا یہ اقدام پاکستانیوں کے دل میں کرنل قذافی کی یادیں ہمیشہ تازہ رکھے گا۔ پاکستانی حکومت نے ڈاکٹر صاحب کو مطلع کیا کہ روپے پیسے کی فکر نہ کریں، بس جلد از جلد قوم کو ایٹم بم کا تحفہ دیں، تاکہ طاقت کا ترازو متوازن ہوسکے۔ تب وہ بھارت کی طرف کچھ زیادہ جھک گیا تھا۔

ڈاکٹر عبدالقدیر یورینیم افزودگی پلانٹ کی تعمیر کے لیے درکار تمام تکنیکی معلومات رکھتے تھے۔ پھر سینٹری فیوج مشینیں بنانے کے لیے ان کے پاس بیش قیمت نوٹس بھی تھے جس کی مالیت اربوں روپے تھی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ پلانٹ کی تمام مشینیں، متعلقہ آلات اور ساز وسامان مغربی کمپنیاں بناتی تھیں۔ اُدھر یورپی ممالک اور امریکہ نے یہ سامان پاکستان کو فروخت کرنے پر پابندی لگا رکھی تھی۔ لہٰذا فیصلہ ہوا کہ خفیہ طریقے سے مطلوبہ ساز وسامان اور پرزہ جات یورپ سے پاکستان منگوائے جائیں۔

کہوٹہ میں جب پاکستانی انجینئر بریگیڈیئر زاہد اکبر علی خان کی زیرِقیادت افزودگی پلانٹ بنانے میں محو ہوئے، تو ڈاکٹر صاحب نے کئی یورپی ممالک کا دورہ کیا۔ تب وہیں ان کی ملاقات ایسے مغربی اسمگلروں سے ہوئی جو ہر قسم کی مشینیں اور پرزے سمگل کرتے تھے۔ یہ اسمگلروں کا پورا نیٹ ورک تھا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ان کے ساتھیوں نے انھیں قائل کرلیا کہ وہ پاکستانی افزودگی پلانٹ کے لیے متعلقہ مشینیں اور آلات فراہم کریں۔ یوں کہوٹہ میں عمارتی ڈھانچہ کھڑا ہوتے ہی مشینیوں کی تنصیب کا کام بھی شروع ہوگیا۔

پابندیوں سے چھٹکارا پانے کی خاطر جرمنی، سوئٹزرلینڈ، لکسمبرگ، کویت، برطانیہ، متحدہ عرب امارات وغیرہ میں جعلی کمپنیاں بنائی گئیں۔ یہ کمپنیاں مغربی اداروں سے سینٹری فیوج کے پرزہ جات و آلات خریدتی اور انھیں



دبئی بھجوا دیتیں۔ اس زمانے میں دبئی میں کسٹمز اور دیگر پابندیاں موجود نہ تھیں، چنانچہ اسی کو مرکز بنایا گیا۔ وہیں مغربی اداروں کے نمائندے آتے اور اسمگلنگ نیٹ ورک کے ارکان کا بھی آنا جانا تھا۔

پاکستان میں یورینیم افزودگی پلانٹ کی تکمیل کے لیے اندرون و بیرون ملک مقیم کئی پاکستانیوں نے کوئی نہ کوئی کردار ادا کیا..... یہ سبھی ہمارے بے نام ہیرو ہیں۔ اِدھر کہوٹہ میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے دن رات کام کیا اور پاکستانی سائنس دانوں و انجینئروں کو پلانٹ سے متعلق تکنیکی معلومات سکھا کر اپنی ٹیم تیار کرلی۔ یوں ۱۹۷۸ء میں پلانٹ تکمیل کو پہنچا اور وہاں یورینیم کی افزودگی کا آغاز ہوگیا۔ یہ ایک نہایت پیچیدہ عمل ہے جس میں خالص یورینیم سے ایٹم بم میں مستعمل یورینیم ۲۳۵ کو گیس بنا کر علٰحدہ کیا جاتا ہے۔ آخر ۱۰ر دسمبر ۱۹۸۴ء کو زبردست کامیابی نصیب ہوئی جب تمام رُکاوٹوں اور مشکلات کے باوجود پاکستان ایٹم بم بنانے میں کامیاب ہوگیا۔

## دوست ممالک سے ایٹمی تعاون

چین: جب چینی حکومت کو خبر ملی کہ پاکستانی یورینیم افزودگی پلانٹ تعمیر کررہے ہیں، تو انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ان کی ٹیم چین کو بھی ایسا ہی پلانٹ تیار کردے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے مع ٹیم چینی شہر، ہنززونگ میں افزودگی پلانٹ لگانے میں بھرپور حصہ لیا۔ تب سینٹری فیوج مشینوں، انورٹروں، والووں، فلو میٹروں، پریشر گیجوں اور دیگر متعلقہ ساز وسامان سے بھری سی۔۱۳۰ جہازوں کی ''ایک سو پینتیس پروازیں'' چین بھجوائی گئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بذاتِ خود بھی چینی پلانٹ کا دورہ کیا۔

جواباً چین نے ایٹم بم بنانے کے سلسلے میں ڈیزائن ڈاکٹر صاحب کو فراہم کیے۔ نیز ۵۰ر کلو افزودہ یورینیم اور ۱۰ر ٹن خالص یورینیم بھی دیا۔ مزید براں چین کے تعاون ہی سے پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن نے ایٹمی بجلی گھر لگائے اور پلوٹونیم کاری پروسیسنگ پلانٹ تعمیر کیا۔

ایران: ایرانی حکومت کو خطرہ رہتا ہے کہ امریکہ موقع دیکھ کر اس پر حملہ کرسکتا ہے۔ چنانچہ اس نے بھی ایٹم بم بنانے کا فیصلہ کیا تاکہ امریکیوں کو منہ توڑ جواب دیا جا سکے۔ ۱۹۸۹ء میں انھوں نے اپنے ایٹمی پروگرام کے سلسلے میں پاکستانیوں سے مدد مانگی۔ تب پاک بری فوج کے سربراہ جنرل اسلم بیگ نے آمادگی ظاہر کردی۔ جنرل صاحب کا خیال تھا کہ اگر ایران ایٹم بم بنالے تو یوں عالمِ اسلام کو مزید طاقت میسر آئے گی۔

پاکستانی حکومت کی ایما پر پھر ڈاکٹر صاحب نے ایرانیوں کو سینٹری فیوج مشینوں کے ڈیزائن اور کچھ پرانی مشینیں فراہم کیں۔ مزید براں مغربی اسمگلنگ نیٹ ورک میں شامل ان لوگوں کے نام و پتے بھی دیے جن سے ایرانی سینٹری فیوج اور متعلقہ سامان خرید سکتے تھے۔ یوں ایرانیوں نے پاکستان کے تعاون سے اپنے ایٹمی منصوبے کا آغاز کیا اور پھر نطنز میں یورینیم افزودگی پلانٹ تعمیر کرلیا۔

شمالی کوریا: ۱۹۹۳ء میں شمالی کوریا نے پاکستان کو زمین سے زمین تک مار کرنے والے گائیڈڈ میزائل فراہم کیے۔ بعد ازاں شمالی کوریا نے خواہش ظاہر کی کہ ڈاکٹر اے کیو لیبارٹریز میں تیار کردہ سینٹری فیوج انھیں قیمتاً فراہم کیے جائیں۔ چنانچہ مشینیں انھیں دے دی گئیں۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ شمالی کورین تب تک پلوٹونیم کے ذریعے ایٹم بم بنا چکے تھے تاہم وہ یورینیم بم بنانے میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔

لیبیا: ۱۹۹۷ء میں لیبیا کے مرحوم حکمران صدر کرنل قذافی نے بذریعہ اپنے نمائندے ڈاکٹر عبدالقدیر سے رابطہ کیا۔ یہ ملاقات استنبول، ترکی میں ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کرنل قذافی کو چاہتے اور ان کا احترام کرتے تھے۔ اوّل اس لیے کہ کرنل قذافی کے فراہم کردہ سرمائے ہی سے پاکستانی ایٹمی منصوبے کی داغ بیل ڈالی گئی۔ دوم، مرحوم قذافی آزادی کی ان مسلم تحریکوں کو مالی امداد دیتے تھے جو مختلف ممالک میں غاصبوں کے خلاف چل رہی تھیں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صدر قذافی کی خواہش تھی کہ ڈاکٹر صاحب لیبیا کا ایٹمی منصوبہ تیار کرنے میں ان کی مدد کریں۔ قذافی سے دیرینہ شناسائی کے باعث ڈاکٹر صاحب نے ہامی بھر لی۔ انھوں نے پھر پاکستانی حکومت کی اجازت سے مغربی اسمگلنگ نیٹ ورک سے رابطہ کیا تاکہ اس بار لیبیا میں یورینیم افزودگی پلانٹ تعمیر کیا جا سکے۔

نیٹ ورک سے تعلق رکھنے والے سوئس باشندے، فریڈرچ ٹنر کے ایک بیٹے نے ملائشیا میں ایک کارخانے کے اندر سینٹری فیوج اور متعلقہ سامان بنانے والا کارخانہ قائم کرلیا۔ مزید براں سوئٹزرلینڈ میں بھی ایک مرکز بنایا گیا۔ ستمبر ۲۰۰۳ء میں ملائشیا میں تیار کردہ مشینیں بی۔بی۔سی چین نامی بحری جہاز کے ذریعے دبئی بھجوائی گئیں۔ وہاں سے انھیں لیبیا جانا تھا۔ لیکن ۴؍اکتوبر کو دبئی میں سی۔آئی۔اے نے جہاز میں لدی مشینیں پکڑ لیں۔ اس کے بعد ہی ڈاکٹر عبدالقدیر کے خلاف شرانگیز مہم کا آغاز ہوا اور انھیں عالمی میڈیا مجرم اور گنہگار بنا کر پیش کرنے لگا۔

## سازش کا آغاز

ستمبر ۲۰۰۲ء میں بی۔بی۔سی چین سے سینٹری فیوج کے پرزہ جات برآمد ہوئے، تو سی۔آئی۔اے کی ایما پر مغربی میڈیا یہ واویلا مچانے لگا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان اس خفیہ نیٹ ورک کے سربراہ تھے جو ایران، لیبیا، شمالی کوریا وغیرہ کو ایٹم بم بنانے کی خاطر یورینیم افزودہ پلانٹ فراہم کررہا تھا۔ نیٹ ورک کے دیگر ارکان میں گوتھارا یلرچ، ہینز مابس، ہینگ سلیبوس، فریڈرچ ٹنر، پیٹر گرفن، محمد فاروق اور طاہر کے نام سامنے آئے۔

یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر صاحب مندرجہ بالا افراد سے شناسائی رکھتے تھے۔ مگر یہ واقفیت دو چار برس نہیں ۱۹۷۷ء سے چلی آرہی تھی۔ دراصل یہی وہ نمایاں یورپی اور غیر ملکی باشندے ہیں جن کے ذریعے ڈاکٹر صاحب نے خفیہ طور پر پاکستانی افزودگی پلانٹ کی مشینیں اور آلات منگوائے۔ ان باشندوں میں صرف دو، فاروق اور طاہر بیری لنکن مسلمان تھے، باقی تمام ہالینڈ، سوئٹزرلینڈ، جرمنی، بیلجیئم وغیرہ سے تعلق رکھتے تھے۔

امریکی سی۔آئی۔اے بہت عرصہ قبل یہ جان چکی تھی کہ مندرجہ بالا یورپی اس بین الاقوامی نیٹ ورک کا حصہ ہیں جو خفیہ طور پر مختلف ممالک کو یورینیم افزودگی پلانٹ کی مشینیں و پرزہ جات فروخت کرتا ہے۔ لیکن سی آئی اے نے کبھی ضرورت نہیں سمجھی کہ ان یورپیوں کو گرفتار کیا جائے۔ یہ تو جب امریکہ میں صدر بش برسرِ اقتدار آیا، اس کو جنگی ہسٹریا کا دورہ پڑا، تو پاکستانی حکومت کے تعاون سے یہ سازش تیار ہوئی کہ ایک تیر سے دو شکار کیے جائیں، یعنی نیٹ ورک کا خاتمہ نیز ایسی چال چلی جائے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر اسے چلانے کے ذمے دار قرار پائیں۔

چنانچہ ۲۰۰۰ء کے لگ بھگ سی۔آئی۔اے اور برطانوی خفیہ ایجنسی، ایم آئی ۱۶ نے فریڈرچ ٹنر، اس کے دونوں بیٹوں، پیٹر گرفن اور فاروق کو اپنا ایجنٹ بنا لیا۔ یہ پانچوں اشخاص بظاہر خفیہ نیٹ ورک کا حصہ رہے مگر درپردہ سی۔آئی۔اے کے لیے کام کرنے لگے۔ یہ فریڈرچ ٹنر اور اس کے بیٹے ہی ہیں جنھوں نے لیبیا بھجوانے والے سینٹری فیوج کے آلات ملائشیا میں تیار کیے۔ پھر انھی کی اطلاع پر امریکی ایجنٹوں نے وہ آلات دبئی میں پکڑے اور یوں نام نہاد ڈاکٹر خان نیٹ ورک طشتِ از بام کرنے کا جھوٹا دعویٰ کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر خان نیٹ ورک کا کوئی وجود نہیں تھا، بلکہ یہ یورینیم افزودگی پلانٹ کا سامان چوری چھپے فروخت کرنے والے مغربی تاجر، کاروباری اور ہنرمند تھے جنھیں سی۔آئی۔اے نے پکڑا۔ وہی اصل مجرم تھے، لیکن متعصب مغربی میڈیا نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو بوجوہ نشانہ بنایا اور انھیں بدنام کیا۔

۲۰۰۳ء میں فریڈرچ ٹنر دبئی میں ایک ورکشاپ چلا رہا تھا جو یورینیم پلانٹ کے مختلف پرزہ جات استعمال کرتی تھی۔ اس نے پھر ملائشیا میں بھی ایک چھوٹا سا کارخانہ قائم کیا جہاں لیبیا جانے والے سینٹری فیوج مشینوں کے



آلات بنتے تھے۔ یہ کارخانہ جس بڑے کارخانے میں قائم ہوا، وہ طاہر کی ملکیت تھا۔ طاہر بھی اس نیٹ ورک کا حصہ اور محمد فاروق کا بھتیجا یا بھانجا تھا۔

۱۹۷۷ء میں فریڈرچ ٹنر سوئٹزرلینڈ کی کمپنی، کورا انجینئر کا منیجر تھا۔ ڈاکٹر خان نے اسی سے گیسی فیکیشن اور سولڈ فیکیشن یونٹ خریدا۔ یہی یونٹ افزودگی پلانٹ میں یورینیم گیس سینٹری فیوج مشینوں کو فراہم کرتا اور پھر اسے واپس ٹھوس شکل میں تبدیل کرتا ہے۔

جب ستمبر ۲۰۰۳ء میں بی۔بی۔سی چین بحری جہاز پکڑا گیا، تو ٹنر باپ اور بیٹے سوئٹزرلینڈ چلے گئے۔ وہاں ان پر مقدمہ چلا، لیکن ۲۰۰۸ء میں امریکہ کے شدید دباؤ پر سوئس عدالت نے انھیں رہا کردیا۔ ۲۵؍اپریل ۲۰۰۸ء کو ممتاز امریکی اخبار نیویارک ٹائمز نے انکشاف کیا کہ سی آئی اے نے ٹنر خاندان کو اپنا ایجنٹ بنانے کی خاطر ایک کروڑ ڈالر (۸۸ کروڑ روپے) دیے تھے اور ''بیشتر رقم سوٹ کیس میں دی گئی جو نوٹوں سے بھرا پڑا تھا۔''

حال ہی میں سوئس مجسٹریٹ، اینڈریاس میولر کی وہ تفتیشی رپورٹ سامنے آئی ہے جو اس نے ٹنر خاندان پر مقدمہ چلانے کے سلسلے میں تیار کی تھی۔ اس رپورٹ کا خلاصہ بھی یہی سچ ہے کہ ایٹم بم بنانے کا متعلقہ سامان مغربی اسمگلر ہی دنیا بھر میں پھیلاتے ہیں اور یہ کہ ڈاکٹر اے۔کیو خان نیٹ ورک کوئی وجود نہیں رکھتا۔ واضح رہے کہ ٹنر باپ بیٹوں کے خلاف ابھی مقدمہ ختم نہیں ہوا بلکہ زیرِ التوا ہے۔ چونکہ جب بھی مقدمہ چلا، اس سارے بکھیڑے میں سی۔آئی۔اے کا مکروہ کردار عیاں ہوجائے گا، اسی لیے مقدمہ چلایا نہیں جا رہا۔

سازش کا دوسرا کردار، پیٹر گرفن برطانوی ایم۔آئی ۱۶ کا ایجنٹ تھا۔ ۲۰۰۴ء میں جب سی۔آئی۔اے کے کارندے ملائشیا پہنچے، تو انھیں (حسب توقع) فریڈرچ کا بیٹا ارس ٹنر تو نہیں ملا، البتہ گرفتار شدہ طاہر مل گیا۔ طاہر نے انھیں بتایا کہ اس کے کارخانے کو سینٹری فیوج آلات تیار کرنے کے لیے دبئی کی ایک کمپنی نے آرڈر دیا تھا۔ پیٹر گرفن اسی کمپنی کا مالک تھا۔ مگر امریکہ اور برطانیہ کے اثر و رسوخ کی وجہ سے یہ شخص بھی آزاد پھر رہا ہے جبکہ طاہر اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان نہ صرف معتوب قرار پائے بلکہ قیدیوں کے مانند زندگی گزار رہے ہیں۔

سی۔آئی اے سری لنکن مسلمان، محمد فاروق کو بھی اپنا ایجنٹ بنانے میں کامیاب رہی۔ یہ شخص چاچا کے نام سے معروف اور دبئی میں ایک ایسی کمپنی کا منیجر تھا جو یورینیم پلانٹ کے پرزہ جات کی خرید و فروخت کرتی تھی۔ ۱۹۹۵ء میں محمد فاروق اور طاہر کے مابین اختلافات پیدا ہوگئے اور پھر مقدمے بازی بھی ہوئی۔ ۲۰۰۳ء کے لگ بھگ یہی چاچا فاروق سی۔آئی۔اے کا ایجنٹ بن گیا اور اس نے امریکی سازش تیار کرانے میں حصہ لیا۔ فاروق کینسر کے ہاتھوں جاں بحق ہوکر عالمِ بالا پہنچ چکا ہے۔

## سازش کا تانا بانا کس نے بُنا؟

ڈاکٹر عبدالقدیر کے خلاف سازش سی۔آئی۔اے کے ڈائریکٹر آپریشنز، رالف مووت لارسن کی زیرِ نگرانی تیار ہوئی اور انجام پائی۔ یہ شخص یہودی ہے اور اب اسرائیل میں رہائش پذیر ہے۔ سی۔آئی۔اے کے سابق سربراہ،



جارج ٹینٹ



MOD: 0345-3812251, 0315-7354954

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جارج ٹینٹ نے اس کا نام لیے بغیر اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے ''جب میری ملازمت میں صرف ایک دن باقی تھا، تو میں شام کو سی۔آئی۔اے ہیڈکوارٹر میں واقع اس شخص کے کمرے میں گیا جس نے ڈاکٹر خان نیٹ ورک ختم کیا تھا۔ پھر میں نے یہ کارنامہ انجام دینے پر اُسے تمغا پہنایا۔''

یہ رالف میوت ہی ہے جس نے اردسمبر ۲۰۰۲ء اور ستمبر ۲۰۰۳ء میں جارج ٹینٹ کے ساتھ سابق صدر پاکستان، جنرل (ر) پرویز مشرف سے تنہائی میں ملاقاتیں کیں۔ پہلی ملاقات اسلام آباد میں ہوئی۔ اس کے بعد دو پاکستانی ایٹمی سائنسداں، سلطان بشیرالدین اور عبدالمجید گرفتار کرلیے گئے۔ ان سائنسدانوں سے پھر سی۔آئی۔اے نے تفتیش کی تھی۔ ستمبر ۲۰۰۳ء کی ملاقات نیویارک میں ہوئی۔ اسی کے نتیجے میں ڈاکٹر عبدالقدیر کے زوال کا آغاز ہوگیا۔

جارج ٹینٹ کے علاوہ امریکی صحافی، ران سسکنڈ نے بھی اپنی کتاب ''دی ون پرسنٹ ڈاکٹرائن'' میں ان ملاقاتوں کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کتاب میں ایک پیراگراف خصوصاً چشم کشا اور ہمارے حکمرانوں کی اصلیت عیاں کرتا ہے۔ سسکنڈ لکھتا ہے ''جب ملاقات ختم ہوئی، تو سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ جارج ٹینٹ فہرست مطالبات کے علاوہ ایک بھاری پیکٹ بھی میز پر رکھا پیچھے چھوڑ گیا۔ سوال یہ ہے کہ اس پیکٹ میں کیا تھا؟ مجھے یقین ہے کہ وہ پیکٹ ڈالروں سے نہیں بھرا تھا۔ البتہ ٹینٹ نے خاصی جگہ یہ تذکرہ کیا ہے کہ جب کوئی ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' میں اسے اہم معلومات فراہم کرتا، تو اسے نوٹوں سے بھرا پیکٹ دے کر نوازا جاتا تھا۔''

ران سسکنڈ مزید لکھتا ہے ''جب پرویز مشرف نے عہدۂ صدارت سے استعفا دیا، تو اُنھی دنوں مجھے اُن سے آرمی ہاؤس میں ملاقات کرنے کا موقع ملا۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ نے کسی ساتھی کے بغیر سی۔آئی۔اے کے چیف اور ایجنٹ سے تنہائی میں کیوں ملاقاتیں کیں؟ اس پر جنرل مشرف کی تیوری چڑھ گئی اور ماتھے پر شکنیں پڑگئیں۔ انھوں نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا کہ ان کی کبھی سی۔آئی۔اے کے چیف یا ایجنٹوں سے اکیلے میں ملاقات نہیں ہوئی۔

''میں نے ان سے دریافت کیا ''یہ تو سبھی لوگ جانتے ہیں کہ اردسمبر ۲۰۰۲ء کو آپ نے قصرِ صدارت میں ٹینٹ سے ملاقات کی تھی۔ تب ٹینٹ چاہتا تھا کہ بشیرالدین محمود اور ایک دوسرے پاکستانی ایٹمی سائنسداں کو گرفتار کرلیا جائے۔''

یہ سوال سن کر جنرل (ر) پرویز مشرف کہنے لگے ''یہ بشیرالدین محمود کون ہے؟''

بس اس کے بعد میرا انٹرویو ختم ہوگیا۔ پھر میں نے کئی بار ان سے درخواست کی کہ لندن یا دبئی میں انٹرویو دیجیے، مگر وہ انکاری رہے۔

سی۔آئی۔اے نے جس گھناؤنی سازش کے ذریعے پاکستان کے ہیرو، ڈاکٹر عبدالقدیر کو بدنام کیا، اس کی تفصیل انتہائی خفیہ ہے۔ شاید ۵۰/سال بعد اسے منظرِعام پر لایا جائے جیسا کہ امریکیوں کا دستور ہے۔ تاہم ایک رپورٹ کے مندرجات سے عیاں ہے کہ امریکی اس سازش کو اپنا بہت بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں۔ یہ رپورٹ ۲۰۰۵ء میں اس کمیشن نے جاری کی تھی جو حادثہ ۹/۱۱ کے بعد صدر جارج بش نے وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کے سلسلے میں امریکی انٹیلی جنس کی صلاحیت جانچنے کی خاطر بنایا تھا۔

اِس رپورٹ میں انکشاف کیا گیا کہ ڈاکٹر خان کے خلاف سی۔آئی۔اے آپریشن دوسری جنگِ عظیم کے بعد امریکی خفیہ ایجنسیوں کی تیسری سب سے بڑی کامیابی ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا:

''امریکی خفیہ ادارے دشمنوں کے قلب میں پہنچ کر اپنے ہمدرد ڈھونڈنے میں کامیاب رہے۔ چنانچہ جب سرد جنگ کے دوران کیوبن میزائل بحران رونما ہوا، تو ہمیں روسی فوجی افسر، کرنل اولیگ پینکوسکی کی جانب سے اہم معلومات ملیں۔ انہی کی مدد سے ہم اس قابل ہوئے کہ



بحران کو ٹال سکیں۔ پھر پولش فوجی افسر، کرنل رسزارڈ کوکلینسکی نے ہمیں سوویت یونین کے خفیہ جنگی منصوبوں کی نقول فراہم کیں۔ اب سی۔آئی۔اے کے ایجنٹوں نے کامیابی سے ڈاکٹر اے کیو خان نیوکلیئر پرولیفریشن نیٹ ورک میں دخول کیا اور اسے ختم کرکے چھوڑا۔ سابق سی آئی اے ڈائریکٹر جنرل، جارج ٹینٹ نے بجا طور پر اسے ''آپریشن ڈیرنگ'' (Daring) کا نام دیا۔ اس آپریشن کی تفصیل خفیہ ہے اور سامنے نہیں آسکتی۔''

## ڈاکٹر صاحب پر الزامات

سی۔آئی۔اے اور پاکستان میں امریکہ کے تنخواہ دار ملازموں نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان پر دو بنیادی الزام لگائے۔ اول یہ کہ وہ ہالینڈ سے یورینیم سینٹری فیوج مشینیں بنانے کے جو نقشے دخا کے لائے، وہ غیر مکمل اور غلطیوں سے پُر تھے۔ چنانچہ ایٹمی توانائی کمیشن سے تعلق رکھنے والے پاکستانی ماہرین طبیعات نے خاکوں کے نقائص دور کیے۔ تب ڈاکٹر صاحب اس قابل ہوئے کہ یورینیم افزودگی پلانٹ تیار کرسکیں۔ دوم یہ کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے نیٹ ورک سے خوب کمائی کی اور کروڑ پتی بن گئے۔

پہلے الزام کا جواب یہ ہے کہ یورینکو کمپنی نے سینٹری فیوج مشینوں کے ڈیزائن ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو اس لیے دیے تھے کہ وہ انھیں نقائص سے پاک کرسکیں۔ یورینکو کے انجینئر اور سائنس دان یہ نقائص دور کرنے میں ناکام رہے تھے اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو نقائص یورپ اور امریکہ کے تربیت یافتہ اور تجربے کار ایٹمی سائنس دان و انجینئر دور نہیں کرسکے، انھیں چند پاکستانی ماہرین نے کیونکر ختم کردیا؟ چنانچہ یہ الزام بالکل لغو ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ نقائص دور کرنے میں چند پاکستانی سائنسداں بھی ڈاکٹر صاحب کے شریک کار رہے اور انھوں نے جو کارنامہ انجام دیا، وہ پاکستانیوں کے لیے قابلِ فخر ہے۔

دوسرا الزام بھی حقائق کی کسوٹی میں خام اور بے ہودہ ثابت ہوتا ہے۔ مشرف حکومت نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح اندرون یا بیرون ممالک میں ڈاکٹر صاحب کے خفیہ کھاتے دستیاب ہوجائیں لیکن وہ ناکام رہی۔ بڑی چھان بین کے بعد پتا چلا کہ دبئی کے ایک بینک میں ڈاکٹر صاحب کی دُختر دینا خان کا کھاتہ ہے اور اس میں ۱۰/لاکھ ڈالر جمع ہیں۔

یہ اطلاع ملنے پر مشرف حکومت کے کارپردازوں کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ لیکن بعد ازاں معلوم ہوا کہ یہ ڈالر دراصل دینا خان کی نانی کے تھے جو مرتے ہوئے اپنا ترکہ نواسیوں کو دے گئیں۔ دینا خان کی نانی نے کئی برس اسلام آباد میں اپنی بیٹی کے ہاں ہی گزارے اور وہ پاکستانی دارالحکومت ہی میں دفن ہیں۔ مشرف حکومت کو یہ حقیقت معلوم ہوئی، تو اس کے ارمانوں پر اوس پڑگئی۔

سچ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے عمر بھر جو کمایا، وہ غریبوں کی فلاح و بہبود کے منصوبوں پر خرچ کردیا۔ پھر یہ ڈاکٹر صاحب ہی ہیں جنھوں نے ہندوستان میں اسلام کا جھنڈا گاڑنے والے سلطان محمد غوری کا خوبصورت مزار بنوایا اور انھیں شانِ شایانِ عزت و احترام دیا۔ اب ڈاکٹر صاحب کو پاک فوج کے ''سپیشل پلانز ڈویژن'' سے خصوصی پنشن ملتی ہے۔ (آپ اسی آرمی یونٹ سے وابستہ تھے۔) اسی پنشن سے گھریلو اخراجات پورے ہوتے ہیں۔ شاید اخباری کالم بھی ذریعہ آمدن ہوں۔

اب تک بیان کردہ سچائیوں سے عیاں ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان ایک سچے و پکے مسلمان، عظیم محبِ وطن، غریبوں کے ہمدرد اور شائستہ و نفیس انسان ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ دعویٰ حق بجانب ہے کہ اگر ان کی کوششوں سے پاکستان ایٹم بم نہ بناتا، تو بھارتی بہت پہلے حملہ کرکے ہمیں نابود کرنے کی سعی کرچکے ہوتے۔ لیکن افسوس کہ چند امریکی ٹکوں کی خاطر ہمارے حکمرانوں نے نہ صرف اپنا ضمیر و ایمان بیچا، بلکہ ڈاکٹر صاحب کو بھی رسوا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ لیکن جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے..... جس پر خدا مہربان ہو، اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چوہدری خورشید انور

اُردو کے سرمایۂ افتخار، مختار مسعود

# صاحبِ آوازِ دوست

ایک صاحب طرز نثر نگار کا انمول خزانہ جن کی تحریریں بے رس الفاظ نہیں بلکہ ملک و قوم کی محبت سے شرابور جذبات و خیالات کا گراں بار مرقع ہیں

اس عہد کے خوش فکر اور صاحب طرز دانشور کو اُردو ڈائجسٹ کا خراجِ تحسین ہمیں اپنے ہیروں کی پہچان اور اُن پہ مان، اُن کی زندگی میں ہی کرنا چاہیے

میں شعرِ اقبالؒ کا قتیل ہوں اور نثرِ مسعود کا قائل۔ یوں لکھتے ہوئے پیرومرشد علامہ اقبالؒ کے اشعار ان کی تراکیب ذہن میں آتی اور تحریر میں جگہ پاتی چلی جاتی ہیں۔ انھیں ممیز کرنے کے لیے پیرومرشد علامہ اقبالؒ کے اشعار ان کی تراکیب کے لیے خطِ صلف کا سہارا لیا گیا ہے۔

**مختار مسعود صاحب کے فقرات خطِ اسود اولڈ میں ہیں۔**

**مرزا غالب کے فرمودات خطِ طلعت میں ہیں۔**

**اُردو ادب سے جو اٹھایا وہ خطِ روقہ وغیرہ میں ہے۔**

باقی جو بچا وہ میرا ہے اور وہ نوری نستعلیق۔

ممکن ہے اس اہتمام سے پڑھنے میں روانی نہ رہے، اُس کے لیے پیشگی معذرت.....!

ان سے واقفیت بہت پرانی ہے اتنی پرانی کہ بیسیوں دفعہ ذہن پر زور دینے کے باوجود یاد نہیں آسکا کہ تعارف کب اور کہاں ہوا؟ البتہ انہیں پہلی دفعہ دیکھا تو وہ سکول میں جلسے کی صدارت کر رہے تھے۔ یہ کل کی بات ہے اور ذہن میں اس کی تفصیلات نقش ہیں۔ **'آتش اُن دنوں جوان بھی تھا اور ڈپٹی کمشنر بھی'**، ضلع ملتان میں ان کی تعیناتی کا پہلا سال تھا اور سکول میں طالب علمی کا میرا آخری سال۔ ۱۹۵۸ء میں صوبہ مغربی پاکستان کی حدود موجودہ پاکستان کی حدود پر مشتمل تھیں اور ضلع ملتان موجودہ چار اضلاع ملتان، خانیوال، وہاڑی اور لودھراں کے اضلاع کی حدود پر مشتمل تھا۔ ضلع کا انتظامی سربراہ ڈپٹی کمشنر تھا اور اس پر فائز شخص صاحبِ آن بان ہوتا۔ اختیارات کی حدود اس وقت کی ضلعی حدود کے مانند وسیع تر تھیں اور ان اختیارات کا شہرہ لامحدود تھا۔ صاحبِ ضلع ہونے کی رعایت سے تقریبات میں وہ صدر کی حیثیت سے شرکت کرتے لیکن سچ پوچھیے تو ان تقریبات کے روحِ رواں تھے۔ ان کی زیرِ صدارت آغا شیر احمد خاموش نے پاک و ہند کا وہ عظیم الشان مشاعرہ کرایا جس کی یاد آج بھی اہلِ ملتان کے دلوں کو گرماتی ہے۔ منشی عبدالرحمن خان نے پاکستان میں پہلی بار مقابلۂ حسنِ قرأت کی تقریب کا اہتمام کیا۔ انہی کی روایت ہے کہ یہ فکرِ سعید دراصل 'خیالِ مسعود' تھا!

سکول میں ان کی تقریر سنی تو اردو زبان کی خوش قسمتی پہ پیار آیا کہ ان جیسا مقرر اسے نصیب ہوا ہے۔ پیرومرشد (حضرت علامہ اقبالؒ) کے اشعار پڑھیں تو ترشے ہوئے جواہرات کا احساس ہوتا ہے۔ صاحبِ آوازِ دوست اپنی تقریر میں موتی پروتے اور پیر و مرشد کے اشعار کے حوالوں کے جواہرات ٹانکتے چلے جاتے ہیں۔ پہلی نظر میں وہ سٹیج پر بیٹھے نظر آئے دوسری نظر ڈالی تو وہ دل میں بیٹھے تھے۔ پھر ان سے ملاقاتیں رہیں اور ہر ملاقات میں وہ دل کی مزید گہرائی میں اترتے چلے گئے۔ انہوں نے آوازِ دوست میں لکھا ہے کہ **'کعبۂ دل میں ایک روز جھانکا تو دیکھا کہ ایک صنم نے وہاں گھر کر لیا ہے..... میں نے آگے بڑھ کر نظر ڈالی تو یہ بت ایک دیوی کا نکلا'** اسے قسمت کی خوبی کہیں یا ذوق کی خرابی کہ کچھ لوگوں کو اپنے دل میں کسی صنم کا نہیں جن کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے، جسے وہ اپنی تسلی کی خاطر فطین کا نام دے ڈالتے ہیں۔

☆☆☆

مارچ ۱۹۶۴ء میں، میں ملت ہائی سکول ملتان کے کے۔ جی سیکشن میں کام کر رہا تھا۔ رمضان پراجیکٹ کے سلسلے میں بچوں کا جلسہ تھا۔ بی اے قریشی ملتان کے کمشنر تھے، ان کی اہلیہ اس جلسے کی صدارت کے لیے تشریف لا رہی تھیں۔ مجھے سکول کے بچوں جاوید مرزا، روبینہ مسرت وغیرہ کے ہمراہ کمشنر ہاؤس ملتان بھیجا گیا کہ افسرِ مہمانداری کے خوشگوار فرائض سرانجام دیتے ہوئے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مہمان معزز کو اپنے ہمراہ لاؤں۔ کمشنر ہاؤس پہنچے تو بچوں کو بیگم قریشی کے پاس اندر بھیج دیا، خود لان میں روش پر ٹہل رہا تھا۔ اسی وقت قریشی صاحب باہر سے تشریف لائے۔ ان کے ساتھ مہمان تھے۔ قریشی صاحب تو اندر چلے گئے، مہمان برابر میں آ کھڑے ہوئے۔ میں نے انہیں دیکھا تو حیرت نے مجھے آلیا..... یہ مختار مسعود تھے!

ان سے گپ رہی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے آٹو گراف کی فرمایش کی۔ انہوں نے نصیحت کی ''آٹو گراف تو بڑے آدمیوں سے لیے جاتے ہیں.....!'' میں نے عرض کیا ''کوئی آدمی بڑا ہے یا چھوٹا، اس کا فیصلہ کرنا اس کا کام نہیں ہے۔ میری نظر میں آپ بڑے آدمی ہیں۔'' یہ سطریں لکھتے ہوئے احساس تفاخر کا شکار ہوں کہ ہم نے زندگی میں ڈھنگ کی ایک پیش گوئی کی۔ انہوں نے خوبصورت اور پیاری سی مسکراہٹ سے مجھے دیکھا اور آٹو گراف البم میرے ہاتھ سے لے لی! آوازِ دوست میں بہت سی شخصیات کا ذکر ملتا ہے۔ جن سے آٹو گراف لیے گئے اور صرف ایک آٹو گراف البم کا ذکر ہے جس پر انہیں دستخط کرنا پڑے۔ اس آٹو گراف البم پر انہوں نے نصیحت لکھی **''فتوحات انہی کے حصے میں آتی ہیں جو شکست نا آشنا ہوں۔''** میں نے یہ پڑھا تو مجھے اپنی آٹو گراف البم میں انہی کے ہاتھ سے لکھا ہوا فقرہ یاد آیا They conquer who think they can. اس مماثلت پر خوشگوار حیرت تو ضرور ہوئی لیکن یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ **''اقوام ہوں یا اشخاص، وہ واقعات سے اپنی مرضی کے مطابق سبق لیتے ہیں۔''** مجھے اپنے رجحانات کے مطابق اس فقرے کے مطالب تلاش کرنے چاہئیں۔ انہوں نے تو صرف واقعات کا ذکر کیا ہے، ہماری تنوع پسندی کے باعث ایک ہی نکتۂ ایماں کی مختلف تفسیروں سے لائبریریاں پٹی پڑی ہیں۔

قریشی صاحب نے انہیں اندر بلالیا۔ میں باہر روش پر ٹہل رہا تھا۔ ہاتھ میں ڈائری تھی۔ عید قریب تھی یوں ڈائری میں چند عید کارڈ بھی تھے۔ خیال آیا کہ انہیں عید کارڈ ہی پیش کر دوں۔ چنانچہ عید کارڈ پر چند الفاظ گھسیٹے، لفافے پر ان کا نام لکھا اور کار کی نشست پر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر تشریف لائے، مجھ سے ہاتھ ملایا۔ کار کا دروازہ کھولا، بیٹھنے لگے تو لفافے پر نظر پڑی۔ اٹھایا، پڑھا میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور پوچھا ''بھئی! اتنی سی دیر میں یہ کیا ہو گیا؟'' عرض کیا ''اتنی سی دیر میں یہی کچھ ہو سکا۔'' انہوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا، لیکن گردن ہلانے کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ جواب پسند آیا ہے۔ وہ کار میں بیٹھے اور چل دیے۔ کار گیٹ پر پہنچی تو سڑک کا رُخ کرنے کے بجائے دائرے میں گھومتی ہوئی میرے برابر آرکی۔ وہ باہر نکلے ''بھئی خورشید! کچھ آٹو گراف میں نے بھی لے رکھے ہیں، اگر کبھی فرصت ملے تو بہاولپور آیئے، آپ کو دکھاؤں گا۔'' میری حالت عجیب سی تھی۔ سرِ راہ ملاقات کے حسنِ اتفاق سے نہ سنبھلا تھا کہ مہمانی کی دعوت ملی۔ میرے الفاظ خیالات کا اور خیالات احساسات کا ساتھ دینے سے قاصر تھے۔ یہی کہہ سکا ''ضرور حاضر ہوں گا۔''

☆☆☆

اتوار ۱۵ اپریل ۱۹۶۲ء کو بہاولپور کے ڈپٹی کمشنر ہاؤس میں مہمان کا حقِ آسایش استعمال کرتے ہوئے وہ ننھی سی نیلی البم دیکھی جو ۱۹۳۸ء میں ورما فوٹو گرافر کے ہاں سے خریدی گئی تھی۔ ان دنوں بھی میرا خیال یہ تھا کہ جو شخص پیر و مرشد علامہ اقبالؒ کا معتقد نہیں، وہ کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن سچا پاکستانی اور اردو نواز نہیں۔ ان کے بارے میں میری رائے تھی کہ وہ علامہ اقبال سے متاثر ہیں اور ان کے معتقد۔ لیکن کس حد تک؟ یہ جاننے کے لیے ڈرتے ڈرتے سوال کیا ''علامہ اقبالؒ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟'' ''وہی جو مولانا گرامی کی تھی 'پیغمبری کرد ونتواں گفت'' (اس نے پیغمبری کی لیکن دعویٰ نہ کیا) دل جھوم اٹھا اور اس نے انہیں اٹھا کر آئیڈیل کے مقام پر بٹھا دیا۔ اس ملاقات میں آٹو گراف البم سے متعلق بہت سے واقعات ان کی زبانی سنے۔ سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ سے مجھے بھی عقیدت ہے کہ والدِ محترم ان سے بیعت تھے۔ اپنے ہاں شاہ صاحب کی آمد کا حال سناتے ہوئے انہوں نے پیغامبر سے اپنے پیام کا ذکر ''ڈپٹی کمشنر ملتان نے سلام نہیں بھیجا تھا۔ مختار مسعود نے حاضری کی اجازت چاہی تھی'' کے الفاظ سے کیا تھا! میں نے یہ سنا تو جانا کہ انہوں نے اپنی ذات کو دو حصوں میں بانٹ رکھا ہے۔ یوں جب وہ ملتان میں تعینات تھے تو ڈپٹی کمشنر ملتان کسی کی سیاست سے کوئی واسطہ نہ رکھتا اور سلام بھیجنے کا روادار نہ تھا۔ لیکن مختار مسعود دورِ حاضر کے عظیم خطیب سے ملنے کے خواہشمند تھے اور حاضری کی اجازت کے طلبگار۔ اپنے اس خیال کی روشنی میں مَیں نے ان کی سرکاری حیثیت کو بھلا دیا۔ البتہ اپنی نیاز مندی نہ چھپا سکا۔

۱۰ سال بعد آوازِ دوست پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اس میں یہ پیغام **'میں نے پہلے ہی شاہ جی سے حاضری کی اجازت چاہی تھی سلام نہیں بھیجا تھا'** کے الفاظ میں ملا۔ میں نے حافظے میں موجود فقرے کا اس فقرے سے تقابل کیا۔ الجھن سی تھی۔ دو صفحے پلٹے تو **''حافظہ بھی خواہشات کے تابع ہوتا ہے اور بسا اوقات خواب و خیال کو واقعات و واردات میں تبدیل کر دیتا ہے''** کے الفاظ ملے۔ اُلجھن دور ہو گئی۔ ان کا کہنا ہے **''ایسے میں اس کا کہا مانیں تو نفس اور تاریخ دونوں کا زیاں ہوتا ہے۔''** رہا اس سے اختلاف تو یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے۔ جناب نفس اور تاریخ کا زیاں ہوتا ہوگا۔ لیکن تجربہ بتلاتا ہے کہ تعلقات میں استواری آجاتی ہے۔

☆☆☆

میرے علم میں نہیں کہ انہوں نے اس آٹو گراف البم سے متعلق کہانیاں کسی اور کو بھی سنائی ہوں۔ لیکن وجدان کہتا ہے کہ ایسے اشخاص کی تعداد (اگر ہوں بھی تو) بہت کم رہی ہوگی۔ یوں میں ان چند اشخاص میں شامل ہوں جنھیں اس نیلی کتاب سے متعلق کہانیاں ان کی زبانی سننے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے حفیظ جالندھری سے شاہنامۂ اسلام ان کی جوانی میں سنا جب وہ اسے سناتے ہوئے نہ تھکتے تھے۔ بہاولپور کی اس ملاقات میں وہ سنانے پر مائل نظر آتے تھے اور میں تو ملتان سے ہمہ تن گوش ہو کر چلا تھا۔ اس دن میں نے وہ تصویر بھی دیکھی جس کا ذکر آوازِ دوست میں ملتا ہے **''میں گیارہ بارہ برس کا تھا تو شہر میں پاسپورٹ سائز کی تصویر کھینچنے کی ایک خودکار مشین نصب ہوئی۔ میں نے شوق سے تصویر اُتروائی اور دوسرے دن اسکول لے گیا۔ سبق ہو رہا تھا مگر جو لڑکا میرے ساتھ بیٹھا تھا، اس نے تصویر لے کر پہلے دیکھی اور پھر چپکے سے آگے بڑھا دی۔ وہ تصویر ہاتھوں ہاتھ کلاس میں بہت دُور نکل گئی۔ بالآخر مولانا عقیل الرحمٰن نے دیکھ لیا۔ پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ جس کے ہاتھ میں تصویر تھی، اُس نے ڈر کر اِسے اُستاد کی میز پر رکھ دیا۔ سب اس انتظار میں تھے کہ اب ڈانٹ پڑے اور سزا ملے گی مگر ایسا نہ ہوا۔ مولانا نے تصویر غور سے دیکھی پھر اس پر سعدی شیرازی کا ایک دُعائیہ شعر اپنے خوبصورت خط میں لکھ کر مجھے تصویر واپس کر دی۔ یہ تحریر اور تصویر اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔''**

ان کے استادِ محترم نے سعدی کا یہ شعر لکھا تھا۔

بالائے سرش زہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک عرصے بعد پیر و مرشد کے بارے میں پڑھا کہ ۶ر نومبر ۱۹۳۱ء کو اقبال لٹریری ایسوسی ایشن کا سر عبدالقادر مرحوم کی زیرِ صدارت لندن میں اجتماع ہوا۔ ابتدائی تقریر ڈاکٹر نکلسن نے کی اور فرمایا ''۲۵ر برس پیشتر کسی طالب علم کے متعلق پیشگوئی کرنا مشکل تھا کہ وہ آگے چل کر عظمت کی بلندیوں پر پہنچے گا'' لیکن ۱۹۰۵ء میں اقبال کو دیکھ کر سعدی کا یہ شعر ذہن میں تازہ ہو جاتا تھا۔

بالائے سرش زہوشمندی
مے تافت ستارۂ بلندی

اسے حسنِ اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ دونوں اساتذہ کو بعد مکانی اور بعد زمانی کے باوجود اپنے اپنے شاگرد کے لیے ایک ہی شعر ملا۔ اسے آپ فیضانِ نظر کہیں یا مکتب کی کرامت لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک شاگرد کی شخصیت میں قوم کا اقبال نظر آتا ہے۔ تو دوسرا قوم کے لیے مسعود ہے۔ **بعض دعائیں پیش گوئی کا درجہ بھی تو حاصل کر لیتی ہیں۔**

بہاولپور سے لوٹا تو مشکل آ پڑی کہ اب کس کے آٹو گراف حاصل کیے جائیں۔ ہر شخص اتنا خوش نصیب نہیں ہوتا کہ تربیت اور راہ نمائی کے لیے اللہ تعالیٰ اسے والد کی شکل میں استاد بھی عطا فرمائے جو شیخ ہی نہیں شیخ بھی ہو! (ان کے والد محترم کا اسم گرامی شیخ عطا اللہ تھا، وہی اقبال نامے والے۔) میں نے انہیں لکھا ''میں آپ کے حالات جاننا چاہتا ہوں اور ان عوامل کو بھی جنھوں نے آپ کو یہاں تک پہنچایا۔'' جواب میں انہوں نے لکھا '**عزیزم! آپ واقعات کے تسلسل کو جاننا چاہتے ہیں اور میں نہیں سمجھتا کہ ابھی ان کے ساتھ انصاف کر سکوں گا۔ اس کے لیے مزید دس پندرہ برس درکار ہیں۔**' میں یہ خط بار بار پڑھے جا رہا تھا۔ تین فقرات پر مشتمل یہ ذاتی خط جس میں انصاف نہ کر سکنے کا ذکر تھا۔

بہاولپور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے لکھا تھا۔ اس کے ۱۰ر سال بعد دو مضامین پر مشتمل آوازِ دوست میرے ہاتھوں میں تھی اور مصنف نے جو حکومتِ پاکستان کے معتمد کے فرائض سرانجام دے رہے تھے، بڑے اعتماد سے ان واقعات کا تجزیہ کر ڈالا تھا۔

☆☆☆

میں نے ان سے سوال کیا تھا ''اگر آپ سول سروس میں نہ آتے تو آپ کا کیا پروگرام تھا؟'' جواب مختصر سا تھا ''درس و تدریس اور میں اس کے لیے تیار تھا۔'' اس دلچسپی کو میں نے قیامِ ملتان کے دوران تعلیمی اداروں کی تقریبات میں شرکت کے موقع پر ان کے چہرے پر نمایاں دیکھا۔ اسلامیہ کالج ملتان میں جلسہ تقسیمِ انعامات کی تقریب تھی۔ حاکم ضلع ہونے کی رعایت سے وہ تقریب کے صدر تھے۔ پرنسپل صاحب نے بتلایا کہ کالج کی نئی عمارت کی تعمیر کے لیے رقوم تو موجود ہیں لیکن سنگِ بنیاد کا پروگرام لٹکتا جا رہا ہے۔ اُنہوں نے مزید بتلایا کہ صدر ایوب خان سے درخواست کی گئی اور انہیں کراچی سے بذریعہ ٹرین اسلام آباد جاتے ہوئے ملتان رُکنا تھا۔ لیکن سوئے اتفاق کہ اسی روز ڈاکٹر خان صاحب قتل ہو گئے اور وہ سیدھے نکل گئے۔'' صاحبِ آوازِ دوست نے صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے انہیں مشورہ دیا ''درسگاہ کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے سربراہِ مملکت کی موجودگی ضروری نہیں، آپ اس نیک کام کو جتنی جلدی کر لیتے اچھا ہوتا۔ اور اگر شخصیت کا چناؤ مشکل تھا تو کسی ایسے طالب علم کو جس نے رمضان کے پورے روزے رکھے ہوں، تکلیف دے سکتے تھے اور اگر ایسے طالب علم زیادہ تھے تو قرعہ اندازی کی جا سکتی تھی۔'' اس مشورے کے چند سال بعد مجھے ملتان میں ایک تقریب میں شمولیت کا موقع ملا۔ ایک مختصر اور پُروقار تقریب میں سکول کی عمارت کے ایک نئے حصے کا سنگِ بنیاد رکھنے کی درخواست کرتے ہوئے چودھری عبدالرحمٰن صاحب نے ایک طالب علم کا تعارف کرایا کہ یہ بچہ حافظِ قرآن اور کئی سالوں سے اپنا تعلیمی اعزاز برقرار رکھے ہوئے ہے۔ پابند صوم و صلوٰۃ اور سب سے بڑھ کر اس مرتبہ رمضان المبارک میں تراویح کی امامت کی ہے۔ پورا قرآنِ کریم سنایا ہے۔ یہ درسگاہ بچوں کی اور بچوں کے لیے ہے۔ میرے خیال میں یہ بچہ کسی بھی صاحبِ اختیار کی نسبت اس نیک کام کا زیادہ حق دار ہے۔

ملتان جاؤں تو مسلم ہائی سکول ضرور جاتا ہوں اور عمارت کے اس حصے کو دیکھتے ہی جس کی پیشانی آبرو ئے مازنام مصطفٰے کی تعلیم سے دمک رہی ہے، مجھے وہ مختصر اور سادہ تقریب یاد آتی اور اس کے ساتھ ہی ذہن میں ایک سوال سر اُبھارتا ہے؟ سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے اس بچے کے انتخاب کی بنیاد اسلامیہ کالج ملتان میں دیے گئے مشورے کی بازگشت تھی یا ایک ہی انداز میں سوچنے والے دو نابغوں کی فکری مماثلت و مطابقت کا حسنِ اتفاق؟ یہ سوال پہلی مرتبہ اس تقریب کے دوران ذہن میں آیا۔ بعد میں جب کبھی چودھری صاحب سے ملاقات ہوتی (اور یہ ملاقات ہوتی رہتی تھی کہ ان سے نیازمندی بے تکلفی کی حد کو چھو گئی تھی) تو یہ سوال ذہن میں کلبلاتا۔ کچھ خواہشات کا نا آسودہ رہنا مزہ دیتا ہے میں نے اس سوال کا جواب حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔

☆☆☆

آوازِ دوست کے شائع ہونے کے چند سال بعد میں نے انہیں خط لکھا، کئی مرتبہ آپ کو خط لکھنے اور ملنے پر مائل ہوا لیکن ''**میں نے انہیں (آرنلڈ ٹائن۔ بی کو) اس دن کے بعد ایک روز واشنگٹن میں دیکھا۔ وہ عالمی خوراک کانگریس میں قحط اور انسان کی تاریخ کے موضوع پر تقریر کر رہے تھے۔ میرے اور ان کے درمیان ایک ہزار کا اجتماع حائل تھا۔ میں نے اُن تک پہنچنے کی کوشش ہی نہ کی۔ جب بھی جی چاہتا ہے کہ ان سے ملاقات کروں تو میں مطالعہ تاریخ اُٹھا لیتا ہوں یا اپنی آٹو گراف البم۔**''

ایسی خوبصورت تلقین کے ہوتے ہوئے کہ میرے پاس آپ کے آٹو گراف بھی موجود ہوں اور آوازِ دوست بھی، آپ کو خط لکھنا ذرا حوصلے کا کام تھا۔ آپ آٹو گراف البم لیے ایک شخص کا تعاقب اور ہر ۵ر سال بعد ملنے کی کوشش کرتے رہے اور جب وہ شخص ملا تو جوئندہ 'پائندہ والی بات غلط نکلی۔ اس لحاظ سے (اور صرف اسی لحاظ سے) میں آپ سے خوش قسمت ٹھہرا۔ میں آٹو گراف لے چکنے کے بعد تین چار سال کے وقفے سے ایک شخص سے ملتا رہا (عرصے کی کمی بیشی میری طبیعت کی بے قاعدگی کی غماز ہے) اور میں نے اپنے ممدوح کو تابندہ تر پایا۔ آپ کی ملاقات رہی تو انہوں نے درخواست بڑھا دی۔ میری غیر حاضری کو دیر ہوئی تو آوازِ دوست میرے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ آوازِ دوست پر تبصرہ نہیں کروں گا کہ یہ کام پڑھے لکھوں کا ہے اور میں اپنے آپ کو ابھی اتنا پڑھا لکھا نہیں پاتا۔ البتہ جب میں نے کتاب ختم کی تو مجھے ایک عبارت یاد آئی '**حشر کے دن بہت سے لوگ اعمال نامے ہی نہیں کتابیں بھی لیے کھڑے ہوں گے۔ سرسیّد کے ہاتھوں میں مسدس حالی کا نسخہ ہوگا۔ سلطان جہاں بیگم نے سیرۃ النبوی ﷺ کی جلدیں اُٹھائی ہوں گی، حمید اللہ کے ہاتھ میں ضربِ کلیم ہوگی۔ مغفرت کے بھی خدا نے کیا کیا سامان پیدا کیے ہیں۔**'' اس فہرست میں چند ناموں کا اضافہ آپ کی وجہ سے ہوا بلکہ میرا خیال کچھ یوں ہے کہ آپ کے والدِ محترم اور والدہ محترمہ آوازِ دوست کا نسخہ اٹھائے ہوں گے۔ حافظ سدیدی اعزازِ تزئین لیے ہوں گے۔ خورشید عالم صاحب اعزازِ کتابت تو کوئی اعزازِ اشاعت...... **واقعی**


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

**مغفرت کے بھی خدا نے کیا کیا سامان پیدا کیے ہیں۔** سید قاسم محمود نے ۱۹۷۵ء میں جب شاہکار کتب پیش کیں تو جی بہت خوش ہوا کہ اُردو ادب میں مثبت اور فعال تحریک تھی۔ جی چاہا ان سے ملوں اور جب شاہکار نے آواز دوست شائع کی تو مجھے ان کی دوستی ناگزیر محسوس ہوئی۔ میں نے ملاقات پر ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا ''مختار مسعود نے آوازِ دوست لکھ کر اُردو ادب پر احسان کیا تھا تو آپ نے شاہکار ایڈیشن شائع کر کے اُردو قارئین کو زیر بار کر دیا۔''

آپ نے لکھا ہے **''اہلِ جمال کی پہچان یہ ہے کہ یہ لوگ مسجدِ قرطبہ تعمیر بھی کرتے ہیں اور تحریر بھی، یہ الحکم کی طرح بادشاہ بھی ہو سکتے ہیں اور اقبال کی طرح درویش بھی۔''** میں اس پر صرف اتنا اضافہ کروں گا 'اہلِ جمال اگر مختار ہوں تو الحکم نام پاتے اور مسجدِ قرطبہ تعمیر کرتے ہیں۔ مسعود ہوں تو اقبال نام پاتے اور مسجدِ قرطبہ تحریر کرتے ہیں اور قوم کی خوش قسمتی سے اگر کوئی مختار مسعود بھی ہو تو وہ منارِ پاکستان تعمیر بھی کرتا ہے اور تحریر بھی! آوازِ دوست آپ نے لکھی تو میری رائے یہی ہے کہ آپ نے اُردو ادب پر احسان کیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس سلسلے میں آپکو مبارک باد دوں لیکن مبارکباد کا لفظ اتنا گھسا پٹا ہے کہ استعمال کرنے کو جی نہیں چاہتا البتہ آوازِ دوست کی مدد سے اتنا ضرور کہوں گا کہ **''اردو زبان کو ہمیشہ اِس پر فخر رہے گا کہ وہ آپ کی زبان سے بولی اور آپ کے قلم سے لکھی گئی۔ اردو نے جب بھی اپنے سرمایہِ افتخار پہ ناز کیا ،اِسے بہت سے لوگ یاد آئیں گے۔''**

اس پر اِتنا سا اضافہ ضرور کروں گا کہ ان لوگوں میں ایک نام اگر سرِ فہرست نہیں تو ممتاز ترین ناموں میں سے ایک ضرور ہوگا.....مختار مسعود..... **بات کہاں سے چلی اور کہاں جا نکلی۔ اب بس کرتا ہوں۔** والسلام

☆☆☆

پیر و مرشد نے آخری دنوں میں تمام کتابیں الماریوں میں رکھوا دی تھیں۔ قرآنِ کریم کی جلد ان کے سرہانے موجود رہتی اور اکثر و بیشتر اسی کا مطالعہ فرماتے رہتے۔ پہلی مرتبہ یہ بات پڑھی تو حیرت ہوئی کہ مطالعے کے لیے عام طور پر ہلکے پھلکے ادب سے تعلق رکھنے والی کوئی دلچسپ کتاب اٹھائی جاتی ہے۔ قرآنِ کریم کی عظمت اپنی جگہ مسلم لیکن مطالعے کو جی چاہے تو اسے نکال کر پڑھنا آسانی سے سمجھ میں آنے والی بات نہ تھی۔ اسے 'ضعیف روایت' کے کھاتے میں ڈالنا چاہا لیکن اقبالیات میں اس کا ذکر تواتر سے ملتا ہے۔ یوں جب بھی یہ بات پڑھنے کا موقع ملتا ،مزید حیرت ہوتی۔ آوازِ دوست آئی تو اس کا مطالعہ ہوتا رہتا۔ یہ مطالعہ دنوں اور ہفتوں سے پھیل کر سالوں اور عشروں پر چلا گیا۔ عروبہ (ہماری بیگم نورین طلعت عروبہ) کئی مرتبہ کہہ چکی ہیں کہ کوئی اور کتاب بھی پڑھ لیجئے کہ یہ تو آپ کو حفظ ہو چکی۔'' میں جواب میں صرف مسکراتا اور سوچتا ہوں کہ اچھی کتاب کا حسن یاد ہو جانے سے کم تو نہیں ہوتا۔ اقبالیات میں بہت سے اشعار ایسے ہیں جنھیں ہم بیسیوں مرتبہ دہرا چکے لیکن ان کی تازگی قائم و دائم ہے۔ دراصل جب انتخاب ایک کتاب تک محدود ہو کر رہ جائے تو کتاب کے نفسِ مضمون اور قاری کی سوچ کے درمیان بدرجہ اتم ہم آہنگی موجود ہوتی ہے یا مصنف کی ذات سے قاری کی دلچسپی عقیدت تک پہنچ جاتی ہے۔

پیر و مرشد کا کہنا ہے کہ

جن کی طبیعت قابل نہ ہو وہ
تربیت سے نہیں سنورتے۔
عکسِ سرو کنارِ جو کی مثال
دیتے ہیں۔ جو پانی میں رہ
کر سرسبز نہیں ہوتا۔

آوازِ دوست کا کہنا ہے **''اگر خداداد صلاحیت موجود ہو اور اس کی تربیت اَرسطو اور لیونی ڈس جیسے اساتذہ کے ہاتھوں ہو جائے تو دُنیاوی معاملات کے بارے میں سوچنے کا انداز بالکل بدل جاتا ہے۔''** سفرِ نصیب میں لکھا ہے **دریا اور زندگی دونوں پر بند باندھنا چاہیئے کہ ضائع ہونے سے بچ جائیں۔''** گویا مزاج اور کردار کی بناوٹ میں مبادیات خدا کی دین ہیں۔ تربیت اور ماحول کا اثر اس کی کانٹ چھانٹ کرتا ہے اور انسان کی اپنی کوشش اسے حتمی شکل دیتی ہے۔ یوں جب انتخاب کا موقع آتا ہے تو کوئی

اپنا رزق خاک راہ میں
ڈھونڈتا ہے تو دوسرا نہ
سیپ کو نگاہ میں نہیں لاتا۔

کسی کو آواز دوست اُردو ادب میں ملتی ہے تو کوئی اسے صرف قرآن کریم میں پاتا ہے۔ سچ ہے **''رزق ہی نہیں کتابیں بھی ایسی ہوتی ہیں جن کے پڑھنے سے پرواز میں کوتاہی آجاتی ہے۔''** کوئی سوال کرتا ہے 'از کجای آید ایں آوازِ دوست' (مولانا رومیؒ) دوسرا اس کا حوالہ دیتا ہے اور جواب بھی (علامہ اقبالؒ)۔ تیسرا آوازِ دوست کے نام سے اس کی تشریح کر ڈالتا ہے۔ مختصراً انسان کے اندر کوئی چیز دوست کی آواز کی منتظر رہتی ہے۔ جہاں اِسے یہ آواز سنائی دیتی ہے، وہ لپکتا اور اِس میں کھو جاتا ہے۔

☆☆☆

جدہ رہتے ہوئے ایک مرتبہ حج کی چھٹیاں مصر میں منانے کا پروگرام بنا۔ سوچا اس کے بارے میں کچھ پڑھ لیا جائے۔ عبد بھائی (بڑے بھائی پروفیسر چوہدری عبدالرحمٰن عبد مرحوم) کی مصر اور مصریات سے دلچسپی بہت پرانی ہے اور اس موضوع پر ان کے پاس بہت سی کتابیں بھی ہیں۔ مجھے ریڈرز ڈائجسٹ والوں کی شائع شدہ ایک کتاب یاد آئی۔ اُنہیں لکھا کہ یہ کتاب، ملتان کتاب گھر، گھنٹہ گھر ملتان بھجوا دیں، وہاں سے شیخ جاوید انور مجھے پہنچا دیں گے۔' ایک حاجی کے سامان میں وہ کتاب رکھ دی گئی۔ وہ کتاب بڑی مشکل سے جدہ ہوائی اڈے سے باہر نکل سکی کہ کتاب میں قدیم مصری تہذیب کے حوالے سے پتھر کی مورتوں کے جہازی سائز فوٹو وغیرہ وغیرہ لٹک رہے تھے اور وہاں متعین شرطے (پولیس آفیسر) کتاب کو نہیں اس حاجی کو واپس بھیجنا چاہتے تھے جو ایسی خطرناک بلکہ خوفناک کتاب اٹھائے حج کرنے چلا آیا تھا۔ کتاب ملی، دیکھی تو اُردو ادب کی ۲/شخصیات یاد آئیں اور کتابوں کی ۳/اقسام۔

غالب کو ایک خط موصول ہوا۔ مکتوب نگار کا خط اتنا 'پاکیزہ' تھا کہ غالب ایک لفظ نہ پڑھ پائے۔ انہوں نے جواب میں لکھا **'پیرو مرشد! خط ملا، چوما چاٹا آنکھوں سے لگایا۔ آنکھیں پھوٹیں جو ایک لفظ بھی پڑھا ہو۔ تعویذ بنا کر بکیے میں رکھ لیا ہے، نجات کا طالب غالب!'** دوسرے صاحب آوازِ دوست تھے یہ کہانی ان کے قلم کی زبانی سنیئے **'مجھے رہ رہ کر ایک انگریز افسر کا طنزیہ جملہ یاد آتا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ''ٹائن بی کے مطالعہ تاریخ کے خلاصے کی پہلی جلد تم نے ناحق خریدی۔ ایسی کتاب کے مطالعے کے لیے جو فرصت، رغبت اور اہلیت چاہیئے وہ سرکاری ملازم کے حصے میں نہیں آتی۔'' میں نے اس جملے کا طنز ایک عرصے تک برداشت کیا مگر اس رائے سے اتفاق نہ کیا۔ ایک بار فرصت ملی تو میں نے بڑی رغبت سے اس مصنف کو پڑھ ڈالا۔''** کتاب کی ۳/قسمیں جو یاد آئیں یہ تھیں کہ کچھ کتابیں چکھنے کے قابل ہوتی ہیں۔ بہت سی نگلے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جانے اور ایک آدھ کتاب چبانے اور ہضم کرنے کے زمرے میں آتی ہے۔ یوں عبد بھائی کو رسید دی۔ اس کی تصویریں پڑھ لی ہیں۔ عبارت صرف دیکھی ہے چکھی تک نہیں۔ وہ اور لوگ ہوتے ہیں جو چھوٹا سا طنزیہ جملہ برداشت نہ کر سکیں۔ اسے تعویذ بنا کر تکیے میں نہیں رکھ سکتا کہ اس کا سائز مانع ہے۔ یوں تکیے کے نیچے رکھ دی ہے۔ امید ہے کتاب سے نکلنے والی ریڈیائی شعاعیں دماغ تک پہنچ کر مصر کی تاریخ سے آشنا کر دیں گی!'

☆☆☆

میری معلومات کے مطابق ورما کے ہاں سے خریدی گئی نیلے رنگ کی بیش قیمت آٹو گراف البم پر سب سے پہلا مضمون ایک طالب علم نے لکھا اور وہ بھی اتفاقاً۔ وہ بی اے کا امتحان دے رہا تھا۔ انگریزی ب کا پرچہ تھا۔ مضمون لکھنے کے لیے دیے گئے عنوانات کا جائزہ لے رہا تھا۔ مشاغل کا عنوان دیکھ کر اضطراری طور پر خیال گزرا کہ بہاولپور میں دیکھی ہوئی اس چھوٹی سی نیلی کتاب پر ایک خوبصورت مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ قدرت بعض اوقات انصاف کا اہتمام بھی کر ڈالتی ہے۔ اس مضمون کے معیار کے پیشِ نظر اسے ایک ہی قاری نصیب ہوا۔ 'ممتحن'۔

شادی کے چند روز بعد عروبہ نے پوچھا؟ 'آپ کی زندگی میں کوئی کلاسک قسم کا ڈراما گزرا ہے؟' میں نے بتلایا 'ڈراما تو نہیں البتہ ہم نے ایک مرتبہ ایک پیشکش کی تھی جو بذاتِ خود کلاسک تھی۔ جون ۱۹۶۷ء میں لاہور کے کمشنر ہاؤس میں مختار مسعود صاحب سے ملاقات رہی۔ میرے ذہن میں یہ خیال تھا کہ اس آٹو گراف البم پر ایک خوبصورت مضمون لکھا جا سکتا ہے'۔ میں نے اس خیال کا اظہار کیا۔ کہنے لگے 'بھئی سوچتا تو ہوں لیکن مصروفیت آڑے آتی ہے'۔ **'جوانی اور نادانی کے بہت سے فائدے ہیں'۔** اور ہم اس وقت یقیناً جوان بھی تھے۔ یوں پیشکش کی۔ 'آپ واقعات کی تفصیل دے دیجیے، میں مضمون لکھ دوں گا'۔ انہوں نے کمال متانت سے کہا 'بھئی خورشید! آپ سے اچھا تو میں لکھ سکتا ہوں'۔ میں نے بحث کرنا مناسب نہ جانا کہ جو شخص اتنی پیاری اُردو تقریر کرتا ہو، اس کی تحریر بھی خاصے کی چیز ہو گی۔ ویسے بھی میرا مقصد اور مقصود صرف ان واقعات کو تحریر میں لانے کی تحریک تھا۔

دسمبر ۱۹۷۲ء میں آوازِ دوست کے بارے میں پڑھا کہ یکم جنوری ۱۹۷۳ء کو شائع ہو رہی ہے۔ ملتان کتاب گھر والے شیخ جاوید انور سے کہا، یکم جنوری کو لاہور پہنچو، فیروز سنز سے یہ کتاب خریدو، اِسے باقی مال کے ساتھ نہ بندھوانا بلکہ اپنے بیگ میں لے آنا۔ ۲؍جنوری کی صبح ناشتے کے وقت کتاب میرے ہاتھ میں تھی۔ اسے پڑھتے ہوئے اپنی پیشکش یاد آئی۔ ایک کیفیت تھی جسے بیاں کرنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ یہ مشکل بھی آوازِ دوست نے ہی حل کی اُس **(آرنلڈ نائن بی) کا رویہ دیکھ کر ندامت سے مجھے پسینہ آگیا۔ پسینہ آتا اور خشک ہوتا رہا۔'** معاً قاری اور ادیب کا فرق بھی واضح ہو گیا کہ جو فقط محسوس کر کے رہ گیا وہ قاری اور جو اس کیفیت کو لفظوں میں ڈھال گیا وہ ادیب ہے۔ کتاب کے بارے میں میری مختصر رائے ویسی تھی جو ان کی اہرام مصر کے بارے میں **اب جو یہ مکان بنا تو لوگوں نے دیکھا کہ عجائب عالم کی فہرست میں اضافہ ہو گیا ہے۔** اُردو ادب میں آوازِ دوست کا اضافہ تاریخی بھی ہے اور تعمیری بھی۔ مجھے اُمید ہے کہ تاریخ یہ فیصلہ کرے گی کہ اس کتاب نے اشاعت کے روز سے ہی اُردو دان طبقے کی طرزِ فکر اور طرزِ تحریر پر مثبت اثر ڈالا ہے۔

انہوں نے آٹو گراف البم کا ایک صفحہ ۱۳؍سال تک خالی رکھا کہ قائداعظم کی ہمشیر محترمہ فاطمہ جناح ہی اس پر دستخط کریں گی۔ میں نے پڑھا تو مجھے ایک آٹو گراف البم یاد آئی۔ اس میں بھی ایک صفحہ ۱۹، اُنیس سال خالی رکھا گیا تھا۔ طویل انتظار کے بعد جب آٹو گراف کے لیے درخواست کی گئی تو آٹو گراف دینے والے نے کچھ لکھنے



سے پہلے صفحات پلٹ کر دیکھنا چاہے۔ یہ موقع بہت نازک تھا۔ درخواست دہرائی گئی کہ آٹو گراف دے دیجیے، پھر اس کا مطالعہ کیجیے گا۔ آٹو گراف دینے کے بعد انہوں نے ورق کی پشت پر صاحبِ دستخط کو پہچانا تو آزردہ ہوئے۔ ان کی آزردگی بجا تھی۔ وہ دونوں اپنے زمانے کی معروف شخصیات تھیں لیکن ان کے درمیان فرق کو شرفا زمین آسمان کا فرق کہہ سکتے ہیں اور پنجابی اِٹ کتے دا ویر۔ ان صاحب نے بڑی شوخی سے بتلایا تھا کہ اس ورق کے علاوہ دنیا میں کسی کاغذ پر ان دونوں کے دستخط اکٹھے نہیں مل سکتے۔ ہمیں ان کی بات کا اعتبار آیا۔ خیال آتا ہے کہ موقع ملے تو ان سے کہوں صاحب! آج کے دور میں اصحابِ ذوق کے اثاثوں میں تصویرِ بتاں اور خطوط کے علاوہ ایک آٹو گراف البم بھی ہوتی ہے جو اتفاق سے آپ کے پاس موجود ہے۔ آپ بھی ایک مضمون لکھیے۔ پرانے زمانے میں بعض 'معقول' قسم کے بادشاہوں کو زیادہ سے زیادہ نیند کرنے کا مشورہ دیا جاتا تھا۔ غایت یہ کہ وہ کچھ کرنے سے باز رہیں کہ اسی میں ان کی بھلائی اور دُنیا کا سکون تھا۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے ہم نے کچھ نہ لکھنے کا سوچ رکھا ہے اور بعض کا احسان نہ کرنا ہی سب سے بڑا احسان ہوتا ہے کہ پہلے میں نے ایک آٹو گراف البم پر مضمون نہ لکھا تو اُردو ادب کو آوازِ دوست نصیب ہوئی۔

☆☆☆

درسی کتاب میں 'علامہ اقبال مسجد قُرطبہ میں' پڑھتے ہوئے آٹھویں جماعت کے ایک طالب علم نے سوچا کبھی موقع ملا تو مسجدِ قُرطبہ دیکھوں گا۔ اس کے چند سال بعد مسجدِ قُرطبہ نظم پڑھنے کا اتفاق ہوا تو اس کی خواہش تھی کہ مسجدِ قُرطبہ جانے کا اتفاق ہو تو مسجد میں بیٹھ کر یہ نظم پڑھی جائے۔ منارِ پاکستان کا مضمون پڑھنے کا اتفاق کئی مرتبہ ہوا اور کئی مرتبہ منارِ پاکستان کی بالائی منزل پر بھی پہنچا۔ ایک مرتبہ خیال آیا کہ کبھی منارِ پاکستان کی بالائی منزل پہ بیٹھ کر اس مضمون کو پڑھا جائے۔ خواہش جائز تھی لیکن پرانی خواہش یاد آئی، مسجدِ قرطبہ میں بیٹھ کر مسجدِ قرطبہ کی نظم پڑھی جائے۔ صاحبِ آوازِ دوست ایک مرتبہ آٹو گراف نہیں لے پائے تھے کہ وہ حفظِ مراتب کے قائل ہیں۔ مجھے ان کی یہ ادا اچھی لگی۔ سو اس کے تتبع میں منارِ پاکستان پر چڑھ کر مضمون پڑھنے کی خواہش کو موخر کیا۔ اِس دوران میں یہ خیال بھی آیا کہ نظم اور مضمون کے پڑھنے کے پروگرام تو بن رہے ہیں، کتاب کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔ یوں ترتیب یہ رکھی کہ اگر قدرت مہربان ہو تو حرم نبوی ﷺ میں بیٹھ کر قرآنِ پاک ختم کیا جائے۔ پھر مسجدِ قرطبہ جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں یہ نظم پڑھ لی جائے اس کے بعد منارِ پاکستان کی باری آئے گی۔ حج پر جانے کا موقع ملا اور پھر حرمِ نبویؐ میں ۴۰؍نمازیں ادا کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ اسی دوران میں نے وہاں بیٹھ کر قرآنِ کریم ختم کیا اور اس سعادت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

مسجدِ قرطبہ کی نظم کو میں امتِ مسلمہ کی طرف سے ایک حساس دل کی اجتماعی دعا جانتا ہوں۔ یہ دعا کار جہاں بے ثبات کے فلسفے سے شروع ہوتی ہے اور واحد استثنائی صورتِ حال عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام کا درس دے کر 'معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود' تک پہنچتی ہے۔ یہاں پہنچ کر عشق کی مزید تشریح ہے کہ یہ نہ تو صرف جمال ہے اور نہ ہی فقط جلال۔ بلکہ ان دونوں کا خوبصورت امتزاج اور مرقع ہے اور اس کا فلسفۂ زندگی قلیل امیدوں اور جلیل مقاصد سے عبارت ہے۔ اس کی سلطنت فقر ہے شاہی نہیں۔ پھر تجاہل عارفانہ کے انداز میں سوال ہوتا ہے عشق بلا خیز کا قافلۂ سخت جان کون سی وادی کون سی منزل میں ہے؟ سوال کا یہ انداز واضح کرتا ہے کہ عشق بلا خیز کے قافلے (اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دور) کو یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا، اِسے دیر ہو رہی ہے۔ پھر وہیں مسجد کے نواح میں کھڑے کھڑے **تیرے کنارے کوئی کسی اور زمانے کے خواب دیکھ رہا ہے** کی نوید سنائی گئی ہے۔ دُعا یہاں ختم ہو جاتی تو بات تشنہ رہ جاتی وہ حکیم الامت تھے۔ مرض کی تشخیص اور بیماری کی تفصیل کے بعد مریض کے ہاتھ میں نسخہ تھما دیا۔ **وہ قوم جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب کرتی ہے، دستِ قضا میں شمشیر کی صورت ہے**۔ رہے عمل تو ان کے بارے میں جاتے جاتے دوبارہ یاد دلاتے ہیں کہ **خونِ جگر کے بغیر سب نقش ناتمام ہیں اور نغمہ سودائے خام ہے**۔

جب بھی اور جہاں کہیں موقع ملا ہے، میں نے اِسے بار بار پڑھا ہے۔ حرمِ مکہ، حرمِ نبوی، میدانِ عرفات، منیٰ وغیرہ میں پڑھ چکا ہوں۔ مسجدِ قُرطبہ میں داخل ہوا تو اس عمارت پر کسی خوبصورت غزل کا گمان گزرا 'ایک شاعرانہ تخیل جسے چابکدستی سے اینٹ اور گچ میں مجسّم کر دیا گیا ہو۔' پیرو مرشد نے اس عمارت کے **جلال و جمال کو مردِ خدا کی دلیل ٹھہرایا کہ وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل** صاحبِ آوازِ دوست نے اہلِ جمال کا حوالہ دینا چاہا تو اینٹوں کی عمارت اور لفظوں کی امارت کا یہی مرقع یاد آیا۔ مسجد میں بیٹھ کر نظم پڑھی۔ یہ دو آتشہ سرور تھا۔' سوچ رہا تھا کہ **وہ مقام جہاں خواہشِ قلبی اور فرضِ منصبی کی حدیں مل جائیں، اسے خوش بختی کہتے ہیں'** جس آن دو خوبصورت خواہشوں کو پورا ہوتا دیکھیں، اس کے لیے کون سا لفظ مناسب ہے؟ افسوس اپنا تبحرِ علمی اس سوال کا جواب نہ دے سکا۔ پھر ایک دن منارِ پاکستان کی فوقانی منزل پر کھڑے کھڑے منارِ پاکستان کا مضمون پڑھ ڈالا۔ خوش تھا کہ قدرت نے اس مقام پر اس مضمون کو پڑھنے کا موقع دیا۔ یوں ایک فہرست تمام ہوئی۔ افسوس ہو رہا تھا کہ مختلف مقامات اور ان سے متعلق ادب کے شہ پاروں سے اپنی شناسائی بڑی سطحی ہے۔ مطالعہ وسیع ہوتا تو صورتحال مختلف ہوتی۔

☆☆☆

چاند سے ان کے تعلّقات بہت پرانے ہیں۔ ان تعلّقات کا آغاز طالب علمی دور کے اختتام پر ہوا۔ سفر نصیب تھے سو ملکوں ملکوں گھومے۔ خوش نصیب تھے سو چاند ساتھ ساتھ رہا۔ یہ تعلّقات محرمانہ بھی ہیں اور آبرومندانہ بھی۔ **بارہا ایسا ہوا کہ لکھنے بیٹھے ورق سادہ کا سادہ رہا۔ فغاں پختہ نظر آئی تو چاند سیاہی کی سطح پر تیر گیا اور اس نے سادہ کاری کی اجازت دے دی۔** آتش نے شاعری کو مرصع سازی کہا اور انہیں نثر میں سادہ کاری (سونے کی زمین پر سونے کا نفیس کام) کی اجازت ملی۔ مرصع سازی داغ کے محبوب کی یاد دلاتی ہے۔ **بھنویں تنی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں**۔ سادہ کاری غالب کے محبوب کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ **سادگی و پرکاری کا مرقع، جو تغافل میں بھی جرأت آزما** ہے۔ یوں بھی سادہ کاری، سادگی کی ابتدا سے شروع ہوتی ہے اور پرکاری کی انتہا پر ختم۔ (کہ سادہ کاری کا لفظ لکھتے ہوئے شروع میں سادگی کے ابتدائی حروف س ا د لکھے جاتے ہیں اور آخر میں پرکاری کے آخری حروف 'ک ا ر ی') میں مضمون لکھنے بیٹھا ہوں کون **قلم تراشے، دوات بنائے اور پھر انتظار کرے کہ چاند سیاہی کی سطح پر تیرتا نظر آئے؟** یوں بال پوائنٹ ہاتھ میں اور **بجلی کی روشنی میں اندھیر مچ رہا ہے**۔



انہیں پلو ٹارک کی بدولت ایک فقرہ ہاتھ لگا جسے وہ تقسیم کرنا چاہتے تھے۔ ہم خوش قسمت نکلے کہ ان کی تحریر میں بہت سے ایسے فقرے ملتے ہیں جو حاجت مندوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ وہ انہیں وصول نہ کر پائیں ایک واقعہ آپ بھی سنیئے۔ یورپ کی سیاحت کے دوران لندن جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک صاحب ملے اپنی داستان غریب حمزہ لے کر بیٹھ گئے لبِ لباب 'مدت ہوئی ہم نے پاکستانی بود و باش کو خدا حافظ کہہ ڈالا' لیکن یہ پڑھا لکھا مہذب معاشرہ ہمیں اپنانے کے لیے تیار نہیں۔ بچے عجیب عجیب نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو گئے ہیں...... داستان خاصی طویل تھی میں چپکے سنتا رہا اور اس دوران ایک فقرہ میرے ذہن میں گونجتا رہا۔ وہ تنک کر بولے 'آپ بھی تو کچھ کہیئے۔' میں نے بے دھیانی میں وہی فقرہ لڑھکا دیا '**ہوائی جہاز کا سفر بھی خوب ہے۔ زمین سے فاصلہ بڑھتا چلا جاتا ہے اور آسمان سے دوری کم ہونے میں نہیں آتی۔**' وہ ناراض ہو گئے 'کمال ہے میں اپنا رونا رو رہا ہوں اور آپ اپنی سیاحت میں مست ہیں۔'

☆☆☆

اقبال ارشد بے تکلّف دوست اور اچھے شاعر ہیں۔ شاعری کے ناتے کبھی کبھار ان کی خود اعتمادی کے غبارے میں بہت زیادہ ہوا بھر جاتی تو میں صاحبِ آوازِ دوست سے ملاقات کے ذکر کی سوئی چبھو دیتا۔ حالات اور بندے ٹھیک ہو جاتے۔ اس ملاقات کے ذکر میں شاہ کی تعریف تو یقیناً کم ہوتی لیکن **شہ کا مصاحب ہونے** کے ناتے **اِترانے** کا سلسلہ خاصا دراز ہوتا! عوامی دور میں وہ پاپولیشن پلاننگ میں میرے رفیقِ کار تھے۔ ایک دن کہنے لگے 'خورشید! بھئی وہ مختار مسعود صاحب صحت کے سیکرٹری ہو گئے ہیں، اپنا محکمہ بھی انہی کے پاس ہے، تمہیں ان سے ملنا چاہیے۔ ممکن ہے تمہاری ترقی کی کوئی بات بن جائے۔' سیڑھیاں چڑھنے کا وہ طریقہ جس کا ذکر آوازِ دوست میں ملتا ہے۔ ان دنوں وطنِ عزیز میں عام تھا۔ سیڑھیوں کی آرایش کے سلسلے میں محکمہ 'خود کفیل' تھا۔ یوں اس کا چلن ذرا زیادہ ہی تھا۔ ہم نے بعض 'باصلاحیت افسران' کو سیڑھیاں چڑھتے نہیں، پھلانگتے دیکھا۔ ان کی قابلیت ان سیڑھیوں کو سجانے تک محدود تھی جس کے لیے یہ لوگ بڑے التزام سے چند تاریخیں یاد رکھتے اور بڑے اہتمام سے بھول جاتے کہ تاریخ ایسے لوگوں کو کس انداز میں یاد رکھتی ہے۔

میرے دوست کی سوچ صحیح تھی اور مشورہ درست لیکن مخاطب غلط۔ میں نے عرض کیا 'مختار مسعود صاحب سے ملنے کو جی چاہتا ہے لیکن سیکرٹری ہیلتھ کی خدمت میں حاضری دینا اپنے بس کی بات نہیں۔' انہوں نے جواب سنا تو ہمیں سودائی جانا۔ شاعر تھے یوں ان پر آمد طاری ہوئی جسے بے تکلّف دوستی نے رفت کا رخ دے ڈالا۔ غنچہ اور قلمدان موجود نہ تھے۔ لہٰذا اس سودائی کی شان میں سودا کے انداز میں نثری قصیدے گھڑے اور گرما گرم سنا ڈالے۔ شریفانہ الفاظ میں ان کا مطلب کچھ یوں تھا 'نالائق! تم شرافت کو گود میں لیے بیٹھے رہو جبکہ احمق طبقہ اپنے مخصوص انداز میں ترقی کی سیڑھیاں فرفر پھلانگتا چلا جا رہا ہے۔ دیکھتے نہیں کیسے کیسے نالائق ہمارے افسر بن رہے ہیں؟ یہ کس اہلیت کی بِنا پر ہے؟ اپنا یہ حال کہ طبیعت **کسی بندے سے اس کی خدائی کی زکوٰۃ قبول کرنے پر تیار نہ تھی۔ ویسے بھی حصولِ جاہ مذاقِ تلاش سے وابستہ ہے۔** ادھر ان کا نادر مشورہ بلکہ نادری حکم تھا کہ میں **اٹھوں اور اس تگ و تاز میں شریک ہو جاؤں۔**

ایک عرصے بعد محمد نقوش مرحوم کا مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اس میں گلہ بھی تھا کہ جن دنوں یہ پی آئی ڈی سی کے چیرمین تھے۔ ان کا محکمہ نمک کے پرمٹ بانٹتا تھا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ اپنے کسی عزیز کی دال روٹی کے لیے نمک کا پرمٹ چاہتے تھے۔ ذکر کیا تو انتظار کرنے کو کہا گیا کہ ان دنوں کچھ لوگ عام نمک سے نمک سلیمانی بنائے بغیر گنجِ سلیمان اور کالا نمک بنائے بغیر کالا دھن بنا رہے تھے۔ صاحب محکمہ جانتے تھے کہ **'کوئلوں کی دلالی میں صرف منہ کالا ہوتا ہے اور ڈرتے تھے کہ قیمتی پتھروں کی کان کنی میں جان کنی کا بھی خطرہ تھا'** سو انہوں نے محکمہ کی کانوں کو ناحق کے معاملات کے لیے بند رکھا البتہ اپنے کانوں کو حق بات سننے کے لیے کھلا چھوڑ دیا۔ فرہادانِ وقت نے **دُنیاداری اور دُکانداری** کے تیشوں سے زور آزمائی شروع کی تو **یارانِ نکتہ دان کو صلائے عام** دے ڈالی اور سرِ بازار نیلام لگا دیا۔ اسے پڑھ کر اطمینان ہوا کہ دستِ سوال دراز کر کے خفیف نہ ہوئے تھے۔ دستِ سوال کے بارے میں خیال تھا کہ **دستِ طمع** کا بھائی ہے اور **سرہانے دھرے دھرے سو گیا ہے**۔ ایک دن یہ غلط فہمی بھی دور ہوگئی۔

تلاشِ معاش کے سلسلے میں چند سال جدہ میں گزارنے کا موقع ملا۔ تصویرِ یار دیکھنے کے لیے گردن کا جھکانا کافی ہے اور جدہ میں رہتے ہوئے عمرے کی ادائیگی کے لیے گاڑی کی چابی گھمانا۔ یوں وہاں رہتے ہوئے عمرے کی ادائیگی کے بے شمار مواقع ملے۔ ایک مرتبہ ذہن میں اس خیال نے سر ابھارا کہ قدرت مہربان ہو تو ایک عمرہ صاحبِ آوازِ دوست کی معیت میں کیا جائے۔ پھر اس خیال نے آہستہ آہستہ خواہش کی شکل اختیار کر لی جو ایک دِن نوکِ قلم سے پھسلی اور کاغذ پر آرہی۔ میں نے انہیں لکھا

**میر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ**

اوراس کیا کیا کچھ میں ایک دبی دبی خواہش آپ کی معیت میں عمرہ ادا کرنے کی ہے۔ اگر آپ کبھی جدہ تشریف لائیں تو...... نسیم سحر جدہ کے ادبی حلقوں میں بڑا معتبر نام ہے۔ غزل، آزاد نظم، ہائیکو، تنقید، مزاحیہ شاعری، غرض سبھی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے اور نام کماتے ہیں۔ رابطہ عالمِ اسلامی بینک جدہ کے چیئرمین کے ساتھ منتھی ہیں۔ ان سے بے تکلفی ہے، ایک دن عرض کیا 'مختار مسعود صاحب جدہ آئیں تو آپ کے بینک میں بھی ان کا آنا ہوتا ہے۔ اگر آپ ان کی آمد سے مطلع فرما سکیں تو عنایت ہوگی۔' انہوں نے وعدہ کر لیا۔ ایک دن دفتر سے گھر آیا۔ عروبہ نے دروازہ کھولتے ہی کہا 'اتنی پیاری خبر ہے کہ آپ خوشی سے جھوم اٹھیں گے۔' الٰہی خیر کیا خبر ہو سکتی ہے؟ ہم نے سوچا اور اندھیرے میں تیر پھینکا 'معلوم ہے مختار مسعود صاحب جدہ میں ہیں۔' 'تو آپ کو ان کا پیغام مل گیا تھا؟' اب حیران ہونے کی باری میری تھی۔ صاف اقرار کیا کہ پیغام وغیرہ تو نہیں ملا۔ عروبہ نے بتلایا کہ پانچ بجے ان کا فون آیا تھا۔ ہوٹل میں ہیں۔ آپ انہیں فون کر لیجیے! فون کیا تو بڑی شفقت سے بولے 'تھوڑا سا آرام کر لوں، آپ مغرب کے بعد آجائیے' فون بند کر کے نسیمِ سحر کا نمبر گھمایا اور گلہ کیا کہ ایک کام آپ سے کہا تھا، آپ بھول گئے۔ کہنے لگے' آپ یقین کریں کہ مجھے بھی شام ساڑھے چار بجے علم ہوا کہ وہ آئے ہوئے ہیں۔ ابھی ابھی دفتر سے لوٹا ہوں۔ سوچ رہا تھا کہ کپڑے بدل کر آپ کو فون کروں گا کہ اتنی دیر میں آپ کا فون آگیا۔'

مغرب کے بعد میں اور عروبہ ان کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے بتلایا' بینک والوں کا کوئی کام تھا۔ مجھے بلایا۔ حرم میں حاضری کا موقع نظر آیا۔ سو چلا آیا۔ تین دن سے کام میں مصروف تھا۔ شام ساڑھے چار بجے کام سے فارغ ہوا تو سوچا احباب سے گپ شپ ہو جائے۔ آپ کے دفتر فون کیا تو آپ دفتر سے نکل چکے تھے۔ گھر فون کیا تو عزیزہ سے بات ہوئی'۔ مجھے آوازِ دوست کی چند سطریں یاد آئیں **'بڑے آدمی وہی اچھے ہوتے ہیں جو کام میں مصروف ہوں تو سو پردوں میں پوشیدہ رہیں اور جب فارغ ہوں تو سارے حجابات دُور ہو اور یارانِ نکتہ داں کے لیے صلائے عام بن جائیں۔'** شاعر نے عید کے حوالے سے **رسمِ دنیا، موقع اور دستور کا ذکر کیا ہے**۔ جدہ کی رعایت سے میں حرم پاک، عمرے اور معیت کا سوچ رہا تھا۔ سو پوچھ لیا 'عمرے کا کیا پروگرام ہے؟' بتلانے لگے ''صبح ان شاء اللہ جاؤں گا۔ آج دفتر میں ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ صبح اکٹھے چلتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ بھئی عمرہ تو بندے اور مولا کے درمیان تعلق کا سلسلہ ہے۔ اس میں رفاقت نہیں چلے گی۔'' یہ سنا تو جانا کہ **غالب ادائے خاص سے نکتہ سرا ہونا** چاہتا ہے۔ قدرت مہربان ہوئی تھی تو **چشمۂ حیوان چل کر گدائے میکدہ** تک پہنچ گیا تھا۔ دل و دماغ میں جنگ جاری تھی۔ دماغ کا کہنا تھا، لب بام دو چار ہاتھ نہیں ایک اظہارِ خواہش پر موقوف ہے۔ ہمت سے کام لو، اظہار تو کر ڈالو' یہ موقع پھر نہ جانے کب ملے؟ دل نے حوالہ دیا۔ **ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں** پیرو مرشد کا حوالہ آیا تو **گدائے میکدہ نے بے نیازی سے سبو توڑ دیا** نیاز مندی کا سکوت نہ توڑا۔ جدہ چھوڑ کر لاہور آبسے۔ ایک دن ان کے ہاں ملنے کے لیے گئے تو مغرب کا وقت ہوگیا۔ ایڈمنسٹریٹو سٹاف کالج کی پیاری سی مسجد کی پہلی صف میں محمود و ایاز اکٹھے کھڑے تھے۔ سلام پھیرا تو محسوس ہوا کہ قدرت نے اس خلش کی تلافی کر دی ہے اور پھر یوں ہوا کہ روزگار کی چیل نے پنجوں میں دبوچا اور دوبارہ جدہ لا پھینکا۔ ایک دن ان کا فون آیا وہ مکہ میں تھے۔ مکہ پہنچا انہیں فون کیا پوچھنے لگے 'آپ اس وقت کہاں ہیں؟' عرض کیا 'مکہ المکرمہ میں، حرم پاک کے

### مارگلہ سے البرز تک

میں وہاں موجود نہ تھا۔ اور ہوتا بھی کیسے کیونکہ یہ بات ڈھائی ہزار سال پرانی ہے۔ ایران کے جنوب سے ایک زیرِ فرمان اٹھا اور فرمانروا کو شکست دے کر بادشاہ بن گیا۔ حوصلہ مند شخص تھا۔ محض ایک ملک کی بادشاہت پر کیونکر قناعت کرتا۔ شہروں شہروں اپنا جھنڈا گاڑتا ہوا اور ملکوں ملکوں دوسروں کے جھنڈے سرنگوں کرتا ہوا دریائے فرات کے کنارے بابل تک جا پہنچا جو اس زمانہ کا سب سے بڑا شہر تھا۔ دیوتاؤں کا شہر، بہت بڑی سلطنت کا دارالسلطنت۔ تین طرف تہ بہ تہ مضبوط فصیل، چوتھی جانب فرات کا دریا۔ قلعہ بندی مکمل، بظاہر یہ شہر ناقابلِ تسخیر نظر آتا تھا، مگر ایک کسر تھی۔ وہ یہ کہ لوگوں میں اتحاد اور اتفاق نہ تھا۔ آپس میں ان بن، حکومت سے بیزار، بادشاہ سے ناراض، ملک اور مستقبل سے لاتعلق۔ بے چینی کے کئی اسباب تھے۔ ایک سبب یہ بے ڈھب اعتراض تھا کہ مقامی دیوتاؤں کی بہتات کے باوجود بادشاہ نے پوجا پاٹ کے لیے غیر ملکی دیوتاؤں کے بت کیوں درآمد کیے ہیں۔ لوگ بتوں سے ان کی قومیت اور خداؤں سے ان کی شہریت پوچھتے تھے۔ جہاں انسانوں کے ساتھ دیوتا بھی مقامی اور مہاجر کی بحث میں شامل ہو جائیں اور درآمد و برآمد کے جائز یا ناجائز ہونے کے جھگڑے میں فریق بن جائیں، وہاں حملہ آور کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ بابل پر چڑھائی کرنے والے کا راستہ یہ پراگندہ حال لوگ کیسے روکتے۔ اگر ذرا سی دیر کے لیے اسے کسی نے روکا تو دریائے فرات تھا۔ حملہ آور نے حکم دیا کہ دریا کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ حکم بجالانے والوں نے نہریں کھودیں اور دریا کا رخ موڑ دیا۔ تاریخ کے دھارے کا رخ خود بخود تبدیل ہوگیا۔

اس جنگجو بادشاہ نے نہ جانے کیوں، چن چن کر وہ سارے علاقے فتح کیے جن کے نام آنے والے زمانہ میں متروک ہونے والے تھے۔ آج کل ایسے نام سننے میں آتے ہیں نہ کہیں نقشہ پر دکھائی دیتے ہیں۔ مشکل اتنے کہ نام لینا چاہیں تو زبان موٹی پڑ جائے۔ شاید وہ ان لوگوں کو سزا دینا چاہتا تھا جنہوں نے اپنی بستیوں کے نام رکھنے میں عام آدمی کی سہولت کا خیال نہیں رکھا۔ ان غیر معروف علاقوں کا محلِ وقوع معلوم کرنے کے لیے میں زمانہ قدیم کے آثار شناس سے رجوع کرتا ہوں۔ میڈیا، شمال مغربی ایران ہے۔ لیڈیا، مغربی ترکیہ ہے۔ پارتھیا، شمالی ایران کا نام ہے۔ باکتریا، افغانستان ہے۔ بلخ کو ان دنوں باختر کہتے تھے اور ہمدان کو اکبتانہ۔ رہا گیڈروشیہ تو وہ اپنے مکرانیوں والا مکران ہے۔ الغرض وہ مقامات جنہیں ہم کسی دوسری دنیا کا حصہ سمجھتے تھے، اپنے گردوپیش کے جانے پہچانے علاقے نکلے۔ وہ شخص اپنے قرب و جوار کا بادشاہ نکلا۔ اس کی فتوحات کی فہرست میں ملکوں اور شہروں کے ناموں کے بعد وغیرہ وغیرہ لکھا ہوا ہے۔ یہ وغیرہ وغیرہ وہ مقامات ہیں جنہیں بادشاہ مورخ کی مدد سے فتح کرتے چلے آئے ہیں۔ ان کے نام میں وقت کے ساتھ کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ کل بھی وغیرہ وغیرہ تھے اور آیندہ بھی اسی نام سے پکارے جائیں گے۔ بے مصرف زندگیاں بھی ان بے نام بستیوں کی طرح ہوتی ہیں۔ جیے تو ایرا اور غیرا۔ مرے تو وغیرہ وغیرہ۔

(جناب مختار مسعود کی کتاب لوحِ ایام کا ابتدائی صفحہ)





Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سامنے ہلٹن ہوٹل کے استقبالیہ پر۔ ''ٹھیک ہے میں نیچے آرہا ہوں۔'' ''جی نہیں میں صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ آپ کمرے میں موجود ہیں، حاضر ہوتا ہوں!'' ملاقات ہوئی۔ گپ رہی۔ مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔ حرم پاک میں آئے مغرب ادا کی۔ اس کے بعد انہوں نے دعوت دی 'آئیے طواف کریں۔' دورانِ طواف اُردو ادب کی چند سطریں یاد آئیں ''**جب میں نے اُردو کے ممتاز ادیب اور دیرینہ کرم فرما ممتاز مفتی کا سفرنامہ حج پڑھنا شروع کیا تو اپنا داہنا ہاتھ ان کی طرف اس طرح بڑھایا کہ وہ اپنی اصل لمبائی سے کہیں زیادہ لمبا ہو کر دُور تک مصنف کے پیچھے چلا گیا۔ یہ اضافی اور عارضی لمبائی اسے شدتِ شوق نے عطا کی تھی۔ خیال تھا کہ مصنف ایک اُنگلی میری طرف بڑھائیں اور کہیں گے لو، اِسے پکڑ لو اور پھر سفر میں مجھے ساتھ ساتھ رکھیں گے لیکن مصنف نے میری طرف قطعاً کوئی توجّہ نہ کی۔ ایک بار اچٹتی نظر بھی نہ ڈالی اتنا کہنہ مشق ادیب اور میرے جیسے دوست اور قاری سے یہ بے اعتنائی۔ لبیک ختم ہوئی بات میری سمجھ میں آگئی۔ مصنف کے ہاتھ خالی نہ تھے۔ وہ مجھے کیا دیتے۔ انہوں نے خود دونوں ہاتھوں سے قدرت اللہ شہاب صاحب کا احرام تھاما ہوا تھا اور وہ بھی اتنی مضبوطی سے کہ شہاب صاحب کا احرام کھل کھل جاتا تھا۔**'' صورتِ حال پر غور کیا تو ہزار شکر سلامت رہا

ترا احرام گنگنانے کو جی چاہا کہ دلیل حجاب شدتِ شوق کے ہاتھ کو وہ اضافی اور عارضی لمبائی عطا کرتی ہے کہ وہ لمبا ہو کر مصنف تک جا پہنچے۔ لیکن حضور کی لذت میں کندھے سے کندھا جڑا ہو تو مٹا دیا میرے ساقی نے دفترِ من و تو کا سماں بندھ جاتا ہے! اور پھر یوں بھی ہوا کہ وہ اُردو نثر کا عالمی اردو ایوارڈ وصول کرنے دوحہ پہنچے۔ بھابھی ساتھ تھیں۔ (وہاں ملاقات رہی)۔ دوحہ سے وہ ریاض آئے کہ سہیل مسعود وہیں تھے۔ پھر حرمِ پاک میں حاضری۔ واپسی پر جدہ میں چند گھنٹوں کے لیے ٹھہرے۔ میں عروبہ اور بچیاں انہیں ملنے گئے۔ انہوں نے اپنا احرام مجھے دیتے ہوئے کہا ''بھئی! سامان زیادہ ہے اسے کہاں اٹھاتا پھروں گا۔ کسی مستحق کو دے دیجئے گا۔'' عروبہ بول اٹھیں ''یہ کسی کو نہیں دیں گے، خود رکھیں گے۔'' تردید کی مجال نہ تھی فوراً تائید کی 'بندہ خود بھی تو مستحق ہو سکتا ہے۔'

شعرِ اقبال سے عشق کی بنا پر علامہ اقبالؒ کو پیر و مرشد کہتا اور لکھتا ہوں۔ نسیم سحر بے تکلف دوست ہیں۔ نثر مسعود (آوازِ دوست اور سفر نصیب) میں میری دلچسپی کے حوالے سے انہیں میرے اسسٹنٹ نے پیر و مرشد کہا تھا۔ احرام ملنے پر خیال آیا کہ اگلے وقتوں میں مرید اپنی ذات کی نفی کر کے پیر سے عقیدت کے دھاگے سے سلا ہوتا تھا۔ یوں اسے خرقہ عطا ہوتا تھا۔ آج مرید کو عقیدت کی وہ شدت کہاں نصیب کہ وہ اپنی شخصیت کو پیر کی شخصیت میں گم کر ڈالے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی شخصیت کو الگ رکھتا ہے۔ لہٰذا اس کے حصے میں الگ الگ دو چادریں آتی ہیں۔ یہ الگ بات کہ دنیا بھر کے گوشے گوشے میں بسنے والے مسلمان دعا مانگتے رہتے ہیں کہ انہیں حج یا عمرے کی سعادت نصیب ہو اور وہ احرام کی انہی چادروں کا استعمال کر سکیں۔

دُنیائے نفسیات کی بھول بھلیاں

# ذہنی دباؤ بُرا ہے تو... اچھا بھی

مرد و زن کو نشانہ بنانے والی نفسیاتی کیفیت کی منفی و مثبت خصوصیات عیاں کرتا انوکھا شہ پارہ

تحسین بانو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# صبح

سویرے آپ گھر سے نکلے، تو ایک حادثے سے بال بال بچے۔ دفتر پہنچے، تو وہاں کسی مسئلے پر ایک ساتھی سے الجھ گئے۔ شام کو گھر وارد ہوئے، تو سوئی گیس اور بجلی کے بل ہاتھ میں پکڑے بیوی نے استقبال کیا۔ بس اب صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا، ذہنی دباؤ کا ایسا مسئلہ ہوا کہ آپ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

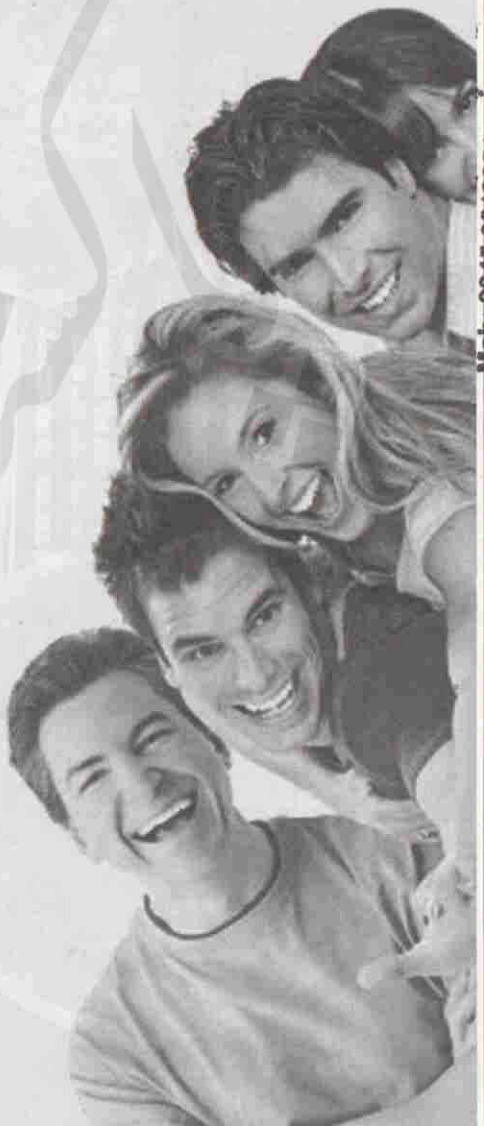

جوان ہو یا بوڑھا اور بچہ، ہر انسان کو دن میں کبھی نہ کبھی ذہنی دباؤ سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہ دباؤ پھر خیالات پر اثر انداز ہوتا اور صورت حال تک تبدیل کرنے کی قدرت رکھتا ہے لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی، ذہنی دباؤ ہمارے اندر جسمانی تبدیلیاں بھی پیدا کرتا ہے۔ تب انسانی جسم مختلف ہارمون خارج کرتا ہے جو ہمیں حملہ کرنے پر تیار کرتے یا فرار ہونے پہ اکساتے ہیں۔ یہی کیمیائی مادے پھر ہمارا بلڈ پریشر بڑھاتے اور دل کی دھڑکن بڑھا دیتے ہیں، یوں ہم تیز تیز سانس لینے لگتے ہیں۔ مزید براں یہی حالت ہماری یادوں اور سیکھنے کی صلاحیت پر بھی اثرات مرتب کرتی ہے۔

مثال کے طور پر ایک طالب علم خوب تیاری کر کے امتحان دینے گیا۔ لیکن وہ حسب توقع اچھا امتحانی پرچہ نہیں دے سکا۔ دوران امتحان وہ جوابات کے اہم حصے بھول گیا۔ وہ پھر اسے کئی گھنٹوں بعد یاد آئے۔ یادداشت کھونے کی ایک بڑی وجہ وہ ذہنی دباؤ تھا جو امتحان سے خوف کھانے کے باعث پیدا ہوا۔ اس نے عارضی طور پر طالب علم کے حواس مختل کر دیئے۔

ذہنی دباؤ کے یہ اثرات ماہرین نفسیات کو عرصہ دراز سے معلوم ہیں لیکن اب تحقیق سے انکشاف ہوا ہے کہ یہ نفسیاتی و جسمانی کیفیت دراصل منفی اور مثبت دونوں پہلو رکھتی ہے۔ تجربات سے پتا چلا ہے کہ مخصوص حالات میں ذہنی دباؤ ہماری قوت یادداشت بڑھا دیتا ہے، اگرچہ ضروری نہیں کہ ہمیں وہ معلومات یاد آئے جو ہم کو کامیاب کر دے۔ بلکہ جو طالب علم دوران امتحان سبق یاد نہ کر پائیں، انھیں یہ ضرور یاد رہتا ہے کہ اس وقت بہت ذہنی دباؤ، پریشانی اور "ٹینشن" سے گزرے تھے۔

ماہرین نفسیات نے دریافت کیا ہے کہ جذباتی طور پر ہیجان انگیز لمحات..... چاہے وہ منفی ہوں یا مثبت غیر معمولی طور پر یادداشت میں محفوظ رہتے ہیں۔ مثلاً آپ پچھلے ایک سال کے دوران اپنے نمایاں تجربات یاد کیجیے، بیشتر کا تعلق خوشی، تکلیف، ذہنی دباؤ، غم وغیرہ سے ہوگا۔

طویل عرصے سے ماہرین یہ جاننے کی کوشش میں تھے کہ جذبات یادداشت کی تشکیل و تشریح میں کیا کردار ادا کرتے ہیں۔ اب پچھلے چند برسوں میں تحقیق و تجربوں سے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ذہنی دباؤ کے اثرات کا انحصار وقت اور مدت پر ہوتا ہے۔ ان دونوں کی تفصیل جان کر معلوم کرنا ممکن ہے کہ ذہنی دباؤ یادداشت بڑھائے گا یا گھٹائے گا۔ ماہرین پر یہ بھی انکشاف ہوا ہے کہ خاص مدت سے گزر کر ذہنی دباؤ نقصان دہ بن جاتا ہے۔

## ہمارا دفاعی نظام

جب ہم خود کو نازک یا خطرناک صورت حال میں پائیں، تو ہمارے جسم کا قدرتی دفاعی نظام بیدار ہوجاتا ہے۔ پہلی نشانی کے طور پر ہمارے دماغ کی گہرائی میں واقع ایک عضو، زیر اندرون حرم (Hypothalamus) الارم بجا دیتا ہے۔ اس الارم کے باعث پھر وقفے وقفے سے تحریکیں جنم لیتی ہیں۔ پہلی سرگرمی مخصوص ہارمون خارج کرتی اس کے بعد دوسری سرگرمی مختلف ہارمونوں کا سیٹ چھوڑتی ہے۔

یہ دونوں سرگرمیاں دراصل ہمارے دفاعی ہتھیار ہیں۔ انہی کے ذریعے ہم نہ صرف ذہنی دباؤ کی صورت حال کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوتے ہیں، بلکہ یہ ہماری یادداشت بھی بہتر بنا دیتی ہیں تاکہ مستقبل میں ایسی کسی صورت حال کا سامنا ہو، تو اس سے بخوبی عہدہ برا ہوسکیں۔

پہلی سرگرمی: سب سے پہلے زیر اندرون حرم، شاخی نظام اعصاب (Sympathetic Nervous System) کے ذریعے برگردہ راس النخاع (Adrenal Medulla) کو ایک اشارہ (سگنل) بھجواتا ہے۔ یہ مقام گردے کے اوپر واقع برگردہ غدہ کے مرکز میں موجود ہے۔ برگردہ راس النخاع پھر ذہنی دباؤ سے وابستہ دو ہارمون ایڈرینالائن اور نوراڈرینالائن خارج کرتا ہے۔ یہی ہارمون جسم کو "مقابلہ کرنے یا فرار ہونے" کا ردعمل ظاہر کرنے پہ آمادہ کرتے ہیں۔

یہ ہارمون پھر بدن میں موجود توانائی کے ذخائر متحرک کرتے، خون کا دباؤ بڑھاتے اور دل کی دھڑکن بڑھاتے ہیں تاکہ اعصاب کو زیادہ غذائیت ملے، سانس تیز چلاتے ہیں تاکہ دماغ تک زیادہ آکسیجن پہنچے، بطور دفاع درد ختم کرنے والے قدرتی دافع تکلیف مادے متعلقہ اعضا سے خارج کراتے اور پلاٹلیٹ بھی سرگرم کرتے ہیں تاکہ زخم لگنے کی صورت میں کم سے کم خون بہے۔

دوسری سرگرمی: کچھ مدت بعد ہمارا جسم تین اعضا زیر اندرون حرم، غدہ نخامیہ (Pituitary Gland) اور برگردہ قشر (Adrenal Cortex) کے ذریعے مزید ہارمون خارج کرتا ہے۔ سب سے پہلے زیر اندرون حرم سے کورٹیکوٹروفین ریلیزنگ ہارمون نکل کر باریک ریشوں کے خصوصی نظام ہوتے ہوئے غدہ نخامیہ تک پہنچتا ہے۔ یہ بادام جیسا عضو دماغ کے نچلے حصے میں واقع ہے۔

غدہ نخامیہ میں کورٹیکوٹروفین کے باعث دوسرا ہارمون، ایڈرینو کورٹیکوٹروفک ہارمون خارج ہوتا ہے۔ یہ دوسرا ہارمون خون کے ذریعے بہتا ہوا برگردہ راس النخاع تک پہنچتا اور تیسرا ہارمون، کورٹیسول خارج کراتا ہے۔ یہی کورٹیسول ذہنی دباؤ سے متعلق سب سے اہم ہارمون ہے۔

کورٹیسول، ایڈرینالائن اور نوراڈرینالائن کو تقویت پہنچاتا اور ساتھ ساتھ ہمارے جسم کو معمول کی حالت پر لاتا ہے۔ یہ بدن کے دفاعی نظام کو مضبوط بناتا اور غذائی چکنائی (Fats) کو گلائیکوجن میں بدلتا ہے تاکہ توانائی کے ذخائر ازسرنو بھر سکیں۔

یہ علٰحدہ سرگرمیاں واضح کرتی ہیں کہ ذہنی دباؤ ہماری



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# ذہنی دباؤ سے نجات پانے کے آسان گر

دن میں معمول کے کام کاج کرتے ہوئے ہر انسان کبھی نہ کبھی ذہنی دباؤ سے دوچار ہوتا ہے۔ لیکن آدمی اگر روزانہ چھ چھوٹی سی حکمت عملیاں اپنا لے، تو بخوبی ذہنی دباؤ کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

(۱) چانو اور چھٹکارا پاؤ: دن میں کسی فارغ وقت ان چیزوں یا باتوں کو جاننے کی کوشش کیجیے جو آپ کو پریشانی اور دباؤ کا شکار بناتی ہیں۔ مثلاً موٹر سائیکل کی بریک خراب ہے، تو بریک شو بدل دیجیے۔ موبائل فون کی بیٹری تنگ کرتی ہے، تو نئی خرید لیجیے۔

(۲) مثبت اندازِ فکر رکھیے: ہمارے ہاں لوگوں کی اکثریت نقصان دہ طریقے اپنا کر ذہنی دباؤ کا مقابلہ کرتی ہے۔ مثلاً سگریٹ پینا، پان لینا، ضرورت سے زائد کھانا، ٹی۔ وی دیکھنا وغیرہ۔ چنانچہ یہ نہایت ضروری ہے کہ اگر آپ کبھی ذہنی دباؤ کا شکار ہوں، تو اس کا مقابلہ مثبت طرزِ فکر اور صحت مند طریقوں سے کیجیے۔ مثلاً سیر کرنے نکل جائیے، یوگا کیجیے، کسی ہمدرد سے مشورہ لیں۔ اس طرح ذہنی دباؤ آپ کو کم سے کم ذہنی و جسمانی نقصان پہنچائے گا۔

(۳) اپنے سیکرٹری خود بنیئے: دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ اپنے کاموں کی فہرست بنا کر رکھیں، وہ واقعتاً دوسروں سے زیادہ کام کرتے ہیں۔ اب تو آپ موبائل فون پر کاموں کی فہرست بنا سکتے ہیں۔ یا پھر کسی ڈائری سے مدد لیجیے۔ حتیٰ کہ فہرست بٹوے میں بھی رکھیے۔ یوں آپ کو اس حادثے کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا کہ سپر مارکیٹ جو خریدنے گئے تھے، اسے ہی خریدے بغیر گھر واپس چلے آئے۔

(۴) خود کو مامون بنائیے: انسان اگر باقاعدگی سے ورزش کرے، روزانہ کچھ وقت غور و فکر پر لگائے اور سکون دینے والی تکنیکوں کی مشق کرے، تو ذہنی دباؤ کا سامنا بخوبی کر لیتا ہے۔ آخر ہر شیر سدھانے اور ان سے سرکس میں کرتب دکھانے والے بھی دوران کار پُرسکون رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان ذہنی دباؤ کا مقابلہ کرنے کی تیاری کر لے، تو وہ ہر مشکل سے دو دو ہاتھ کر سکتا ہے۔

(۵) چھوٹا منصوبہ تیار کیجیے: ہر روز صبح سویرے یہ سوچئے کہ آج کون کون سے کام کرنے ہیں۔ اس چھوٹے سے منصوبے کے ذریعے آپ کا وقت کم ضائع ہوگا۔ زیادہ کام انجام پائیں گے اور آپ تشویش و گھبراہٹ میں مبتلا نہیں ہوں گے۔

(۶) اور بڑا منصوبہ بھی بنائیے: امریکہ کا مشہور ماہرِ نفسیات، بی۔ ایف۔ سکنر ایک دن یا سال نہیں بلکہ دس برس کا پلان بناتا ہے۔ لیکن آپ کو اتنا لمبا چوڑا منصوبہ بنانے کی ضرورت نہیں، تاہم مستقبل ذہن میں رکھ کر عمدہ سا پلان ضرور بنائیے۔ دراصل یوں آپ اپنی زندگی کو بہتر طور پر کنٹرول کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے، زندگی جتنی قابو میں ہوگی، آپ ذہنی دباؤ بھی اتنا ہی کم محسوس کریں گے۔



یادداشت پر متناقص اثر کیوں ڈالتا ہے۔ پہلی سرگرمی ہمارے ادراک میں اضافہ کرتی اور ہمارا تجربہ بڑھاتی ہے لیکن دوسری سرگرمی ہماری معلومات میں اضافے کا عمل روک دیتی ہے۔

مثال کے طور پر آپ امتحان والے دن دیر سے امتحانی مرکز پہنچے۔ تب آپ نے جو ذہنی دباؤ محسوس کیا، اسے یاد کرنا آسان ہے۔ کیونکہ اس تجربے سے آپ خود گزرے۔ لیکن دوران امتحان آپ نے جواب یاد کرتے ہوئے جو ذہنی دباؤ سہا، اسے یاد کرنا کٹھن ہے۔ وجہ یہ ہے کہ آپ نے جو جواب یاد کیا تھا، اس کے کئی گھنٹوں یا دنوں بعد آپ کو امتحانی ذہنی دباؤ سے گزرنا پڑا۔

## چوہوں پر تجربات

جانوروں خصوصاً چوہوں پر کیے گئے تجربات بھی عیاں کرتے ہیں کہ ذہنی دباؤ یادداشت اور عمل سکھلائی (Learning) پر کیسے اثرات مرتب کرتا ہے۔ واضح رہے کہ چوہے، مرغیاں اور دیگر ریڑھ دار جانور بھی ذہنی دباؤ کے وقت ہماری طرح ہارمون اور نیورو ٹرانسمیٹر خارج کرتے ہیں۔ اسی طرح انسانوں کے مانند جانور بھی جگہیں اور واقعات یاد رکھتے ہیں۔ مثلاً ''پچھلے دن مجھے کہاں خوراک ملی تھی؟''، ''میرا گھونسلا کہاں ہے؟''، ''کون سی جگہیں خطرناک ہیں اور وہاں نہیں جانا چاہیے؟'' وغیرہ۔ وجہ یہ ہے کہ ذہنی دباؤ سے وابستہ جو واقعات جنم لیں، وہ بقا کے لیے ضروری ہیں۔

حیوانیات میں ذہنی دباؤ کے ہارمون یادداشت پر کیا اثرات رکھتے ہیں، یہ جاننے کے لیے پچھلے دنوں ایک دلچسپ تجربہ ہوا۔ ماہرین نے ایک طشت میں پانی بھرا اور اس میں ایک چوہا چھوڑ دیا۔ چوہے کو علم نہ تھا کہ ٹب کے وسط میں شفاف شیشے کا بنا چبوترہ رکھا ہے جس پر چڑھ کر وہ پانی سے دور ہو سکتا تھا۔ شروع میں تو ہر چوہے نے ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے اتفاقاً چبوترہ دریافت کیا، لیکن جب پانچوں چوہوں کو کئی بار اس تجربے سے گزارا گیا تو انھوں نے چبوترے کے خاص نشان ذہن نشین کر لیے۔ پھر جیسے ہی انھیں پانی میں چھوڑا جاتا، وہ سیدھے چبوترے پر جا چڑھتے۔

خاص بات یہ ہے کہ سکھلائی کے اس عمل میں ذہنی دباؤ سے وابستہ ہارمونوں نے خاص کردار ادا کیا۔ دراصل جب ماہرین نے دو چوہوں کے (ہارمون چھوڑنے والے) برگردہ غدود نکال دیے، تو پھر چبوترہ ڈھونڈنے میں انھیں مشکلات پیش آئیں۔ یعنی چبوترے کی تلاش میں انھوں نے بقیہ تین چوہوں کی نسبت زیادہ وقت لگایا۔

لیکن ماہرین نے یہ بھی دریافت کیا ہے کہ انسان ہو یا حیوان، اگر مسلسل ذہنی دباؤ میں مبتلا رہے، تو فائدے کے بجائے نقصان پہنچتا ہے۔ ذہنی دباؤ پھر ان کی ذہنی و جسمانی صلاحیتیں کند کرتا ہے اور وہ روزمرّہ کے کام انجام دیتے ہوئے دشواری محسوس کرتے ہیں۔

## انگریزی خون

ایک مرتبہ انگریز اور افریقا کے کسی وحشی قبیلے کے جبشی کو ریل گاڑی میں اکٹھے سفر کا اتفاق ہوا۔ انگریز کو جبشی کی رفاقت ناگوار گزر رہی تھی اور وہ منہ پھیرے بیٹھا تھا۔ جبشی نے کئی مرتبہ انگریز سے بات کرنے کی کوشش کی مگر اس نے ذرا پروا نہ کی۔ تب جبشی نے کہا ''جناب! ایسی بھی کیا نفرت، یقین فرمائیں میری رگوں میں بھی انگریزی خون دوڑ رہا ہے۔''

یہ سن کر انگریز چونکا اور پوچھا ''وہ کیسے؟''

''وہ ایسے کہ میرے آباء و اجداد نے ۱۰۰ سال پہلے ایک انگریز کپتان کو ہڑپ کر لیا تھا۔'' حبشی نے معصومیت سے جواب دیا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈاکٹر سلیم اختر

ہم میں سے بیشتر مرد وزن سمجھتے ہیں کہ اپنی صحت برقرار رکھنا پہاڑ کھودنے کے مترادف ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ چند بنیادی نکات پر عمل کیا جائے، تو انسان خوب اچھی صحت پا سکتا ہے اور یہ نکات آج کی مصروف زندگی میں کچھ زیادہ وقت بھی نہیں مانگتے۔ ذیل میں کچھ ایسے ہی نسخے دیے جا رہے ہیں جو آپ بہت کم مدت میں انجام دے سکتے ہیں۔ یہ نسخے قدیم وجدید کا بہترین ملاپ اور اس قابل ہیں کہ سنبھال کر رکھے جائیں۔

صرف ۵ منٹ میں

# صحت

## عطا کرنے والے 40 نسخے

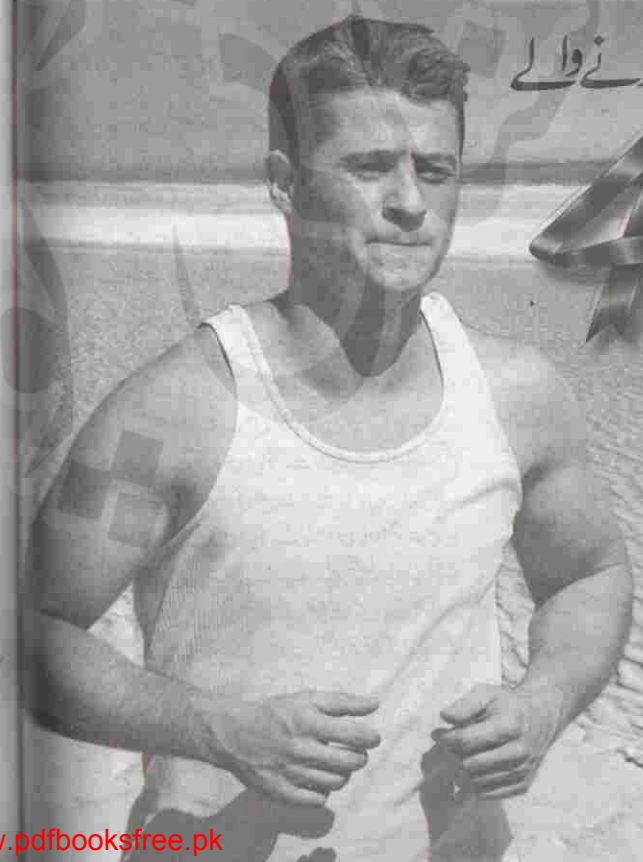

ان تیر بہدف
مفت نسخوں سے فائدہ
اٹھائیے اور کئی
موذی بیماریاں
کوسوں دور بھگا دیجئے

## قدرت سے مدد لیجیے

(۱) ابتدائی طبی امداد لینے کے بعد جلد پر لگے کٹ، جلنے کے زخم اور گھاؤ جڑی بوٹیوں اور نباتات سے بنے تیل سے جلد بھر جاتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ایسے تیلوں میں دس بارہ قطرے میٹھے باداموں کا تیل ملا لیا جائے، یوں ان کی افادیت بڑھ جاتی ہے۔ تاہم اسطوخودوس (لیونڈر) کا خالص تیل براہ راست جلد پر لگایا جا سکتا ہے۔

(۲) اگر آپ جل جائیں یا جلد پر چوٹ لگے، تو اس پر گھیکوار پیس کر لگائیے۔ اسطوخودوس کا تیل لگانا بھی مفید ہے۔ یہ دونوں قدرتی تحفے زخم جلد بھر دیتے ہیں۔

(۳) اگر سورج کی تپش سے جلد متاثر ہو، تو گیندے کے پھول کی پنکھڑیاں پیس کر لگائیے۔ گھیکوار کا آمیزہ بھی خوب رہتا ہے۔ چند بار استعمال سے جلد قدرتی حالت میں پلٹ آئے گی۔

## حسن میں اضافہ کیجیے

(۴) گرم پانی سے تادیر غسل کرنا جلد کو نقصان پہنچاتا ہے۔ چنانچہ سردیوں میں بھی نیم گرم پانی سے نہائیے اور جلد فارغ ہوئیے۔ دراصل گرم پانی نہ صرف جلد کی نمی اڑا دیتا بلکہ قدرتی محافظ خلیے بھی مار ڈالتا ہے۔ لہٰذا زیادہ سے زیادہ دس منٹ نہائیے اور پانی زیادہ گرم نہ کیجیے۔

(۵) جلد چکنی اور چمک دار بنانے کے لیے زیتون کا تیل لگائیے۔ اس میں شامل ناسیر شدہ (مونو ان سیچو ان ریٹڈ) چکنائی جلد کو دوبارہ نمی فراہم کرتی ہے اور یوں فضول مادہ بھی جنم نہیں لیتا۔ مزید براں یہ آرائشِ حسن کے لیے مستعمل بیشتر تیلوں سے سستا پڑتا ہے۔ جلد ہموار بنانے کے لیے چند قطرے سونے سے قبل چہرے، کہنیوں، گھٹنوں اور ہاتھوں کی پشت پر لگائیے۔

(۶) بازار میں کئی کریمیں دستیاب ہیں جو چہرے اور ہاتھوں کی جلد پر نمودار ہونے والی جھریاں سکیڑ دیتی ہیں۔ تاہم ڈرامائی نتیجہ پانے کے لیے ایسی کریم استعمال کیجیے جس میں ریٹنوئیڈز (Retionoids) شامل ہو۔ یہ وٹامن اے سے اخذ کردہ ایک مادہ ہے جو امریکہ میں کئی کریموں مثلاً ریٹن۔اے (Retin.A) اور رینووا (Renova) میں ملتا ہے۔ یہ مادہ دراصل ہماری جلد کے ایک مادے، کولاجن کی افزائش کرتا ہے۔ کولاجن کے باعث ہی ہماری جلد جھریوں سے نجات پا کر چست اور چمک دار ہوتی ہے۔

## (۷)

ہفتے میں ایک بار سوڈیم کاربونیٹ سے دانت صاف کیجیے۔ یہ دھوبی یا کھاری سوڈا بھی کہلاتا اور دانتوں پر جمی میل کچیل اور داغ دھبے دور کر ڈالتا ہے۔ یوں دانت صاف ہو کر سفید ہو جاتے ہیں۔ مزید اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آپ کا سانس خوشگوار ہے یا نہیں، تو ہتھیلی پر زبان لگائیں اور پھر فوراً اسے سونگھیں۔ آپ کو پتا چل جائے گا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## جسمانی و ذہنی انحطاط سے نجات پائیے

(۸) جدید تحقیق سے یہ دلچسپ انکشاف ہوا ہے کہ اگر کوئی مرد وزن کسی باعث ایک رات نہ سو سکے، تو وہ ایک ماہ تک جسمانی و ذہنی انحطاط سے محفوظ رہتا ہے۔ گویا اگر آپ شدید ڈیپریشن سے نجات چاہتے ہیں، تو ایک رات جاگ کر گزاریے۔ اس عجوبے کی اصل حقیقت تحقیق نہیں جان سکے لیکن ان کا خیال ہے کہ جاگنے کے باعث انسان کی جسمانی گھڑی نئے سرے سے چل پڑتی ہے۔ چنانچہ لوگ جسمانی و ذہنی انحطاط (ڈیپریشن) سے چھٹکارا پا کر سکون سے سونے لگتے ہیں۔

(۹) بعض اوقات صبح اٹھتے ہوئے طبیعت سست اور کسلمند ہوتی ہے۔ تب آپ سانس کی مخصوص ورزش کر کے یہ کیفیت ختم کیجیے۔ سب سے پہلے بستر پر یوں لیٹیے کہ سر کنارے پر آجائے۔ پھر ۲ تا ۴ کلو وزنی کوئی شے مثلاً کتاب یا چینی کا تھیلا دونوں ہاتھوں میں پکڑیے اور بازو پیچھے لے جایئے، یوں کہ وہ لٹکتے ہوئے فرش سے جا لگیں۔ اب دس بارہ گہرے سانس لیجیے۔ کوشش کیجیے کہ زیادہ سے زیادہ گہرا سانس لیں اور آپ کا سینہ خوب پھول جائے۔ بعد ازاں معمول کے مطابق بستر پر لیٹیے اور پھر دس بار گہرے سانس لیجیے۔ یہ عمل تین بار کیجیے۔ یوں آپ کی پسلیوں اور سینے میں موجود کھنچاؤ دور ہو جائے گا اور پھیپھڑے آکسیجن سے بھر جائیں گے۔ دراصل کئی خواتین و حضرات اس لیے ہلکے جسمانی و ذہنی انحطاط کا نشانہ بنتے ہیں کہ ان کی پسلیاں اور سینہ کھنچاؤ کا شکار ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ بذریعہ سانس مناسب آکسیجن نہیں لے پاتے اور وہ انحطاط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مزید براں یاد رکھیے کہ کمرے میں تازہ ہوا وافر ہونی چاہیے۔

(۱۰) کبھی آپ گھبراہٹ اور بے چینی میں مبتلا ہوں، تو اپنے پیٹ کے عضلات بھینچیں اور پھر ڈھیلا چھوڑ دیں۔ یہ عمل کئی بار دہرایئے۔ اس کے دو فائدے ہیں۔ اوّل، آپ جس گھبراہٹ کا شکار ہیں، اس سے ذہن ہٹ جاتا ہے۔ دوم، یہ پیٹ کی اچھی ورزش ہے۔



# (۱۱)

مختصر مدت کی مالش بھی جسمانی و ذہنی انحطاط (ڈیپریشن) کا شافی علاج ہے۔ ماہرین نے دریافت کیا ہے کہ جو لوگ ہفتے میں تین بار مختصر مالش کرائیں، وہ جسمانی و ذہنی انحطاط کا کم ہی نشانہ بنتے ہیں۔ مزید براں ضروری نہیں کہ مالشیا تجربے کار ہو، آپ کا کوئی بھی ساتھی مالش کر سکتا ہے۔ ایک بار محض بارہ منٹ کی مالش بھی عمدہ نتیجہ دیتی ہے۔ چنانچہ ڈیپریشن زدہ مرد و زن ہفتے میں تین بار کم وقتی مالش کرنا معمول بنا لیں۔ سردیوں میں اگر دھوپ میں مالش کی جائے، تو انسان کی ساری تھکن دُور ہو جاتی اور وہ چاق و چوبند ہو جاتا ہے۔ یہ ایک آزمودہ نسخہ ہے، تاہم یاد رہے کہ دھوپ تیز ہونی چاہیے۔

(۱۲) گھروں میں دودھیا بلبوں کا استعمال بڑھ رہا ہے اور سورج جیسی شعاعیں خارج کرنے والے ۶۰ و ۱۰۰ واٹ کے بلب متروک ہو چکے، لیکن ان کا کم از کم ایک بڑا فائدہ اب بھی ہے۔ یہ آفتابی بلب دراصل موسم سرما میں سورج کا بہترین نعم البدل ہیں جب دھوپ کا یہ منبع کم ہی نکلتا ہے۔ چنانچہ سورج کی زندگی بخش کرنوں سے محروم ہو کر کئی لوگ جسمانی و ذہنی انحطاط کی ایک قسم، سیڈ (سیزنل ایفکٹیو ڈس آڈر یعنی موسمیاتی اثر انداز خلل) میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ صبح سویرے، کوئی بھی کام شروع کرنے سے قبل چند منٹ آفتابی بلب کے سامنے گزار لیں تو سیڈ سے محفوظ رہتے ہیں۔ مزید براں تحقیق سے یہ بھی انکشاف ہوا ہے کہ موسم سرما میں حاملہ خواتین کچھ وقت آفتابی بلب تلے بیٹھی رہیں، تو وہ جسمانی و ذہنی انحطاط سے محفوظ رہتی ہیں۔ بلکہ ڈیپریشن توڑ ادویہ کا استعمال اور آفتابی بلب تلے بیٹھنا ایک جیسے نتائج دیتا ہے۔

## کوشش کے بغیر غذا بہتر کیجیے

(۱۳) جب کھانا کھا لیں اور پیٹ اچھی طرح بھر جائے، تب خریداری کرنے لگیے۔ وجہ یہ ہے کہ تب انسان زیادہ کاربوہائیڈریٹ اور چکنائی رکھنے والی غذاؤں کی طرف کم ہی متوجہ ہوتا ہے۔ یوں وہ مٹاپا پیدا کرنے والی غذاؤں سے بچا رہتا ہے۔

(۱۴) یہ بڑا کٹھن کام ہے کہ باہر سے کوئی کھانا خرید کر نہ کھایا جائے۔ جو لوگ باہر کے کھانے نہیں کھاتے، کبھی کبھی ان کا بھی بہت جی چاہتا ہے کہ آج گھر کا پکا کھانا نہ کھایا جائے۔ ایسی صورت میں بہترین حکمت عملی یہ ہے کہ ایسا کھانا کھایئے جس میں کم سے کم مسالا جات، تیل اور چینی استعمال ہوئے ہوں۔

(۱۵) بعض لوگ ڈبا بند غذائیں بصد شوق خریدتے ہیں۔ ان کے لیے مشورہ ہے کہ منجمد پھل، سبزیاں اور گوشت خریدیے۔ وجہ یہ ہے کہ ڈبا بند غذائیں جلد ہی اپنی غذائیت کھو بیٹھتی ہیں، جبکہ منجمد اشیائے خورونوش پگھلنے تک اپنے وٹامن، معدنیات وغیرہ برقرار رکھتی ہیں۔

(۱۶) کھانا ہضم کرنے کا ایک سہل طریقہ یہ ہے کہ کھانے کے بعد معقول دباؤ سے شکم پر ہاتھ پھیریے۔ طریق کار یہ ہے کہ پیٹ پر ایک یا دونوں ہاتھ رکھیے، پھر درمیانی رفتار سے بہ اندازِ گھڑی انھیں دائرے میں گھمایئے۔ دراصل ہماری آنتوں میں کھانا اسی سمت چکر کھاتے ہوئے سفر کرتا ہے۔

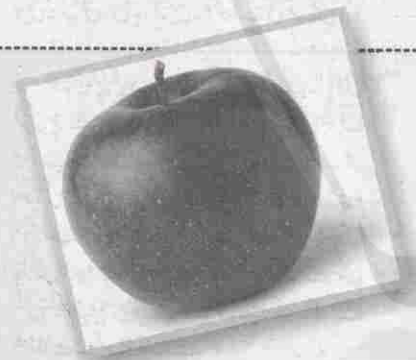

(۱۷) وزن کم کرنے کے لیے مخصوص خوراک استعمال کرنے والی خواتین و حضرات کو ایسی غذا کی تلاش رہتی ہے جس کی کم سے کم مقدار پیٹ بھر دے۔ ان کے لیے خوش خبری ہے کہ سیب ایسی ہی غذا ہے۔ دراصل اس میں موجود ایک حل پذیر ریشہ، پکٹین سیری کا احساس پیدا کرتا ہے۔ امریکن کالج آف نیوٹریشن کے ماہرین نے بعد از تحقیق دریافت کیا ہے کہ اگر کوئی ۵۰۰ گرام (تقریباً تین سیب) کھا لے، تو اسے چار گھنٹے تک بھوک نہیں لگتی۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## ۱۸



ماہرین طب کے نزدیک تندرستی کا سنہرا اصول یہ ہے کہ روزانہ آدھی غذا سبزیوں پر مشتمل ہونی چاہیے۔ اس لیے کوشش کیجیے کہ روزمرہ کی خوراک میں سبزی شامل رکھیے۔ مثلاً ہر کھانے کے وقت سلاد بنائیے۔ کوشش کیجیے کہ گاجر یا مولی کو بحیثیت ہلکی غذا استعمال کریں۔ پیزے پر زیادہ سلاد ڈلوائیے۔ واضح رہے بقیہ آدھی خوراک ۵۰ رفیصد غیر چربیلے گوشت یا مچھلی اور ۵۰ رفیصد نشاستے پر مبنی ہونی چاہیے۔

## کمر مضبوط بنائیں

جسم انسانی میں کمر ایک اہم جسمانی حصہ ہے کیونکہ اسی میں ریڑھ کی ہڈی واقع ہے۔ لہٰذا اس کا مضبوط ہونا ضروری ہے۔ صبح سویرے درج ذیل تین ورزشیں کرنے سے کمر صحت مند رہتی ہے۔

(۱۹) فرش پر یوں بیٹھیں کہ گھٹنے اوپر ہوں لیکن پیر زمین پر جمائے رکھیں۔ اب پیروں کی انگلیاں اس طرح اٹھائیں کہ صرف ایڑی ہی زمین پر رہے۔ اس دوران بالکل سیدھے بیٹھے رہیں۔ کمر بھی سیدھی ہونی چاہیے۔ اس کے بعد اپنی ہتھیلیاں پنڈلیوں کی ہڈیوں پر رکھیں پھر تھوڑی اپنے سینے سے لگائیں اور کوشش کریں کہ کولھوں کے مقام سے کمر کو آگے جھکائیں۔ اس حالت میں سعی کیجیے کہ اپنا بالائی جسم زیادہ سے زیادہ گھٹنوں کی سمت جھکا دیں۔ یہ عمل دس بار کریں۔ اگر آپ کی کمر میں درد ہو، تو دن میں ایک بار یہ ورزش کیجیے تاکہ اسے آرام آسکے۔ یہ ورزش خصوصاً ان لوگوں کے لیے مفید ہے جو سارا دن دفتر میں کرسی پر بیٹھے گزارتے ہیں۔

(۲۰) فرش پر گھٹنے اٹھا کر لیٹ جائیے۔ پاؤں زمین پر جمے ہوں۔ اب اپنا دایاں گھٹنا سینے کی طرف کیجیے اور پاؤں کے گرد کسی پٹی یا ورزشی بینڈ کا حلقہ دیجیے۔ پٹی بائیں ہاتھ میں تھام لیں۔ اس کے بعد ٹانگ بالکل سیدھی اٹھائیے۔ تب پاؤں کا رخ چھت کی طرف ہو۔ پھر دائیں ہتھیلی اُسی ٹانگ کی ران پر رکھیے اور اسے دبائیے۔ اسی دوران پٹی کھینچ کر ٹانگ پر دباؤ بڑھائیے۔ اسی حالت میں ۳۰ رسیکنڈ رہیے۔ پھر ڈھیلا چھوڑ دیں۔ یہ عمل تین بار دہرائیے۔ بعدازاں بائیں ٹانگ کے ساتھ بھی یہی عمل کیجیے۔

(۲۱)



زمین پر لیٹ جائیے۔ گھٹنے موڑ لیجیے۔ پاؤں فرش پر جمے ہوں۔ اب دائیں ٹانگ سینے کی طرف موڑیے اور دونوں ہاتھوں سے ران تھام لیجیے۔ پھر کوشش کیجیے کہ ٹانگ کو سینے کی سمت زیادہ سے زیادہ موڑ لیں۔ دو سیکنڈ تک اسی حالت میں رہیے، پھر دس بار عمل دہرائیے۔ بعدازاں بائیں ٹانگ سے یہی عمل کیجیے۔ اس ورزش کے ذریعے کمر کے تنے عضلات سے دباؤ نکلتا ہے۔

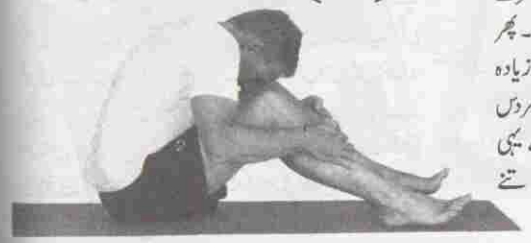

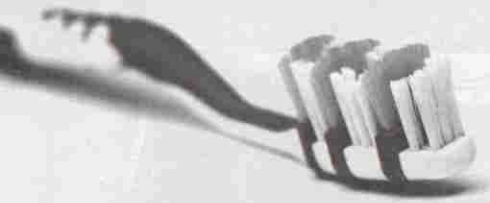





## بیماریوں سے بچیں

(۲۲) دل صحت مند رکھنے کے لیے روزانہ دانت صاف کیجیے۔ اگر خصوصاً رات کو دانت صاف نہ کیے جائیں، تو دانتوں میں پھنسی غذا میں جراثیم جنم لیتے ہیں۔ یہ جراثیم پھر دوران خون میں شامل ہو کر امراض قلب پیدا کرتے ہیں۔ ماہرین دریافت کر چکے کہ مسوڑوں کی بیماریوں اور امراض قلب میں گہرا تعلق ہے۔ دندان ساز تو تجویز کرتے ہیں کہ دن میں دو بار برش کیجیے۔

(۲۳) کڑاھی یا توا ایسی لیجیے جس میں تلنے والی شے پیندے سے نہ چپکے یعنی نان سٹک خریدیے۔ مزید براں کوئی شے تلنے سے قبل کڑاھی میں تھوڑا سا تیل ڈال لیں۔ یوں چپکنا مزید کم ہو جائے گا۔ دراصل غذا چپکنے سے تیل یا گھی زیادہ کھپتا ہے جو صحت کے لیے مفید امر نہیں۔

(۲۴) اگر آپ کو سردی کے باعث فلو ہو جائے، تو فوراً ایک پورا پیاز کھا لیجیے۔ یہ فلو کو ابتدا ہی میں روک دے گا۔ دراصل پیاز میں ایک خاص مادہ، ایلیسین ہوتا ہے، یہ نظام ماموں کو تقویت پہنچاتا اور فلو کے اثرات کی شدت کم کرتا ہے۔ مزید براں پیاز کاٹتے وقت خارج ہونے والے تیز مادے ہماری آنکھوں اور ناک سے پانی جاری کر دیتے ہیں۔ یوں نہ صرف جما ہوا مواد نکلتا ہے بلکہ فلو کے وائرس بھی جڑ پکڑنے سے قبل باہر نکل جاتے ہیں۔ اگر آنکھوں سے آنسو نکالنا مقصود نہیں، تو لہسن یا اس کا کیپسول کھا لیجیے۔

(۲۵) اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی خوراک غذائیت سے بھرپور نہیں، تو روزانہ ملٹی وٹامن کی گولی کھا لیجیے۔

## نظامِ ماموں کو تقویت پہنچائیے

(۲۶) موسم سرما میں مالٹا، کینو، مسمی وغیرہ استعمال کیجیے۔ ان میں بائیو فلاونوئیڈز مادہ ملتا ہے۔ یہ نظام ماموں مضبوط کرتا اور جلد صحت یاب ہونے میں مدد دیتا ہے۔ یہ پھل وٹامن سی بھی خوب زیادہ رکھتے ہیں۔

(۲۷) وٹامن سی، ای اور بیٹا کیروٹین ضد تکسیدی (Antioxidants) مادے بھی ہیں یعنی وہ ہمارے جسم میں جنم لینے والے زہریلے خلیے مارتے ہیں۔ یہ مادے کئی پھلوں اور سبزیوں میں ملتے ہیں۔ لیکن ضروری ہے کہ سبزیاں ہلکی حرارت میں پکائی جائیں تاکہ یہ قیمتی مادے ضائع نہ ہوں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

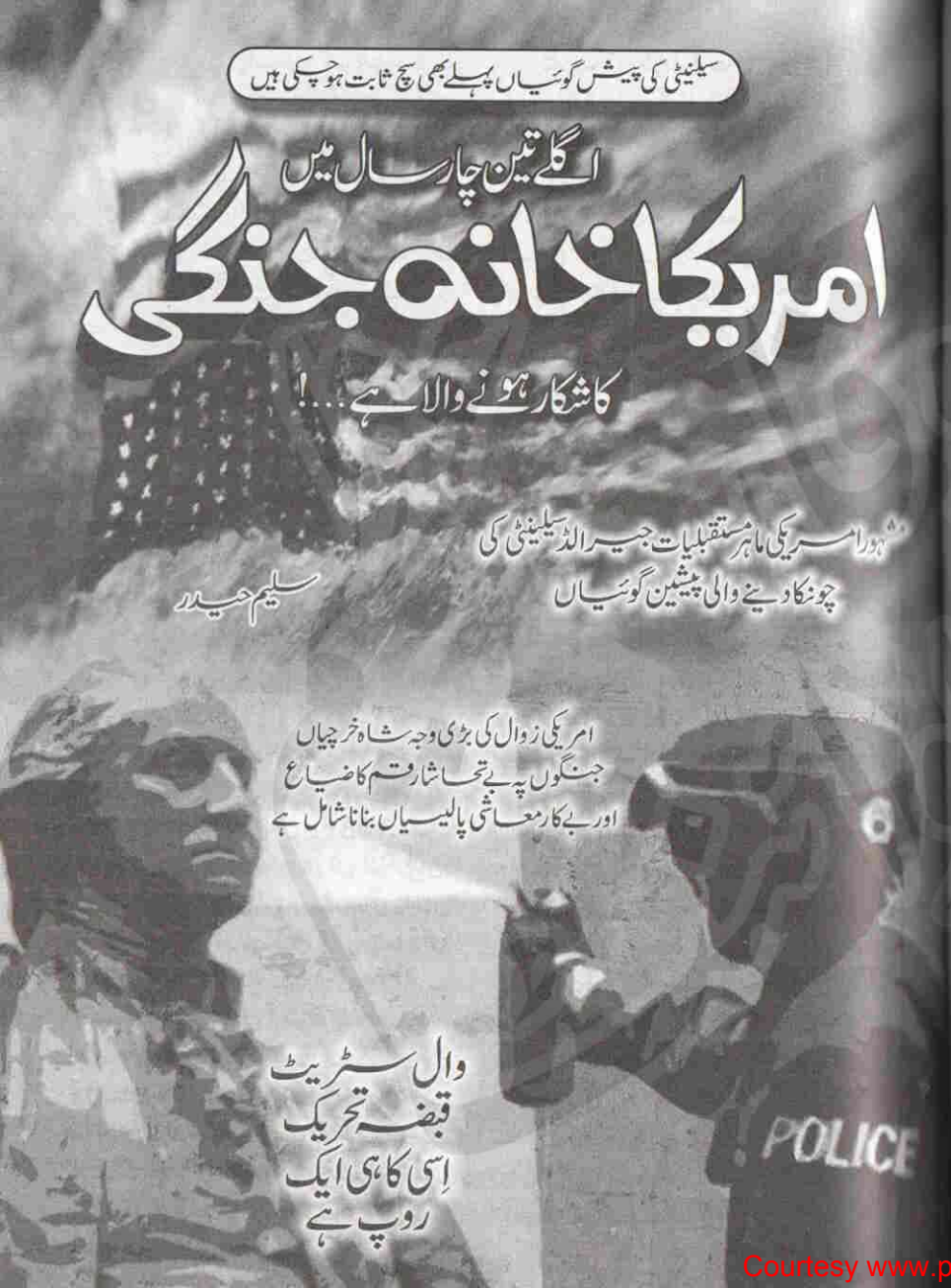

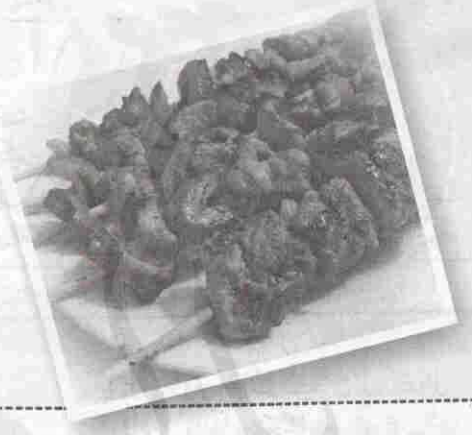

(۲۸) گلوٹیتھون (Gluetathione) وہ اہم ضد تکسیدی مادہ ہے جو امراض کے خلاف نظام مامون کا دفاع قوی کرتا ہے۔ یہ ساگ، گوبھی، کرم کلا اور اسی قبیل کی سبزیوں اور تربوز میں ملتا ہے۔

(۲۹) کوریسٹن (Quercetin) بائیو فلاونوئیڈ کی ایک قسم ہے۔ یہ ست نظام مامون کو متحرک کرتا ہے۔ یہ مادہ بند گوبھی، ترنجی پھلوں اور پیاز میں پایا جاتا ہے۔

(۳۰) نظام مامون کو تقویت پہنچانے والا ایک اہم معدن جست بھی ہے۔ یہ بیماریوں کے خلاف ڈھال بنتا ہے۔ جست سے بھرپور غذاؤں میں کستورا مچھلی، انڈے، مغز اور سالم اناج شامل ہیں۔

## اصول جو تندرست بنائیں

(۳۱) سگریٹ نوشی چھوڑ دیجیے۔ ابھی اور اسی وقت! کیا آپ موت کا انتظار کر رہے ہیں؟

(۳۲) تیز پیدل چلیے۔ روزانہ ۳۰ منٹ تیز پیدل چلنا صحت پر خوشگوار اثر مرتب کرتا ہے۔



**۳۳** ان میں پہلا نمبر پروٹین کا ہے۔ چنانچہ روزانہ کم از کم پچاس گرام پر مشتمل غیر چربی والا سرخ گوشت، مرغی، مچھلی، انڈے، دالیں یا مغز کھائیے۔ پروٹین ہمارے بدن میں توانائی بڑھاتا ہے۔ نیز درج بالا بہت سی غذائیں ہمارا نظام مامون (Immune System) مضبوط کرنے والے وٹامن و معدنیات مثلاً وٹامن بی، جست اور سیلینیئم رکھتی ہیں۔

(۳۴) چائے پیجیے لیکن معتدل مقدار میں۔ چائے ہماری یادداشت کی قوت بڑھاتی اور ہمارے ارتکاز میں اضافہ کرتی ہے۔

(۳۵) دوست سے گفتگو کیجیے۔ ٹیلی فون یا آمنے سامنے باتیں کرنے سے انسان ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔

(۳۶) ہفتے میں دو بار مچھلی کھائیے۔

(۳۷) دن میں پانچ منٹ تنہائی میں بیٹھیے۔ اس دوران آنکھیں بند کر کے گہرے سانس لینے کی مشق کیجیے۔

(۳۸) کوشش کیجیے کہ تازہ خوراک کھائیں۔ خصوصاً ڈبوں میں محفوظ غذا سے احتراز کیجیے۔

(۳۹) رات کو بھرپور نیند لیجیے۔ اچھی طرح سونے سے ہمارے بدن میں ہوئی توڑ پھوڑ کی مرمت ہو جاتی ہے۔

(۴۰) ہاتھ دھوئیے۔ دن میں اکثر ہاتھ دھونے سے انسان کئی جراثیم سے بچا رہتا ہے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ کسی دیوانے کی بڑ نہیں بلکہ ایک تجربے کار اور مستند ماہرِ مستقبلیات کی پیشین گوئی ہے جس کی پہلے بھی کئی پیشین گوئیاں درست ثابت ہوچکیں۔ جیرالڈ سیلینٹی امریکی ہے لیکن اس کی خاصیت لگی لپٹی رکھے بغیر سچ بولنا اور سچ ہی سامنے لانا ہے۔ چنانچہ نیویارک ٹائمز اور وال سٹریٹ جرنل جیسے مخصوص طرزِ فکر رکھنے والے اخبار بھی اسے سراہے بغیر نہیں رہ سکے۔ نیویارک ٹائمز لکھتا ہے ''اگر آج نوسٹراڈیمس زندہ ہوتا، تو اُسے جیرالڈ سیلینٹی کا ساتھ دیتے ہوئے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔'' اسی طرح وال سٹریٹ جرنل کہتا ہے ''جو پیشین گوئیوں پر ایمان رکھتے ہیں، ان کا گرو سیلینٹی ہے۔'' اس ماہرِ مستقبلیات کے متعلق ہم بعد میں بتائیں گے، پہلے یہ پڑھیئے کہ وہ کہتا کیا ہے۔

☆☆

دنیا بھر کا تعلیم یافتہ اور باشعور طبقہ اس حقیقت سے تو واقف ہے کہ دنیا کی اکلوتی سپر پاور کا معاشی زوال شروع ہوچکا، لیکن اول اُسے یہ علم نہیں کہ نشانیاں کیا ہیں۔ دوسرے وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ اس معاشی زوال کے باعث امریکہ ہی نہیں دنیا بھر میں کیسی تبدیلیاں ظہور پذیر ہوں گی۔ جیرالڈ سیلینٹی ان نامعلوم پہلوؤں کے متعلق پیشین گوئیاں کرتا اور معلوم دنیاؤں کی کھوج لگاتا ہے۔

امریکہ کے زوال کی بڑی وجوہ میں شاہ خرچیاں، جنگوں پر بے محابا رقم ضائع کرنا اور بیکار معاشی پالیسیاں بنانا شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ پر چڑھا قرضہ ۱۴ ٹریلین ڈالر تک جا پہنچا ہے۔ (یعنی ۱۴۰۰ کھرب ڈالر۔ پاکستان پر چڑھا کُل قرضہ تقریباً ۱۴۰ ارب ڈالر ہے)۔ دوسرے امریکہ میں امیر اور غریب کے مابین فرق تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اسی فرق کے باعث وہاں غریب اور متوسط طبقہ متحد ہوکر امرا و حکومت کے خلاف مظاہرے کرنے لگا ہے۔ ''وال سٹریٹ قبضہ تحریک'' اس کا ایک روپ ہے۔

تیسرے سستی افرادی قوت کی تلاش میں امریکی کمپنیاں اپنا کاروبار اور کارخانے بیرونِ ملک منتقل کررہی ہیں، چنانچہ امریکہ میں بیروزگاری پھیلنے کی یہ بڑی وجہ ہے۔ چوتھے وہاں مہنگائی بہت زیادہ ہے۔ لہٰذا غریب اور بیروزگار طبقہ اس قابل نہیں رہا کہ معیاری غذا اور پانی خرید سکے۔ اسی طرح کرائے بھی ہوش ربا ہیں، چنانچہ غریب مجبور ہیں کہ جہاں جگہ ملے، خیمے لگا کر پڑ رہیں۔

امریکی حکومت کوششیں کررہی ہے کہ مختلف اقدامات کے ذریعے معاشی زوال پر قابو پا سکے، مگر فی الحال اس کی دال نہیں گلی۔ لہٰذا وہاں حالات بد سے بدتر ہورہے ہیں۔

اسی تمام صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے جیرالڈ سیلینٹی نے امریکہ کے مستقبل کے سلسلے میں خاصی پیشین گوئیاں کی ہیں جن میں سے اہم درج ذیل ہیں:

☆ ۲۰۱۲ء تک امریکہ میں خوراک کی کمی جنم لے گی۔ تب امریکیوں کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ وہ کرسمس کے تحفے خریدنے کے بجائے اپنا پیٹ بھرنے کی خاطر غذا خریدیں۔

☆ خریداروں کی کمی کے باعث امریکہ بھر میں سپر اسٹور اور مارکیٹیں بھوت گھر بن جائیں گی۔

☆ سرکاری، نیم سرکاری اور نجی بنک و مالیاتی ادارے بند ہونے سے لاکھوں امریکیوں کی جمع پونجی برباد ہوجائے گی۔

☆ شہروں میں جگہ جگہ بے گھر خیمے لگائے نظر آئیں گے۔

☆ جرم کی شرح میں بے پناہ اضافہ ہوگا۔ اغوا برائے تاوان کی وارداتیں بڑھ جائیں گی۔ ان کا رخ زیادہ تر امرا کی طرف ہوگا۔

☆ امریکی شہری ٹیکس دینا بند کردیں گے۔ اگر حکومت نے زبردستی کی تو وسیع پیمانے پر خانہ جنگی کا آغاز ہوگا۔

☆ ۲۰۱۲ء میں معاشی زوال روکنے میں ناکامی پر امریکہ نئی جنگ چھیڑ دے گا۔ مقصد یہ ہوگا کہ عوام کی توجہ



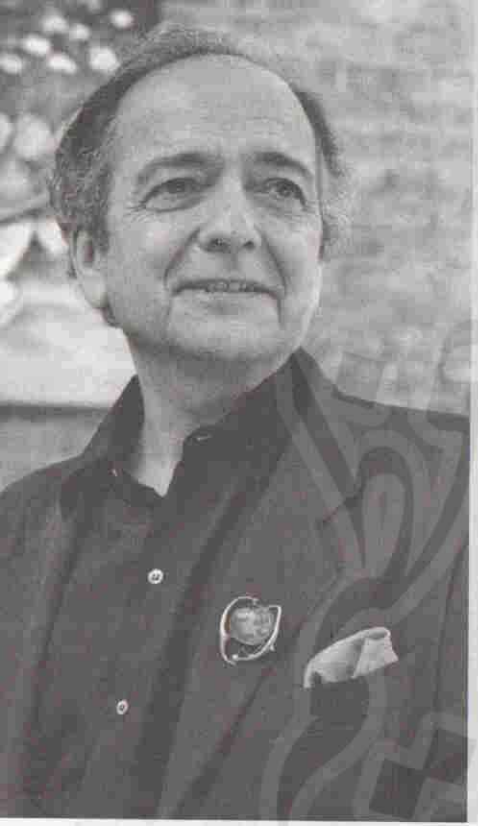

جیرالڈ سیلینٹی ۱۹۴۶ء کو نیویارک، امریکہ میں پیدا ہوا۔ سیاسیات کی تعلیم پائی۔ نیویارک کی ریاستی سینٹ کے سیکرٹری کا نائب رہا۔ (سیلینٹی اسے اپنی فضول ترین ملازمت کہتا ہے۔) ۱۹۸۰ء میں اس نے ''دی ٹرینڈز ریسرچ انسٹیٹیوٹ'' کی بنیاد رکھی۔ اس ادارے کے سربراہ کی حیثیت سے سیلینٹی مع اپنی ٹیم کے تمام حالات کا جائزہ لے کر معاشی و سیاسی شعبوں کے متعلق پیشین گوئیاں کرتا ہے۔ یہ ادارہ ایک سہ ماہی رسالہ، ٹرینڈز جرنل، بھی شائع کرتا ہے۔

سیلینٹی ۱۹۹۳ء سے پیشین گوئیاں کررہا ہے۔ اس نے ۱۹۹۷ء میں سامنے آنے والے ایشیائی کرنسی اسکینڈل کو پہلے سے بیان کردیا۔ اسی طرح اس کی یہ پیشین گوئی بھی درست ثابت ہوئی کہ ۲۰۰۸ء میں امریکی دیوہیکل مالیاتی ادارے (مثلاً لیہمان برادرز) دیوالیہ ہوجائیں گے۔ نیز ڈالر کی قدر گھٹ جائے گی۔

اب یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ سیلینٹی نے امریکی زوال کے متعلق جو پیش بینی کی ہے، وہ کس حد تک پوری ہوتی ہے۔

مقامی مسائل اور ابتری سے ہٹ جائے۔

☆ ۲۰۱۲ء ہی میں مروجہ ٹی۔وی نیٹ ورکوں، اخبارات و رسائل کے ساتھ ساتھ آن لائن نیوز سائٹس، بلاگر اور آزاد صحافی بھی بڑا اثر و رسوخ حاصل کرلیں گے۔ یوں پھر امریکی سیاست پر میڈیا کے مخصوص ٹولے کی اجارہ داری نہیں رہے گی اور تیسری قومی جماعت کو ابھرنے کا موقع ملے گا۔

☆ امریکیوں کا معیارِ زندگی کمتر ہوجائے گا۔ وہ کم سفر کریں گے تاکہ بیش قیمت پٹرول بچا سکیں۔ ایندھن کی بڑھتی قیمت، ٹیلی کمیونیکشن میں جدّت اور بوڑھوں کی تعداد میں اضافہ بیشتر امریکیوں کو مجبور کردے گا کہ وہ گھر پر کام کریں یا قریب ہی ملازمت ڈھونڈیں۔ ایسی نئی بستیاں وجود میں آئیں گی جہاں ہر جگہ پیدل پہنچا جا سکے۔

☆ شہروں میں بے روزگار مظاہرے کریں گے۔ اس سے پولیس کا تصادم خطرناک صورت حال پیدا کرسکتا ہے۔

جیرالڈ سیلینٹی کا کہنا ہے کہ وال سٹریٹ کے سرمایہ کار امریکی حکومت پر قبضہ کرچکے۔ اب امریکی سیاست دان دراصل انہی کی کٹھ پتلیاں ہیں۔ جیسا امریکی سرمایہ کار چاہتے ہیں، وہی ہوتا ہے۔ چونکہ میڈیا بھی انہی کے قبضے میں ہے، لہٰذا انھوں نے عام امریکیوں کا دماغ بھی اپنی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

منتھی میں لے لیا ہے۔ بہت کم امریکی ایسے ہیں جو آزادی وخودمختاری سے حالات وواقعات کا جائزہ لے سکیں۔

یہی وجہ ہے کہ آج بھی امریکی حکومت اور میڈیا اپنے عوام کے سامنے یہی تصویر پیش کر رہا ہے: سب کچھ اچھا ہے۔ لہٰذا عام امریکی اس قیامت سے بے خبر ہیں جو مستقبل میں ان پر ٹوٹنے والی ہے۔ یہ بے خبری آفتوں کی شدت بڑھا دے گی۔

سیلینٹی کہتا ہے کہ عنقریب مثبت انقلاب نہ آیا، تو امریکہ کو تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ معاشی زوال اُسے ایک ترقی پذیر اور مسائل کے شکنجے میں پھنسے ملک میں بدل دے گا۔ یہ وہ امریکہ ہوگا جو آج کے امریکیوں کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتا۔

یہ واضح رہے کہ برطانوی محکمہ دفاع کی ایک رپورٹ سے بھی انکشاف ہوتا ہے کہ محض امریکہ ہی نہیں تمام ترقی یافتہ ممالک میں انقلاب آنا ممکن ہے۔ رپورٹ کے مطابق اگلے ۳۰ برس میں دنیا بھر میں امیر ترین طبقے اور غریب ومتوسط طبقوں کے درمیان خلا بہت بڑھ جائے گا۔ تب بھی ممالک کے غریب ومتوسط طبقے متحد ہو کر معلومات، وسائل اور ہنر بروئے کار لاتے ہوئے انقلاب برپا کر دیں گے تاکہ ان کی حکومت قائم ہو سکے۔

ان پیشین گوئیوں سے عیاں ہے کہ مستقبل میں بھیانک منظرنامہ امریکیوں کا منتظر ہے۔ یہ منظرنامہ باشعور امریکی کے سرتاپا سنسنی دوڑانے کو کافی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ پیشین گوئیوں کو پیش کرنے والا عام دانشور نہیں بلکہ اس کا شمار دنیا کے ممتاز ترین مستقبلیات میں ہوتا ہے۔

## ھونا ھے تمھیں خاک سب خاک سمجھنا

حضرت عمرؓ کو حمص کا امیر گورنر بنایا گیا۔ ایک عرصہ بعد اہل حمص حضرت عمرؓ کے پاس آئے تو آپؓ نے ان سے کہا اپنے فقرا کے نام لکھ دو تاکہ ہم ان کی مدد کر سکیں۔

وہ لکھ کر لائے۔ ان میں ایک نام سعید بن عامر بھی تھا۔ کون سعید بن عامر؟ کہا ہمارا امیر، پوچھا تمہارا امیر فقیر ہے؟ کہا ہاں کئی دن گزر جاتے ہیں اور ان کے گھر میں آگ نہیں جلتی۔ حضرت عمرؓ یہ سن کر رونے لگے اور ایک ہزار دینار ان کے لیے بھیجے۔ جب وہ دینار ملے تو ایک دم اناللہ پڑھنے لگے۔ بیوی نے کہا کیا بات ہے امیر المومنین انتقال کر گئے؟ کہا معاملہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ دنیا میرے پاس آنے لگی، فتنہ میرے پاس آنے اور مجھ پر چھانے لگا۔ کہنے لگی اس کا تو حل راہِ خدا میں تقسیم کر دیجیے۔ چنانچہ اگلے دن وہ ساری رقم اللہ کے راستے میں خرچ کر دی۔ یہ تھے خواہشات کو کچلنے والے اصحاب بلند ذوق ونظر، ہوس چھپ چھپ کر ان کے سینوں میں تصویریں کہاں بنا سکتی تھی۔ شاعر نے خوب کہا ہے۔

اُمید نہیں جینے کی یاں صبح سے شام
ہستی کو یہ سمجھو کہ ہے خورشید لب بام
کام کرو ایسا جو آئے وہاں کام
آجائے خدا جانے کب موت کا پیغام
اپنی کوئی ملک نہ املاک سمجھنا
ہونا ہے تمہیں خاک سب خاک سمجھنا

(ابو میمون اللہ بخش، ملتان)



عدلیہ سے شکایت رکھنے والوں کے لیے تحفۂ خاص

# ”جج ہنس بھی سکتا ہے“

جسٹس ایم آر کیانی

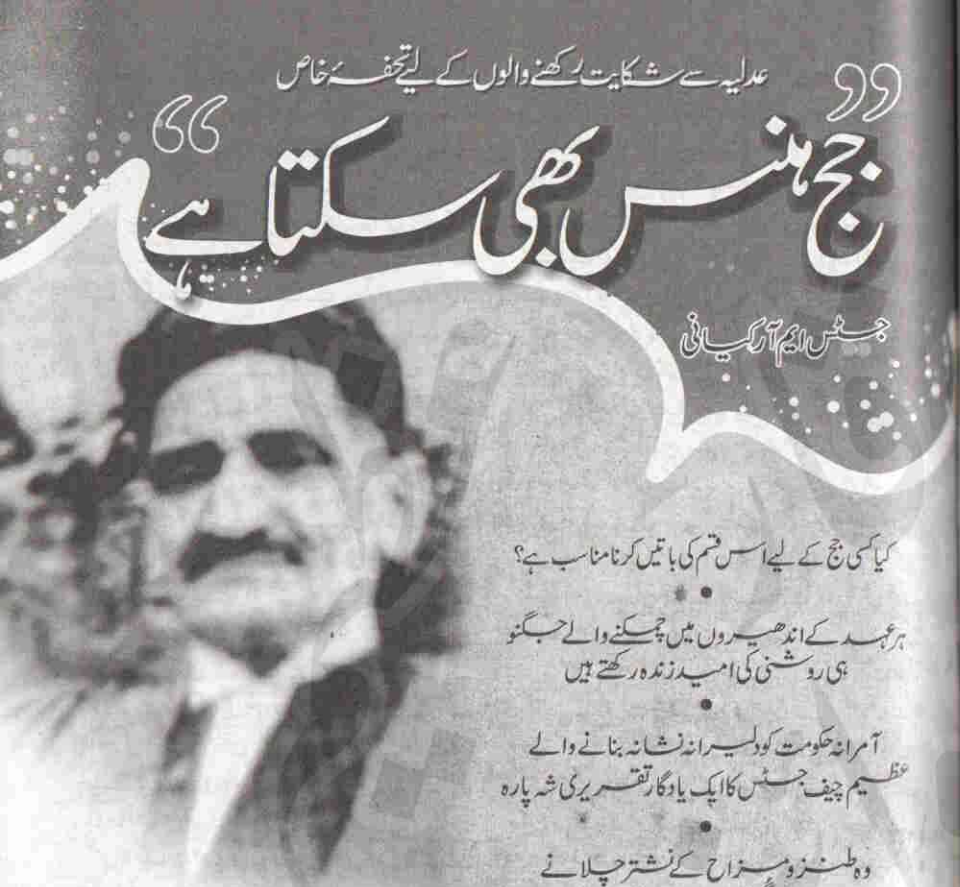



کیا کسی جج کے لیے اس قسم کی باتیں کرنا مناسب ہے؟

ہر عہد کے اندھیروں میں چمکنے والے جگنو ہی روشنی کی امید زندہ رکھتے ہیں

آمرانہ حکومت کو دلیرانہ نشانہ بنانے والے عظیم چیف جسٹس کا ایک یادگار تقریری شہ پارہ

وہ طنز ومزاح کے نشتر چلانے کا گر خوب جانتے تھے

جسٹس ایم آر کیانی عدلیۂ پاکستان کی تاریخ میں ممتاز اور باوقار کردار کے مالک ہیں۔ ان کی ذہانت اور دیانت نے عدلیہ کے وقار کو اور بھی بلند کر دیا تھا۔ جس طرح کیانی صاحب کی شخصیت زندہ دلی اور طنز ومزاح کی شوخی سے مزین تھی، اسی طرح تحریریں بھی ان کی شخصیت کی بھرپور عکاس ہیں۔ ان کے اُردو مضامین کا مجموعہ ”افکارِ پریشاں“ اتنا مقبول ہوا کہ اُس کی بیسیوں مرتبہ طباعت ہوئی۔ ان کی سنجیدہ انگریزی تحریروں میں نمایاں خصوصیت قوم کا راستہ درست کرنے کی تڑپ اور شوخی کی آمیزش ہے۔ جسٹس ایم آر کیانی نے مغربی پاکستان (متحدہ پاکستان) کے چیف جسٹس ہائی کورٹ کی حیثیت سے ایوب خان کے بعد عدلیہ کا وقار برقرار رکھنے کے لیے مختلف وکلاء تنظیموں کی وساطت سے اپنے خاص انداز میں تقریریں کیں جن میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ شوخی وطنز کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس ضمن میں کراچی بار میں کی گئی ان کی ایک تقریر (۷ر نومبر ۱۹۶۲ء) نذرِ قارئین ہے۔ یہ خاصے کی چیز ہم نے ”جج ہنس بھی سکتا ہے“ سے کشید کی ہے۔
(مدیر)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# آپ

نے مجھے خاموشی کے ساتھ وظیفہ یاب ہونے کی اجازت نہیں دی بلکہ مجھے پابند کیا ہے کہ میں ایک خاصا طویل سفر طے کر کے آؤں اور آپ سے باقاعدہ رخصت چاہوں۔ لیکن جب مسٹر بروہی نے مجھ سے کہا کہ میرے وظیفہ یاب ہونے سے پہلے کراچی مجھے گلے لگانے کے لیے بے قرار ہے تو کیا یہ بات وہ صرف اپنی طرف سے کہہ رہے تھے یا آپ سب کی نمائندگی کر رہے تھے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب آپ لوگوں کو زیادہ بہتر معلوم ہوگا۔ عوامی تقریبات کے خلوص پر مجھے ایک شبہ سا رہتا ہے جس کے پیشِ نظر میں ان دعوتوں کو قبول کرتے ہوئے ہمیشہ جھجکتا ہوں، مبادا ایک اچھی نظیر دنیا میں خرابی کا سبب نہ بن جائے۔ حالانکہ عام انسانی کمزوری یہ ہے کہ جب لوگوں کو ایسی تقریبات میں مدعو کیا جاتا ہے، وہ یقین کر لیتے ہیں کہ ان کے معاملے میں لوگ واقعی خلوص کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

مسٹر بروہی نے مجھ سے کہا کہ میں وظیفہ یاب ہونے سے پہلے کراچی ضرور آؤں لہٰذا اسی بنا پر میں نے لاہور کی بار ایسوسی ایشن سے کہا کہ اگر وہ میری دعوت کرنا چاہتے ہیں تو میری وظیفہ یابی کے بعد کریں۔ مجھے ایک ہلکا سا احساس تھا کہ اٹھارہ اکتوبر کے بعد میں اس عزتِ نفس کا ایک بڑا حصہ دوبارہ حاصل کر لوں گا، جسے میں نے اپنی ملازمت میں کھو دیا تھا اور یہ کہ میں ایک عام شہری کی طرح بولنے کے قابل ہو جاؤں گا۔ گزشتہ دو تین مہینوں میں مجھ سے میری وظیفہ یابی کے بارے میں اتنے سوال کیے گئے ہیں کہ میں نتائج و عواقب کی پروا کیے بغیر وظیفہ یاب ہونے کی خواہش کرنے لگا تھا اور اب جبکہ میں وظیفہ یاب ہو چکا ہوں، میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میری اس خواہش کے نتائج خاصے سنگین نکلے۔ مجھے ہر اہم بار ایسوسی ایشن کے سامنے اپنا حساب دینا پڑتا ہے اور ہر موقع پر، اس کے ارکان کے مزاج کے مطابق، ایک مختلف نوعیت کا حساب۔

ایک شیر اور بیل کی کہانی سنئے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے بڑے گہرے دوست تھے۔ گیدڑ جیسے بہت سے جانور جو شیر کے پس خوردہ پر زندہ رہتے ہیں، اُن کی دوستی سے بہت جلتے تھے۔ لہٰذا ایک گیدڑ نے شیر سے بیل کی شکایتیں کرنی شروع کیں۔ شروع شروع میں شیر نے کوئی توجہ نہ دی بلکہ اُس نے بیل کی تعریف کرتے ہوئے اسے ایک ایماندار اور راست گو جانور قرار دیا۔ آخر گیدڑ نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ اس نے شیر سے کہا، بیل تو اپنے آگے کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ اس کے خیال میں جرأت اور بہادری میں کوئی جانور حتیٰ کہ شیر بھی اس کے برابر نہیں اور اس غرور کا سبب یہ ہے کہ بیل کے سر پر دو سینگ ہیں جب کہ شیر کے سر پر کچھ بھی نہیں۔ شیر یہ تو جانتا ہی تھا کہ اس کے اپنے سر پر سینگ نہیں ہیں لہٰذا وہ کسی حد تک بیل کی جانب سے شبے میں مبتلا ہو گیا۔ گیدڑ نے کہا "اگر آپ کو میری بات میں کوئی شک ہے تو کبھی آپ دور سے بیل کو آتے ہوئے دیکھیے وہ مسلسل اور جارحانہ طور پر اپنے سر کو ہلاتا رہتا ہے۔"

معزز حاضرین! آپ تو جانتے ہیں کہ چلتے وقت سر کو اوپر نیچے حرکت دینا بالکل اُسی طرح بیل کی خصوصیت ہے جس طرح لکھتے وقت تھوڑا بہت ہنسنا ہنسانا میری خصوصیت ہے اور آپ انھیں اسی صورت میں روک سکتے ہیں کہ آپ ایک کو چلنے سے روک دیں اور دوسرے کو لکھنے سے۔ لہٰذا جب بیل سر کو اوپر نیچے ہلاتا ہوا دور سے نمودار ہوا تو گیدڑ نے چلا کر کہا "دیکھیے، آج تو یہ بہت ہی جوش میں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ کہہ رہا ہو کہ مجھے کسی کی کیا پروا؟" شیر نے پہلے کبھی بیل کے سر کی اس حرکت پر توجہ نہ دی تھی اب جو اُس نے غور کیا تو اسے بھی اس انداز میں ایک جارحیت نظر آئی اور بیل سے کچھ پوچھے بغیر وہ اس پر جھپٹ پڑا اور اُسے چیر پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ بیل کے گوشت کا بڑا حصہ وہ گیدڑ اور اُس کے قبیلے والے کھا گئے۔

غور فرمائیے معزز سامعین! ایک غلط مشورہ کتنے غلط نتائج پیدا کر سکتا ہے اور چونکہ یہ نتائج اُن باتوں کے ہیں



جو میں نے کراچی میں کہی تھیں، لہٰذا مناسب یہی ہے کہ اِس سلسلے کی اپنی تیسری اور آخری تقریر کے ذریعہ میں اپنی پہلی دو تقریروں پر کچھ روشنی ڈالوں۔ اس مرحلے پر ایک اہم سوال اٹھایا گیا کہ کیا کسی جج کے لئے اِس قسم کی باتیں کرنا مناسب ہے؟

لاہور بار سے خطاب کرتے ہوئے میں ان سے کہہ سکتا تھا "اے پنجابیو!" "اپنے بازوئے تیغ زن کا خیال کرو اور اُس نام کا بھی خیال کرو جو انگریزوں نے تمہیں دیا تھا یعنی مارشل ریس (عسکری نسل)۔ میدان جنگ میں تم نے مارشل (حربی) کارنامے انجام دیئے اور عدالتوں میں تم مارشل لا (فوجی قانون) لائے۔" اسی طرح پشاور میں خطاب کرتے ہوئے میں یہ کہتا "اے پٹھانو! تمہیں اپنے خونریز جھگڑوں پر فخر کرنا چاہیے۔ دراصل میں اُن سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اُنھیں قانون کی حکمرانی کی خلاف ورزی میں زیادہ مزا آتا ہے یا اس کی تنسیخ میں۔" لیکن آپ کے معاملے میں، میں یہ سوچ رہا تھا کہ کیا مجھے یہ کہنا چاہیے "اے سندھیو" یا "اے ہندیو" مگر مجھے یاد آیا کہ آپ کے سامنے میری صفائی خطیبانہ یا جذباتی حدود سے آگے کی چیز ہے۔ پہلی بار آئین کی تنسیخ کے تقریباً دو ماہ بعد یعنی ۱۱ دسمبر ۱۹۵۸ء کو میں نے آپ کی دونوں بار ایسوسی ایشنوں سے مشترکہ خطاب کیا تھا۔ اُس خطاب میں، میں نے مارشل لا کے بارے میں بھی کچھ کہا تھا اور میں ابھی اس بارے میں آپ کی یادداشت تازہ کروں گا۔ دوبارہ جب میں نے آپ سے ۱۰ اپریل ۱۹۶۰ء کو خطاب کیا تھا اُس وقت آپ پاکستان بار ایسوسی ایشن کا نشان اٹھائے ہوئے تھے۔ میں نے اُس خطاب میں ایک بڑا لطیف ہوا کا ذکر بھی کیا تھا جو کبھی کبھار تیز رفتاری سے بھی چل سکتی ہے اور تھوڑی سی گرد بھی اڑا سکتی ہے بلکہ گرد و غبار کے ایک طوفان کی شکل بھی اختیار کر سکتی ہے۔ میری تقریر نے اتنی گرد اُڑائی کہ مجھے دارالعلوم میں ایڈمنڈ برک کی جانب سے وارن ہیسٹنگز پر چلائے جانے والے مقدمے کا ایک منظر یاد آ گیا۔ میکالے نے اُس کا بیان ان الفاظ میں کیا ہے:

> گیلریوں میں بیٹھی ہوئی وہ خواتین جو خطابت کے ایسے مظاہروں کی عادی نہ تھیں، اِس اجلاس کی اہمیت سے متاثر ہو کر اور شاید اپنے ذوق اور نازک احساسات کے اظہار پر آمادگی کے باعث ایک ناقابلِ بیان ہیجانی کیفیت میں مبتلا تھیں۔ بار بار رومال نکالے جا رہے تھے۔ تسکین بخش خوشبو کی بوتلیں ہاتھوں ہاتھ گردش کر رہی تھیں۔ ہسٹریائی سسکیاں اور چیخیں سنائی دے رہی تھیں اور مسز شریڈن کی تو یہ حالت تھی کہ اُنھیں ایک دورے کی کیفیت میں باہر لے جایا گیا۔

اگر میری نظروں کے سامنے ایسا کوئی واقعہ پیش آتا تو غالباً میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ یہ ذوق اور احساس کا ایک مظاہرہ ہے۔ لیکن چونکہ بیچ لگژری ہوٹل سے آپ سب اچھے بھلے رخصت ہوئے، لہٰذا میرے خیال میں ابتدائی تاثرات خطرناک نہیں تھے مگر جب اُن لوگوں نے جو قوتِ برداشت نہیں رکھتے اور تسکین بخش خوشبو کی بوتلیں اور سرخ پنسلیں ساتھ لئے پھرتے ہیں، بعض عبارتوں کے نیچے خط کھینچ کر انھیں دوسرے لوگوں کو دکھایا اور جب دوسرے لوگوں نے خط کشیدہ عبارتوں کو، ریلوے اسٹیشنوں اور ہوائی اڈوں پر، اُن کے سیاق و سباق میں پڑھے بغیر بلکہ بعض اوقات بالکل ہی پڑھے بغیر دیکھا تو انھوں نے سوچا کہ حالات غالباً تسکین بخش خوشبو کی بوتلوں کا تقاضا کر رہے ہیں۔ بعض مشوروں میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ اگر وہ کسی کمزور لمحے میں آپ کو دیئے جائیں تو آپ کے لیے انھیں رد کرنا آسان نہیں ہوتا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میری رائے یہ ہے کہ کسی جج کا اور بطور خاص کسی چیف جسٹس کا اُن چیزوں سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے جو قانون کی حکمرانی پر اثر انداز ہوں۔ یہ کہنا بڑا مشکل ہوگا کہ کوئی جج حکومت کے کسی ایک فیصلے کو تو خلافِ قانون قرار دے سکتا ہے لیکن وہ اُس وقت کچھ نہیں بول سکتا جب پورا آئین منسوخ کر دیا جائے۔ یہ بات دوسری ہے کہ طاقت کے اور سب چیزوں پر حاوی ہونے کا نظریہ جو دوسرے امور پر بھی حاوی ہے، کچھ عملی قسم کے ماہرینِ قانون کو یہ کہنے پر آمادہ کر دے کہ ایک کامیاب انقلاب بجائے خود اپنا جواز ہوتا ہے۔ جہاں تک ہمارے ملک کا تعلق ہے تو میں نے تو اپنی قانونی حس کو ڈوسو والے مقدمہ میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے ذریعے مطمئن کر لیا۔ لیکن میں آپ میں سے اُن حضرات سے جو آئین سے وفاداری کے اُس حلف سے واقف ہیں جو ایک جج اپنے تقرر کے وقت لیتا ہے، یہ پوچھتا ہوں کہ میرا حلفِ وفاداری مجھ سے کیا تقاضا کرتا ہے؟

جنابِ والا! ضمیر کے سوالات کا شمار مشکل ترین سوالات میں ہوتا ہے اور یہ اُس وقت اور زیادہ مشکل ہو جاتے ہیں جب آپ کو یہ معلوم ہو کہ تصویر کا دوسرا رخ بھی تاریک ہے۔ لہٰذا میں نے اپنی پہلی تقریر میں کہا تھا ''مجھے تقریباً ہر تیسرے روز ملک کے سیاسی افق سے ایسی چیزیں نظر آتی ہیں جنھیں دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے'' اور اگر مارشل لا کا مطلب حالات کی اصلاح تھا تو آپ بجا طور پر اس کے مستحق تھے۔ تاہم ساتھ ہی ساتھ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ پورے آئین کو منسوخ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ فوری مسئلہ حکومت کا تھا لہٰذا آئین میں صرف حکومت اور اسمبلی سے متعلق اجزا کو معطل کر دینا چاہیے تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اربابِ اقتدار کو کوئی اچھا مشورہ نہیں مل سکا۔ اب جو بات کھل کر سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ حکومتِ پاکستان کے محکمہ قانون میں کوئی شخص کسی ایسے ہی موقع کا منتظر تھا کہ وہ ہائی کورٹ کے دائرہ اختیار کو کم کر دے اور اُس کی جگہ برطانوی نظام رائج کر دے حالانکہ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ برطانوی نظام ہے کیا۔

ہم اس بات پر حیران تھے کہ آخر مارشل لا حکومت کو اپنے قیام کے ساتھ ہی ہائی کورٹ اور رٹ کے اختیارات سے کیا پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ آخر کار اِس شخص کی فکر ایک چھوٹے سے پمفلٹ کے ذریعہ آشکار ہو گئی جس کی ایک کاپی ہائی کورٹ میں بھی موصول ہوئی۔ مجھے اِس وقت گزشتہ عالمی جنگ کے ایک برطانوی افسر کا قصہ یاد آ گیا۔ وہ گالف کھیلنے کی چھڑیوں کا بڑا شوقین تھا۔ جن دنوں رنگون سے انخلا ہو رہا تھا تو اُس افسر کے ساتھیوں نے اسے کسی دوسرے مکان کی کھڑکی سے اس انداز میں کود کر نکلتے ہوئے دیکھا کہ اس کے کاندھے پر گالف کی چھڑیوں کا ایک تھیلا لٹک رہا تھا۔ وہ بڑا پُرخطر زمانہ تھا اور کسی گھر میں گھسنا تو اور بھی خطرناک تھا لیکن جب اِس عجیب وغریب حرکت کا سبب اس سے پوچھا گیا تو اُس نے بڑے پرجوش لہجے میں کہا ''بہت دِنوں سے میری نظر گالف کی ان چھڑیوں پر تھی۔''

محترم سامعین! اجرائے پروانہ کے اختیارات گالف کی اِن چھڑیوں کے مثل تھے جن پر محکمہ قانون بہت دنوں سے نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اِس مخصوص محکمے کے بااثر افراد ایسی بہت سی برائیوں کو جن کے خلاف مجھے نبرد آزما ہونا پڑا تھا، بھوت بنا کے میرے سامنے لا کھڑا کرتے تھے اور چونکہ ہائی کورٹ کی آزادی کے بارے میں میرا تصوّر یہ تھا کہ اِسے محکمہ قانون اور سپریم کورٹ دونوں کی بالا دستی سے آزاد ہونا چاہیے لہٰذا میرا زیادہ تر وقت اپنے اختیارات کے دفاع میں گزر گیا اور ہائی کورٹ کے اندرونی حالات کی اصلاح کا موقع مجھے بہت کم ملا۔ یہ وہ داستان ہے جسے دس برس بعد زیادہ موزوں طریقے سے لکھا جا سکتا ہے اور عین ممکن ہے کہ اس وقت اسے لکھنے والا ہی کوئی نہ ہو۔ بہرحال میں اتنا ضرور بتا دوں کہ نظامِ عدل کے ارکان اس بات سے بہت بددل ہو گئے تھے کہ فوجی حلقوں میں عام قانون کے خلاف جو تاثر فطری طور



## ھائی کورٹ اور رٹ کے اختیارات سے لاحق پریشانی کی وجہ

ہم اس بات پر حیران تھے کہ آخر مارشل لا حکومت کو اپنے قیام کے ساتھ ہی ہائی کورٹ اور رٹ کے اختیارات سے کیا پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ آخر کار اِس شخص کی فکر ایک چھوٹے سے پمفلٹ کے ذریعہ آشکار ہو گئی جس کی ایک کاپی ہائی کورٹ میں بھی موصول ہوئی۔ مجھے اِس وقت گزشتہ عالمی جنگ کے ایک برطانوی افسر کا قصہ یاد آ گیا۔ وہ گالف کھیلنے کی چھڑیوں کا بڑا شوقین تھا۔ جن دِنوں رنگون سے انخلا ہو رہا تھا تو اُس افسر کے ساتھیوں نے اسے کسی دوسرے مکان کی کھڑکی سے اس انداز میں کود کر نکلتے ہوئے دیکھا کہ اس کے کاندھے پر گالف کی چھڑیوں کا ایک تھیلا لٹک رہا تھا۔ وہ بڑا پُرخطر زمانہ تھا اور کسی گھر میں گھسنا تو اور بھی خطرناک تھا لیکن جب اِس عجیب وغریب حرکت کا سبب اِس سے پوچھا گیا تو اُس نے بڑے پرجوش لہجے میں کہا ''بہت دنوں سے میری نظر گالف کی ان چھڑیوں پر تھی۔''

پر موجود ہے، اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وزارتِ قانون کی کوشش یہ تھی کہ حکومت اور ہائی کورٹ کے درمیان خلیج کو اور وسیع کر دیا جائے۔

ان حالات میں جب یہ پمفلٹ ہائی کورٹ میں آیا تو مجھے موقع مل گیا اور میں نے ججوں سے کہا: ''میری نظریں بہت دنوں سے گالف کی ان چھڑیوں پر تھیں۔'' میرے اور انتظامیہ کے درمیان اختلافِ رائے کا یہ واحد معاملہ تھا جو کسی عدالت میں گیا۔ مجھے اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر دوسرے اختلافات بھی اسی طرح طے کیے جاتے تو ہر معاملے میں میرا موقف صحیح ثابت ہو جاتا۔

محترم ارکان بار! اگرچہ مجھے محکمہ صحت نے یہ مشورہ دیا ہے کہ میں ۶ر صفحات سے زیادہ کا کوئی خطبہ نہ لکھوں ورنہ میری زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے (اس خطاب کے ۸ر دن بعد یعنی ۱۵ نومبر ۱۹۶۲ء کو چٹاگانگ میں مصنف راہیِ ملکِ عدم ہوئے) لیکن اس وقت میں ساتواں صفحہ شروع کر چکا ہوں۔ لہٰذا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مجھے کیوں اپنی تقریر کو مختصر کرنا پڑ رہا ہے۔ کراچی میں میری دوسری تقریر پہلی تقریر سے زیادہ نرم تھی۔ مجھے جو ابتدائی خطبہ پیش کیا گیا تھا وہ میرے خیال میں قانون کی حکمرانی اور عدلیہ کی آزادی کی موت پر ایک نوحے کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں نے اس خطبے کی نرمی کو موسم بہار کی اس خوش گوار ہوا سے تشبیہ دی تھی جو تھوڑی بہت گرد بھی اڑا دے۔ میں نے یہ کہا تھا کہ جب تیز ہوا چلے تو آپ اپنے سروں کو ڈھانپ لیجیے تا کہ آپ گرد و غبار سے اپنی سانس محفوظ رکھ سکیں۔ اس کے علاوہ میں اور کیا کہتا! کیا میں یہ کہتا کہ سانس کے ساتھ گرد بھی جانے دیں۔ ٹھیک ہے! اگلی بار آپ ایسا کر سکتے ہیں لیکن اُس کے ساتھ میں نے آپ سے یہ بھی کہا تھا کہ قانون کی حکمرانی کے بارے میں آپ کے تصوّرات میں بھی کچھ تبدیلی آنی چاہیے تا کہ اسے وہ عزت و احترام دوبارہ حاصل ہو جائے جس کی وہ مستحق ہے۔ میں نے کہا تھا ''جب کوئی چیز ایک حد سے دوسری طرف جاتی ہے تو اس کا ایک ردِعمل ہوتا ہے اور اسی ردِ عمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں قانون کی تاخیر، قانون کی رکاوٹوں اور صاحبِ مقدمہ کی پریشانیوں کے سبب بغاوت کی ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔'' آپ نے ضرور محسوس کیا ہو گا کہ میں نے آپ کے اور حکومت کے درمیان ایک توازن قائم کر دیا تھا۔

جہاں تک بنیادی حقوق کا تعلق ہے تو میں نے آپ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو یہ رائے دی تھی کہ آپ ان حقوق کو عدالتوں کے بجائے انسانوں میں تلاش کیجئے۔ میں نے کہا تھا: ''انھیں صدر کی ذات میں تلاش کیجئے۔ کیا انھوں نے ڈھاکہ میں آپ سے نہیں کہا تھا کہ چاہے وہ آپ سے متفق ہوں یا نہ ہوں آپ اپنی بات پوری آزادی کے ساتھ کہیے؟ مارشل لا کی حکومت میں آپ ان الفاظ کو ایک پروانۂ آزادی سمجھ سکتے ہیں'' مجھے یہ سوچ کر صدمہ ہوتا ہے کہ وہ تسلی بخش الفاظ رائیگاں گئے۔ اس کا ایک سبب ہوسکتا ہے کہ یا تو مجھے اتنا اہم آدمی نہیں سمجھا گیا کہ میں ان امور پر بول سکوں یا یہ طے کر لیا گیا کہ عوام مارشل لا کے لئے بے تاب تھے۔ جناب والا! اگر آپ سمجھتے ہیں کہ کوئی قوم حکومت کے حق میں بولنے کے علاوہ اور کسی معاملے میں آزادی کے ساتھ بولنا پسند نہیں کرتی تو پھر وہ قوم اس لائق نہیں ہے کہ اس سے خطاب کیا جائے اور نہ ایسی قوم سے میں کوئی تعلق رکھنا پسند کروں گا۔

بہر حال مجھے اِس امر میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ صدر نے وہی کیا جو وہ دل سے چاہتے تھے۔ مجھے شبہ اس بات پر تھا کہ کیا اُس یقین دہانی کے باوجود لوگ مارشل لا کے ہوتے ہوئے حق بات کہنے کی جرات کرسکیں گے۔ لہٰذا میں نے ایک معتدل مشورہ اِن الفاظ میں دیا تھا ''غالباً یہ رائے دینے میں کوئی خطرہ نہیں ہے کہ آئین کی تیاری اور اعتماد کی فضا پیدا کرنے کے لئے مارشل لا کو رفتہ رفتہ اٹھا لیا جائے۔ اگر ضروری ہو تو مخصوص مقاصد کے لئے فوجی عدالتیں باقی رکھی جائیں اور متعلقہ مارشل لا ریگولیشنوں کو فوجی عدالتوں کا آرڈیننس، قسم کا کوئی نام دے دیا جائے''۔ معزز حاضرین! میں نہیں سمجھتا کہ یہ اقدامات کسی لحاظ سے بھی غلط ہوتے۔ دراصل اس طرح ہم مارشل لا کا نام لئے بغیر اس کی روح کو باقی رکھ سکتے تھے۔ لوگ ملک کے اندر بلند آواز میں سرگوشیاں کر رہے تھے اور ملک کے باہر ببانگِ دہل اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ انگلستان اور امریکہ خاص طور سے پریشان تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ عوام کے سیاسی مفادات سیاسی زندگی کے تسلسل ہی کی بنیاد پر قائم رہ سکتے ہیں۔ ان مفادات کو شدید نقصان پہنچائے بغیر مارشل لا ایک طویل مدت تک کیسے قائم رہ سکتا ہے۔ میں نے حکومت کے ایک وزیر سے جن کے پاس میں اپنی پریشانیاں لے کر اکثر جایا کرتا تھا، ایک بار پوچھا ''یہ بھول جائیے کہ یہ مشورہ میں نے دیا تھا لیکن یہ بتائیے کہ کیا حکومت نے اس مشورے کی اہمیت کو غور وخوض کے لائق بھی سمجھا تھا؟'' انھوں نے کہا ''ہاں بات چیت تو ہوئی تھی اور (مارشل لا) ایڈمنسٹریٹروں اور سب ایڈمنسٹریٹروں سے مشورہ بھی کیا گیا تھا لیکن ان حضرات کی رائے یہ تھی کہ اگر مارشل لاء اٹھا لیا گیا تو وہ اپنے فرائض ادا نہیں کرسکیں گے۔''

کئی سال گزرے جب میں ڈپٹی کمشنر تھا، اس وقت میرے زیرِ غور ایک معاملہ یہ تھا کہ کیا زمین کی لگان کے کچھ بقایاجات کو جو بہت عرصے سے باقی تھے، ناقابلِ وصول سمجھ کر کمشنر سے معاف کرادیے جائیں؟ پٹواری کی رپورٹ یہ تھی کہ نمبردار کے لئے وہ بقایاجات وصول کرنا ممکن نہیں۔ قانون گو، تحصیل دار اور ریونیو اسسٹنٹ نے لکھا تھا پٹواری کی رپورٹ مفصل ہے۔ یہ محکمہ اراضیات کی ایک خاص زبان ہے۔ زیادہ اہم بات یہ تھی کہ میرا اپنا ہیڈ ورنا کیولر کلرک (ایچ، وی، سی) بھی ان سے متفق تھا۔ ہم نے رپورٹ کمشنر کے پاس بھیج دی۔ جب میں اگلی بار کمشنر سے ملنے گیا تو انھوں نے اپنے ایچ وی سی سے معافیوں کی مسل منگوائی اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ''آپ کی رپورٹ یہ ہے کہ بقایاجات وصول نہیں ہو سکتے؟'' میں نے کہا ''جی ہاں'' تو انھوں نے اپنے ایچ وی سی سے مخاطب ہو کر کہا ''ٹھیک ہے اگر مسٹر کیانی کا خیال یہ ہے کہ یہ وصول نہیں ہو سکتے تو پھر یہ وصول نہیں ہو سکتے۔

یقین کیجئے کہ مارشل لا لگنے کے دو ماہ کے اندر اندر ججوں کی معطلی کا جو قانون بنا اس سے مجھے انتہائی تکلیف ہوئی۔ میں نے بحیثیت چیف جسٹس اسے اپنے لئے ایک سنگین توہین سمجھا اور تہیہ کیا کہ میں اسے کبھی فراموش نہیں کروں گا۔ میں نے اسے فراموش نہیں کیا۔ میں نے اعلیٰ



ترین حلقوں میں یہ کہا کہ کوئی اور حکومت اس قسم کی انقلابی دفعات بنانے پر آمادہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اس قانون نے ہائی کورٹ کے وقار اور اہمیت دونوں کو مجروح کر دیا تھا۔ معزز حاضرین! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ انھوں نے اس قانون کو نئے آئین میں کیوں نہیں برقرار رکھا؟

آئین کی بات آئی تو یہ بھی سن لیجئے کہ اِس میں ججوں کی وظیفہ یابی کے بعد کی مدت کے لئے ایک بڑی فراخ دلانہ دفعہ کا اضافہ کیا گیا ہے یعنی ہم جس عدالت کی سربراہی کر چکے ہیں، اب اُسی عدالت میں ہم بحیثیت وکیل پیش ہو سکتے ہیں۔ بلکہ اب ہم مجسٹریٹ کے سامنے بھی پیش ہو سکتے ہیں۔ کیا یہ فراخ دلی نہیں؟ یوں میرے نزدیک تو اس کی اہمیت ایک توہین کی دوسری توہین سے بدلنے کے مترادف ہے۔ ۱۰ سال تک ایک اعلیٰ عدالت کی کرسی سے فیصلے دینے کے بعد اب میں ایک جونیئر عدالتی عہدیدار کی ڈانٹ ڈپٹ سننے کے لئے اُس کے سامنے حاضر ہوں گا تاکہ میرے وظیفے میں چند روپوں کا اضافہ ہو جائے۔ معزز سامعین! جب آپ کی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے تو آپ انتظامی امور کی قانونی حیثیت کے تعین کا اختیار برطانوی آئین کی روشنی میں عدالتوں کی بجائے پارلیمان کو تفویض کرنے کی تائید کرتے ہیں اور جب کبھی آپ کے نزدیک قرین مصلحت ہوتا ہے تو آپ سرکاری مشینری کے عمومی ڈھانچے کے لئے امریکی آئین کا سہارا لے لیتے ہیں۔ میں تو یہی کرسکتا ہوں کہ آپ کو یہ حق دے کر کہ آپ ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلیں پھر آپ سے پوچھوں ''کیا انگلینڈ اور امریکا کے جج وظیفہ یابی کے بعد بطور وکیل کام کرتے ہیں؟'' یہ بات صاف ہو جانی چاہیے کہ آج میں کوئی اپیل نہیں کر رہا ہوں کیونکہ اپیل تو ہمدرد حلقوں ہی سے کی جاتی ہے جہاں یہ احساس رہتا ہے کہ ججوں کی ملازمت کے تقاضے دوسرے عہدے داروں کی ملازمت سے مختلف ہوتے ہیں اور یہ کہ جج ایک مخصوص نوعیت کی قومی خدمت انجام دیتے ہیں جو عام زندگی میں استحکام پیدا کرتی ہے۔ ان ہمدرد حلقوں کو یہ احساس بھی رہتا ہے کہ ججوں کی ان کی تکمیلِ ملازمت کے بعد ایک ایسی باسہولت زندگی فراہم کرنا ضروری ہے جو انھیں ضروریات سے مستغنی کر دے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے اپنی آخری تقریر میں حضرت علیؓ کے اس مکتوب سے ایک اقتباس سنایا تھا جو انھوں نے والیِ مصر ملک اشتر کی راہنمائی کے لئے لکھا تھا کہ قاضی القضاۃ کے انتخاب میں انھیں کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے اور قاضی کو اپنے اعلیٰ عہدے کے شایانِ شان باسہولت زندگی گزارنے کے لائق بنانے کے لئے کیا اقدامات کرنے چاہئیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ حضرت علیؓ کے مکتوب کی روشنی میں حکومت پاکستان نے اس کے علاوہ اور کیا کیا ہے کہ اس نے ججوں کو وظیفہ یابی کے بعد وکالت کرنے کا حق دے دیا ہے لیکن اس تقریر کے کچھ ہی دنوں بعد مجھے شکاگو کی امریکی ججوں کی انجمن (Amerian Judicature Society) کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر نے ایک خط لکھا تھا جس سے ایک اقتباس میں پیش کرتا ہوں:

> میں نے بڑی دلچسپی کے ساتھ ایک جج کی حیثیت اور کارکردگی کے بارے میں اس عبارت کو پڑھا جسے آپ نے حضرت علیؓ کے اس مکتوب کی جانب منسوب کیا ہے جو انھوں نے اپنے ایک گورنر ملک اشتر کو لکھا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مکتوب ہمارے اُس جریدے اور ججوں کے ہدایت نامے میں شامل کرنے کے لئے موزوں ہوگا جو ہم تیار کر رہے ہیں۔ اگر آپ مجھے اس مکتوب کا پورا متن بھیج دیں تو میں انتہائی شکر گزار ہوں گا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تقریباً اُسی وقت مجھے امریکی سپریم کورٹ کے جسٹس ولیم، او، ڈگلس کا بھی ایک خط ملا جس میں انھوں نے لکھا تھا ''حال ہی میں فوجی عدالتوں کے خلاف آپ کی احتجاجی تقریر پڑھ کر مجھے بہت اطمینان ہوا، اپنی محبت اور آپ کی قدر شناسی کے اظہار میں میں آپ کو اپنی ایک حالیہ کتاب بھیج رہا ہوں۔'' ظاہر ہے کہ جسٹس ڈگلس نے میری تقریر کو ممنوعہ میدانوں میں مہم جوئی نہیں بلکہ قانون کی حکمرانی کے لئے ایک استدلال ہی سمجھا ہے۔ اس تقریر کے ایسے ہی مفید اثرات انگلینڈ میں بھی ظاہر ہوئے۔ برطانوی پارلیمان کے ایک رکن نے جو پاکستان میں مارشل لاء سے بہت دل گرفتہ تھے، ہماری حکومت کے ایک وزیر سے میری تقریر کے حوالے سے کہا ''بہرحال آپ کی عدلیہ بہت آزاد ہے''۔ میں نے اُن وزیر سے پوچھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اب مجھے اِس بارے میں مزید کچھ نہیں کہنا چاہیے بلکہ اب میں مسٹر بروہی اور مسٹر رحیم سے مخاطب ہو کر پوچھوں گا کہ کیا انھیں یقین ہے کہ انھوں نے تعریف و توصیف کے ہاروں سے مجھے اس طرح لاد نہیں دیا تھا کہ میرا چہرہ ناقابل شناخت ہو گیا ہے۔ مجھے اپنی ایک چچی یاد ہیں جو ایک بار اپنے بیٹے کو وردی میں دیکھ کر اس قدر خوش ہوئیں کہ انھیں اندیشہ ہوا کہ کہیں میرے بیٹے کو ان کی نظر نہ لگ جائے۔ لہٰذا انھوں نے کرخت لہجے میں کہا ''بھاگ جاؤ، تم میرے بیٹے نہیں ہو۔'' معزز حاضرین! یہ کہنے سے میرا مقصد یہ نہیں کہ وزیر موصوف بھی میرے گاؤن اور وگ (مخصوص عدالتی لباس اور ٹوپی) سے اتنے ہی خوش ہوئے تھے جتنی میری چچی اپنے بیٹے کی وردی سے خوش ہوئی تھیں۔

## دریائے نیل

جب مسلمانوں نے مصر فتح کیا تو گورنر عمرو بن العاصؓ نے ایک دن دربارِ عام منعقد کیا۔ اس میں بعض لوگوں نے بتایا کہ دریائے نیل کو جاری رکھنے کے لیے قدیم زمانے سے ایک طریقہ رائج ہے کہ چاند کی گیارھویں تاریخ کو ہم ایک نوجوان لڑکی اس کے والدین کی رضامندی سے، قیمتی کپڑے اور عمدہ زیور پہنا اور خوب سنگھار کر کے دریائے نیل کے حوالے کر دیتے ہیں۔

یہ سن کر حضرت عمرو بن العاصؓ نے جواب دیا کہ یہ رسمیں اسلام میں ہرگز جائز نہیں۔ اسلام غیر شرعی رسموں کو مٹانے آیا ہے چنانچہ اس سال یہ رسم ادا نہیں ہوگی۔ دریائے نیل تقریباً سوکھ گیا اور لوگ وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

حضرت عمرو بن العاصؓ نے تمام واقعات امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کو لکھ بھیجے۔

حضرت عمر فاروقؓ نے انہیں لکھا کہ واقعی اسلام غیر شرعی رسموں کو ختم کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور خط بھی بھیجا کہ اسے دریائے نیل میں ڈال دیا جائے۔ گورنر نے یہ خط پڑھا جس میں یہ تحریر تھا:

''اللہ کے بندے امیر المومنین کی طرف سے دریائے نیل کے نام حمد و صلوٰۃ کے بعد، اگر تُو اپنے اختیار سے بہتا ہے تو ہرگز جاری نہ ہو اور اگر اللہ تعالیٰ تیری روانی اور بہا کو جاری کرتا ہے تو میں اللہ واحد قہار کی بارگاہ میں سوال کرتا ہوں کہ وہ تجھے جاری کر دے۔''

گورنر نے خط دریائے نیل میں ڈال دیا۔ مصر کے لوگوں نے صبح بیدار ہو کر دیکھا کہ ایک ہی رات میں اللہ تعالیٰ نے سولہ ہاتھ گہرا پانی دریائے نیل میں جاری کر دیا چنانچہ اس طرح اللہ تعالیٰ کے حکم سے دُخترِ کشی بیٹی کو مار ڈالنے کی رسم کا خاتمہ ہوا۔ اللہ کی شان سے وہ ایسا جاری ہوا کہ اب تک دریائے نیل جاری ہے۔

جب اللہ تعالیٰ اس کا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق اس کا حکم مانتی ہے۔ صحابہ کرام نے اپنا سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لیے قربان کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوق کو ان کے تابع کر دیا۔ ہمیں بھی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہیں۔

(علی اعجاز نظامی، ملتان)

جدید سائنس کی نئی مہربانیاں

# ہرپل آسانیاں اور نئی منزلیں

طاہرہ اعجاز ڈنگہ

ایسی تحقیق اور معلومات یقیناً زندگی آسان اور اچھا بنانے میں مدد کرتی ہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## بچوں میں وٹامن ڈی کی کمی اینیمیا کا باعث

جان ہاپکنز چلڈرن سنٹر میں ڈاکٹروں نے یہ دریافت کیا ہے کہ وٹامن ڈی کی کمی کی وجہ سے بچوں کو اینیمیا کی بیماری لاحق ہو سکتی ہے۔ اینیمیا ایسی بیماری ہے جو انسانی جسم میں موجود خون کے سرخ خلیے کم ہونے کے باعث پیدا ہوتی ہے جن کی مقدار کا تعین ہیموگلوبن کی سطح ناپنے سے کیا جاتا ہے۔ اینیمیا کی علامات جسم میں تھکن، ہلکا سر درد اور کمزوری پر مشتمل ہیں لیکن جب اینیمیا شدت اختیار کر جائے اور خطرناک حد تک پہنچ جائے تو جسم کے بہت سے اعضا متاثر ہو سکتے ہیں۔

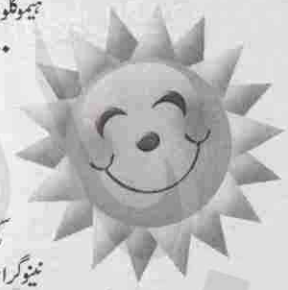



ہیموگلوبن اور وٹامن ڈی کے درمیان تعلق معلوم کرنے کی خاطر طبی ماہرین نے ۹۴۰۰/ سے زیادہ بچوں کے خون کے نمونوں کا معاینہ کیا۔ اِن بچوں کی عمریں ۲/ سے ۱۸/ سال تک تھیں۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جن بچوں میں وٹامن ڈی کی سطح کم تھی، اُن میں ہیموگلوبن بھی کم تھا اور انہیں اینیمیا لاحق ہونے کا خطرہ زیادہ تھا۔

وہ بچے جن میں وٹامن ڈی کی سطح ۲۰/ نینوگرام فی ملی لیٹر سے کم تھی، ان میں اینیما کا خطرہ ان بچوں کی نسبت ۵۰/ فیصد زیادہ تھا جن میں وٹامن ڈی کی سطح ۲۰/ نینوگرام فی ملی لیٹر یا اس سے زیادہ تھی۔ وٹامن ڈی کی سطح فی ملی لیٹر ایک نینوگرام زیادہ ہونے سے اینیمیا کا خطرہ ۳/ فیصد کم ہو جاتا ہے۔

۹/ فیصد سیاہ فام بچوں کی نسبت صرف ایک فیصد سفید فام بچوں کو اینیمیا لاحق تھا۔ سیاہ فام بچوں میں وٹامن ڈی کی سطح سفید فام بچوں کی نسبت کم ہوتی ہے جس کی وجہ سے ان میں اینیمیا کی بیماری بھی زیادہ عام ہے۔ لیکن اس کی وجہ ابھی تک مکمل طور پر واضح نہیں، اگرچہ چند ماہرین کا خیال ہے کہ اس کی وجہ جینیاتی عوامل ہو سکتے ہیں۔

## وٹامن اے کے سپلیمنٹ اور قطرے دینے سے سالانہ چھ لاکھ بچوں کی جانیں بچائی جا سکتی ہیں

برٹش میڈیکل جرنل میں یہ تحقیق شائع ہوئی ہے کہ کم اور درمیانی آمدنی کے حامل ممالک میں بچوں کو وٹامن اے کے سپلیمنٹ اور قطرے دے کر بیماریوں اور موت کے منہ میں جانے سے بچایا جا سکتا ہے۔ وٹامن اے انسانی صحت کے لیے بہت مفید اور ضروری ہے جو خوراک کے ذریعے ضرور حاصل کرنا چاہیے۔ اِس کی کمی کی وجہ سے بچوں میں پیچش اور خسرہ جیسی بیماریوں کے پھیلاؤ کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (WHO) کے مطابق دُنیا بھر میں ۵ سال سے کم عمر تقریباً ۱۹۰/ ملین بچے وٹامن اے کی کمی کا شکار ہیں۔

انگلستان اور پاکستان کے طبی ماہرین کی ایک ٹیم نے ۶/ ماہ سے ۵/ سال کی عمر کے ۲/ لاکھ بچوں پر وٹامن اے کے ۴۳/ تجربات کیے جس کے نتیجے میں وٹامن اے کی کمی پورا کرنے کی وجہ سے کم آمدنی والے ممالک کے بچوں میں فوت ہونے کی شرح ۲۴/ فیصد کم ہو گئی۔ اسہال اور خسرہ سے فوت یا مفلوج ہونے کی شرح میں بھی کمی دیکھنے میں آئی۔

چنانچہ اِس تحقیق کے مطابق ۱۹۰/ ملین بچوں میں فوت ہونے کی شرح میں ۲۴/ فیصد کمی آئی ہے۔ وٹامن اے کی کمی پوری کر کے سالانہ ۶/ لاکھ بچوں کی زندگیاں بچائی جا سکتی ہیں۔

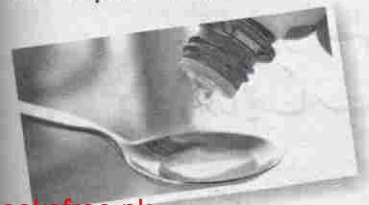





## پستہ پھیپھڑوں کے کینسر کا خطرہ کم کر سکتا ہے

امریکن ایسوسی ایشن آف کینسر ریسرچ کانفرنس کے مطابق پستہ کھانے سے پھیپھڑوں کے کینسر کا خطرہ کم ہو سکتا ہے۔ وٹامن ای کینسر کی بہت سی اقسام کے خلاف انسانی جسم کی حفاظت کرتا ہے۔ گاماٹوکوفیرول جو کہ وٹامن ای کی ایک قسم ہے، کے زیادہ استعمال سے پھیپھڑوں کے کینسر کا خطرہ کم کیا جا سکتا ہے۔

یونیورسٹی آف ٹیکس کے ایپیڈیمیالوجی ڈیپارٹمنٹ کی ایم ایس (MS) لیڈیا ایم ہرنینڈرس کہتی ہیں کہ پستے کا استعمال گاماٹوکوفیرول (وٹامن ای) حاصل کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ اِس کا استعمال دل کو تندرست رکھنے کے لیے بھی مفید ہے کیونکہ اِس کی وجہ سے کولیسٹرول کی سطح بھی قابو میں رہتی ہے۔ گاماٹوکوفیرول کے زیادہ سے زیادہ استعمال کے باعث دوسری قسم کے کینسر کو بھی پیدا ہونے سے روکا جا سکتا ہے۔

ہرنینڈرس اور اِس کے ساتھیوں نے یہ دیکھنے کے لیے کہ آیا پستہ کھانے سے گاماٹوکوفیرول کی سطح میں اضافہ ہوتا ہے، چھ ہفتے پر مشتمل ایک تجربہ کیا۔ اس تجربے میں ۳۶/ تندرست افراد شامل تھے۔ ۱۸/ لوگ ایسے تھے جن کی خوراک میں روزانہ ۶۸/ گرام (تقریباً ۲/ اونس) پستے شامل کیے گئے اور ۱۸/ لوگ ایسے تھے جو کہ اپنی معمول کی خوراک کھاتے رہے۔ (ان کی خوراک میں پستہ شامل نہیں تھا۔) ۴/ ہفتوں بعد جو نتیجہ برآمد ہوا، اس سے یہ ثابت ہوا کہ پستہ کھانے والوں میں کولیسٹرول کو قابو کرنے والے گاماٹوکوفیرول کی سطح زیادہ تھی۔ ۶/ ہفتے کے بعد بھی یہی نتیجہ برآمد ہوا۔

چنانچہ اِس تحقیق کے مطابق روزانہ ۲/ اونس پستہ کھانے سے پھیپھڑوں کے کینسر کا خطرہ کم کیا جا سکتا ہے۔ دوسری اشیا جن کے ذریعے گیماٹوکوفیرول (وٹامن ای) حاصل کیا جا سکتا ہے، میں مونگ پھلی، اخروٹ، سویابین اور مکئی کا تیل شامل ہیں۔

## زعفران جگر کے کینسر سے بچاتا ہے

چوہوں پر تجربہ کرنے سے یہ ثابت ہوا ہے کہ زعفران جگر کے کینسر کے خلاف اثر پذیر قوت کا حامل ہے۔ یہ پانچواں عام کینسر ہے اور دُنیا بھر میں کینسر سے اموات کے حوالے سے تیسرے نمبر پر آتا ہے۔

کینسر کے خلاف جنگ میں اِس بات پر بہت زور دیا جا رہا ہے کہ قدرتی جڑی بوٹیوں اور پودوں کے ذریعے کینسر کا علاج کیا جا سکے۔

اقوام متحدہ عرب امارات یونیورسٹی کے پروفیسر امرامین کہتے ہیں کہ زعفران پودے سے قدرتی طور پر حاصل ہونے والا جوہر ہے جو عام طور پر کھانوں میں ذائقہ اور رنگ پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ کینسر مخالف خصوصیت کا بھی حامل ہے اور جگر کے کینسر کے علاج کے لیے بہت کارآمد ہے۔

زعفران کی شفائی خصوصیت کا جائزہ لینے کے لیے تحقیق کی خاطر چوہوں میں زعفران کا استعمال کر کے تجربہ کیا گیا۔ زعفران تین مختلف مقداروں یعنی ۷۵/ ملی گرام فی کلو، ۱۵۰/ ملی گرام فی کلو اور ۳۰۰/ ملی گرام فی کلو میں استعمال کیا گیا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نتیجے میں ثابت ہوا کہ زعفران کے استعمال سے جگر میں نوڈلز (ابنارمل طریقے سے پیدا ہونے والے اُبھار) کی تعداد میں کمی آئی، جو جگر میں خرابی پیدا کر کے کینسر کے خلیے پیدا کرتے ہیں۔

جن چوہوں کو زعفران کی زیادہ مقدار استعمال کرائی گئی، اُن میں نوڈلز (Hepatic Nodule) کا مکمل طور پر خاتمہ ہو گیا اور ایلفا فیٹوپروٹین (Alpha Fetoprotein) میں بھی کمی واقع ہوئی۔ یہ پروٹین جگر کی خرابیاں پیدا کرتی ہے جس کی وجہ سے کینسر کا خطرہ بڑھتا ہے۔ اِس تجربے سے ثابت ہوا کہ زعفران کینسر کے خلاف استعمال ہونے کی خصوصیت کا حامل ہے اور کینسر کے خلیوں کو کم کرتا اور اُنہیں پھیلنے سے روکتا ہے۔

## ٹریفک سے پیدا ہونے والی ہوائی آلودگی

سٹاک ہوم کنٹری کونسل یونٹ کے توسط سے BAMSE پروجیکٹ میں یہ تحقیق کی گئی ہے کہ وہ بچے جو زندگی کے پہلے سال زیادہ ہوائی آلودگی والے علاقوں میں رہتے ہیں، اُن میں دمہ، پولن الرجی اور تباہ شدہ نظام تنفس کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ اگرچہ اِس میں جینیاتی عوامی بھی عمل ادا کرتے ہیں۔

اِس پروجیکٹ میں ۴۰۰۰ر بچوں پر پیدائش کے وقت سے تجزیہ کرنا شروع کیا گیا اور ان کے گھر کے اِردگرد کے ماحول میں ہوا میں ٹریفک کی وجہ سے ہونے والی آلودگی کی سطح کا بھی جائزہ لیا گیا جس میں اوزون، نائٹروجن ڈائی آکسائیڈ اور ڈیزل کے اجزا کی مقدار دیکھی گئی۔ نتیجے میں دیکھا گیا کہ جو بچے زیادہ ہوائی آلودگی کا سامنا کرتے ہیں، اُن میں دمے کا خطرہ ۶۰ر فیصد بڑھ جاتا ہے، نظامِ تنفس بری طرح متاثر ہوتا ہے اور بچے پولن الرجی کا زیادہ شکار ہوتے ہیں۔

اِس تحقیق میں یہ بھی بتایا گیا کہ ہوا میں آلودگی کی وجہ سے جو حساسیتیں پیدا ہوتی ہیں اور سانس لینے میں مسائل آتے ہیں، اُن کے ساتھ جین (Genes) کا بھی تعلق ہے یا نہیں۔ تحقیق سے ثابت ہے کہ جین GSTP1 نامی بہت سی حساسیتوں کی وجہ بنتا ہے۔ اگرچہ TNF جین ہوا میں موجود آلودگی جذب کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اُن دونوں کے مشترکہ عمل سے الرجی اور دمہ لاحق ہونے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ وہ بچے جو زیادہ ہوائی آلودگی والے علاقے میں رہ رہے تھے، ان میں سانس لینے کے مسائل اور دمہ زیادہ پایا گیا۔ البتہ تمام بچے اس کا شکار نہیں تھے کیونکہ جنیاتی عوامل بھی اس میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، البتہ ان بچوں میں الرجی اور دمہ کا خطرہ زیادہ بڑھ جاتا ہے۔

## سگریٹ نوشی ترک کیجئے، یادداشت بڑھائیے

نارتھمبریا یونیورسٹی کی تحقیق کے مطابق سگریٹ نوشی ترک کر دینا نہ صرف صحت کے لیے بہت اچھا ہے بلکہ یادداشت کے لیے بھی بہت مفید ہے۔ سگریٹ نوشی ترک کرنے اور سگریٹ نوشی نہ کرنے والے انسان کی یادداشت کی سطح برابر ہو جاتی ہے۔

ڈرگ اینڈ الکوحل ریسرچ گروپ آف نارتھمبریا یونیورسٹی نے ایک رئیل ورلڈ میموری ٹیسٹ کیا، جس میں سگریٹ نوشی کرنے والے ۲۷ر افراد، سگریٹ نوشی ترک کر دینے والے ۱۸ر افراد اور سگریٹ نوشی نہ کرنے والے ۲۴ر افراد نے شرکت کی۔ ان تمام افراد نے پہلے سے بتائے گئے مقررہ کام یونیورسٹی کیمپس کے دورہ کے دوران مختلف مقامات پر انجام دینے تھے اور یاد رکھنے تھے۔ سگریٹ نوشوں نے اپنا کام نہایت برے انداز میں انجام دیا اور صرف ۵۹ر فیصد کام یاد رکھے جبکہ وہ افراد جو سگریٹ نوشی ترک کر چکے تھے، اُنہوں نے ۷۴ر فیصد مطلوبہ کام یاد رکھے۔ ان لوگوں نے جنھوں نے کبھی سگریٹ نوشی نہیں کی تھی، ۸۱ر فیصد کام یاد رکھے۔

ڈاکٹر ہیفرنن آف نارتھمبریا یونیورسٹی کہتے ہیں کہ دُنیا بھر میں سگریٹ نوشی کرنے والے افراد بہت زیادہ تعداد میں ہیں، اِس لیے ضروری ہے کہ یادداشت پر مرتب ہونے والے سگریٹ نوشی کے اثرات کا جائزہ لیا جائے۔

یہ تو طے ہے کہ سگریٹ نوشی ترک کرنے سے جسم پر بہت صحت مند اثرات مرتب ہوتے ہیں، لیکن اس تحقیق سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ سگریٹ کا استعمال ترک کرنے سے یادداشت پر بھی بہت اچھا اثر مرتب ہوتا ہے۔



## مردوں کی جلد کا کینسر

خواتین کی نسبت مرد حضرات میں جلد کا کینسر ۳ گنا زیادہ پایا جاتا ہے لیکن طبی سائنس ابھی تک اس کی وجہ معلوم نہیں کر سکی۔ ایک حالیہ تحقیق میں چوہے پر تجربے کر کے طبی ماہرین نے اس کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ امریکی اوہیو سٹیٹ (Ohio State) یونیورسٹی کینسر سنٹر کے طبی ماہرین نے دیکھا کہ نر چوہے کی جلد میں مادہ چوہے کی نسبت ایک اہم ضد تکسیدی مادے (Antioxidant) کی مقدار کم ہوتی ہے۔ اسی خلل کے باعث کینسر کے خلیے پھیل جاتے ہیں۔ یہ ضد تکسیدی مادہ ایک پروٹین ہے جس کا نام کیٹا لیس (Catalase) ہے۔ سرطانی خلیوں کا پھیلاؤ روکنا اسی کی ذمے داری ہے۔ جب سورج کی شعاعیں جلد

## نمک اور عارضہ قلب

کئی برس سے ڈاکٹر خبردار کرتے آئے ہیں کہ نمک کا زیادہ استعمال دل کے لیے مضر ہے۔ لیکن ایک حالیہ تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ بہت کم نمک کا استعمال بھی دل سے منسلک پیچیدگیاں پیدا کرتا ہے۔ یہ تحقیق جرنل آف امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن میں شائع ہوئی ہے۔ اس کی رو سے نمک کی معتدل مقدار عارضہ قلب کو سب سے زیادہ کم کرتی ہے۔ واضح رہے، نمک کا بہت زیادہ استعمال حملۂ قلب، فالج اور دل کی دوسری بیماریاں پیدا کرتا ہے۔

یہ تحقیق برطانوی پروفیسر مارٹن ڈونیل اور میک ماسٹر یونیورسٹی کینیڈا کے ڈاکٹر سلیم یوسف کی مشترکہ محنت ہے۔

اس کے مطابق سوڈیم کلورائیڈ کا گردوں سے معتدل اخراج (۵٫۹۹ - ۴ گرام یومیہ) کے برعکس بہت زیادہ اخراج (یومیہ ۷-۶ گرام سے زیادہ) دل کی بیماریوں میں بہت زیادہ اضافہ کر سکتا ہے۔ جبکہ سوڈیم کلورائیڈ کا کم اخراج (۳ گرام سے کم یومیہ) بھی عارضہ قلب پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔

اب ماہرین مشورہ دیتے ہیں کہ نمک کا روزانہ استعمال ۲٫۳ گرام (۲٫۳۰۰ ملی گرام) سے کم ہونا چاہیے۔ نمک کی یہ مقدار ایک تجربے کے بعد بتائی گئی جس میں دیکھا گیا کہ نمک کو اس مقدار میں استعمال کیا جائے تو فشارِ خون میں کمی واقع ہوتی ہے۔ لیکن بڑے پیمانے پر ابھی یہ تجربہ نہیں کیا گیا کہ اس مقدار سے حملۂ قلب یا فالج کا خطرہ بھی کم ہوتا ہے یا نہیں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر پڑیں تو کینسر پیدا ہونے کا خدشہ بڑھ جاتا ہے۔ تب اسی پروٹین کی موجودگی کینسر پیدا ہونے سے روکتی ہے۔

تحقیق کے مطابق عورتوں میں اس قدرتی پروٹین کی مقدار مردوں کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے عورتوں میں جلد کے کینسر کا خطرہ کم ہوتا ہے۔ طبی ماہرین نے یہ تجربہ بالوں کے بغیر والی قسم کے چوہے پر کیا۔ اُسے جلد کا وہ کینسر تھا جو انسانوں میں بہت عام ہے۔ جب اس کا علاج پروٹین کیمالیس سے ہوا تو کینسر کے خلیوں میں کمی دیکھی گئی۔

## سنیکس اور وزن کم کرنے کی کوششیں

فریڈ ہچنسن کینسر ریسرچ سنٹر، واشنگٹن کے طبی ماہرین دریافت کیا ہے کہ جو خواتین پرہیزی کھانے کے معمول میں ناشتے اور دوپہر کے کھانے کے درمیان سنیکس کھائیں، وہ ان عورتوں کی نسبت جو ناشتے کے بعد سنیکس نہیں کھاتیں، کم وزن گھٹا پاتی ہیں۔ طویل المدتی تحقیق کے بعد ماہرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ناشتے کے بعد سنیکس کھانے سے جسم کے کل وزن کا ۷ر فیصد وزن کم ہوتا ہے جبکہ وہ لوگ جو ناشتے کے بعد سنیکس استعمال نہیں کرتے، ان کے جسم کے کل وزن کا ۱۱ر فیصد سے زیادہ وزن کم ہوتا ہے۔ تحقیق کے مطابق سنیکس ہر وہ کھانے پینے کی شے ہے جو ضروری کھانوں کے درمیان لی جائے۔

دیکھا گیا ہے کہ سنیکس بھوک لگنے کی صورت میں نہیں کھائے جاتے بلکہ صرف عادت کی وجہ سے استعمال کیے جاتے ہیں۔ دونوں کھانوں کے درمیان وقفہ کم ہونے کے باعث سنیکس کھانے سے وزن میں کمی زیادہ نہیں ہو پاتی۔ لیکن اصل کھانوں کے درمیان وقفہ بہت زیادہ بڑھا دیا جائے جس میں بھوک لگنا شروع ہو جائے تو یہ بھی وزن کم کرنے کے لیے مستعمل خوراک کے اثر کو کم کرتا ہے۔ بعض لوگوں کے مطابق وزن کم کرنے کی خاطر مخصوص خوراک کے استعمال کا مطلب یہ ہے کہ ہر وقت انسان بھوکا رہے۔ لیکن طبی ماہرین کے مطابق سنیکس کا استعمال اس وقت کیا جا سکتا ہے جب ناشتے اور کھانے کے دوران وقفہ زیادہ ہو۔ مزید براں سنیکس میں بھی ایسی صحت آور غذائیں کھانی چاہیے جن میں کیلوریز کم ہوں، مثلاً پھل، سبزیاں، دہی، تھوڑی مقدار میں خشک میوہ جات، پانی کافی پیا جائے۔ ایسی چیزیں جن میں کیلوریز زیادہ ہوں مثلاً میٹھی چیزیں، آلو کے چپس یا تلی ہوئی اشیا وغیرہ، ان سے پرہیز کرنا چاہیے۔

طاہرہ اعجاز نے ایم اے کیا ہے اور گجرات کے ایک قصبہ ڈنگہ میں مقیم ہیں۔ پڑھنا لکھنا وراثت میں اپنے والد اعجاز احمد ڈنگہ سے پایا۔ یاد رہے کہ ڈنگہ ان کے نام کا حصہ نہیں مگر پہچان کا حصہ بن گیا ہے۔



تاریخ کے جھروکے سے

# سدِّ ذوالقرنین

محمود جمال

ایک تاریخی دیوار جو قرآن پاک کی رُو سے ۲ر خطرناک قبائل یاجوج ماجوج کا راستہ روکنے کے لیے بنائی گئی

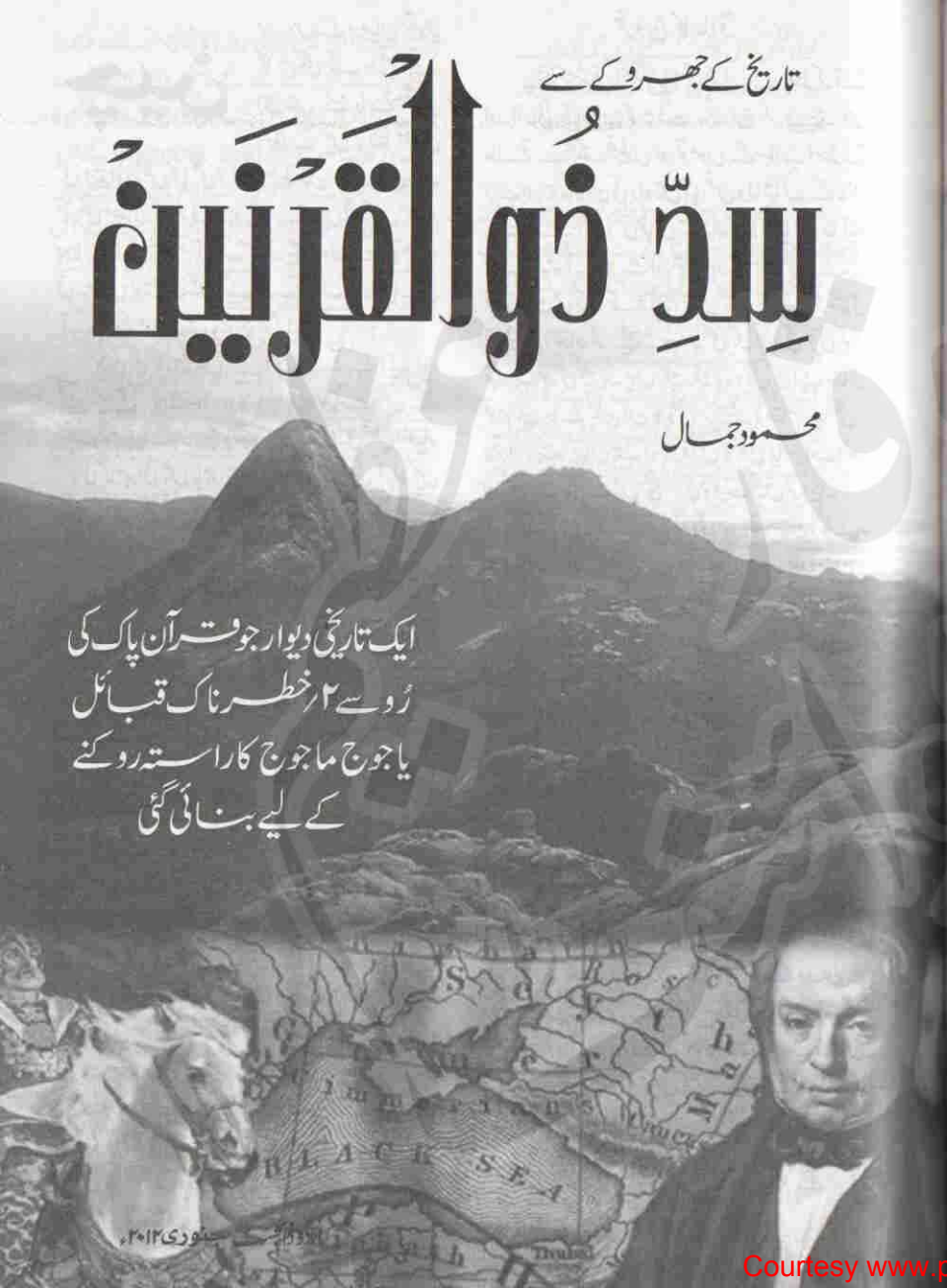




Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# چین

اور روس کے درمیان منگولیا کا تاریخی ملک واقع ہے۔ اس میں بسنے والے منگول کہلاتے ہیں۔ لفظ منگول کی ابتدائی شکل کیا تھی؟ اس سلسلے میں جب چین کے تاریخی مصادر کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ قدیم نام ''موگ'' تھا۔ یہی موگ ہے جو چھ سو ق۔م میں یونانیوں میں میگ اور مے گاگ پکارا گیا۔ یہی آگے چل کر عبرانی میں ماجوج ہوگیا۔

چین کی تاریخ میں ہمیں اسی علاقے کے ایک اور قبیلے ''یواچی'' (Yuch-chi) کا ذکر ملتا ہے جس نے مختلف قوموں کے مخارج وتلفظ سے مل کر ایسی شکل اختیار کر لی کہ عبرانی میں یاجوج ہوگیا۔ یہ محققین کی آراء ہیں جنہیں ایک غیر تحریری تاریخ کہا جا سکتا ہے اور جو بہر حال حرفِ آخر نہیں۔

بائبل کے عربی، فارسی اور اُردو تراجم میں ماجوج کا نام درج ہے۔ یہ انگریزی ترجمے میں مے گاگ (Maygog) ہے۔ یاجوج صرف ''عہد نامہ جدید'' کے مکاشفات یوحنا کے اُردو تراجم میں ملتا ہے۔ ''عہد نامہ قدیم'' کے حزقی ایل کی کتاب میں جوج آیا ہے جو انگریزی میں گوگ (GOG) کہلاتا ہے۔ قرآن مجید، احادیث اور اسلامی ادبیات میں یہ نام یاجوج ہے، محض جوج کہیں نہیں ملتا۔ اس میں ''یا'' کا اضافہ کیونکر ہوا، اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ تاہم چند باتیں واضح ہوتی ہیں: (۱) یاجوج و ماجوج حضرت آدمؑ اور پھر حضرت نوحؑ کی اولاد میں سے ہیں۔ بائبل میں انھیں ''یافث'' کی اولاد میں شمار کیا گیا۔ (۲) لہٰذا ان کے اجسام بھی عام انسانوں کی طرح ہیں۔ (۳) اکثر روایات میں ان کی کثرتِ تعداد کی طرف اشارہ ہے۔ (۴) قرآن کریم اور حدیث دونوں سے یہ امر واضح ہے کہ یہ اقوام خون ریزی اور سفاکی میں بہت بڑھ کر تھیں اور ان سے دوسری قوموں کو اکثر خطرہ درپیش رہا۔

## خروج کا علاقہ

یہ شمال مشرق (منگولیا) کی طرف سے امنڈ کر آتے اور انسانی آبادیوں کو تاخت و تاراج کر دیتے۔ اس علاقے سے مختلف قبیلوں اور قوموں کے سیلاب امنڈتے رہے اور جو کچھ ان کی راہ میں آیا، خس وخاشاک کے مانند بہالے گئے۔ انھی وحشی قبائل میں کچھ وسط ایشیا میں جا آباد ہوئے، کچھ آگے بڑھے اور شمالی یورپ تک پہنچ گئے۔ یہ قبائل جن ممالک تک پہنچتے، وہیں بس جاتے اور مقامی تہذیب اختیار کر لیتے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کی اپنی کوئی تہذیب تو تھی نہیں۔ یوں رفتہ رفتہ وہ وہاں کی ایک مقامی قوم بن جاتے لیکن ان کا وطنی سرچشمہ (مقامِ پیدائش) برقرار رہتا۔ یہاں تک کہ پھر قبائل کا کوئی نیا سیلاب اٹھتا اور کسی نئے علاقے میں پہنچ کر نئی قومیت تخلیق کر دیتا۔

قدیم زمانے میں آریائی اقوام، ہندوستان، فارس، ماد (علاقہ) اور اناطولی میں آباد ہوئیں۔ یہ ہندوستان و یورپ کے آریاؤں کی مورثِ اعلیٰ تھیں۔ سیتھین، ہُن وغیرہ کہلانے والی اقوام بھی اِس زمرے میں آتی ہیں۔ ان اقوام نے جنوبی، مشرقی اور مغربی علاقوں پر مختلف حملے کیے، جن کی تاریخ میں تفصیل ملتی ہے۔ حضرت ذوالقرنین کے زمانے میں ان اقوام کی ترکتازیاں مغربی علاقوں کے لئے وبالِ جان بنی ہوئی تھیں، چنانچہ روک تھام کے لئے انھوں نے دو پہاڑوں کے مابین ایک اونچی اور مضبوط سدّ (دیوار) تعمیر فرما دی۔

قرآن کریم نے سورۂ کہف میں بحوالہ یاجوج ماجوج، ذوالقرنین کے حالات بیان کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ جب ذوالقرنین اپنی شمالی مہم کے دوران دو دیواروں (پہاڑوں) کے درمیان پہنچا تو وہاں اسے ایسی قوم ملی جس کی زبان ناقابلِ فہم تھی۔ تاہم جب ترجمان کے ذریعے گفتگو ہوئی تو قوم کے نمائندوں نے عرض کیا:

''اے ذوالقرنین! یاجوج ماجوج اس سر زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ تو کیا ہم تجھے کوئی ٹیکس اس کام کے لیے دیں کہ تو ہمارے اور ان کے درمیان ایک سدّ (بند) تعمیر کر دے'' (الکہف۔۹۴)

ذوالقرنین نے ان کی مدد کی اور لوہے کی بڑی بڑی چادروں کو پگھلاتے ہوئے تانبے کے ذریعے جوڑ کر ایک پختہ دیوار بنا دی۔ اس طرح یاجوج ماجوج کا یہ فتنہ وقتی طور پر تو دب گیا مگر ساتھ ہی یہ فرما دیا گیا:

''جب میرے رب کے وعدے کا وقت آئے گا تو وہ اس کو پیوندِ خاک کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے اور اس روز ہم لوگوں (یاجوج ماجوج) کو چھوڑ دیں گے کہ (سمندر کی موجوں کی طرح) ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوں۔'' (الکہف۔۹۸۔۹۹)

اسی طرح سورہ انبیا میں ارشاد ہے:

''جب یاجوج ماجوج کھول دیئے جائیں گے اور ہر بلندی سے وہ نکل پڑیں گے۔''
(سورہ الانبیاء۔۹۶)

بائبل کے حوالے سے طبری کا بیان ہے کہ حضرت نوحؑ کا بیٹا، ترک یاجوج ماجوج اقوام کا باپ ہے۔ بنابریں یاجوج ماجوج ترک قوم کے بنوعم (چچازاد) ہیں۔ ان کا اپنا جزیرہ، ملک اور زبان تھی۔ حزقی ایل کی کتاب میں جوج (یاجوج) سر زمین ماجوج کا باشندہ اور روش (روس) اور ملک ماسکو کا سردار بتایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ماجوج اور روس کی سرحدیں ملتی تھیں۔ یہ حضرت مسیحؑ سے ساڑھے پانچ سو برس پہلے کا بیان ہے۔ بعد میں یاجوج ماجوج کی آبادیاں الگ الگ ہوگئیں۔

''الادریسی'' (مسلم مورخ) نے یورپی روس کے جو نقشے بنائے، ان میں یورپی روس کا شمالی حصہ ملک ماجوج ظاہر کیا ہے۔ اس حصے کے نیچے ماسکو، روس اور دوسرے قبائل کی آبادیاں بلغارِ اعظم تک چلی گئی ہیں۔ بلغارِ اعظم کا علاقہ کوہ قاف اور بحرِ خزر (Caspean Sea) کے اوپر تھا۔ الادریسی نے تمام قوموں کے نام نقشے میں لکھے ہیں اور یاجوج کا ملک ایشیائی روس میں سائبیریا کے اس علاقے کو بتایا جو کوہِ یورال سے مشرق کی طرف سمندر کے کنارے کنارے چلا جاتا ہے۔

قرآن مجید نے ان کی نسبت جو تاریخی بیان دیا، اس میں ان دونوں قوموں کی قوت اور غارت گری کا ذکر ہے، جسے روکنے کے لئے ذوالقرنین نے سدّ (دیوار) تعمیر کی تھی۔ سدّ کا وجود تاریخی حقیقت ہے، جس کی تائید مہموں سے بھی ہوتی ہے۔

قرآن کریم نے سدّ کا قصہ سورہ کہف میں بیان کیا ہے۔ بائبل اس کے ذکر سے خالی ہے کیونکہ کتابِ پیدائش اور حزقی ایل کی کتاب دونوں سدّ سے پہلے کی تحریریں ہیں۔ سدّ کہاں واقع ہے؟ اس بارے میں مختلف آراء ہیں۔ البیرونی کا کہنا ہے کہ دنیا کے شمال مغربی حصے میں ماجوج کا ملک تھا۔ امام رازی کا موقف بھی یہی ہے۔ بعض محققین نے آرمینیا اور آذربائیجان کے درمیان اس کا محلِ وقوع بیان کیا ہے۔ بعض مفسّرین نے اِسے سائرس اعظم، نوشیرواں عادل اور اسکندرِ اعظم سے منسوب کیا ہے۔

## سدِّ ذوالقرنین کا محلِ وقوع

تاریخی طور پر یہ امر ثابت ہے کہ شمال میں بسنے والی اقوام جنوبی علاقوں کی طرف تاخت وتاراج کرتی تھیں۔ مختلف زمانوں میں ان کے متعدد خروج ہوئے۔ چنانچہ متوقع حملوں سے محفوظ رہنے کے لیے ان علاقوں میں مختلف دیواریں تعمیر کی گئیں، جن میں سے حسبِ ذیل قابلِ ذکر ہیں:



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

(۱) دیوارِ چین: یہ دیوار سب سے زیادہ مشہور اور لمبی ہے۔

(۲) سدّ دربند یا باب الابواب: داغستان (موجودہ روس) میں بحیرہ خزر (Caspean Sea) کے مغربی کنارے "دربند" نام کا ایک شہر آباد ہے۔ اس کی جغرافیائی اہمیت کے پیشِ نظر اسے باب الابواب کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہاں قدیم زمانے میں ایک سدّ (دیوار) موجود تھی۔

(۳) سدّ درّہ داریال: مذکورہ باب الابواب سے مغربی جانب، کاکیشیا (پہاڑ) کے بلند حصوں میں دو بلند پہاڑوں کے درمیان درّہ داریال (Darial) ہے۔ موجودہ نقشوں میں اس کا محلِ وقوع قفقاز کاکیشیا (Vladi Kavkaz) اور تفلیس کے درمیان دکھایا جاتا ہے۔ وہاں بھی قدیم زمانے سے ایک سدّ ملتی ہے، تاہم اس کے بانی کا نام غیر معلوم ہے۔ یاقوت الحموی کے مطابق یہ دیوار تانبا پگھلا کر بنائی گئی۔ یہ دیوار آہنی دروازہ (باب الحدید) کے نام سے معروف ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان مذکورہ دیواروں میں سے سدّ ذوالقرنین کون سی ہے؟

مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں متعدد قدیم و جدید حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ دیوار (جو دربند سے داریال تک پھیلی سمجھنی چاہیے) کا بانی ذوالقرنین (سائرس) تھا اور یہی دیوار مذکورہ قرآنی "سدّ" کے مصداق ہے۔ ترجمان القرآن میں اس کی حسبِ ذیل تفصیل آئی ہے۔

ایک قدیم شہر دربند ٹھیک اس مقام پر واقع ہے جہاں قفقاز کا سلسلۂ کوہ ختم ہوتا اور بحرِ خزر سے مل جاتا ہے۔ یہاں ایک دیوار موجود ہے جو سمندر سے شروع ہو کر تقریباً تیس میل تک مغرب میں چلی گئی ہے جہاں قفقاز کا مشرقی حصہ بہت زیادہ بلند ہے۔ یوں دیوار نے ایک طرف بحرِ خزر کا ساحلی مقام بند کر دیا اور دوسری طرف پہاڑ کا وہ تمام حصہ بھی روک دیا جو ڈھلوان ہونے کی وجہ قابلِ عبور ہو سکتا تھا۔ ساحل کی طرف یہ دیوار دہری ہے۔

اگر آذربائیجان سے ساحل کے ساتھ ساتھ آگے بڑھیں تو پہلے ایک دیوار ملتی ہے جو سمندر سے برابر مغرب کی طرف چلی گئی ہے۔ اس میں ایک دروازہ تھا۔ دروازے سے جب گزرتے تو شہر دربند شروع ہو جاتا۔ دربند سے آگے پھر اسی طرح کی ایک دیوار ملتی لیکن یہ صرف ایک میل تک گئی ہے۔ اس کے بعد اکہری دیوار کا سلسلہ ہے۔ دونوں دیواریں جہاں جا کر ملتیں وہاں ایک قلعہ ہے۔ قلعے تک پہنچ کر دونوں کا درمیانی فاصلہ سو گز سے زیادہ نہیں رہتا لیکن ساحل سے پانچ سو گز دور ہے۔ اسی پانچ سو گز کے درمیان شہر دربند آباد ہے۔

اِس دیوار کو قدیم زمانے سے دوبارہ یعنی دہرا سلسلہ کہتے تھے۔ یہ دیوار ۱۷۹۶ء تک موجود تھی، جس کی روسی سیاح کی بنائی ہوئی ایک تصویر ایچ والڈ (Eich Wald) نے اپنی کتاب "کواکیس" میں نقل کی ہے۔ لیکن ۱۹۰۴ء میں جب پروفیسر جیکسن نے اس کا معاینہ کیا تو گو اس کے آثار باقی تھے مگر دیوار گر چکی تھی۔

## تلاشِ سدّ کی مہمات

یاجوج ماجوج کی سدّ کی دریافت کے سلسلے میں جو علمی اور جغرافیائی مہمات دورِ اسلام میں وہاں گئیں، وہ تاریخی ترتیب سے حسبِ ذیل ہیں:۔

(ا) وہ بزرگ جنھوں نے حضورِ نبی اکرمؐ سے سدّ کے بارے میں اپنے مشاہدات بیان کیے، ممکن ہے قصداً وہاں گئے ہوں یا اتفاقیہ ان کا وہاں گزر ہو گیا۔ آغازِ ۵ھ سے ربیع الاول ۱۱ھ تک کسی زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک شخص نے نبی کریمؐ سے آ کر بیان کیا میں نے "سدّ" کو دیکھا ہے اور وہ خوبصورت دھاری دار چادر (مجر) کی طرح ہے۔

(ب) حضرت عمرؓ کے آخری زمانۂ خلافت ۲۲ھ میں آرمینیا پر حملہ ہوا۔ تاریخ طبری میں اس عنوان کے تحت "روم" کے مشاہدے منقول ہیں۔ اس دیوار کا نام بھی بعض اشخاص کی زبان پر آتا ہے جس سے ثابت ہے کہ یہ دیوار اس زمانے میں موجود تھی اور لوگ اس سے واقف



تھے۔ مطر بن ثلج التمیمی کا بیان ہے کہ میں عبدالرحمٰن بن ربیعہ کے پاس گیا، وہاں "شہر براز" (نامی شخص) بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک شخص ان کے پاس آیا جس پر سفر کی تکان کا اثر تھا۔ وہ شہر براز کے برابر بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔

اس کی باتوں سے فرصت پا کر شہر براز نے عبدالرحمٰن سے کہا: "امیر! آپ جانتے ہیں، یہ شخص کہاں سے آیا ہے؟ میں نے اس کو دو برس ہوئے "سدّ" کی طرف بھیجا تھا تا کہ وہاں کا حال دیکھ آئے اور پتا چلائے کہ اس کے آگے کون رہتا ہے۔ اسے میں نے بہت سا مال دیا تھا اور آس پاس کے سلاطین کے نام خطوط اور ہدیے دیئے تھے۔ یہ بالآخر اس بادشاہ کے پاس پہنچا جس کی قلمرو میں "سدّ" واقع ہے۔ وہ پھر حاکم کے بازیار (رہنما) اور عقاب کے ساتھ "سدّ" پہنچا"..... (اب مذکورہ شخص بیان کرتا ہے).....

"وہاں دو پہاڑ ہیں، جن کے درمیان سدّ بنی ہوئی ہے۔ یہ دونوں پہاڑوں کے برابر آنے کے بعد کچھ اونچی بھی ہو گئی ہے۔ سدّ کے آگے خندق ہے جو بہت گہری ہونے کے سبب رات سے زیادہ تاریک ہے۔ میں نے یہ دیکھ کر جب پلٹنا چاہا تو بازیار نے کہا، ابھی ٹھہرو! اس نے پھر تھوڑا سا گوشت کاٹ کر جو ساتھ لے گیا تھا، ہوا میں پھینکا۔ عقاب اس پر جھپٹا، لیکن گوشت خندق میں جا چکا تھا۔ عقاب بھی اندر گیا۔ جب وہ گوشت کو پنجوں میں دبائے ہوئے باہر آیا تو گوشت کے ساتھ ایک سرخ یاقوت چپکا ہوا تھا۔"

شہر براز نے وہ یاقوت اس شخص سے لے کر عبدالرحمٰن بن ربیعہ کو دیا۔ عبدالرحمٰن نے دیکھ کر واپس کیا اور اس شخص سے پوچھا "روم" کا کیا حال ہے؟ وہ (دیوار) کیسی ہے؟"

وہ بولا "بالکل ایسی جیسا ان کا کپڑا (مطرکی قبا)۔"

مطر نے عبدالرحمٰن سے کہا "یہ سچ کہہ رہا ہے۔ یہ وہاں تک گیا ہے اور دیکھ کر آیا ہے۔"

عبدالرحمٰن بولے "یہ غالباً لوہے اور پیتل کی صورت بیان کر رہا ہے۔"

لیکن درج بالا واقعہ سے واضح نہیں ہوتا کہ اس سے مراد "سدّ دربند" ہے یا "سدّ داریال؟" خلیفہ واثق باللہ عباسی (۲۲۷ھ تا ۲۳۲ھ) نے خواب دیکھا کہ سدّ کا کچھ حصہ کھل گیا ہے۔ اس نے تحقیق کے لیے آدمی بھیجنا چاہا۔ وزراء نے رائے دی کہ اس کام کے لئے سلام مترجم سے موزوں کوئی آدمی نہیں کہ وہ تیس زبانیں جانتا ہے۔ خلیفہ نے اس کو پچاس مستعد اور مضبوط جوانوں کے ساتھ مہم پر روانہ کیا۔ گرم کپڑوں کے علاوہ پانچ ہزار دینار صلہ کے طور پر اور دس ہزار درہم دیت (اگر جان ضائع ہو جائے) کے طور پر۔ علاوہ ازیں سال بھر کے اخراجات ان جوانوں کے حوالے کئے گئے۔

یہ مہم ۱۵ ماہ میں "سرمن رائے" سے چل کر تفلیس (آرمینیا)، سریر، لان، فیلان شاہ، طرخان (خزر) سے "سدّ" تک پہنچی۔ راستہ میں ۲۲ ساتھی ہلاک ہوئے۔ واپسی دوسرے راستے سے ہوئی۔ اس میں ۱۲ ماہ صرف ہوئے اور ۱۴ آدمی جان سے گئے۔ اس طرح ۳۶ ساتھی اس تحقیقی مہم میں کام آئے۔ سوا دو سال سے کچھ اوپر مدت میں یہ سفر تمام ہوا۔

## دیوار کی ماہیت

عالم اسلام کے ممتاز جغرافیہ داں، ابن خرداذبہ نے اپنی کتاب "المالک و الممالک" میں سدّ ذوالقرنین کی ہیت کچھ یوں بیان کی ہے:

"سدّ" کے پاس ایک بلند گول پہاڑ پر ایک قلعہ ہے اور وہ سدّ جو ذوالقرنین کی بنائی ہوئی ہے، وہ ایک راستہ (درّہ) دو پہاڑوں کے درمیان تھا۔ یہ ۲۶۰ ہاتھ چوڑا تھا۔ اس راستے سے یاجوج و ماجوج قتل و غارت گری کرنے آیا کرتے۔ ذوالقرنین نے راستے کو بند کرنے کے لئے جو دیوار اٹھائی، اس کی بنیاد ۳۰ ہاتھ گہری کھدوائی، پھر اس کو لوہے اور تانبے سے بنوا کر زمین کے برابر تک لایا۔ راستے کے دونوں پہلوؤں پر پہاڑ سے ملے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئے دو بازو بنوائے۔ ہر بازو ۲۵/ ہاتھ چوڑا اور ۵۰/ ہاتھ اونچا تھا۔ یہ سب لوہے کی اینٹوں کا تھا، جس پر تانبا پگھلا کر ڈال دیا گیا۔ ہر اینٹ ۴/ انگل موٹی اور ڈیڑھ ہاتھ لمبی اور چوڑی تھی۔ لوہے اور تانبے کی یہ ساری عمارت پہاڑ کی چوٹی تک چلی گئی ہے۔ اس کے اوپر لوہے کی ۳۷/ برجیاں ہیں۔ ہر برجی ۵/ ہاتھ لمبی اور ۴/ ہاتھ چوڑی ہے۔ دروازہ بھی لوہے کا ہے۔ اس کے دو پٹ ہیں۔ ہر پٹ ۵/ ہاتھ چوڑا، ۷۵/ ہاتھ لمبا اور ۵/ ہاتھ موٹا ہے۔ دروازے اور پہاڑ میں اتنی درز بھی نہیں کہ ہوا آسکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ڈھال دیے گئے ہیں۔

دروازے پر قفل بھی ہے۔ یہ قفل ۷ ہاتھ لمبا اور ایک ہاتھ موٹا گولائی میں ہے۔ اسے دو آدمی اپنے گھیرے میں نہیں لے سکتے۔ یہ زمین سے ۲۵/ ہاتھ اونچا ہے۔ اس کی کنجی ڈیڑھ ہاتھ لمبی اور اس میں ۱۲/ دندانے ہیں۔ اس کی گولائی ۴/ بالشت ہے۔ دروازے کے ساتھ ۲/ قلعے ہیں۔ قلعوں کے دروازوں پر ۲/ درخت ہیں اور دونوں قلعوں کے درمیان آبِ شیریں کا چشمہ ہے۔ سدّ کی تعمیر کے وقت لوہے کے دیگدان (چولھے) اور ہانڈیاں، جن میں تانبا پگھلایا گیا تھا، وہ سب یہاں موجود ہیں۔

ابوریحان البیرونی (۴۲۱ھ) نے سدِّ ذوالقرنین کے جائے وقوع کی نسبت لکھا ہے کہ وہ دنیا کے شمال مغربی حصہ میں ہے۔ الادریسی نے چھٹی صدی کے وسط میں نزہۃ المشتاق لکھی، اس میں دنیا کا نقشہ بنایا اور نقشے میں سدِّ ذوالقرنین کا جائے وقوع بھی دیا۔ محققین کی آراء اور ان کا اختلاف اپنی جگہ لیکن ایک بات قابلِ غور ہے، یہ کہ اب تک صرف دو مقامات ایسے ہیں جہاں سدِّ ذوالقرنین کے آثار اور کھنڈر پائے جاتے ہیں۔ یہ دو مقامات ''دربند'' اور ''داریال'' ہیں۔ ان کے علاوہ اور کہیں اس کے آثار نہیں ملے۔

اس صورت میں یہ تو متحقق ہو گیا کہ سدِّ ذوالقرنین دربند میں تھی یا داریال میں۔ اب سوال ہے کہ دونوں میں سے وہ ایک کون سا مقام ہے جہاں ذوالقرنین نے دیوار بنائی۔ وسطِ ایشیا کے نقشے پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دربند شہر سے مغربی سمت وہ علاقہ جو آج کل ''ولادی قفقاز'' (Vladi Kavkaz) کہلاتا ہے، وہیں کسی جگہ درّہ داریال واقع ہے۔ ان ہر دو مقامات کے درمیان اتنا طویل فاصلہ نہیں جسے ہم بہت کہہ سکیں۔ لہٰذا دربند اور داریال کے اس سارے علاقے کو ایک ہی علاقہ شمار کر لینے میں کوئی خاص چیز مانع نظر نہیں آتی۔

بعض محققین دیوار کو نوشیرواں یا سکندرِ اعظم سے منسوب کرتے ہیں، تب بھی ۵۰/ میل کے اس علاقے میں اتنی لمبی دیوار تعمیر کرنے میں پہل کس نے کی؟ ظاہر ہے پانچ سو قبل مسیح میں ذوالقرنین کے سوا، جسے ایرانی ''کورش'' اور یورپی ''سائرس'' کہتے ہیں، اس علاقے میں اور کوئی فاتح نہیں پہنچا۔ سبھی فاتحین ذوالقرنین کے بعد ہی وہاں پہنچے۔ چنانچہ ایک کام کی ابتدا کرنے والے کو اس سے نسبت دینے میں کوئی حرج نہیں۔ قرآن پاک کا حوالہ اس ضمن میں کافی اور مضبوط ہے۔ مولانا مودودیؒ کی رائے بھی اس سلسلے میں وقیع ہے، ملاحظہ کیجیے۔ مولانا تفہیم القرآن کی تیسری جلد کے ضمیمہ نمبر۲ میں فرماتے ہیں:۔

''ذوالقرنین کی تعمیر کردہ دیوار کے متعلق بعض لوگوں کا یہ غلط خیال ہے کہ اس سے مراد مشہور دیوار چین ہے۔ حالانکہ دراصل یہ دیوار قفقاز (Caucasus) کے علاقے داغستان میں دربند اور داریال (Darial) کے درمیان بنائی گئی۔ قفقاز (کاکیشیا) بحیرہ اسود (Black Sea) اور بحیرہ خزر (Caspian Sea) کے درمیان واقع ہے۔ اس علاقے میں بحیرہ اسود سے داریال تک نہایت بلند پہاڑ ہیں اور ان کے درمیان اتنے تنگ درّے ہیں کہ کوئی بڑی فوج نہیں گزر سکتی۔ البتہ دربند اور داریال کے درمیان جو علاقہ ہے، اس میں پہاڑ زیادہ بلند نہیں اور ان میں کوہستانی راستے بھی خاصے وسیع ہیں۔''

''قدیم زمانے میں شمال کی وحشی قومیں اسی سمت سے جنوب کی طرف غارت گرانہ حملے کرتی تھیں۔ ایرانی فرمارواؤں کو اپنی مملکت پر شمالی حملوں کا خطرہ لاحق رہتا تھا۔ انھی حملوں کو روکنے کے لئے ایک نہایت مضبوط دیوار بنائی گئی جو ۵۰/ میل لمبی، ۲۹۰/ فٹ بلند اور ۱۰/ فٹ چوڑی تھی۔ ابھی تک تاریخی طور پر یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ یہ دیوار ابتداً کب اور کس نے بنائی مگر مسلمان مؤرخین اور جغرافیہ نویس اسی کو سدِّ ذوالقرنین قرار دیتے ہیں۔ اس کی تعمیر کی جو کیفیت قرآن مجید میں بیان کی گئی ہے، اس کے آثار اب بھی وہاں پائے جاتے ہیں۔''

''ابنِ جریر طبری اور ابنِ کثیر نے اپنی تاریخوں میں یہ واقعہ لکھا ہے اور یاقوت نے بھی معجم البلدان میں اس کا حوالہ دیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے آذربائیجان کی فتح کے بعد ۲۲/ ہجری میں سُراقہ بن عمرو کو باب الابواب (دربند) کی مہم پر روانہ کیا۔ سُراقہ نے عبدالرحمٰن بن ربیعہ کو اپنے مقدمۃ الجیش کا افسر بنا کر آگے بھیجا۔ عبدالرحمٰن جب آرمینیا کے علاقے میں داخل ہوئے تو وہاں کے فرمانروا، شہر براز نے جنگ کے بغیر اطاعت قبول کر لی۔ اس کے بعد انھوں نے باب الابواب کی طرف پیش قدمی کا ارادہ کیا۔ اس موقع پر شہر براز نے ان سے کہا کہ میں نے اپنے ایک آدمی کو سدِّ ذوالقرنین کا مشاہدہ اور اس علاقے کے حالات کا مطالعہ کرنے بھیجا تھا، وہ آپ کو تفصیلات سے آگاہ کر سکتا ہے۔''

''چناچہ اس نے عبدالرحمٰن کے سامنے اُسے پیش کر دیا۔ اس واقعہ کے ۲/ برس بعد عباسی خلیفہ واثق (۲۲۷ھ-۲۳۳ھ) نے سدِّ ذوالقرنین کا مشاہدہ کرنے کے لیے سلام الترجمان کی قیادت میں ۵۰/ آدمیوں کی ایک مہم روانہ کی جس کے حالات یاقوت نے معجم البلدان اور ابنِ کثیر نے البدایہ والنہایہ میں خاصی تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ یہ وفد سامرہ (سُرَّ مَنْ رَأی) سے تفلیس، السریر اور اللّان سے ہوتا ہوا فیلان شاہ کے علاقے میں پہنچا۔ پھر خزر کے ملک میں داخل ہوا اور اس کے بعد ''دربند'' پہنچ کر اس نے سدّ (دیوار) کا مشاہدہ کیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی ہجری میں بھی مسلمان عموماً قفقاز کی دیوار ہی کو سدِّ ذوالقرنین سمجھتے تھے۔''

''یاقوت نے معجم البلدان میں متعدد مقامات پر اسی امر کی تصریح کی ہے۔ خزر کے زیرِ عنوان وہ لکھتا ہے ''یہ ترکوں کا علاقہ ہے جو سدِّ ذوالقرنین کے قریب باب الابواب کے پیچھے واقع ہے اور جسے ''دربند'' بھی کہتے ہیں۔ اسی سلسلے میں وہ خلیفہ المقتدر باللہ کے سفیر، احمد بن فضلان کی ایک اطلاع نقل کرتا ہے جس میں مملکتِ خزر کی تفصیلی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ خزر ایک مملکت کا نام ہے جس کا صدر مقام اتل ہے۔ دریائے اتل اسی شہر کے درمیان سے گزرتا ہے۔ یہ دریا روس اور بلغار سے آکر بحرِ خزر میں گرتا ہے۔''

''یاقوت باب الابواب کے زیرِ عنوان لکھتا ہے کہ اس کو الباب اور دربند بھی کہتے ہیں۔ یہ بحرِ خزر کے کنارے واقع ہے۔ بلادِ کفر سے بلادِ مسلمین کی طرف آنے والوں کے لئے یہ راستہ انتہائی دشوار گزار ہے۔ ایک زمانے میں یہ نوشیرواں کی مملکت میں شامل تھا اور شاہانِ ایران اس سرحد کی حفاظت کو غایت درجہ اہمیت دیتے تھے۔

قرآن پاک میں سدّ کا گرنا اور یاجوج ماجوج کا ہر بلندی سے اترنا مذکور ہے۔ پہلی بات کا بائبل میں ذکر نہیں کیونکہ اس وقت تک سدّ تعمیر نہیں ہوئی تھی، دوسری اس کے مطابق ہے۔ احادیث میں خروجِ یاجوج ماجوج قیامت کے دس آثار میں سے ایک ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ ان اقوام کا خروج اقوامِ عالم کے لئے سخت خطرہ اور سخت ترین خونریزی کا موجب ہوگا اور یہ خطرہ قیامت سے پہلے ضرور وقوع میں آئے گا۔ چنگیز خان کی قیادت میں منظم ہونے والے تاتاری جنگجو قبائل کا خروج ایک مصداق تو ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں کہ قیامت تک ان کا کوئی خروج نہ ہو۔ عین ممکن ہے کہ شمالی اقوام پھر کسی وقت اس سے بھی زیادہ تباہ کن حملہ کریں اور امنِ عالم کو تہ و بالا کر ڈالیں۔ علاوہ ازیں یہ امر بھی طے شدہ ہے کہ وہ غارت گر اقوام اُسی سمت (شمالی پہاڑی علاقوں) سے اُتر کر آئیں گی جس سے عہدِ عتیق میں آتی رہی ہیں۔

(استفادہ: ترجمان القرآن، تفہیم القرآن، دائرہ معارف اسلامیہ)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محمد اسحاق

# دعاؤں نے رسولی کا خاتمہ کر دیا

## ایک سچا واقعہ

پچھلے سال کے آغاز میں ہم پر یہ تکلیف دہ انکشاف ہوا کہ میرا بڑا بیٹا، جاوید جگر کی بیماری میں مبتلا ہے۔ اس نے ڈاکٹر جہانگیر سے رجوع کیا۔ ڈاکٹر نے اسے کچھ ٹیسٹ کروانے کا کہا۔ ٹیسٹ میں جگر میں کچھ خرابی ظاہر ہوئی۔ متعلقہ ڈاکٹروں نے بتایا کہ یہ مرض ابھی ابتدائی حالت میں ہے اور اس نے جسم کو متاثر نہیں کیا۔ بعدازاں شوکت خانم لیبارٹری سے ٹیسٹ کروایا۔ اس میں ۳۰،۰۰۰ (۳۰ ہزار) AFP (Serum A-Fetoppotein ظاہر ہوئے جو انتہائی تشویش ناک صورت حال تھی۔ اس کے بعد الٹرا ساؤنڈ ہوا۔ اس میں جگر کے دائیں حصے میں 7.3x6.3cm جسامت کی رسولی دریافت ہوئی۔ متعلقہ ڈاکٹروں نے کہا، یہ صرف ٹرانسپلانٹ ہی سے درست ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹروں سے یہ بھی پتا چلا کہ آپریشن صرف چین اور بھارت میں ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں مزید معلومات حاصل کیں تو خرچ تقریباً ۸۰ لاکھ روپے بتایا گیا۔ یہ سن کر ہم بڑے پریشان ہوگئے کیونکہ ایک کروڑ روپیہ کہاں سے لاتے؟

اب اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف رجوع کیا۔ میں، میرے بیٹے اور اس کی بیوی نے اللہ سے دعائیں کیں۔ میں تہجد کے وقت اٹھ جاتا اور اللہ سے رو رو کر اور نہایت عاجزی سے اسے محبوبؐ کا واسطہ دے کر دعائیں مانگتا۔ انہی دنوں جاوید نے دوبارہ ٹیسٹ کروایا۔ اس دفعہ AFP کم ہو کر ۲۳،۰۰۰ تئیس ہزار سے کچھ زیادہ آیا۔ اب اللہ سے کچھ بہتری کی امید ہوئی۔ میں، میرے بیٹے و بہو نے دعاؤں کا سلسلہ جاری رکھا۔ رمضان کے دوران میں بھی، میں روزانہ ڈیڑھ بجے رات کو تہجد پڑھ کر اللہ سے دعا کیا کرتا۔ سورۃ فاتحہ و کلمہ طیبہ پڑھتا اور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے مبارک اسماء کا واسطہ دے دے کر دعائیں مانگتا۔

عید کے دن بھی اللہ سے دعا کی۔ ’’رب العالمین! میں نے رمضان کے پورے روزے رکھے ہیں۔ تیری خلوص دل سے عبادت کی ہے۔ آپ انھیں اپنے حبیبؐ کے صدقے قبول فرمائیں اور اگر اس کا ثواب دینا ہے، تو میرے بیٹے کی صحت یابی کی صورت دیجیے‘‘ میرے بیٹے نے دوبارہ ٹیسٹ کروایا۔ اب نتیجہ ناقابل یقین تھا۔ اس بار اے ایف پی ۲۲۰۰ آئے۔ بہرحال اللہ کا رحم جاری رہا۔ ۱۷ ستمبر کے ٹیسٹ میں اے ایف پی ۶۳۲ ہوگیا۔ اس کا مطلب تھا کہ رسولی، اللہ کے فضل سے تقریباً ختم ہو رہی ہے۔ میرے بیٹے نے ۱۸ ستمبر کو حوصلہ کر کے اپنا الٹرا ساؤنڈ ٹیسٹ کروایا تاکہ جگر کی اصلی حالت کا پتا چل سکے۔ دل سے بے اختیار ہی دعا نکلی۔ جاوید نے اسپتال سے فون کیا کہ ڈاکٹر کو تو کچھ نظر نہیں آ رہا۔ بہرحال ڈاکٹر دیر تک جاوید کا معاینہ کرتا رہا لیکن اس نے رسولی کی موجودگی سے انکار کر دیا۔ اب اسے بڑے ڈاکٹر کے پاس لے جا گیا۔ خوب پڑتال کرنے کے بعد یہ تصدیق ہوگئی کہ اب رسولی کا نام و نشان نہیں۔ ہمارے لیے یہ بات ناقابل یقین تھی کہ بغیر علاج کے رسولی غائب ہوگئی مگر نتائج یہی بتا رہے تھے کہ رسولی کا نام و نشان نہیں۔

یہ حیرت انگیز واقعہ عیاں کرتا ہے کہ میرے رب کی رحمت کا کوئی حساب نہیں۔ رب رحیم نے ہم سب پر بہت بڑا احسان کیا۔ یہ سب سورہ یٰسین، رحمٰن، فاتحہ اور کلمہ طیبہ، اللہ اور سید المرسلین کے اسماء الحسنٰی کے ذکر کی برکت سے ہوا۔ اب بھی ڈاکٹروں سے بات کی جائے، تو وہ یہی کہتے ہیں کہ ایسا آج تک نہیں ہوا۔ جگر کی رسولی صرف آپریشن کے ذریعے ہی ختم ہوتی ہے۔ اس کا اور کوئی علاج نہیں۔ ہم اللہ کی رحمت کے بہت شکر گزار ہیں۔



عاطف مرزا

# کاغذ سے سکرین تک کتاب کہانی

مستقبل کی کتاب الیکٹرانک کتاب ہوگی اور ’’کینڈل‘‘ مقبول ترین کتاب ریڈر ہے

ای ریڈر موبائل جیسا آلہ ہے مگر کتاب پڑھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# کتاب

سے انسان کی دوستی ہمیشہ بے مثال رہی ہے۔ دوستی کے اس سفر میں کتاب نہ صرف انسانی علم کو محفوظ بنا کر ہمارے لیے لاتعداد آسانیاں پیدا کرتی رہی بلکہ ترقی کی نئی راہیں بھی کھولتی رہی ہے۔ یہ دین، تاریخ، سیاست، سماج اور ادب کے رنگارنگ پھولوں سے انسانی شعور کا آنگن بھی مہکاتی رہی۔ اس نے ان گنت ذہنوں کی سوچ کو وسعت دی اور بے شمار دلوں کو اطمینان کی دولت سے بھی مالا مال کیا۔ یہ کتاب ہی تھی جس نے آنے والی نسلوں تک علم کی منتقلی کو یقینی بنایا۔

کتاب کا کاغذ کی شکل میں آنے کا سفر بھی بہت دل چسپ رہا۔ پرانی تہذیبوں میں جب لکھنے کا طریقہ ایجاد ہوا تو پتھر، دھات کی تختیوں سمیت ہر اس چیز کو استعمال کیا گیا جس پہ لکھا جا سکتا تھا۔ قدیم مصر میں، دریائے نیل کے کنارے اگنے والے آبی پودے کے ڈنٹھل سے بنائے پاپیرس (papyrus) کو استعمال کیا گیا۔ کاغذ کا آغاز ۲ سو قبل مسیح میں چین سے ہوا اور ۱۳ویں صدی میں یہ اسلامی دنیا کے ذریعے یورپ پہنچا۔

کتاب ایک طویل مدت سے کاغذ اور اس پہ پھیلے ہوئے لفظوں کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے یہ بات طے کر دی کہ کتاب نئی شکلیں بھی اختیار کرے گی۔ یہ کاغذ سے ڈیجیٹل شکل میں بھی منتقل ہو رہی ہے جسے کمپیوٹر یا موبائل کی سکرین پہ پڑھا جا رہا ہے۔

کاغذ کی کتاب سے انسان کا رشتہ بہت گہرا ہے۔ شائد وہ کاغذ کے لمس، اس کی خوشبو اور اس کی صفحہ پلٹنے کی آواز کو کبھی بھلا نہ پائے لیکن امید ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کتاب کی نئی شکلوں سے بھی مانوس ہوتا جائے گا۔ کتاب اپنی ہر شکل میں ہماری بہترین رفیق رہے گی اور ہمیں تاریخ کا یہ سبق بھی یاد دلاتی رہے گی کہ وہی افراد اور قومیں کامیاب اور سرفراز ٹھہرتی ہیں جو کتاب اور علم سے اپنی نسبت قائم رکھتی ہیں۔

مستقبل کی کتاب الیکٹرونک کتاب ہوگی۔ الیکٹرونک کتاب یا ای کتاب (eBook) سے مراد ایسی کتاب ہے جو کاغذ کے بجائے ڈیجیٹل (Digital) شکل میں موجود ہو یعنی اسے موبائل، کمپیوٹر یا کسی دوسرے الیکٹرونک آلے کی سکرین پہ پڑھا جائے۔ اسی طرح الیکٹرونک ریڈر یا ای ریڈر (eReader) موبائل جیسا آلہ (Device) ہے جس کی سکرین کو الیکٹرونک کتاب پڑھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

دنیا میں پہلی الیکٹرونک کتاب (ای کتاب) ۱۹۷۱ء میں سامنے آئی جب مائیکل ایس۔ ہارٹ نے امریکی آزادی کا اعلامیہ کمپیوٹر میں ٹائپ کیا۔ اسی نے گٹن برگ (Gutenberg) منصوبہ بھی شروع کیا جس کا مقصد دوسری کتابوں کی الیکٹرونک نقول تیار کرنا تھا۔ ۹۳-۱۹۹۲ء میں پہلا الیکٹرونک ریڈر انسیپٹ (Incipit) کے نام سے سامنے آیا۔

ابتدا میں الیکٹرونک کتابیں تکنیکی (Technical) معلومات سے تعلق رکھنے والے موضوعات پہ تیار کی جاتی تھیں۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے میں انٹرنیٹ کو مقبولیت حاصل ہوئی تو کاغذی کتابوں کے ساتھ ساتھ ان کی الیکٹرونک نقول بھی سامنے آنے لگیں۔ پھر ایسی الیکٹرونک کتابیں بھی مقبول ہونے لگیں جو صرف ڈیجیٹل وجود رکھتی تھیں۔ آج دنیا میں سیاست، نفسیات، صحت، کھیل، ادب اور سائنس کے میدان سے تعلق رکھنے والی بے شمار کتابیں کاغذ کے ساتھ ساتھ ڈیجیٹل شکل میں موجود ہیں۔

مقبول عام (Best Seller) کتابوں کی فہرست جاری کرنے والے اداروں میں ایک معتبر نام نیویارک ٹائمز اخبار کا ہے۔ یہ ہر ہفتے مقبول کتابوں کی فہرست جاری کرتا ہے اور یہ سلسلہ ۱۹۴۲ء سے جاری ہے۔ ان مقبول کتابوں کی فہرست میں اب الیکٹرونک کتابیں بھی اپنی جگہ بنانے لگی ہیں۔

مستقبل میں کتاب منتخب کرنے، خریدنے اور اسے



پڑھنے کا تجربہ ہمارے آج کے تجربے سے بہت مختلف ہوگا۔ قارئین کتاب خریدنے کے لیے اپنے موبائل کمپیوٹر کے ذریعے انٹرنیٹ پہ موجود سٹور پر جائیں گے۔ وہاں ادب، صحت، سیاست، نفسیات، کھیل اور سائنس جیسے مختلف موضوعات پہ لاکھوں کتابیں ان کی منتظر ہوں گی۔ وہاں انھیں نئی مقبول کتابیں بھی ملیں گی اور پرانے ادوار کی شہرہ آفاق کتابیں بھی۔ آن لائن سٹور ہماری راہ نمائی کرے گا کہ کون سی کتابیں زیادہ پسند کی جا رہی ہیں اور پڑھنے والے ان کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ قاری خود کسی کتاب کی موجودگی کے بارے میں بھی سوال پوچھ سکے گا۔ اسی طرح وہ اپنی مطلوبہ کتاب خریدنے سے پہلے اس کے چند صفحات اپنے کمپیوٹر کی سکرین پر پڑھ کر اس کی خریداری کے بارے میں بہتر فیصلہ کر سکے گا۔

خریداری کے بعد کتاب قاری کے کمپیوٹر پہ محفوظ ہو جائے گی اور وہ کسی بھی وقت اس کو سکرین کے ذریعے پڑھ سکے گا۔ اس کے کمپیوٹر پہ بے شمار کتابیں محفوظ ہو سکیں گی اور اسے جگہ کی کمی کی شکایت بھی نہیں ہوگی۔ یوں سفر کرتے ہوئے بھی ہزاروں کتابیں اس کے ہمراہ ہوں گی۔

کتاب پڑھنے کا مرحلہ بھی بہت دل چسپ ہوگا۔ ٹچ سکرین کے ذریعے کمپیوٹر کو ہدایات دی جا سکیں گی۔ قاری اپنی آسانی کے لیے متن کی جسامت چھوٹی بڑی کر سکے گا۔ اسی طرح وہ کسی مشکل لفظ کا مطلب بھی ایک کلک کے ذریعے دیکھ سکے گا اور کسی جملے یا صفحے کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ بھی کر سکے گا۔ اسی طرح کتاب اسے اپنا متن خود پڑھ کر بھی سنا سکتی ہے یا قاری کتاب پڑھتے ہوئے کمپیوٹر سے اپنی پسند کی موسیقی بھی سن سکتا ہے۔

قاری کتاب پڑھتے ہوئے اپنے نوٹس یا تبصرے بھی وہاں محفوظ کر سکے گا۔ کمپیوٹر قاری کے مطالعہ کا حساب بھی رکھے گا کہ اس نے کس وقت کون سی کتاب پڑھی۔ قاری اپنی پسند کے حصوں کو دوسروں کے لیے نمایاں بھی کر سکے گا۔

آپ کی الیکٹرونک کتاب آپ کی پسند اور مطالعہ کے معمول کو دیکھتے ہوئے آپ کو مزید کتابوں کا مشورہ بھی

## میں کتاب ہوں

میں تمھاری دوست ہوں گی
تمھارے ساتھ رہوں گی
تم سے اختلاف ہوگا
تمھیں ہنساؤں گی
یا کبھی گرمیوں کی دھوپ بھری صبح میں
تمھاری آنکھوں میں آنسو بن جاؤں گی

میں تمھیں تحریک دوں گی
سونے میں مددگار رہوں گی
ایسے خواب بنوں گی
جو تم ہمیشہ کے لیے
خزاں زدہ سہ پہر کو اپنے پاس رکھو گے

وفورِ جذبات کی حدت سے
تمھیں روشن رکھوں گی
اور جب تک طوفان تھم نہ جائے
موسم سرما کی برفانی شام میں
تمھیں اپنے حصار میں رکھوں گی

جب تم پڑھ رہے ہو گے
میں تمھارے ہاں
موسم بہار کا پودا کاشت کروں گی
جو زندگی سے بھرپور ہوگا

میں کتاب ہوں
جسے تم پڑھ رہے ہو

شاعر: ٹام رابرٹ شیلڈز
ترجمہ: انور زاہدی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دے گی۔ اس طرح علم دوستی کے لیے سفر میں وہ آپ کے ساتھ ساتھ رہے گی۔ الیکٹرونک کتاب سے بے شمار آسانیاں پیدا ہوں گی۔ آپ کے دوست جاننے والے کسی کتاب پہ کیے گئے آپ کے تبصروں کو بھی دیکھ سکیں گے۔ آپ کو ایسے لوگ بھی ملیں گے جو آپ کی منتخب کتابوں کو پسند کرتے ہیں۔ اس طرح آپ کی کتاب دوستی آپ کے لیے نئے دوستوں کے تعارف کا باعث بھی بنے گی۔

روایتی کتاب کا تصور بدل رہا ہے تو ساتھ ہی کتب خانوں کا تصور بھی تبدیل ہو رہا ہے۔ ایک مکمل ڈیجیٹل لائبریری میں آپ کو کاغذ کی بنی کوئی کتاب نظر نہیں آئے گی۔ آپ دور بیٹھے اس کتب خانے کی کسی بھی کتاب کو اپنے کمپیوٹر پہ پڑھ سکتے ہیں۔ روایتی کتب خانے بھی اپنے پڑھنے والوں کو الیکٹرونک کتابوں تک رسائی دے رہے ہیں۔ امریکن لائبریری ایسوسی ایشن کی ایک حالیہ تحقیق کے مطابق امریکہ میں ۶۷ فیصد لائبریریاں الیکٹرونک کتابیں (ebooks) فراہم کر رہی ہیں۔ دنیا کے ایک بڑے کتب خانے شکاگو پبلک لائبریری میں ایک اندازے کے مطابق ۳۶ ہزار الیکٹرونک کتابیں موجود ہیں۔

ذیل میں اس وقت مقبول الیکٹرونک ریڈرز (eReaders)، ای بک سٹورز الیکٹرونک کتابوں کے بڑے منصوبوں کا تعارف پیش خدمت ہے۔

ایمزون (Amazon) انٹرنیٹ پر کتابیں فروخت کرنے والا دنیا کا سب سے بڑا ادارہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ ۱۹۹۵ء میں امریکہ میں قائم ہوا۔ دنیا کا مقبول الیکٹرونک ریڈر، کینڈل (Kindle) بھی ایمزون نے متعارف کروایا۔ یہ موبائل جیسا آلہ ہے جس کی سکرین پہ الیکٹرونک کتاب کو پڑھا جا سکتا ہے۔ یہ آلہ ۲۰۰۷ء میں سامنے آیا۔ کینڈل کے ذریعے قارئین ایمزون کے آن لائن بک سٹور تک جا سکتے ہیں۔ یہاں وہ الیکٹرونک کتاب



کینڈل کی سکرین سے سورج کی روشنی میں پڑھنا بھی ممکن ہے



کو منتخب کر کے اپنے پڑھنے کے لیے محفوظ کر سکتے ہیں۔ یہ آلہ دس لاکھ سے زائد کتابوں تک قارئین کی رسائی ممکن بناتا ہے۔ ان کے علاوہ ۲۰ لاکھ سے زائد ایسی کتابیں جن کی اشاعت کے حقوق ختم ہو چکے ہیں وہ بھی یہاں دستیاب ہیں۔ اس میں کتابوں کے علاوہ اخبارات اور رسالوں کو بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

> ”آنے والے دنوں میں ۱۳۰ ملین کتابیں کمپیوٹر اور موبائل کی سکرین پر پڑھی جا سکیں گی“

کینڈل کا وزن ایک روایتی کتاب سے کم ہوتا ہے۔ اس کی سکرین سے سورج کی روشنی میں بھی پڑھنا ممکن ہوتا ہے۔ ایمزون کا دعویٰ ہے کہ اس میں ایسی ٹیکنالوجی استعمال کی گئی ہے جس سے قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے وہ کاغذ پہ لکھی تحریر پڑھ رہا ہو۔

کینڈل کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ جب اسے فروخت کے لیے پیش کیا گیا تو یہ ابتدائی ساڑھے پانچ گھنٹوں میں فروخت ہو گیا۔ پھر اگلے پانچ مہینے یہ مارکیٹ میں دستیاب نہیں تھا۔ تجزیہ کاروں کے مطابق ابتدا میں فروخت ہونے والے آلات کی تعداد ۳ سے ۵ لاکھ کے درمیان تھی۔

**کتابیں جھانکتی ہیں بند الماری کے شیشوں سے**

کتابیں جھانکتی ہیں بند الماری کے شیشوں سے
بڑی حسرت سے تکتی ہیں
مہینوں اب ملاقاتیں نہیں ہوتیں
جو شامیں ان کی صحبت میں کٹا کرتی تھیں، اب اکثر
گزر جاتی ہیں کمپیوٹر کے پردوں پر
بڑی بے چین رہتی ہیں
انھیں اب نیند میں چلنے کی عادت ہو گئی ہے
بڑی حسرت سے تکتی ہیں
جو قدریں وہ سناتی تھیں......
کہ جن کے سیل کبھی مرتے نہیں تھے
وہ قدریں اب نظر آتی نہیں گھر میں
جو رشتے وہ سناتی تھیں
وہ سارے ادھڑے ادھڑے ہیں
کوئی صفحہ پلٹتا ہوں تو اک سسکی نکلتی ہے
کئی لفظوں کے معنی گر پڑے ہیں
بنا پتوں کے سوکھے ٹنڈ لگتے ہیں وہ سب الفاظ
جن پر اب کوئی معنی نہیں اگتے
بہت سی اصطلاحیں ہیں......
جو مٹی کے سکوروں کی طرح بکھری پڑی ہیں
گلاسوں نے انھیں متروک کر ڈالا
زباں پہ ذائقہ آتا تھا جو صفحے پلٹنے کا
اب انگلی کلک کرنے سے بس اک
جھپکی گزرتی ہے......
بہت کچھ تہ بہ تہ کھلتا چلا جاتا ہے پردے پر
کتابوں سے جو ذاتی رابطہ تھا، کٹ گیا ہے
کبھی سینے پہ رکھ کے لیٹ جاتے تھے
کبھی گودی میں لیتے تھے
کبھی گھٹنوں کو اپنے رحل کی صورت بنا کر
نیم سجدے میں پڑھا کرتے تھے چھوتے تھے جبیں سے
خدا نے چاہا تو وہ سارا علم تو ملتا رہے گا بعد میں بھی
مگر وہ جو کتابوں میں ملا کرتے تھے سوکھے پھول
کتابیں مانگنے گرنے، اٹھانے کے بہانے رشتے بنتے تھے
ان کا کیا ہوگا
وہ شاید اب نہیں ہوں گے
(گلزار)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

الیکٹرانک کتاب کی مقبولیت تصور سے بھی زیادہ ہوگئی ہے

ایمزون کے سربراہ، چیف بی زوس Jeff Bezos نے کہا کہ ہم ۱۵ سال سے انٹرنیٹ پر کتابیں فروخت اور تقریباً ۱۴ سال سے کینڈل فروخت کر رہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ مستقبل الیکٹرونک کتاب کا ہے لیکن اس کا تصور اتنی تیزی سے مقبولیت حاصل کرے گا، یہ ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔

ایمزون اپنے الیکٹرونک ریڈر کو قارئین کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کے لیے نئے منصوبے بھی متعارف کرواتا رہتا ہے۔

۲۰۱۱ء میں ایمزون نے کینڈل استعمال کرنے والوں کو امریکہ کے ۱۱ ہزار کتب خانوں تک رسائی دینے کے منصوبے کا آغاز کیا۔ اسی طرح کینڈل کی قیمت کو کم کرنے کے لیے اس کی سکرین پہ اشتہارات کا سلسلہ بھی شروع کیا لیکن اس میں اس بات کا خیال بھی رکھا گیا کہ قاری کو کتاب پڑھنے میں دشواری نہ ہو۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ ۲۰۱۰ء کی آخری سہ ماہی میں ایمزون کی امریکہ میں الیکٹرونک کتابوں کی فروخت کاغذی جلد والی کتابوں (paperbacks) سے زیادہ ہو چکی تھی۔

جدت کے میدان میں مزید آگے بڑھتے ہوئے الیکٹرونک کتابیں پڑھنے کے لیے ایمزون نے کینڈل فائر کے نام سے موبائل کمپیوٹر بھی متعارف کروایا ہے۔

نوک (Nook) کے نام سے الیکٹرونک ریڈر امریکہ کے کتابیں فروخت کرنے والے ایک بڑے ادارے بارنز اینڈ نوبل (Barnes & Noble) نے ۲۰۰۹ء میں متعارف کروایا۔



اس ادارے کی جدید پراڈکٹ نوک سمپل ٹچ کے ذریعے ۲٫۵ ملین کتابوں تک رسائی ممکن ہے۔ ۲۰۱۱ء کی دوسری سہ ماہی میں نوک اور اس سے متعلقہ اشیا کی فروخت ۲۲۰ ملین ڈالر رہی۔

سونی ریڈر بھی ایک الیکٹرونک ریڈر ہے جسے الیکٹرونکس سے تعلق رکھنے والی معروف جاپانی کمپنی سونی نے متعارف کروایا ہے۔ اس کی سکرین سے سورج کی روشنی میں بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کی مدد سے صارف کئی ممالک کے کتب خانوں سے الیکٹرونک کتابیں لے کر پڑھ سکتا ہے۔ اسی طرح قارئین سونی ای بک سٹور سے الیکٹرونک کتابیں خرید سکتے ہیں۔

کوبوای ریڈر (Kobe Ereader) ٹورنٹو کی کمپنی کوبو نے تیار کیا ہے۔ اس میں الیکٹرونک اِنک ٹیکنالوجی استعمال کی گئی ہے جو کاغذ پر سے پڑھنے جیسا احساس پیدا کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔

گوگل ای بکس (Google eBooks) پروگرام انٹرنیٹ سرچ سے تعلق رکھنے والی کمپنی گوگل کی طرف سے ۲۰۱۰ء میں شروع ہوا۔ اس کے ذریعے صارف گوگل کے ای بک سٹور سے خریدی گئی الیکٹرونک کتابیں آن لائن پڑھ سکتا ہے یا بعد میں پڑھنے کے لیے محفوظ کر سکتا ہے۔ اس پہ تیس لاکھ کتابیں موجود ہیں۔ جن میں مقبول (Best Sellers) بھی شامل ہیں۔ صارفین یہ کتابیں لیپ ٹاپ، سمارٹ فون اور موبائل کمپیوٹر پر پڑھ سکتے ہیں۔

۲۰۱۰ء میں دنیا کی سب سے بڑی ٹیکنالوجی کمپنی ایپل نے آئی پیڈ (iPad) کے نام سے موبائل کمپیوٹر متعارف کروایا۔ آئی پیڈ استعمال میں بھی آسان تھا اور اس کے ڈیزائن کو بھی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس میں ۹ گھنٹے تک بیٹری لائف کی سہولت بھی موجود تھی۔ اس پر موسیقی، گیمز، فلموں اور انٹرنیٹ کی معلومات کے ساتھ ساتھ آئی بک سٹور (ibook store) کے نام سے سہولت موجود تھی جس کے ذریعے قارئین کتابیں خرید کر انھیں پڑھ سکتے تھے۔

بھارت نے ونک کے نام سے الیکٹرونک ریڈر متعارف کروایا ہے۔ اس کے ذریعے ۲ ر لاکھ سے زائد کتابیں پڑھی جا سکتی ہیں۔ ان کی تعداد میں ہر ماہ اضافہ ہو رہا ہے۔ اس پر بھارت کی ۱۵ ر زبانوں میں کتابیں موجود ہیں۔ قاری ایک مرتبہ چارج کرنے سے اس آلے پر ایک ہزار صفحات یا ۱۰ گھنٹوں تک کی موسیقی سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

اسی طرح بھارت میں ایک الیکٹرونک ریڈر پائی (Pi) کے نام سے موجود ہے۔ اس کا وزن ایک رسالے کے وزن سے کم ہے۔ یہ قارئین کو ایک لاکھ سے زائد کتابوں تک رسائی دیتا ہے۔ ان میں ہندی، سنسکرت اور کئی دوسری زبانوں میں کتابیں موجود ہیں۔ اسے تعلیم کے میدان میں بھی استعمال کرنے پہ غور کیا جا رہا ہے۔ بھارت میں آئی پیڈ کی طرز کا کم قیمت موبائل کمپیوٹر بھی متعارف کروایا گیا ہے جسے تعلیمی مواد کے لیے استعمال کیا جا سکے گا۔

> دنیا میں انٹرنیٹ پر سب سے زیادہ کتابیں فروخت کرنے والے ادارے ایمزون (Amazon) کی الیکٹرونک کتب کی فروخت روایتی کتابوں سے بڑھ چکی ہے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پاکستان میں بھی محدود پیمانے پر چند ایسے منصوبے موجود ہیں جن کے ذریعے الیکٹرونک کتابوں تک لوگوں کو رسائی دی جا رہی ہے۔ ہائیر ایجوکیشن کمیشن کا ادارہ اپنے نیشنل ڈیجیٹل لائبریری پروگرام کے تحت طالب علموں کی علمی جرائد کے ساتھ ساتھ الیکٹرونک کتابوں تک رسائی ممکن بنا رہا ہے۔ اس لائبریری میں ۷۵ ہزار سے زائد کتابیں، جرائد اور مضامین موجود ہیں۔

اسی طرح انفارمیشن ٹیکنالوجی کی وزارت سائبر لائبریری منصوبے پہ کام کر رہی ہے جس کا مقصد قومی اور دیگر مقامی زبانوں میں انٹرنیٹ پہ مواد کی فراہمی ہے۔ اس لائبریری میں مذہب، ادب، تاریخ اور سائنسی موضوعات پہ کتب موجود ہیں۔

کہ وہ جلد ان تمام کتابوں کو اپنے پاس محفوظ کر لے گا۔ اس طرح وہ انسانی علم کے سب سے بڑے مجموعہ کے طور پر سامنے آئے گا۔

گٹن برگ (Gutenberg) الیکٹرونک شکل کتابوں کی مفت فراہمی سے تعلق رکھنے والا ایک اور منصوبہ ہے۔ اس منصوبے کے تحت ۳۸ ہزار کتابیں آن لائن موجود ہیں۔

انٹرنیٹ آرکائیو (Internet Archive)، ایک غیر کاروباری، غیر منافع بخش منصوبہ ہے۔ یہ ایک ڈیجیٹل لائبریری ہے جس کا مقصد عام لوگوں کی علم تک رسائی ممکن بنانا ہے۔ اسے ۱۹۹۶ء میں شروع کیا گیا۔ اس میں ۳۰ لاکھ کے قریب حقوقِ اشاعت نہ رکھنے والی کتابیں موجود ہیں۔

گوگل پر ۳۰۰ زبانوں کی ۱۵ ملین کتابیں دستیاب ہیں

گوگل بکس (Google Books) کی سہولت انٹرنیٹ سرچ سے تعلق رکھنے والی بڑی کمپنی گوگل نے ۲۰۰۴ء میں متعارف کروائی ہے۔ اس کے ذریعے صارفین اس پروگرام میں موجود کتابوں میں کوئی لفظ یا تصور تلاش کر سکتے ہیں۔ اس پروگرام میں دنیا کے سو سے زائد ممالک کے ۳۵ ہزار پبلشروں کی ۱۵ ملین سے زائد کتابیں موجود ہیں۔ یہ کتابیں دنیا کی ۳۰۰ زبانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ صارفین ان کے چند صفحات ملاحظہ بھی کر سکتے ہیں۔

گوگل کے اندازے کے مطابق اس وقت دنیا میں ۱۳۰ ملین کے قریب کتابیں موجود ہیں۔ گوگل کا عزم ہے

تجزیہ کاروں کے مطابق ای کتاب کی مارکیٹ میں ایپل (Apple) اور گوگل (Google) جیسی بڑی ٹیکنالوجی کمپنیوں کے آنے سے مسابقت کا رجحان بڑھے گا۔ اس سے قارئین کو کم قیمت الیکٹرونک کتاب اور الیکٹرونک ریڈر ملے گا۔ جس کی خصوصیات بھی زیادہ ہوں گی اور یہ قارئین کی زیادہ کتابوں تک رسائی کو یقینی بنائے گا۔

کاغذ اور روایتی کتاب کے وجود میں آنے سے مخصوص طبقات کی اجارہ داری ختم ہوئی اور عام لوگوں کی تعلیم کو فروغ ملا۔ اسی طرح الیکٹرونک کتاب عام لوگوں کی علم کے ذریعے ترقی میں اہم کردار ادا کرے گی۔



# نیا سال
## نئے ارادے
## نئے خواب

فریدہ خانم

ہر سال نو پر یہی دعا ہے میری
ہر خوشی تیرا ہی طواف کرے

آپ ۲۰۱۲ء کو کس
ڈھنگ میں اپنائیں گے

2012

نئے سال پہ قارئین کے
نئے ارادے، نئے خواب اور
تازہ بہ تازہ خیالات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جب بھی نیا سال آئے تو دل میں نئے ارادے اور آنکھوں میں آنے والی زندگی کے خواب سج جاتے ہیں۔ انسان کی کوئی نہ کوئی خواہش نئے سال سے وابستہ ہوتی ہے، کہ یہ کام ضرور انجام دینا ہے۔ اس بار ہمارے سروے کا موضوع بھی یہی ہے، ہم بتائیں گے کہ مختلف لوگ ۲۰۱۲ء کے حوالے سے کیا سوچ رہے ہیں، یقیناً آپ لوگوں نے بھی کوئی نہ کوئی منصوبہ بندی اور نئے سال کے استقبال کے لیے سوچا ہوگا۔

## خواب کی تعبیر چاہتا ہوں

**مُنّو بھائی** (ڈرامہ نگار/چیئرمین سُندس فاؤنڈیشن، لاہور)

میرا خواب یہی ہے کہ ۲۰۱۲ء میں لاہور میں سُندس فاؤنڈیشن کے تحت دو بہت بڑے بلڈ بینک قائم کروں۔ سُندس فاؤنڈیشن میں پہلے ہی پانچ ہزار بچوں کو تھیلیسیمیا، ہیموفیلیا اور کینسر کے علاج کے لیے خون فراہم کیا جا رہا ہے۔ گجرات، میرپور، فیصل آباد، جہلم اور سیالکوٹ کے غریب گھروں کے بچوں کو ہر ہفتے اور بعض کو مہینے میں دو بار خون کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے پاس مریض زیادہ ہیں اور خون کم۔ ہم نے ڈینگی کے مریضوں کو بھی خون مہیا کیا۔ بے شمار بچے ہمارے پاس آنا چاہتے ہیں۔ ان کی خاطر ان شاءاللہ تعالیٰ دو بڑے بلڈ بینک قائم کیے جائیں گے۔

## سچ بولوں گا

**احمد شہاب چوہدری** (کوآرڈینیٹر/پروگرام شاکر علی میوزیم لاہور)

۲۰۱۲ء میں اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ مل کر مجھے صرف سچ بولنے کے لیے تلقین اور کوشش کرنی ہے، جس طرح عدالت جا کر کہا جاتا ہے کہ میں سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔

**محمد اعظم** (کالم نگار/مصنف)

میں ۲۰۱۲ء میں رُوحانیت پر لکھنا چاہتا ہوں۔ مختلف علوم اور روحانیت میں جو فرق ہے، اب وقت آ گیا ہے کہ اسے عیاں کیا جائے۔ اُردو ڈائجسٹ میں بھی اس موضوع پر لکھوں گا۔

**کرنل (ر) جاوید حمید مرزا** (چیف ایگزیکٹو دی انسٹیٹیوٹ آف مائنڈ باڈی اینڈ سپرٹ اینڈ ریکی کلینک لاہور)

۹۹ء سے میں اس طریقۂ علاج سے منسلک ہوں۔ اعصابی نظام سے متعلقہ بیماریوں مثلاً کمردرد وغیرہ کا علاج تین سے چھ دن میں مکمل کرتا ہوں اور اس دوران ادویات بھی استعمال نہیں کی جاتیں۔ ۲۰۱۲ء کے لیے میرا خواب ہے کہ زیادہ سے زیادہ مریضوں کو فائدہ پہنچا سکوں اور ساتھ ریکی، جاودان اور ریفلیکسولوجی کا علم دوسرے لوگوں میں منتقل کروں، اس کے علاوہ غریب لوگوں کا بغیر فیس علاج کر سکوں۔

**شہزاد نیّر** (شاعر/نقاد)

کچھ خواب انسان ذاتی حوالوں سے دیکھتا ہے، کچھ قومی اور کچھ پوری دنیا کے حوالے سے۔ ۲۰۱۲ء کے لیے میرے بھی کچھ خواب ہیں۔ میری نظموں کی تیسری کتاب آجائے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ میری طبیعت میں جذباتی ٹھہراؤ آجائے۔ نیز خواہش ہے کہ وقت اتنی فرصت دے



کہ عالمی شہرت یافتہ شہ کار پڑھ سکوں۔ مثلاً ٹوائن بی اور ایلیٹ کی تمام چیزیں پڑھ سکوں۔ ایک خواب یہ ہے کہ اہلِ وطن میں برداشت پیدا ہو، وہ تنگ نظری، مذہبی جنونیت سے نکل کر انسان دوستی کی طرف آئیں۔ تیسری دنیا کے ممالک کی معاشی بہتری بھی میرا ایک خواب ہے۔

## مخلص قیادت

**سلمیٰ اعوان** (سفرنامہ نگار/ناول نگار)

میرا خواب یہ ہے کہ اللہ میرے ملک کو انقلابی قیادت عطا فرمائے۔ اس وقت پاکستان اور عوام کی یہی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں وہ قیادت دے جو پاکستان کو دنیا میں ممتاز کر دے، آمین

## خدمت عبادت ہے

**ڈاکٹر شیخ اکرام احمد** (ایم۔ڈی) (شیخ کلینک آکوپنکچر، بہاولپور)

میرا یہ خواب ہے کہ میں اپنے شعبے آکوپنکچر اور میگنیٹ تھراپی میں ایسا کارنامہ انجام دوں، جو عوام اور اس شعبے کے لیے بہتر ہو۔ یوں لوگوں کو اچھا علاج مل سکے گا کیونکہ آکوپنکچر اور میگنیٹ تھراپی دیگر علاج سے بہتر ہے۔

**ثمن وقار** (پبلشر)

میں نے جیل میں قید بچوں کے لیے ایک تنظیم قائم کی ہے اور اُنھی کے لیے ۲۰۱۲ء میں بھرپور کام کرنا چاہتی ہوں۔ یہ وہ بچے ہیں جن کی مائیں جیلوں میں سزا بھگت رہی ہیں۔ اُن کے ساتھ بے گناہ اور معصوم بچے بھی قید ہیں۔ میں ان کی تعلیم و تربیت کے لیے معاونت و سامان بالکل مفت فراہم کرتی ہوں۔ میرا یہی خواب ہے کہ ان کی بہبود کے لیے زیادہ سے زیادہ کام کر سکوں۔

## نیا سال مبارک ہو

**چوہدری عبدالخالق**

نویدِ مسرت ہمیں جو سنائے
نیا سال خوشیاں کا پیغام لائے
غریبی کا رونا کوئی بھی نہ روئے
کوئی بھی بشر رات بھوکا نہ سوئے
پریشانی کوئی کسی کو نہ آئے
یہاں سر چھپانے کو اپنا مکاں ہو
یہاں روزگاری کا ملنا آساں ہو
بے کاری کسی کو کبھی نہ ستائے
یہاں ہر باشندہ بڑا محترم ہو
یہاں ایک جیسا سبھی کا بھرم ہو
امیری غریبی کوئی نہ جتائے
ملے سب کو تعلیم یکساں معیاری
ترقی کی راہ پہ چلے قوم ساری
پڑھائی میں پیچھے کوئی رہ نہ جائے
صبح شام محنت کریں بندے سارے
تو جاگیں گے سوئے مقدر ہمارے
محبت کے نغمے ہر اک شخص گائے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سال گزشتہ بچھڑ جانے والے افسانہ نگار کی اچھوتی کہانی

منشایاد

# دیدۂ یعقوب

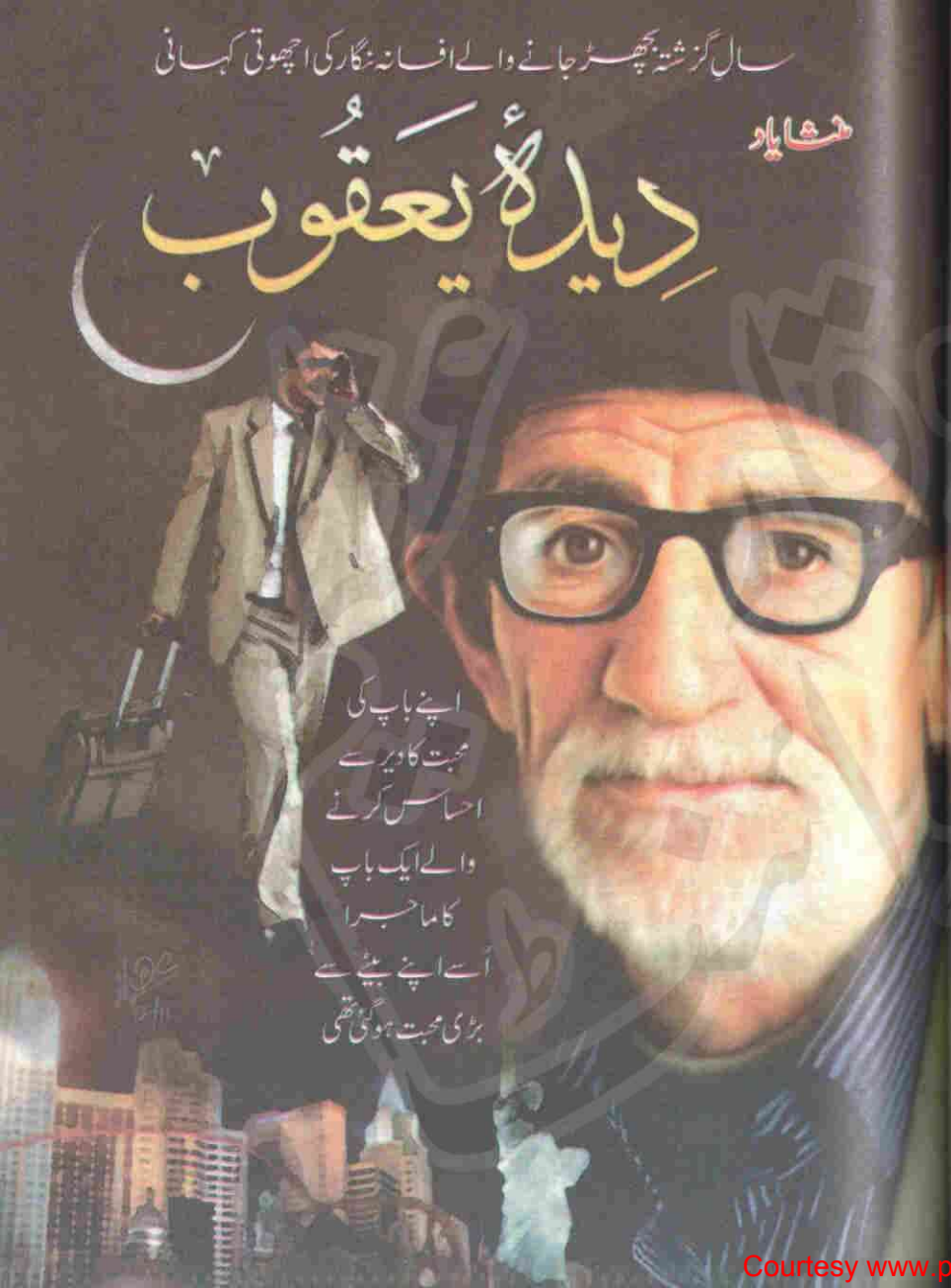


## مستقبل نوجوانوں کا ہے

**طارق صدیق** (صدر صادق سوشل ویلفیئر آرگنائزیشن لاہور)

ہم اس وقت نوجوان نسل کے لیے مثبت سرگرمیاں پیدا کرنے کی خاطر کے لیے سرگرمِ عمل ہیں۔ جسمانی نشوونما کے ساتھ ساتھ ذہنی تربیت بھی کی جاتی ہے جس کے لیے ہم مریضوں کو مفت ادویات مہیا کرتے ہیں۔ نیز ہم نے جسمانی صحت کے لیے ایک مرکز بھی قائم کیا ہوا ہے۔ ۲۰۱۲ء میں ہمارا خواب فرقہ واریت، تعصب و مذہبی لسانی اختلافات سے بالاتر ہو کر نوجوان نسل کو کارآمد شہری بنانے کا عزم لے کر چلنا ہے، تاکہ وہ آیندہ ملکی ترقی کے لیے اہم کردار ادا کرسکیں۔

## وہ کہاں اور ہم کہاں

**سیما پیروز** (افسانہ نگار)

کچھ عرصہ پہلے میں ملائشیا سے واپس آئی، وہاں میں نے اچھے حالات اور امن دیکھا۔ وہ لوگ ۱۹۵۷ء میں یعنی ہم سے ۱۰/ سال بعد آزاد ہوئے تھے۔ جب میں گئی تو اُنھوں نے مجھ سے سوال کیا کہ پاکستان کا ترقی پذیر ملکوں میں ایک نام تھا اور ہم جیسے ملک، مثلاً کوریا، انڈونیشیا، تائیوان، سب آپ کا ملک، صنعت اور نہری نظام دیکھنے آتے تھے۔ آج ہم کہاں اور آپ کہاں کھڑے ہیں۔ آپ لوگوں کو کیا ہوا؟

میں نے جواب دیا کہ آپ کو ایک مہاتیر محمد مل گیا اور ہمیں وہ لوگ ملے جنھوں نے پاکستان کو چوراہے میں کھڑی غریب کی جورو سمجھا جس کے وہ ساٹھ برس سے کپڑے نوچ رہے ہیں۔ نہ ان کی نیت بھری ہے اور پیٹ۔ ۲۰۱۲ء کے سلسلے میں میرا خواب اپنے پاکستان کے لیے ہے۔ میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ ہمیں بھی مہاتیر محمد مل جائے، جو میرے وطن کو صحیح معنوں میں اسلام کا قلعہ اور قائداعظمؒ کا پاکستان بنادے۔ (آمین)

## حضورؐ کے لیے نذرانۂ عقیدت

**صغیرہ بانو شیریں** (مضمون نگار/کالم نگار/مصنفہ)

میرا ارادہ ہے کہ اپنے ادھورے کام مکمل کروں، خصوصاً اپنے تمام مضامین اکٹھا کر کے کتابی صورت میں شائع کردوں۔ میں نے مدینہ منورہ میں نمازِ جمعہ پڑھ کے درود شریف کی ایک چھوٹی سی کتاب لکھنے کی ابتدا کی تھی اور اللہ تعالیٰ سے کہا تھا کہ یہ کتاب پوری ہو جائے تو اِن شاء اللہ اسے مدینہ منورہ لے کر آؤں اور حضور پاکؐ کی خدمتِ اقدس میں دُرودِ پاک کا نذرانہ پیش کروں گی۔ ناگزیر وجوہات کی بنا پر اس کتاب پر کام نہیں ہوسکا، اب اِن شاء اللہ ۲۰۱۲ء میں یہ کتابچہ مکمل کرنے کی بھرپور کوشش کروں گی۔

**رخسانہ زیدی** (سیکنڈ انچارج گورنمنٹ نیو ماڈل گرلز ہائی سکول لاہور)

خواب یہ ہے کہ اپنے اسکول کی تمام بچیوں کو اسلامی تعلیمات اور علامہ اقبالؒ کی تعلیمات سے آگاہ کروں اور ان پر عمل کرنے کا شعور بیدار کروں۔ اس مقصد کے لیے میں اپنا زیادہ سے زیادہ وقت بھی صرف کروں گی اور مالی طور پر جو اخراجات آئیں گے، وہ بھی ادا کروں گی۔

## قرآن کا علم ہر سُو پھیل جائے

**سیدہ اُمِ رُباب زیدی** (گھریلو خاتون)

میرا ارادہ ہے کہ قرآن پاک تجوید کے ساتھ شائع کروا کر لوگوں میں تقسیم کروں تاکہ لوگوں میں قرآن پاک صحیح طریقے سے پڑھنے اور عمل کرنے کا شعور بیدار ہو سکے اور انھیں صحیح طرح پڑھنا آجائے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# بیٹا

اپنی آمد کے متعلق بتا رہا تھا مگر مجھے اس سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی کہ وہ کس طرح آئے..... پیاسی زمین کو اس سے کیا کہ بادل مشرق سے آئے یا مغرب سے؟ اسے تو بارش چاہیے۔ میرے لیے وہی فضائی کمپنی سب سے اچھی تھی جو اسے گھر لے آئے۔ اگرچہ ساتویں آٹھویں روز ہم اس کی آواز تو سن لیتے تھے مگر اسے دیکھے ہوئے اداسی کے بگولوں سے اٹے ہوئے بارہ مہینے دو دن اور العطش العطش پکارتی پیاسی راتیں ہوگئی تھیں۔ ٹیلی فون پر بات چیت شاید بالمشافہ ملاقات کا نعم البدل ہو مگر محبت لمس چاہتی ہے۔ مجھے یاد ہے جب شروع شروع میں اس کا فون آتا، بیوی اس سے بات کر کے رونے لگتی۔

میں کہتا ''تمھیں تو خوش ہونا چاہیے۔'' مگر وہ کہتی کہ اس کی آواز سن لیتی ہوں، دیکھ تو نہیں سکتی ناں۔ ایک بار بیٹے سے اس بات کا ذکر کیا تو کہنے لگا ''اس کا انتظام بھی ہوجائے گا۔'' عنقریب آپ لوگ انٹرنیٹ کے ذریعے آواز کے ساتھ میری تصویر بھی دیکھ سکیں گے۔'' لیکن کیا اس سے ہماری تشفی ہوجائے گی؟

مجھے اس کے آنے کی خبر سن کر خوشی تو ہوتی ہے مگر زیادہ نہیں۔ کیونکہ اس کا مطلب ہے، سال دو سال کی پھر لمبی جدائی.....!! مجھے اس کی متوقع آمد کا انتظار کھینچنا اور دل کی منڈیر پر کوے کا بولتے رہنا زیادہ اچھا لگتا ہے لیکن کاش وہ واپس نہ جاتا۔ میرے بس میں ہوتا تو کبھی اسے اتنی دور نہ جانے دیتا۔ جب ابا ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے، تو ایک روز میں نے حساب لگایا کہ وہ میری پیدائش کے بعد ۵۰ برس تک زندہ رہے۔ لیکن تعلیم اور ملازمت کی خاطر میں انھیں گاؤں میں چھوڑ کر شہر آگیا۔ میری عمر کے ۵۰ برسوں میں سے ابا جی کے حصے میں زیادہ سے زیادہ ۱۵ برس آئے ہوں گے۔

یہ حساب کر کے مجھے سخت صدمہ ہوا کہ ابا زندہ اور اسی دنیا میں آباد تھے مگر میں ۳۵ برس اُن سے دور رہا اور کبھی اس دُوری کو محسوس تک نہ کیا۔ لیکن اب میرا اپنا بیٹا مجھ سے جدا ہوا تو مجھے ابا کے جذبات و احساسات کا کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا۔

وہ ہر دوسرے تیسرے مہینے ملنے آجاتے تھے اور جب تک قیام کرتے، ان کی خواہش ہوتی، مجھے دفتر سے چھٹی ہو اور میں دن رات ان کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہوں۔ مگر میں سال ۲ سال بعد گاؤں کا ایک آدھ چکر لگاتا تو مشکل سے ایک دو راتیں گزار پاتا، پھر مجھے شہر کی رونقیں، روشنیاں اور اپنی دلچسپیاں پکارنے لگتیں۔ بعض اوقات میں شام کو واپس چل پڑتا۔ وہ کہتے ''یہ وقت تو گھر لوٹنے کا ہے تم جا رہے ہو؟'' میں ضروری کام کا بہانہ کرتا، انھیں کیا بتاتا کہ میرا گھر تو کہیں اور ہے۔

مجھے یاد ہے ایک بار شام کے وقت جب میں روانہ ہو رہا تھا، وہ بڑے اداس اور پریشان تھے لیکن منہ سے کچھ نہیں کہا۔ سب لوگ مجھے بے وقت سفر کرنے سے روک رہے تھے مگر وہ خاموش رہے۔ رُخصت کرتے وقت ان سے رہا نہ گیا اور بولے ''تمھاری ماں جی زندہ ہوتیں تو کیا تم تب بھی ایسا ہی کرتے؟'' مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا لیکن میرا دل نہ پسیجا اور اپنی مجبوری بتا کر چلا آیا۔ وہ رات اور ایسی کئی راتیں ابا نے کیسے کاٹی ہوں گی؟ مجھے اس کا اندازہ اب ہوا۔

میرے لڑکپن میں ابا کو داستانِ یوسف بہت پسند تھی۔ میرے شہر چلے جانے کے بعد وہ راتوں کو بلند آواز میں یہ قصہ پڑھتے۔ ماں جی بتاتی کہ وہ زیادہ تر وہی حصے پڑھتے جن میں بیٹے کی جدائی میں حضرت یعقوبؑ کی حالت زار کا بیان ہوتا۔ یا پھر جب حضرت یوسفؑ کا قاصد بشیر ان کا کرتہ اور پھر یہ خوشخبری لے کر پہنچتا کہ آپ کا محبوب فرزند نہ صرف زندہ سلامت بلکہ مصر شہر کا والی بن چکا ہے۔ حضرت یعقوبؑ پھر بیٹے کا کرتہ اپنی نابینا آنکھوں سے لگاتے تو وہ روشن ہو جاتیں۔ ماں جی بتاتی کہ یہاں پہنچ کر تمھارے ابا کی آواز بھرا جاتی اور وہ کوئی بہانہ کر کے پڑھنا چھوڑ دیتے۔ آخری عمر میں جب وہ



پڑھ نہیں سکتے تھے، تب بھی لیٹے بلند آواز میں فراقیہ دوہڑے پڑھتے رہتے۔

☆☆

اگلے روز اس نے پھر فون کیا اور بتایا کہ اسے نشست نہیں مل رہی، اب وہ نیویارک جا کر قسمت آزمائی کرے اور اطلاع دے گا کہ کس پرواز سے آرہا ہے۔ اگر اطلاع نہ دے سکا تب کراچی یا لاہور پہنچ کر فون کر دے گا۔ ورنہ ہم لوگ فکر نہ کریں، اسے گھر کا راستہ معلوم ہے، خود ہی پہنچ جائے گا۔

دو تین روز میں وہ ہمارے درمیان ہوگا اور ہم اسے دیکھ اور چھو سکیں گے..... اس خوشگوار خیال سے دل میں مسرت آمیز ہلچل پیدا ہوگئی۔ آنکھوں کے سامنے بار بار اس کی صورت ابھرنے لگی۔

اس کی امی کا اصرار تھا کہ وہ عید سے کم از کم ایک روز پہلے ضرور پہنچ جائے۔ اس نے یقین دلایا تھا ''امی آپ فکر نہ کریں۔ میں عید کی صبح کا آغاز آپ کے ہاتھوں کی بنائی دودھ سویوں ہی سے کروں گا''۔ پھر بیٹے سے ٹیلی فون کا رابطہ ختم ہوگیا اور اہم اگلی کال کا انتظار کرنے لگے۔ گھر کا کوئی فرد جب بھی ٹیلی فون سن لیتا، وہ پھری شیرنی کی طرح غرانے لگتی۔ مگر پورا ایک دن خراب فوٹوسٹیٹ مشین سے صاف کاغذ کی طرح نکل گیا اور انتظار کی لمبی رات شروع ہوگئی۔ آج اسے وعدے کے مطابق پہنچ جانا چاہیے تھا مگر ابھی تک اس کے روانہ ہونے کی اطلاع بھی نہیں آئی تھی۔

اس نے بھی بیٹے کے پسندیدہ کھانے بنانا اور انھیں فریج میں محفوظ کرنا شروع کر دیا۔ ماؤں کو یہ بڑی سہولت ہے۔ یوں محبت اور مامتا کے اظہار کا موقع ملتا اور مصروفیت میں وقت بھی اچھے طریقے سے گزر جاتا ہے۔ عورتوں کو یہ بڑی سہولت بھی حاصل ہے کہ وہ ہر موقع پر رو کر اپنے جذبات کا اظہار کرتی اور اپنے دل کا غبار نکال لیتی ہیں۔ یوں تو بعض مرد بھی ایسا کرنے میں باک محسوس نہیں کرتے مگر میرے جیسے دیہاتی پس منظر رکھنے والے مردوں کو ایسا کرنے میں اپنی مردانگی خطرے میں نظر آتی ہے۔ مجھے یاد ہے، جب میں پڑھائی کی خاطر پہلی بار گھر سے نکلا اور شہر جا رہا تھا تو گھر کی سب عورتوں نے مجھے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے رخصت کیا۔ مگر ابا نے صرف خاموشی سے سر پر ہاتھ پھیرنے پر اکتفا کیا۔ لیکن وہ باوجود بار بار رومال سے ناک صاف کرتے ہوئے نزلے کی شکایت کر رہے تھے، وہ کیا تھا؟

وہ پریشر ککر کا ڈھکنا کھولتی، بند کرتی، ہنڈیا میں کفگیر چلاتی اور سل وٹے پر قیمہ پیستی ہوئی جب جی چاہتا، اسے یاد کر کے چند آنسو بہاتی اور معمول پر آجاتی۔ مگر میرے اندر کا پریشر ککر ہلکی آنچ پر چڑھا رہتا..... اتنی ہلکی آنچ کہ ویٹ میں لرزش پیدا نہ ہو نہ سیٹی کی آواز سنائی دے۔ یوں تو میں نے بھی عید کی خریداری کرتے وقت اس کی پسند کا خیال رکھا۔ کھانے پینے کی بہت سی چیزیں محض اسی کے لیے خرید لیں مگر بھرم کی خاطر اعلان نہیں کیا۔ ویسے بھی کھانے پینے کا شعبہ خواتین سے مختص ہے۔ میں بتا دیتا تب بھی سہرا اسی کے سر بندھتا۔

ماں جی بھی ایسا ہی کرتی تھیں۔ جس روز میری آمد متوقع ہوتی وہ میری پسند کی چیزیں پکا پکا کر رکھتی جاتیں، گاؤں کی دکان سے برفی اور جلیبیاں منگاتیں۔ موسمی پھل اور کھانے پینے کی چیزیں بیچنے والے گھر کے قریب سے دھوکا دے کر خالی نہ گزر سکتے۔ ابا کہتے ''یہ ۵ روز مری رہتی اور ہفتے کے روز مشین بن جاتی ہے۔''

کام کاج کرنے کے بعد بھی وقت بچ جاتا تو اپنا چرخہ اٹھا کر چھت پر لے جاتیں اور شہر سے آنے والے راستے کی طرف رخ کر کے انتظار کی پرشوق پونیاں کاتنے لگتیں۔ میری بائیسکل کے پہیے اور ماں جی کا چرخہ ایک ساتھ گھومتے۔ واپسی کا سفر مجھے ہمیشہ آسان لگتا۔ ہوا مخالف ہوتی تب بھی لگتا، پکی ڈور سے بندھا کھنچا چلا جا رہا ہوں..... ابا کو بھی اس روز باہر کے سارے کام بھول جاتے اور وہ گھر میں رہنے کا کوئی بہانہ اور مصروفیت تلاش کر لیتے۔

لکڑیاں چیرتے، ٹوٹی چارپائیاں مرمت کرتے یا ان کی ادوائنیں کستے..... مگر ظاہر نہ ہونے دیتے کہ وہ ہفتے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھر کے ملتوی گھریلو کام کاج آج ہی کیوں انجام دے رہے ہیں؟ مگر میرے پاس مصروف رہنے اور وقت گزارنے کا بہت سا جدید ساز و سامان موجود ہے۔ کتابوں میں جی نہ لگے تو آڈیو، ویڈیو کیسٹیں، ڈی وی ڈی اور سی ڈیاں ہیں۔ جب چاہوں ایچ ٹو ایچ گھومنے والے ڈش انٹینا پر مختلف ممالک کے دل بہلانے والے پروگرام دیکھ سکتا، کمپیوٹر پر ٹائپنگ کی مشق کر سکتا، شطرنج کھیل اور انسائیکلوپیڈیا کی فائل کھول کر پہروں مصروف رہ سکتا ہوں۔

وہ کھانے پکاتی رہی اور میں ٹی وی دیکھتا اور موسیقی سنتا رہا مگر اس کے باوجود لگا جیسے رات کا بحرِ اوقیانوس ہم نے کشتی کے بغیر ہاتھ پاؤں مار مار کر عبور کیا ہے۔ جاگنے کے باوجود آخری سحری میں کسی نے پیٹ بھر کر نہ کھایا۔ کئی بار ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے کا گمان ہوا، مگر وہ خاموش تھا۔

وہ باورچی خانے میں بیٹھی سویاں پکاتے ہوئے آنسوؤں کا نمک بہا رہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، مگر سلسلہ منقطع ہوگیا۔ دو تین مرتبہ ایسا ہوا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ دور سے فون آ رہا ہے، وہ کوشش کر رہا ہے مگر ہجوم کی وجہ سے سلسلہ قائم نہیں ہو رہا۔ اس سے اندازہ تو ہو گیا کہ وہ خیریت سے ہے۔ مگر یہ سوچ کر ہم مزید اداس ہو گئے کہ وہ ابھی تک وطن سے دور ہے مگر کہاں؟ اس کا کچھ پتا نہ چل سکا۔ کیونکہ فون پہلے کی طرح پھر خاموش ہو گیا اور رات بھر خاموش رہا۔

معلوم نہیں مجھے بیٹے اور ابا کی یاد ایک ساتھ کیوں آ رہی تھی؟ شاید اس لیے کہ ان کی بھی میرے بیٹے سے بڑی دوستی رہی۔ اپنے پوتوں اور نواسوں میں وہ سب سے زیادہ پیار اسی سے کرتے تھے۔ کئی بار چھٹیوں میں اسے اپنے ساتھ گاؤں لے جاتے اور خوب خاطریں کرتے۔ انھوں نے چارہ لادنے کے لیے ایک گدھی رکھی ہوئی تھی جس کے ساتھ اس کی بچھیری بھی تھی۔ انھوں نے پہلی بار اسے گدھی پر سوار کیا تو کہنے لگا ''داداجی! اس کا ہینڈل کہاں ہے؟''

وہ بہت محظوظ ہوئے اور اس کی رسی تھماتے ہوئے بولے ''یہی اس کا ہینڈل ہے۔'' کچھ عرصہ بعد وہ شہر آئے تو اس نے گدھی کی خیریت معلوم کی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ اور اس کی بچی دونوں بیمار ہو کر مر گئیں۔ اسے بہت افسوس ہوا۔ اس نے محلے کے ہر گھر میں بتایا کہ داداجی کی کھوتیاں مر گئی ہیں۔ کچھ پڑوسنیں اس کی امی کے پاس افسوس کرنے آئیں اور یہ پوچھنا ضروری سمجھا کہ کیا تم لوگ پیچھے سے کمہار ہو؟ اس پر ہم سب نے اسے خوب ڈانٹا۔

پھر جب وہ کالج میں پڑھتا تھا، تو گاؤں گیا۔ لیکن کچھ دن بعد اداس ہو گیا۔ ایک روز اپنے داداجی سے کہنے لگا ''میں واپس گھر جانا چاہتا ہوں۔''

''یہ بھی تو تمھارا اپنا گھر ہے۔''

''میں یہاں ''بور'' ہو رہا ہوں۔''

''وہ کیا ہوتا ہے؟''

ابا بتاتے تھے کہ تب انھیں معلوم نہ تھا، ''بور ہونا'' کیا ہوتا ہے اور نہ ہی کبھی ''بور'' ہوئے تھے۔ مگر پھر وہ بھی بور ہونے لگے۔ جب زیادہ بور ہو جاتے تو کرایہ لے کر ہمیں ملنے شہر آ جاتے۔ جب بیٹا امریکہ سدھار گیا، تو کچھ عرصے بعد ایک روز میرے ہاتھ پندرہ بیس برس پرانی ڈائری لگ گئی۔ پہلے صفحے پر ایک ضروری نوٹ درج تھا:

مجھے یاد آیا، میں نے اسے سبحان تیری قدرت پکارنے والے کالے تیتر کی ایک من گھڑت کہانی سنائی تھی۔ وہ اسے اس قدر پسند آئی کہ رات دس بجے ضد شروع کر دی ''مجھے ابھی کالا تیتر لا کر دیں۔'' میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہہ دیا کہ سردیوں میں کالے تیتر گرم علاقوں میں چلے جاتے ہیں۔ گرمیوں میں واپس آئیں گے تو لا دوں گا۔ اس نے کہا ''ابو آپ بھول جائیں گے۔''

میں نے کہا ''نہیں بھولوں گا، ضرور لا دوں گا۔'' مگر اس کا اندیشہ دور نہیں ہوا۔ تب میں نے اسے یقین دلانے کے لیے ڈائری نکالی اور اس پر لکھا:

ضروری نوٹ: گرمیوں میں عامر کو کالا تیتر لا کر دینا ہے۔ اس نے کہا، یہ بھی لکھیں کہ بھولنا ہرگز نہیں۔ میں نے یہ بھی لکھ دیا۔ تب کہیں جا کر اس کی تسلی ہوئی اور وہ مطمئن ہو کر سو گیا کہ اب گرمیاں آتے ہی ابو کو کالا تیتر



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لانا پڑے گا۔ کیونکہ یہ ان کی ڈائری میں لکھا جا چکا۔ وہ ٹھیک ہی سمجھا تھا کہ لکھا ہوا مٹایا نہیں جا سکتا۔ مگر گرمیاں آنے تک میں ہی نہیں اسے بھی وعدہ بھول گیا۔ لیکن لکھا ہوا اب تک موجود تھا۔ تحریر بڑی ظالم چیز ہے، آدمی بھول جائے یا مٹ جائے تب بھی رہتی ہے۔

وقت بھی بڑا سنگ دل اور تیز رفتار ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ وہ میری انگلی پکڑ کر چلتا، اب مجھے مشورے اور ہدایات لکھ لکھ کر بھیجتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی فرمائشیں کرنے اور حقیر چیزوں سے بہل جانے والا اب میرے لیے قیمتی تحائف لاتا ہے۔ میں بھی ابا کے لیے ہر بار نئے کپڑے، سویٹر اور گرم چادر وغیرہ لے جاتا تھا اور سمجھتا، ان کے سب دکھ دور ہو گئے۔ لیکن کیا چیزیں اور تحائف جدائی کے زخم مندمل کر سکتے ہیں؟

رات کا آخری پہر شروع ہو گیا مگر ٹیلی فون اب تک خاموش تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کچھ دیر ضرور سو لوں ورنہ بیمار پڑ جاؤں گا مگر نیند بالکل نہیں آ رہی تھی۔ پتا نہیں اس وقت کس ملک کے کس شہر میں ہو گا یا کن پانیوں پر اس کا جہاز پرواز کر رہا ہو گا۔ کمرا اس کی یادوں سے پٹا پڑا تھا۔

جب وہ بہت چھوٹا تھا، میں منہ سے سیٹی نکال کر اسے پکارتا۔ وہ سیٹی پہچانتا تھا۔ گھر میں جہاں کہیں ہوتا، سیٹی سن کر پالتو جانوروں کی طرح دوڑتا ہوا فوراً پہنچ جاتا۔ اسے پکارنے کی یہ عادت اس کے ساتھ ہی پختہ ہوتی گئی۔ جب وہ میڈیکل میں داخلے کے بعد بہاولپور چلا گیا تو میں اپنی اداسی کا اظہار سیٹی سے کرتا۔ لیکن جب مجھے احساس ہوا کہ اس کی امی پہچاننے لگی ہے کہ یہ عام سیٹی نہیں، میں اسے یاد کر رہا ہوں تو میں نے بجانا چھوڑ دیا۔ ان عورتوں کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ میں اندر سے کتنا کمزور ہوں۔

مجھے یاد آیا کہ جس روز اس کا ویزہ لگا، وہ جتنا خوش تھا، ہم اتنے ہی اداس تھے۔ اس کی امی بہت روئی۔ میں بھی اسی کی آنکھوں سے رو لیا تا کہ اپنی آنکھیں خشک رکھ کر اسے ہمت و حوصلے سے رخصت کر سکوں۔ مجھے یقین ہے کہ میری آنکھیں بھی تر ہو جاتیں تو وہ حوصلہ ہار جاتا اور اپنا جانا موقوف کر دیتا۔ رخصت ہوتے وقت وہ بہت پرجوش تھا۔ اس کی آنکھوں میں نئی منزلوں کی چمک اور سہانے خواب تھے۔

چند ماہ پہلے میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس بار ٹیلی فون آیا تو اسے واپس آنے پر قائل کرنے کی کوشش کروں گا۔ مگر جس روز ٹیلی فون آیا، ایٹمی دھماکے کی خوشی میں ڈالر کا نرخ دُگنا ہو گیا اور میں چپ ہو گیا..... ماواں تو ویریا بچھڑے.....!

☆☆

وہ سو رہی تھی، اندیشوں، واہموں اور یادوں سے بے نیاز۔ میں نے اٹھ کر نیند کی گولی کھائی اور دوبارہ بستر پر لیٹ کر وٹیں بدلنے اور یادوں کی جگالی کرنے لگا۔ مجھے یاد آیا، جب وہ بہت چھوٹا تھا، ہمارے درمیان سوتا۔ اسے میرے یا اپنی امی کے گال پر ہاتھ رکھ کر سونے کی عادت تھی۔ ہاتھ ہٹایا جاتا تو جاگ پڑتا یا پھر نیند ہی میں دوبارہ وہیں رکھ لیتا۔ شاید اسے اس لمس سے سوتے میں تحفظ کا احساس رہتا تھا۔ رفتہ رفتہ ہمیں بھی اس کے ہاتھ کی عادت ہو گئی۔

لیکن اب سال دو سال بعد وہ چند دنوں کے لیے آئے، تو ہم اسے پہلے کی طرح بار بار لپٹا نہیں سکتے، پیار نہیں کر سکتے اور ہاتھ اپنے گال پر رکھ کر سو نہیں پاتے۔ وہ قریب بیٹھا باتیں کرتا رہے، اسی کو بہت جانتے ہیں۔ مگر وہ کہاں کھو گیا؟ اس نے فون کیوں نہیں کیا؟ کیا اس کی عید بھاگ دوڑ یا سفر میں گزر گئی؟ عید کے موقع پر گھر پہنچ نہ سکنے کا کس قدر ملال ہو گا۔ انہی خیالات میں کھویا میں نجانے کب سو گیا۔ سو گیا یا شاید جاگو مٹی سپنا دیکھا۔

کیا دیکھتا ہوں کہ وہ میرے پہلو میں لیٹا ہے اور اس کا ننھا سا ہاتھ میرے گال پر ہے۔ میں اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیتا ہوں مگر وہ بڑا اور سخت ہوتا جاتا ہے۔ میں چونکتا ہوں۔ اس کی امی کمرے میں نہیں، نیچے کی منزل سے باتوں کا شور سنائی دے رہا تھا اور وہ میرے سرہانے بیٹھا تھا..... میں نے اسے لپٹا لیا اور احتیاط کے سارے بندھن توڑ کر میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔



آئینہ ٹوٹ بھی جائے تو کوئی بات نہیں
دل نہ ٹوٹے کہ یہ بکتا نہیں بازاروں میں

آئینے سے مستفید ہونے والوں میں فلم والے بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ چنانچہ ''آئینہ ان کو دکھایا تو بُرا مان گئے'' ایسے گیت وجود میں آئے۔

باقی رہا آئینے کا سیاسی کردار تو یہ ''ایجاد'' اس ضمن میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ دنیا بھر کی سیاسی جماعتیں اپنی حریف جماعتوں کو آئینہ دکھاتی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ فی الوقت سب سے بڑا آئینہ ہمارا پرنٹ اور الیکٹرانک

# اگر آئینہ نہ ہوتا

محمد اشرف ندیم

آج بیٹھے بیٹھے ذہن میں خیال آیا کہ اگر آئینہ ایجاد نہ ہوا ہوتا تو کیا ہوتا؟ ہم میں سے کسی کو پتا ہی نہ چلتا کہ اس کی شکل کیسی ہے؟ ہم ساری عمر صرف اندازے ہی لگاتے رہتے، مثلاً کسی کی ستواں ناک چھو کر اس کی جسامت معلوم کرتے، پھر اپنی ناک کا حدود اربعہ جانچتے اور اس کے بعد بھی شش و پنج میں رہتے کہ آیا ہماری ناک ستواں ناک کی شرائط پر پوری اترتی ہے یا نہیں؟ یہی الجھن آنکھ، کان، پیشانی، ٹھوڑی اور چہرے کی لمبائی یا چوڑائی کی بابت بھی محسوس ہوتی۔ ہمیں تو یہ بھی پتا نہیں چلنا تھا کہ ہم گورے ہیں، کالے ہیں، گندمی یا سانولے ہیں۔ سو اس ضمن میں بھی دوسروں کی ''معلومات'' پر انحصار کرنا پڑتا بلکہ ہم سب ایک دوسرے کی خوبصورتی اور بدصورتی کے بارے میں بھی ایک دوسرے پر انحصار کرتے۔

سچی بات یہ ہے کہ جب سے سچ مچ کا آئینہ ایجاد ہوا ہے، اس کی بدولت اُردو کو بہت سی خوبصورت تراکیب، محاورے اور اشعار دستیاب ہوئے۔ تراکیب میں آئینہ خانہ اور آئینہ خیال، آئینے ہی کی دین ہیں۔ محاوروں میں آئینہ دکھانا اور آئینہ بنانا (حیران کرنا) ایسے بیسیوں محاورے موجود ہیں اور شاعری میں تو ہر طرف آئینہ ہی آئینہ نظر آتا ہے۔

آئینہ دیکھ کر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

میڈیا ہے جو بلاتمیز رنگ و نسل و مذہب و ملت سب کو آئینہ دکھاتا رہتا ہے۔ لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں، اس کے لیے بڑا دل گردہ چاہیے کہ اس آئینے میں جس حکمران، جس سیاسی جماعت یا جس خفیہ ایجنسی کو اپنی مکروہ شکل نظر آتی ہے وہ آئینہ بردار کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ ابھی تک کئی آئینہ بردار اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے یا زخموں سے چُور اپنے گھروں میں پڑے ہیں۔

گزشتہ دورِ آمریت میں تو جنرل صاحب وہ آئینہ ہی توڑنے کے درپے تھے جو اس آمر کو اس کی اصل شکل دکھاتا تھا۔ تاہم سمجھدار لوگ آئینہ توڑتے نہیں، خریدنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس وقت ہمارے درمیان کتنے ہی آئینہ فروش موجود ہیں۔ ان بدنصیبوں کو دیکھ کر کبھی کبھی تو دل میں خیال آتا ہے کہ کاش ''آئینہ'' ایجاد ہی نہ ہوا ہوتا لیکن کیوں ایجاد نہ ہوتا؟ آخر اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان کی پہچان تو کرانا ہی تھی۔

(عطاالحق قاسمی)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تحفۂ خاص..... اُن سب کے لیے جن کی شادیاں نئی نئی ہوئی ہیں
اور اُن کے لیے بھی جو پرانی شادیوں کو ہمیشہ نیا رکھنا چاہتے ہیں

بشریٰ رحمٰن

# ہوائی سفر

۲۲ گھنٹے کے ایک سفر کا ماجرا،
وہ بے رنگ ہوتی زندگی میں رنگ
بھرنے کا باعث بن گیا تھا

میں عام طور پر دن گیارہ بجے دفتر آتی ہوں۔ کامیاب ترین انسانوں کا یہی وتیرہ ہے۔ جدوجہد کی ڈگر پر گرتے پڑتے جب وہ اپنی منزل پر پہنچ جائیں تو اپنی دانست میں مہنگے ہوجاتے ہیں۔ پھر وقت ان کے اختیار میں ہوتا ہے، وہ وقت کے اختیار میں نہیں ہوتے۔ لوگ ان کے پیچھے دوڑتے ہیں، وہ لوگوں کا پیچھا نہیں کرتے۔ ضرورت مند ان سے وقت خریدتے ہیں، ان کا وقت برباد نہیں کرتے۔ میں اپنی شاندار موٹر سے نکل کر دفتر کی طرف بڑھی تو چپراسی کھڑا ہوگیا۔ اس نے سلام جھاڑا اور دروازہ کھول دیا۔

کمرے میں داخل ہوئی تو وہ معمول کے مطابق پیچھے پیچھے آیا اور بولا ''جی لوگ گھنٹے بھر سے انتظار کررہے ہیں.....''

میں آرام کرسی پر بیٹھ ملاقاتیوں کی فہرست دیکھنے لگی۔ آج مجھے ایک مرد اور تین عورتوں سے ملنا تھا۔ ایک نیوز چینل والے پچھلے چھ مہینوں سے وقت مانگ رہے تھے۔ انھیں میرا طویل انٹرویو درکار تھا۔

''میڈم جی!'' چپراسی بولا ''میڈیا والے صاحب سب سے پہلے آئے۔ کہہ رہے تھے، آج انٹرویو لیے بغیر نہیں جائیں گے۔''

ابھی میں نے جواب نہیں دیا تھا کہ میرا فون بج اٹھا۔ دوسری طرف واحدی صاحب تھے، رین بو چینل والے..... کہہ رہے تھے کہ اب وہ بن پوچھے اندر آکر آج انٹرویو لیے بغیر نہیں جائیں گے..... کیونکہ وہ کیمرے اٹھا کر پورے عملے کے ساتھ آئے ہیں۔ میں نے چپراسی سے کہہ دیا ''انھیں احترام سے اندر لے آؤ اور باقی لوگوں سے معذرت کرکے انھیں ایک گھنٹے بعد آنے کو کہو۔'' اکثر شہرت کی مجبوریاں، پیشہ ورانہ مجبوریوں سے ٹکرا جاتی ہیں۔ بعض اوقات مجھے اپنی ذات کو بھی نظرانداز کرنا پڑتا ہے۔

میں نے کرسی کی نشست پر سر ٹکا کر دفتر کا جائزہ لیا۔ ہر شے چم چم کررہی تھی۔ گرد کا نام و نشان نہیں تھا۔ آبنوسی میز کا شیشہ اس طرح دمک رہا تھا کہ آنے والا اس میں اپنی شبیہ دیکھ لے۔ میں سگریٹ نہیں پیتی، مگر مہمانوں کی خاطر خوبصورت ایش ٹرے چمکا کے رکھتی ہوں۔ میرا قلمدان اور گلدان جس میں ہر روز تازہ پھول لگائے جاتے ہیں، میری شخصیت کی عکاس ہیں۔ میں اردگرد صاف ستھرا اور خوشبودار ماحول پسند کرتی ہوں۔ اس ماحول میں لوگوں کے مسائل سن کر ان کا حل بتانے میں مجھے یک گونہ سرور حاصل ہوتا ہے۔

عجب ہے میری زندگی..... میں نے جن باتوں سے فرار حاصل کرنا چاہا تھا، روزانہ وہی باتیں سننے کی فیس لیتی ہوں۔ جن رشتوں سے میں نے نفرت کی تھی، وہی رشتے جوڑنے کے نئے نئے ٹوٹکے بتاتی ہوں..... لوگ میرے مشوروں پر عمل کرتے ہیں اور ان کی زندگی خوشگوار ہوجاتی ہے۔ تبھی وہ میری شہرت میں اضافہ کرتے ہیں۔

کل زندگی آپ کو کس قطار میں کھڑا کردے گی، یہ کوئی نہیں جان سکتا۔ آپ کی ذات میں کتنے گن چھپے ہیں اور وہ کتنے کانٹوں کی چبھن سہہ سکتی ہے، آپ خود اس حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں۔ سب سے عجیب معاملہ یہ ہے کہ اپنی ذات کے جو کانٹے آپ خود نہیں چن سکتے، دوسروں کی ذات کے وہی کانٹے ان سے چنوانے لگتے ہیں۔

چپراسی نے گھنٹی بجا کر دروازہ کھول دیا اور وہ اندر آگئے۔ دو کیمرے تھے اور چار آدمی۔ میں نے چپراسی کو چائے لانے کا کہا۔ وہ لوگ کیمرے لگانے لگے۔ واحدی صاحب میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے اور بولے ''تعجب ہے، آپ کے کمرے میں سب سے خوبصورت تصویر پرواز کرتے ہوئے ہوائی جہاز کی ہے، اس میں کوئی بھید ہے؟''

میں نے مسکرا کر کہا ''آپ انٹرویو کی شروعات کر رہے ہیں؟''

''ہاں!'' وہ بولے ''میں چاہتا ہوں یہ روایتی بات چیت نہ ہو۔ جس طرح آپ کی شخصیت سب سے الگ تھلگ ہے، اسی طرح کی تصویر اپنے ناظرین کو دکھانا چاہتا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوں۔ میں کیمرے کا رخ اس جہاز کی طرف کروں گا، آپ اسی سے اپنی بات شروع کریں۔''

عین اس وقت آسمان پر جہاز کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ غالباً کوئی مسافر بردار جہاز گزر رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرکے ایک لمبی سانس لی اور جہاز کے اندر پہنچ گئی۔

☆☆

میں نے بزنس کلاس میں کھڑکی والی نشست مانگی تھی، وہ مجھے مل گئی۔ فضائی میزبان نے مجھے وہاں بٹھا دیا اور میں نے سیٹ بیلٹ باندھ لی۔ عجیب بکھرا بکھرا میرا حلیہ تھا۔ نہ چہرے پر رونق، نہ دل میں اُمنگ، نہ آنکھوں میں چمک، نہ خیالوں میں ترنگ..... میں ایک اجڑی صورت اور شکستہ دل لیے امریکی شہر، رچمنڈ اپنی ایک دوست کے پاس جارہی تھی۔ گھر اُجڑنے کے بعد ہر شے کی صورت بھی اُجڑ جاتی ہے۔ مجھے اپنا حلیہ ٹھیک کرنے کا ہوش کب تھا؟ میں ایک سنگین صدمے سے گزر رہی تھی، جیسے آدمی عرش سے فرش پر گرتا ہے تو چور چور ہوجاتا ہے..... ساری دنیا مجھے اندھا کنواں لگ رہی تھی۔

میں زندگی، دنیا اور تمام انسانوں سے بیزار تھی۔ ہر رشتے سے میرا اعتماد اُٹھ گیا تھا۔ سمجھانے بجھانے والے سب مجھے دشمن لگ رہے تھے۔ اب میں ایک آزار بن کر امریکہ جارہی تھی جہاں میری بچپن کی سہیلی رہتی تھی۔ مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ میں امریکہ کیوں جارہی ہوں۔ والدین نے مجھے روکا اور اپنے فیصلے پر غور کرنے کو کہا تھا۔ عزیز واقربا نے بھی مشورے دیے۔ مگر میں بچپن سے اپنی ہر بات منوانے کی عادی تھی، کیوں کسی کی مانتی؟

یہ ٹھیک ہے کہ چھ ماہ بیشتر معید سے میری شادی ہوئی تھی۔ یہ شادی پسند کی تھی مگر معید کا اصلی روپ شادی کے بعد میرے سامنے کھلا..... اُف ایسے آدمی کے ساتھ زندگی گزارنے سے بہتر تھا کہ میں خودکشی کرلیتی۔ میں نے کسی کی نہیں سنی اور امریکہ چل دی، ایک آزاد اور من مانی زندگی گزارنے.....

چھ ماہ بہت ہوتے ہیں کسی کی بے ہودگیاں برداشت کرنے کے لیے! میں اپنے ٹوٹے وجود کی تاریک گلیوں میں اس طرح بھٹک رہی تھی کہ مجھے پتا ہی نہ چلا، ایک مسافر میرے ساتھ آکر بیٹھ گیا۔ کب ابتدائی رسومات طے ہوئیں، کب جہاز نے پرواز کی، کچھ علم نہیں۔ جب دوبارہ بتیاں جلیں تو دیکھا، وہ کوئی غیر ملکی تھا۔ اب اپنا لیپ ٹاپ نکال کے ای میل دیکھ رہا تھا۔

فضائی میزبان پہلے مشروبات لے کر آگئی۔ مسافر نے ایک گلاس اٹھا لیا۔ میں نے ایک گلاس اٹھایا، تو میری کہنی مسافر کو لگ گئی۔ میں نے فوراً کہا ''آئی ایم سوری (معاف کیجیے)!''

''نو میٹر۔ (کوئی بات نہیں)۔'' وہ بولا۔

فضائی میزبان اخبار لے آئی۔ ایک اخبار اس نے اُٹھا لیا۔ ایک اپنی پسند کا میں نے اُٹھایا اور اس طرح زاویہ بنا کر پڑھنے لگی کہ دوبارہ میری کہنی یا میرا اخبار مسافر کو نہ لگے۔ اس مرتبہ مسافر کی کہنی مجھے لگ گئی۔ میں نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا، اس نے جھٹ شرمندہ لہجے میں کہا: ''آئی ایم سوری.....''

''ڈزنٹ میٹر (کوئی بات نہیں۔)'' میں نے جواباً کہا۔

تھوڑی دیر بعد کھانا تقسیم ہونے لگا۔ میں نے اپنے آگے ٹرے کھول لی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا، مجھے شدید بھوک لگ رہی تھی۔ کھانا ڈالتے وقت میں نے کچھ چاول مسافر پر گرائے اور جھٹ کہا ''سوری، آئی ایم سوری۔'' اور چاول صاف کرنے لگی۔

کھانے کے دوران میں سٹ کر ایک کونے کے ساتھ لگ گئی۔ جب فضائی میزبان کوئی چیز لاتی تو مسافر پکڑنے میں میری مدد کرتا۔ کبھی کوئی چیز مجھے پکڑا بھی دیتا۔ میں ہمیشہ تھینک یو ویری مچ (بہت شکریہ) کہہ کر وہ چیز پکڑ لیتی۔

کھانا کھانے کے بعد وہ کمبل اوڑھ گہری نیند سو گیا۔ اُدھر میں غسل خانے جانا چاہتی تھی۔ پریشان ہوگئی کہ راستے میں اس نے ٹانگیں پھیلا رکھی تھی۔ یا تو میں اسے جگا دیتی یا ٹانگوں پر سے کود کر چلی جاتی۔ لیکن کیسے جگاتی؟



وہ اجنبی اور غیر ملکی تھا۔ میں نے تو اس کی شکل بھی غور سے نہیں دیکھی تھی۔ جب بہت مجبور ہوگئی تو سوچا، الانگ کر نکل جاتی ہوں۔ الانگتے وقت میرا پاؤں اس کی ٹانگ کو لگ گیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میں پھر شرمندہ ہوگئی ''آئی ایم سوری! آئی ایم سوری!'' میں نے روہانسی آواز میں کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' کہہ کر پھر سو گیا۔

غسل خانے سے واپس آئی تو وہ گہری نیند سو چکا تھا۔ اب کیا کروں؟ میں نشست کے پاس چپ چاپ کھڑی ہوگئی۔ کوئی اپنا ہم وطن ہوتا تو کندھا ہلا کر جگا دیتی، اگر اپنا شوہر ساتھ ہوتا..... اُف یہ کیا بے ہودہ خیال آگیا۔ مجھے یوں غلطاں و پیچاں دیکھ کر فضائی میزبان آگئی۔ اس نے ''ایکس کیوزمی سر!'' کہہ کر مسافر کو جگا دیا۔ مسافر نے مجھے دیکھا، تو جھٹ ٹانگیں سکوڑ لیں اور بولا ''آئی ایم سوری۔''

میں اپنی نشست پر چلی گئی اور کہا ''بہت بہت شکریہ.....''

رات کو سوتے میں، میں نے پھر اسے کہنی ماردی۔ تب خود ہی نیند کھل گئی۔ میں نے فوراً کہا ''آئی ایم سوری۔''

اس بار بار کی آئی ایم سوری سے بچنے کے لیے میں اُٹھ بیٹھی اور سب مسافروں کا جائزہ لینے لگی۔ سلسلہ یہی چل رہا تھا، کوئی اٹھ کر جارہا تھا، کوئی واپس آرہا تھا۔ کوئی آئی ایم سوری کہہ رہا تھا، کوئی تھینک یو ویری مچ کی گردان کررہا تھا۔ کوئی ایکس کیوزمی کہہ کر راستہ مانگ رہا تھا۔ گویا ہر مسافر دوسرے کا حق تسلیم کررہا تھا۔

جب سورج نکلا، تو جہاز کے اندر بھی صبح ہوگئی۔ سارا عملہ جیسے جاگ اٹھا۔ فضائی میزبان ننھے ننھے گرم تولیے چمٹے سے پکڑے ہر مسافر کو دینے، یعنی منہ دھلانے لگی۔ ایک تولیہ سوئے ہوئے مسافر پر گر گیا۔ وہ جھلا کر اٹھا اور انگریزی زبان میں فضائی میزبان کو گالیاں دینے لگا۔

وہ بے چاری زرد ہوتی ہوئی ''سوری سر..... آئی ایم ایکسٹریملی سوری سر..... پلیز فارگیو می (مجھے معاف کردیں)'' کہتی جاتی اور وہ اس کے بخیے ادھیڑتا جاتا۔

## شہر گم گشتہ

جس شہر کو میرا کہتے ہو
وہ شہر تو میرا شہر نہیں
یہ جنگل ہے انسانوں کا، انسان نُما حیوانوں کا
وہ مسکن تھا مستانوں کا اور گھبرو شیر جوانوں کا
اُس شہر میں دانش پھلتی تھی، وہ شہر تھا ''نور'' جہانوں کا
وہ معبد تھا رومانوں کا، عُنوان تھا افسانوں کا
یہ مقتل ہے ارمانوں کا، سقراط صفت فرزانوں کا
وہ شہر تھا شہرِ زندہ دلاں
اُس شہر وفا کی مٹی میں جو برسوں سے تھے خوابیدہ
وہ مُردے زندہ رہتے تھے
اس شور و شغب کی بستی میں، اس حرص و ہوس کی پستی میں
اب زندہ مُردے رہتے ہیں
اُس شہر کی باتیں یاد کرو
جب دل کی آنکھیں کھولو گے، جب حال و ماضی تولو گے
اک ہُوک سی دل میں اُٹھے گی اور اندر اندر روؤ گے
اُن انجانی سی سڑکوں پر
اُن دوراہوں کو ڈھونڈو گے، اُن چوراہوں کو ترسو گے
تھی جن کی سوندھی مٹی میں اِک رُوح افزا سی خوشبو بھی
اب دُھول دھوئیں سے اَٹے ہوئے ان دوراہوں چوراہوں پر
ہیں قسم قسم کے بلبوں سے اب روشنیاں تو سڑکوں پر
پر اُن پہ چلنے والوں کے اندر تو گھپ تاریکی ہے
اُس دور کی سڑکیں کم روشن
پر اُن پر چلنے والوں کے اندر تو تُور کے سوتے تھے
یہ اُسی شہر کا نوحہ ہے
جہاں علم و ہنر کا شُہرہ تھا اور رشکِ قمر ہر چہرہ تھا
وہ شہر زہرہ جمالوں کا
داناؤں کا، اقبالوں کا
میں اُسی شہر کی کھوج میں ہوں
جو بانہوں میں لے لیتا تھا اور بہت محبت دیتا تھا
تھا شہر امن مگر جنگوں میں وہ بم سینے پر سہتا تھا
وہ شہر تو اب گم گشتہ ہے، بھی راوی جس میں بہتا تھا
اے ہم نفسو کچھ یاد کرو
کس شہر کو میرا کہتے ہو
اس شہر کو میرا کہتے ہو
جس شہر کو میرا کہتے ہو
یہ شہر تو ویسا شہر نہیں
وہ شہر تھا شاید یہیں کہیں

(تنویر خواجہ)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سارے مسافر فضائی میزبان اور مسافر کو دیکھنے لگے۔ بات اتنی بڑی نہیں تھی، مسافر نے بتنگڑ بنادیا۔ مسافر پاکستانی تھا، فضائی میزبان بھی پاکستانی۔ وہ معاف کردیتا مگر بعد میں بھی کہتا رہا ''نہ جانے کیسے کیسے بھوکے ننگے گھروں سے یہ نیم خواندہ اور بدتمیز لڑکیاں آجاتی ہیں۔ سفارش پر رکھ لی جاتی ہیں، یہ کیا جانیں ادب و آداب اور شائستگی۔''

جہاز کا ماحول پریشان کن ہوگیا۔ پھر جو بھی فضائی میزبان آتی، ڈری ہوئی ہوتی..... میں اٹھ کر غسل خانے کی طرف گئی۔ راہداری میں وہی فضائی میزبان رو رہی تھی۔ عملے کے لوگ اسے چپ کرا رہے تھے۔ وہ کہتی جاتی ''بڑی ذلت ہے اس نوکری میں، یہ لوگ ہمیں ادنیٰ نوکرانیاں سمجھتے ہیں۔ آخر ہماری بھی عزتِ نفس ہے۔''

''چپ کر جاؤ، چپ کر جاؤ..... وہ بہت بڑا آدمی ہے تمھاری شکایت کردے گا۔''

''پورے جہاز کے سامنے مجھے ذلیل کرکے اب میری شکایت بھی کردے گا۔''

''تجھے معلوم ہے، مسافر ہمارا باس ہوتا ہے۔''

اتنے میں جہاز کا برسر وہاں آگیا۔ آتے ہی تحکمانہ لہجے میں بولا ''نورین! تم میرے ساتھ چل کر اس مسافر سے باقاعدہ معافی مانگو۔''

''سر! میں تو پہلے ہی سو بار معافی مانگ چکی۔''

''میں ابھی اس سے مل کر آرہا ہوں، وہ بہت خفا ہے اور ناشتا لینے سے انکار کررہا ہے۔ بس میں نے اتنا سنا اور غسل خانے چلی گئی۔ واپس آئی تو روتی ہوئی فضائی میزبان بھی اپنے فرائض انجام دینے جاچکی تھی۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے بنی ٹھنی چاق چوبند فضائی میزبانوں کو دیکھ کر میں سوچ رہی تھی ''کیسی مزے کی نوکری ہے یہ! دنیا بھر کی خوب سیر کرو''۔ شاید لاشعور میں کہیں تھا کہ میں بھی امریکہ جاکر کسی فضائی ادارے میں ملازمت کرلوں۔ مگر جب فضائی میزبان ہر مسافر کے آگے سے جھوٹے برتن سمیٹنے، جگہ صاف کرنے اور اِدھر اُدھر گری ہوئی خوراک اٹھانے لگیں تو مجھے کراہت ہونے لگی۔

کراہت..... میں ٹھٹھک گئی۔ اسی بات پر تو میری اور معید کی لڑائیاں شروع ہوئی تھیں۔ میں نہ اس کے آگے چائے رکھتی، نہ اس کے برتن اٹھاتی۔ دفتر جانے سے پہلے اس کی ضرورت کی کوئی شے سامنے نکال کر نہ رکھتی۔ کپڑے وہ خود استری کرتا۔ روزانہ ناشتا بنانے سے مجھے گھن آتی۔ میں آرام سے کہہ دیتی ''کینٹین سے کرلینا۔''

لیکن ایک شادی شدہ شخص کب تک کینٹین سے ناشتا کرسکتا ہے؟ اسے غصہ آنے لگا۔ شادی سے پہلے اس نے مجھے بتایا تھا، اسے غصہ بہت آتا ہے، جب اس کی بات نہ مانی جائے۔ میں نے بھی ہنس کر کہہ دیا، دیکھا جائے گا کس کا غصہ تیز ہے۔

محبت کے زمانے میں تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ مگر میں سمجھتی تھی کہ میں بس دنیا میں اپنی باتیں منوانے اور سجدے کروانے پیدا ہوئی ہوں۔ یہ زمانہ ایک ماہ میں تمام ہوا۔ میں نے شادی سے پہلے شرط رکھی تھی کہ میں معید کے والدین کے ساتھ نہیں رہوں گی۔ اس نے شادی کے بعد فلیٹ کرائے پر لیا۔ حالانکہ اس کے والدین کا گھر بہت بڑا اور ہم سب کے لیے کافی تھا۔

وہ ایک ماہ بعد ہی دفتر جانے لگا۔ ''کیوں جاتے ہو؟'' میں صبح صبح کسمساتی۔

وہ کہتا ''گھر کے اخراجات کون اُٹھائے گا؟ گھر کا کرایہ، یوٹیلٹی بل وغیرہ۔''

''میں نہیں جانتی۔'' میں کہتی۔

''تو جاننے کی کوشش کرو۔''

''میں یہ بکواس سننے نہیں آئی تمھارے پاس۔''

''تو میں بھی سارا دن تمھارے حسن کے قصیدے نہیں پڑھ سکتا۔ مجھے گھر کا آرام چاہیے، جیسا میری ماں کے گھر میں تھا۔ ہر شے وقت پر مل جاتی، ہر کام اپنے آپ ہورہا تھا۔''

''تو چلے جاؤ اپنی ماں کے گھر!''

بس اس کے بعد الزامات کا ایک آبشار کھل جاتا۔ مجھے جہیز میں ایک کار ملی تھی۔ اکثر لڑائی کے بعد میں کار



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے نکل جاتی۔ کبھی اپنی ماں کے گھر کبھی کسی سہیلی کے گھر۔ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ معید نے کیسے ناشتا کیا، دوپہر کا کھانا کہاں کھایا اور گھر کس وقت لوٹا۔

مجھے گھر کی صفائی ستھرائی کا خیال تھا، نہ باورچی خانہ آباد کرنے کا..... نہ مجھے ایسی تربیت دی گئی تھی۔ میرے ذہن میں فلمی انداز والی محبت بس گئی تھی جہاں شوہر ایک زرخرید غلام کی طرح دن رات خدمت اور محبت کرتا اور میرے ابرو کے اشارے پر تکمیل کے لیے حاضر ہوجاتا۔ معید نے بہت آرام سے مجھے سمجھانے کی کوشش کی، سمجھوتا کرنا چاہا کہ وہ باورچی رکھ لے گا، مگر مجھے کم از کم گھر میں کچھ کرنا چاہیے۔

لیکن میں اکڑ گئی اور کچھ بھی ماننے سے انکار کردیا۔ پھر لڑائیوں نے وہ رخ اختیار کیا جس میں زبانوں پر نامناسب باتیں آنے لگیں، دلوں پر خراشیں پڑیں، زبان کے زخم، تلوار کے زخم سے کاری ہونے لگے۔

یہ بات میں اکثر کہتی کہ میں چلی جاؤں گی، میں تمھارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ اس بات پر وہ چپ ہوجاتا۔ اس کے والدین کی میں بالکل عزت نہیں کرتی اور اپنے والدین کی تو بگڑی ہوئی اولاد تھی۔ اس لیے ان کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھی..... میں نے اپنے زیور بیچے اور امریکہ جانے کی ٹھان لی۔

☆☆

جہاز کے اندر ناشتے کا عمل ختم ہوگیا۔ سب مسافر جاگ اُٹھے۔ منزل مقصود آنے والی تھی۔ امیگریشن کارڈ تقسیم کردیئے گئے۔ سب مسافر اپنی اپنی چیزیں سمیٹنے لگے۔ غسل خانوں کے باہر قطار لمبی ہوگئی تھی۔ کمال ہے، یہاں ہر کوئی بڑے تحمل سے اپنی باری کا انتظار کرتا ہے۔ کوئی کسی پر نہیں چلاتا، کوئی نہیں کہتا، تم نے دیر کیوں لگائی.....؟

میں معید پر چلایا کرتی تھی، میں کہتی ''تم غسل خانے میں ہمیشہ دیر لگاتے ہو، میں پہلے جاؤں گی۔''

وہ کہتا ''مجھے دفتر جانا ہے، براہِ مہربانی مجھے پہلے جانے دو..... تمھاری وجہ سے مجھے دیر ہوجاتی ہے۔''

میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا، صبح کا وقت شوہر کا وقت ہوتا ہے، اسے سکون اور خوش خلقی کے ساتھ کام پر بھیجنا چاہیے۔ دوپہر کا وقت بچوں کا ہے..... پوری توجہ کے ساتھ ان کے ساتھ رہیے اور رات کا وقت بیوی کا ہوتا ہے۔ مگر ان دنوں مجھے معید کی ہر بات بری لگنے لگی اور وہ بھی مجھے منا منا کر تھک گیا۔

جہاز کے اندر منزل آنے کے اعلانات ہونے لگے۔ بتیاں اشارے دینے لگیں۔ آخر ۲۲ر گھنٹے کا طویل سفر تمام ہوا۔ ہر مسافر نے دوسرے کا خیال رکھا، شور نہیں مچایا، بلند آواز سے بات نہیں کی..... بات بات میں چلائے نہیں۔ اٹھتے بیٹھتے ایک دوسرے سے اجازت مانگتے اور شکریہ ادا کرتے رہے..... دوسرے کو جگہ دیتے اور اس طرح سوتے رہے کہ ساتھ والے مسافر کو کوفت نہ ہو۔

شمار کیا کہ خود میں نے اپنے ساتھ بیٹھے مسافر کو دس بار آئی ایم سوری، نو بار تھینک یو اور چار بار ایکس کیوزمی کہا..... اور ہر بار میرا لہجہ بہت نرم اور شائستہ تھا۔ ''کمال ہے صرف ایک رات کے سفر میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کا اس قدر خیال رکھا حالانکہ ہم ایک دوسرے کو جانتے تک نہ تھے۔ ہم نے تو ایک دوسرے کی صورت بھی غور سے نہیں دیکھی۔'' میں نے سوچا ''اکیلی میں ہی نہیں، یہ عمل جہاز کے سارے مسافروں نے کیا تھا، تبھی تو یہ سفر آسان ہوا۔''

جہاز اترا تو مسافر قطاروں میں اتر گئے۔ پھر جس قطار میں حکم ملا، کھڑے ہوگئے۔ مجال ہے کہ امیگریشن کی قطاروں سے اِدھر اُدھر ہوں۔ میں جس قطار میں کھڑی کی گئی، وہ پہلی بار امریکہ آنے والوں کی تھی۔ بڑی لمبی تھی۔ میں آخر میں کھڑی تھی، کیونکہ پہلی بار آئی تھی اور راہداریوں سے واقف نہیں تھی۔ نیچے پہنچتے پہنچتے دیر ہوگئی۔

میرے آگے کھڑا ہوا ہر مسافر پندرہ منٹ سے لے کر ایک گھنٹہ تک کھڑکی پہ لگا رہا تھا۔ ان کے انٹرویو لمبے ہوتے جارہے تھے۔ مگر ہم سب دم سادھے کھڑے تھے۔



پاکستان کی طرح کوئی کسی پر نہیں چلا رہا تھا۔ اس دنیا میں پہلے برداشت کا عمل سکھایا جاتا ہے۔ جو برداشت نہیں کرتا، اسے دھتکار دیا جاتا ہے۔ خدا خدا کر کے میری باری آئی۔ شکر ہے کہ مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ ابھی سامان برقی بیلٹوں پر نہیں آیا تھا۔ میں چوبی نشست پر بیٹھ گئی۔ پرس سے اپنا فون نکالا جو دورانِ پرواز بند کردیا تھا۔ اسے جلدی سے کھولا تاکہ سہیلی کو اطلاع دے سکوں کہ اب صرف سامان کا انتظار ہے۔

فون کھول کر دیکھا تو سہیلی مجھے ۳ر بار فون کرچکی تھی اور اس کا ایک پیغام بھی آیا ہوا تھا۔ الٰہی خیر..... میں نے جلدی سے اس کا نمبر ملایا۔ ادھر ہیلو کی آواز آئی، تو گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا ''طلعت! کیا بات ہے، کیوں فون کررہی تھیں۔''

وہ بولی ''مائدہ ایک مسئلہ ہوگیا ہے۔ تمھیں اطلاع دینا چاہتی تھی۔ یار! مجھے نکلتے ہوئے ذرا دیر ہوگئی۔ نیوجرسی سے ذرا تیز آرہی تھی، سڑک بھی صاف تھی مگر ایک مڑتے ٹرک سے گاڑی کی ٹکر ہوگئی۔''

''پھر'' میں نے چلا کر پوچھا۔

''گھبراؤ نہیں، آرام سے سنو۔ میری گاڑی کو نقصان پہنچا اور میرا ماتھا بھی زخمی ہوگیا۔ تمھیں معلوم ہے یہاں کا قانون بڑا سخت ہے۔ پہلے مجھے ہسپتال لے جایا گیا۔ مرہم پٹی کے بعد میں تھانے پہنچی۔ وہاں میرا چالان ہوا۔ میں نے اپنا قصور تسلیم کرلیا۔ جرمانہ ادا کرنا اور دوسری گاڑی کا نقصان بھی بھرنا پڑے گا۔ اس کام میں پانچ چھ گھنٹے مزید لگ جائیں گے۔''

''پانچ چھ گھنٹے! میں چیچی ''اتنی دیر میں یہاں کیا کروں گی؟''

''پہلے آرام سے سن لو۔ تمھاری پریشانی کا مجھے بخوبی اندازہ ہے۔ ہوائی اڈے کے ساتھ مسافروں کے لیے چھوٹے چھوٹے ہوٹل بنے ہوئے ہیں۔ وہاں فون کرکے میں نے تمھارے لیے کمرا محفوظ کروا دیا ہے۔ میں تمھیں ہوٹل کا نام اور فون نمبر ابھی فون کے ذریعے بجھوا دیتی ہوں۔ مائدہ، میری جان! گھبرانا نہیں اور نہ ہی پریشان ہونا۔ تم اس ہوٹل چلی جاؤ۔ تھوڑا آرام کرو۔ میں، کارروائی سے فارغ ہوکر پہلے اپنی کار ورکشاپ لے جاؤں گی، پھر دوسری کار ڈرائیور سمیت کرائے پر لوں گی اور اس میں تمھیں خود لینے آجاؤں گی۔ تم اِدھر اُدھر مت جانا، میرے آنے تک وہیں رہنا۔ پلیز پلیز.....''

''اچھا'' میں نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

اب پتا نہیں تقدیر اور کیا دکھانا چاہتی تھی۔ تھوڑی سی دیر میں برقی بیلٹ پر سامان آنے لگا۔ مسافر دوڑ کر ہتھ گاڑیاں اٹھا لائے۔ کہاں سے، مجھے معلوم ہی نہیں تھا؟ ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ یہ کام شوہر بڑی مستعدی سے کررہے تھے، بیویاں بچوں کو سنبھال رہی تھیں یا شور مچا رہی تھیں۔

مرد خود آگے بڑھ کر اپنا سامان اٹھا رہے تھے۔ برقی بیلٹ تیز چل رہی تھی اور مجھے اپنے دو سوٹ کیس نظر نہیں آئے۔ میں گھبرائی گھبرائی چاروں طرف گھوم رہی تھی۔ اچانک مجھے خالی ہتھ گاڑی نظر آگئی۔ میں اس کے پاس خوف زدہ کھڑی ہوگئی کہ نہ جانے یہ کس کی ہوگی۔ ہاتھ لگاؤں کہ نہیں؟ پاکستان ہوتا تو لے کر بھاگ جاتی۔ اتنے میں ایک غیر ملکی آیا۔ مجھے دیکھ کر بولا ''یہ ہتھ گاڑی میں لایا تھا۔''

میں نے جلدی سے معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کرلیا ''آئی ایم سوری۔''

وہ بولا نہیں، میں یہ کہنے آیا تھا، اب اس ہتھ گاڑی کی ضرورت نہیں، تم لے سکتی ہو۔''

''تھینک یو سر! تھینک یو۔'' میں نے پُرجوش طریقے سے کہا۔

ہتھ گاڑی لیے میں بیلٹ کے پاس آگئی۔ اب میرے دونوں سوٹ کیس بیلٹ پر نظر آرہے تھے۔ مگر وہ اتنی جلد گزر جاتے کہ میں ہاتھ بڑھاتی رہ جاتی۔ اردگرد مرد کھڑے تھے۔ مگر وہ بے حس بنے کھڑے رہے، اپنی عورتوں کی تو مدد کررہے تھے مگر میری مدد کرنے کوئی نہ پہنچا۔

بعد از بسیار کوشش اپنے دونوں سوٹ کیس گھسیٹنے میں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کامیاب ہوئی، مگر پسینہ پسینہ ہوگئی۔ ہتھ گاڑی میں سامان رکھ باہر نکل آئی۔ سہیلی نے ہوٹل کا نام اور نمبر مجھے بھیج دیا تھا۔ میں راستوں سے واقف نہیں تھی، کسی نے بتایا۔ میں لفٹ میں بیٹھی اور ایک غلط جگہ اتر گئی۔

اس جگہ بھی خلقت جمع تھی۔ سامنے بے شمار فضائی اداروں کے کاؤنٹر تھے۔ کسی کاؤنٹر پر قطاریں بن رہی تھیں۔ کسی پر قطاریں چپٹی ہوئی تھیں۔ حشر کا میدان لگ رہا تھا۔ میں نے وقت دیکھا، بارہ بجے جہاز اترا تھا اور اب شام کے پانچ بج رہے تھے۔ یعنی تھوڑی دیر بعد رات شروع ہوجائے گی۔ میں نے اپنی دوست کو فون کیا اب اس نے اپنا فون بند کررکھا تھا۔ پتا نہیں اس کی مشکل حل ہوئی تھی کہ نہیں۔

میں سامنے ایک چوبی نشست پر بیٹھ گئی۔ میرے عین سامنے امارات کے کاؤنٹر پر جلتی بجھتی بتیاں مسافروں کو اشارے دے رہی تھیں۔ یکا یک میرا ذہن کام کرنے لگا۔ میں امارات کے کاؤنٹر برائے معلومات پر گئی اور کہا ''میں تھوڑی دیر پہلے پاکستان سے آئی ہوں۔ یہاں اترتے ہی مجھے اطلاع ملی کہ میری ماں حملۂ قلب کا شکار ہوگئی ہے۔ اب میں واپس پاکستان جانا چاہتی ہوں، آج اور ابھی۔ اگلی پرواز میں مجھے نشست مل سکتی ہے؟''

وہ بولا ''آپ بیٹھیں، میں کمپیوٹر دیکھ کر ہی کچھ بتا سکتا ہوں۔''

امارات کے مسافروں کی لمبی قطار چھوٹی ہوتی جارہی تھی۔ آخر اس نے مجھے بلایا اور کہنے لگا ''اکانومی کلاس میں آپ کو نشست مل جائے گی۔ مگر پرواز براہ راست پاکستان نہیں، ابوظہبی تک جائے گی۔'' اس نے پھر کمپیوٹر کی مدد لی اور مجھے بتایا ''رات کے بارہ بجے آپ ابوظہبی پہنچیں گی اور صبح چار بجے آپ کو الاتحاد ایئرلائن مل جائے گی، وہ سیدھی پاکستان جاتی ہے۔''

میرے ذہن نے ایک فیصلہ کیا..... یہ کہ بیشتر اس کے کہ میں دنیا کے میلے میں گم ہوں، واپس چلی جاؤں۔ میں نے کہا ''میرے لیے امارات اور پھر الاتحاد میں

### معصومیت

ٹکٹ کلکٹر: (مسافر سے) تمھارے پاس ٹکٹ نہیں تو گاڑی میں کیوں بیٹھے؟

مسافر: جناب کو میرا بیٹھنا بُرا لگتا ہے تو کھڑا ہو جاتا ہوں۔

(ارشاد حسین لاشاری، تونسہ)

نشست محفوظ کردیں۔''

میں نے پھر بوتل خریدی اور سامنے بیٹھ گئی۔ پیاس سے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ ناشتا کے بعد سے میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ پورا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا حالانکہ سردیوں کا موسم تھا۔

اتنے میں فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے دیکھا، یہ میری سہیلی کا نمبر تھا۔ شاید وہ ہوٹل پہنچ کر مجھے تلاش کررہی تھیں۔ میں نے سوچا، اسے تبدیلیِ ذہن کی اطلاع دے دوں۔ عین اسی وقت امارات نے میرے نام کا اعلان کردیا۔ میں نے عافیت اسی میں جانی کہ سہیلی کو کچھ بتائے بغیر چلی جاؤں۔ فون بند کیا اور جہاز میں سوار ہوگئی۔ میرے ساتھ اس مرتبہ ایک عرب جوڑا بیٹھا تھا۔ یہ قطار ۳ نشستوں پر مشتمل تھی۔ مجھے دیکھ کر عرب مرد نے اپنی بیوی کو درمیان میں بٹھا دیا۔ وہی ماحول بن گیا، وہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ ہر کوئی دوسرے کا خیال کررہا تھا، سفر آسان بنا رہا تھا۔

۱۲ بجے رات میں ابوظہبی اتری۔ الاتحاد کے دفتر سے پتا چلا کہ پرواز میں پورے ۱۰ گھنٹے کی تاخیر ہے۔ ایک اور رات جاگنا ہوگا، میں پریشان ہوگئی۔ اتنے میں عملے کا ایک کارندہ آیا۔ مجھے ایک کارڈ دیا اور بولا ''دائیں جانب ایک ہوٹل ہے۔ عارضی مسافر اس میں ٹھہرتے ہیں۔ یہ کارڈ دکھا کر آپ کمرا لے لیجیے۔ آپ پانچ چھ گھنٹے آرام کرسکتی ہیں۔''

میں کمرے میں آگئی۔ مشکل مرحلوں سے گزرنے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے لیے ان لوگوں نے آسانیاں پیدا کردی تھیں۔ سب مسافر مزے سے بیٹھے تھے۔ کوئی چیخ چلا نہیں رہا تھا..... یہ کیسی دنیا ہے؟

میں واقعی بہت تھکی ہوئی تھی۔ گھڑی پر الارم لگا کے سو گئی۔ وقت پہ اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور باہر آگئی۔ ہال میں بے شمار مسافر اکٹھے ہو چکے تھے۔ سب ناشتا کر رہے تھے مگر بڑے سکون کے ساتھ۔ انھیں دیکھ کر میری بھوک جاگ اٹھی۔ میں نے ڈٹ کر ناشتا کیا اور ایک صوفے پر بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگی۔ وہاں بھی خاندان موجود تھے۔ شوہر ان کا ہر طرح سے خیال رکھ رہے تھے۔ بچوں کو پکڑ پکڑ کر لا رہے تھے۔ بیویاں اٹھلاتی پھر رہی تھیں۔ کوئی کسی کے ساتھ بدتمیزی نہیں کر رہا تھا۔ کہیں میاں بیوی میں تو تکار نہیں ہو رہی تھیں۔ کوئی مسافر بے چینی کا اظہار نہیں کر رہا تھا۔

ہمیں نہ جانے کتنے گھنٹے بیٹھنا پڑا، مگر سب سکون سے بیٹھے رہے۔ میں ایک ایک کا چہرہ دیکھتی رہتی۔ جب دن اچھی طرح طلوع ہو چکا تو الاتحاد کی پرواز آگئی جس نے پاکستان جانا تھا۔ میرے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ ۳/دن پہلے میں کشتیاں جلا کر پاکستان سے نکل آئی تھی۔ تب میں ایک دل جلی، باغی اور فراری عورت تھی۔ مجھے صرف ٹھکرانا اور بھاگ جانا آتا تھا، اپنانا نہیں۔ لیکن ایک دن کے ہوائی سفر نے میرے سوئے ادراک کو جگا دیا، میرے احساس کے طبق روشن کر دیئے، مجھے انسانیت کے سب سے خوبصورت اصول سکھا دیئے تھے۔

میں میلے کچیلے لباس میں جب لاہور ہوائی اڈے اتری تو دوپہر کے ۱۲/بج رہے تھے۔ لاہور ویسا ہی تھا، جیسا چھوڑ کر گئی تھی۔ میں نے ٹیکسی کرائے پر لی اور سیدھی اپنے گھر روانہ ہوئی۔ ٹیکسی رخصت کر کے میں بند دروازے کے باہر کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی سی گھبرائی ہوئی تھی۔ جو دروازے ہم اپنے اوپر خود بند کر لیں، وہ کبھی کبھی دوبارہ نہیں کھل پاتے۔ پھر میرے پاس چابی بھی نہیں تھی۔ آتے ہوئے معید کے منہ پر مار آئی تھی۔ اگر دروازہ مقفل ہوا تو شام تک کیسے انتظار کروں گی؟

میں نے آگے بڑھ کر گھنٹی بجا دی۔ ایک بار..... دوبار..... تین بار.....

دروازہ دھڑ سے کھل گیا، سامنے معید کھڑا تھا..... مجھے دیکھ کر پتھر ہو گیا۔ پھر اٹک اٹک کر بولا ''مائدہ! یہ تم ہو..... تم ہو واقعی.....؟''

میں کہنا چاہتی تھی ''معید! دنیا بڑی ظالم ہے۔ اس نے مجھے ۳/دن میں وہ سب سکھا دیا جو تم تین صدیوں میں نہ سکھا سکتے۔ برداشت، تحمل، ضبط، نظم..... یہ انسانیت کے بنیادی اصول ہیں۔ ایک رات کے سفر میں لوگ اپنے عارضی ہم سفر کا اس قدر خیال رکھتے ہیں، تو جو زندگی کا ہم سفر ہو، اس کی نفی کیوں کرتے ہیں؟ ایک دوسرے کی کوتاہیوں اور خامیوں کو آئی ایم سوری اور تھینک یو ویری مچ کے سنہرے کاغذوں میں کیوں نہیں لپیٹ سکتے؟''

☆☆

واحدی صاحب نے بے اختیار تالیاں بجائیں تو میں اپنے آپ میں لوٹ آئی۔ کچھ دیر توقف کے بعد کہا ''بتائیے! آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں اور؟''

''مائدہ صاحبہ! جتنی خوبصورتی سے آپ نے اپنے ہوائی سفر کی ریکارڈنگ کروا دی، مجھے تو یوں لگ رہا ہے، ان ۳/دنوں میں پل پل آپ کے ساتھ دوڑتا رہا ہوں۔ واہ واہ سبحان اللہ..... مجھے یقین ہے، آج تک ہمارے چینل نے ایسا خوبصورت اور اثر انگیز انٹرویو نشر نہیں کیا۔ بس ایک سوال رہ گیا پوچھنے والا، آپ کو ازدواجی مسائل حل کرنے کا خیال کیسے آیا؟''

''واحدی صاحب! شادی کے ۱۰/سال بعد اور دو بچوں کی پرورش کرنے کے بعد، میں نے اپنی زندگی کا ایک مقصد مقرر کر لیا..... وہ ہے گھروں کو ٹوٹنے سے بچانا۔ دلوں کو جوڑے رکھنا، رشتوں کو نبھانا اور جو نعمتیں آپ کو حاصل ہو گئیں، انھیں تقسیم کرتے رہنا۔''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رب کائنات کا چھوتا معجزہ

# یتیم کی گائے اور لومڑی

دو معصوم بچوں کی آہ جب رحمتِ خداوندی کو جوش میں لے آئی ماورائے عقل ایک سچا واقعہ

محمد اکرم رانجھا

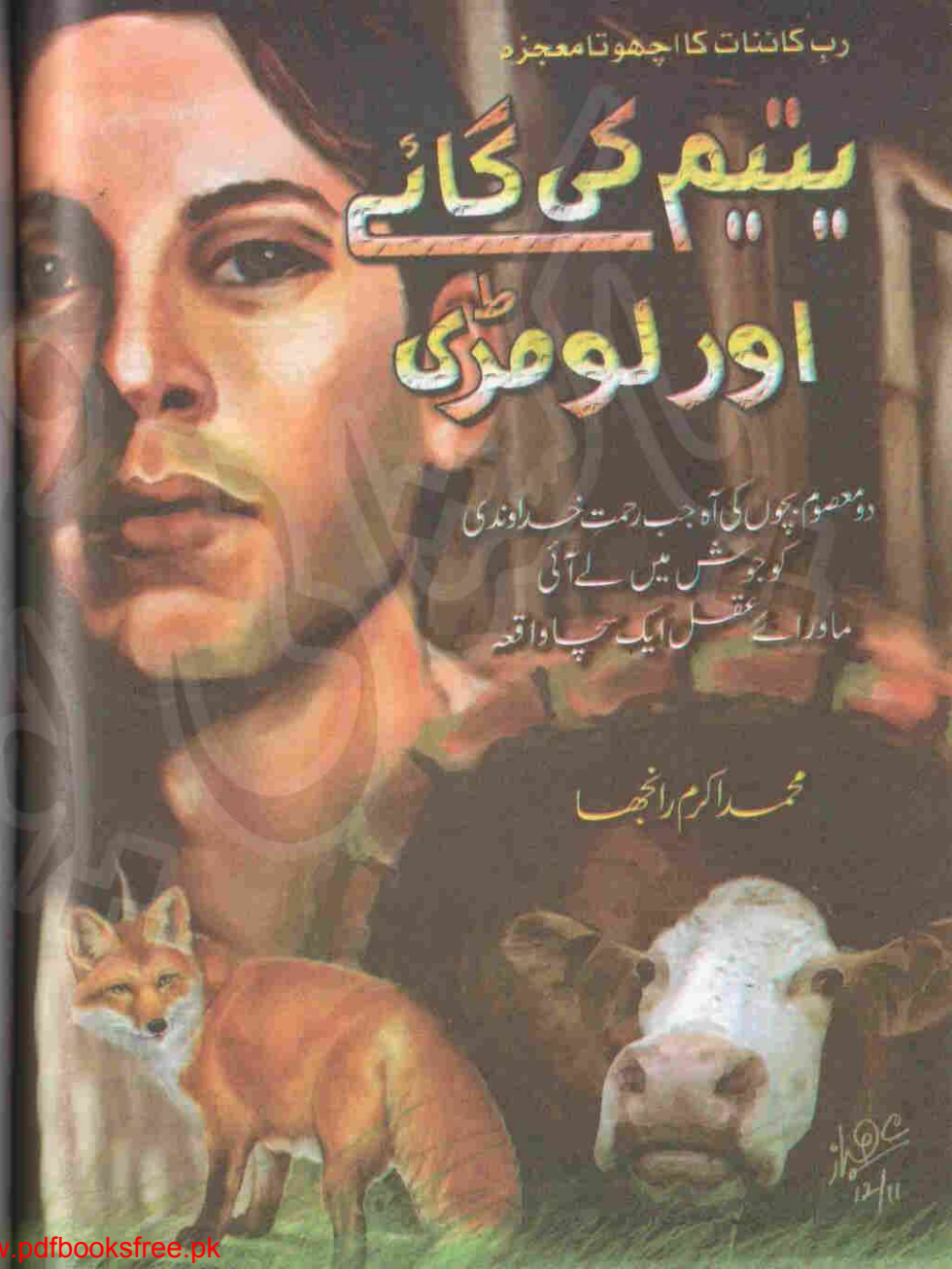

**غالباً** ۲۰۰۲ء کی خزاں میں پاکستان میں بلدیاتی الیکشن ہوئے۔ مجھے بھی تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا کے نائب ناظم کا الیکشن لڑنا پڑا جو میں میاں نصیر احمد ایڈووکیٹ کی معیت میں جیت گیا۔ ہمارے پینل کے ناظم ضلع ملک امجد علی نون بھی جیت گئے۔ اس انتخابی مہم کے سلسلے میں مجھے گاؤں (وان میانہ) میں چند روز رکنا پڑا۔ نمازِ عشا کے بعد میں نے درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا جس کا حاصل یہ ہوا کہ ایک معصوم اور یتیم بچے سے متعارف ہوا۔ بچے کا نام حامد رانجھا تھا جو نمازِ عشا کی ادائی کے بعد میرے ساتھ میرے گھر آتا اور کھانے میں شرکت کرتا۔ اس کی عمر ۸/۹ سال تھی۔ وہ چند ایام میں مجھ سے مانوس ہوگیا۔ اس بیچارے کی ماں فوت ہوئی تو وہ دو سال اور باپ جب داغِ مفارقت دے گیا تو صرف ۶/۷ سال کا تھا۔

یوں وہ ماں باپ دونوں سے محروم ہوگیا۔ اسے تین بڑے بھائیوں سے سابقہ پڑا جو برادرانِ یوسفؑ ہی تھے۔ یتیم کو باپ کی وراثت میں ایک کچی مٹی کی کوٹھڑی اور دو راس گائے اور ایک گدھی ملی۔ جب یہ یتیم بچہ مجھ سے مانوس ہوا، اس وقت تک ایک گدھی اور ایک گائے ہڑپ کی جا چکی تھی۔ میں نے ایک گائے اپنے مال مویشی میں شراکت کی شرط پر شامل کر لی کہ گائے کا مالک بچہ رہے گا اور خوراک میرے ذمہ ہوگی۔ دودھ بھی میں ہی استعمال کروں گا۔ گائے کے بچے (بچھڑی، بچھڑا) نصف نصف ہوں گے۔ نتیجہ بخیر نکلا اور گائے کے سات بچے پھل پھول رہے ہیں اور بیس ہزار روپے یتیم بچے کی جیب میں بطور نقدی بھی پہنچ چکے۔

یہ سودا میرے لیے بھی سراپا خیر ثابت ہوا۔ میں نے دورانِ مطالعہ یہ پڑھا کہ حضورؐ نے فرمایا ''مسلمان کے دل میں جہاد کرنے کی خواہش نہ ہوئی اور نہ ہی اس نے جہاد کیا تو اس کی موت منافق کی موت ہوگی۔'' یہ شدید ترین الفاظ تھے۔ ہم مسلمانوں کے لیے بچاؤ کی راہ بھی حضورؐ نے ہی دکھلا دی کہ جس نے یتیم اور بیوہ کی کفالت کی، اس نے گویا اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ لہٰذا میں نے یتیم اور بیوہ کا خادم بننے کی ٹھان لی۔ میرے اپنے اور مشترک مویشیوں کی یک صد تعداد ہے۔ شیر دار جانور کی سیر دودھ کی مقدار یتیم اور بیوہ کی نذر کی جاتی ہے۔ الحمدللہ۔

یہ یتیم بچہ حامد رانجھا میرے لیے اللہ تعالیٰ کی عنایتِ خاص بن گیا۔ میں نے اسے بچوں کی طرح پالا پوسا۔ ایف۔ٹین ون میں سرکاری اسکول واقع خورشید مارکیٹ اسلام آباد میں داخل کرایا۔ ناظرہ ختم قرآن کے لیے مولانا خلیل الرحمٰن قاری جامع مسجد عمار بن یاسر کے حوالہ کیا۔

شومئی قسمت کہ رانجھا خانوادہ کے اس بچہ نے دوسرے مہینے مجھے کورا جواب دے دیا اور کہا ''باباجی، میں آپ کے گھر اسلام آباد صرف اس شرط پر رہ سکتا ہوں کہ مجھے پڑھنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ ورنہ مجھے گاؤں بھیج دیا جائے۔ وہاں بڑے بھائیوں کے تھپڑ اور بُرا سلوک مجھے پسند ہے۔''

ہم دونوں فریقوں کی بدقسمتی کہ وہ پڑھ نہ سکا اور میں اسے پڑھانے کے اجر سے محروم رہا۔ اب حامد رانجھا ۱۹ برس کا نوجوان ہے۔ تاہم وہ اپنے دوسرے کئی چچاؤں، افرادِ خاندان کی طرح نشئی، راہزن اور رسا گیر بھی نہ بنا۔ وہ نہ تو حقے کے کش لگاتا ہے نہ ہی سگریٹ نوش ہے اور اکثر اوقات نماز بھی پڑھتا ہے۔ گزشتہ رمضان المبارک (ستمبر ۲۰۱۱ء) میں وہ میرے ساتھ اسلام آباد میں رہائش پذیر رہا۔ اس نے تمام روزے رکھے اور تمام نمازیں پڑھی۔ الحمدللہ۔

حامد رانجھا کو سنبھالنے میں میرے اکلوتے اور ہونہار بیٹے محمد سلیم رانجھا نے بھی میری بڑی مدد کی۔ اس نے حامد رانجھا کو پولیس اسکول میں داخلہ لے دیا جہاں وہ کامیاب ڈرائیور بن گیا۔ میں دوست احباب سے حامد رانجھا کا تعارف ان الفاظ میں کروایا کرتا ''یہ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے، ماں باپ کے بغیر ایسا یتیم پورے گاؤں کیا پورے علاقے میں کوئی اور نہیں۔''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں منہ تک سُودی قرضوں میں ڈوب چکا تھا لیکن اس مردِ خدا، میرے بیٹے نے مجھے ذلیل قرضوں سے توبہ کرائی اور نتیجۃً نجات دلائی۔ پھر اخوت جیسی نیک نام اور سراپا خیر این۔ جی۔او میں مجھے کام کرنے کا موقع دلایا۔ میں اخوت وان میانہ کی برانچ میں کارِخیر میں جُتا ہوا ہوں اور چالیس پینتالیس لاکھ روپے کے قرضہ حسنہ بلاسود جاری کر چکا! الحمدللہ۔ وہ اخوت کا ابتدائی ڈائریکٹر ہے۔ ایسی اولاد انسان کے لیے صدقۂ جاریہ اور اصل سرمایہ ہوتی ہے۔ وہ وزیراعظم پاکستان کے دفتر میں جوائنٹ سیکرٹری ہے۔

اب قصہ حامد رانجھا کی خوبصورت کالی سفید ڈبی گائے کا پڑھیے جو اسے ازحد عزیز ہے کیونکہ وہ باپ کی طرف سے وراثت میں ملنے والی گائے کی بیٹی ہے۔ خود ایک خوبصورت بچھڑی کی ماں ہے اور پھر نئے سرے سے گابھن ہے۔ حامد جب بھی گاؤں آئے، اسے گلے لگا کر ملتا ہے۔ حامد سرگودھا ڈیوٹی پر تھا اور ۱۹ نومبر ۲۰۱۱ء کو میں کٹیل فارم پر بعد از نمازِ عصر پہنچا تو مجھے اطلاع دی گئی کہ ایک گائے نہر لوئر جہلم کینال میں گر گئی ہے اور اسے نکالنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ میں نے دعا کی کہ گائے بچ جائے اور وہ یتیم بچے کی نہ ہو۔ نقصان ہونا ہے تو میری گائے کا ہو۔ کارکن موقع سے آیا تو اس نے خبر سنائی کہ حامد رانجھا کی محبوب گائے ہی نہر میں گری ہے جو چند دنوں کے لیے گابھن بھی تھی۔ میں نے موٹریں اور آدمی بھیج دیے اور خود دست بدعا دل گرفتہ چارپائی پر لیٹ گیا۔ درحقیقت میں بری طرح گھبرا گیا تھا۔

موٹر ڈرائیور نے بتایا کہ گائے نہر میں نہیں بلکہ نہر سے ملحقہ ٹیوب ویل کے بنجر اور غیر آباد کنوئیں میں گری ہے جو ۳۰ فٹ گہرا ہے۔ اسے ۱۹۶۰ء میں نہر کے ساتھ بنایا گیا تھا۔ اب غیر آباد کچا کنواں بن چکا ہے اور اینٹیں لوگوں نے اکھاڑ لی ہیں۔ تاہم ڈرائیور نے یہ خبر بھی دی کہ گائے ٹھیک ٹھاک تیس فٹ گہرے کنوئیں میں کھڑی صابر و شاکر جگالی کرتے اس نے خود دیکھی ہے۔ اب مسئلہ رہ گیا صرف گائے کو باہر نکالنے کا! وہ فارم سے مزید نفری اور کدالیں اکٹھی کر لے گیا۔ جبکہ میں نے مسلسل درود شریف کا ورد شروع کر دیا۔ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' مختصر ترین درود شریف ہے اور چند لمحات میں سیکڑوں بار پڑھا جا سکتا ہے اور اس کے ثمرات سمیٹے جا سکتے ہیں۔

مجھے پھر خدشات نے آن گھیرا۔ تیس فٹ گہرا اندھیرا کنواں، گابھن گائے، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ خیر ہو۔ تاہم عمر رسیدہ ڈرائیور چشم دید خوشخبری دے چکا تھا۔ میں بیم و رجا کے بین بین مسلسل درود شریف پڑھتا اور اللہ کے حضور یتیم لڑکے کی پیاری گائے بچنے کے لیے دعائیں کرتا رہا۔ سورج غروب ہو رہا تھا کہ حامد رانجھا کی سیاہ سفید ڈبی اور مالک کی پیاری گائے اپنے پاؤں چلتی آ پہنچی، صحیح سالم اور تندرست لیکن حیران و پریشان کیونکہ اندھیرے گہرے کنوئیں میں ۳۰ فٹ بلندی سے گرنا اس کی زندگی کا عجیب تجربہ تھا۔ پھر وہ اس لیے بھی حیران تھی کہ اسے کوئی چوٹ نہ آئی اور نہ ہی اس کے پیٹ میں موجود بچے کا کوئی نقصان ہوا۔

گہرے کنوئیں کے ایک کنارے میں ۲۰ آدمیوں نے کدالوں سے ایک راستہ بنا دیا۔ گائے خوشی کے کدا کڑے نکالتی کنوئیں سے باہر نکل آئی۔ میرا ڈرائیور اسلم مصلّی اور اس کے انیس ساتھی بھی حیران و پریشان تھے کہ اتنی بلندی سے گہرائی میں گرنا اور پھر صحیح و سلامت باہر نکل آنا کیسے ممکن ہے؟ اسلم اَن پڑھ ہے لیکن تجربے کار۔ اس نے تبصرہ کیا ''آج مان گئے کہ فرشتے موجود ہیں۔ انھوں نے ہی گائے کو بلندی سے سمیٹ کر گہرائی میں آرام سے رکھ دیا اور حاملہ گائے کا بچہ بھی سلامت رہا۔''

اسلم نے اپنا بیان جاری رکھا ''آج اللہ رب العالمین کا وجود بھی ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ گائے کے لیے ہم لوگوں نے گلی بنائی اور وہ کدا کڑے نکالتی بلندی پر چڑھ آئی۔ اس کے پیچھے ایک بدحواس اور حیران و پریشان لومڑی بھی چھلانگ مار کر نکل آئی۔ اس کے دو سراسیمہ بچے جھاڑیوں سے لپک کر اس کی چھاتیوں سے لپٹ کر دودھ پینے لگے۔'' ہم لوگ حیران رہ گئے کہ



کارکنانِ قضا و قدر نے گائے کا ڈراما رچا کر کس طرح لومڑی اور اس کے شیر خوار دو بچوں کا آپس میں ملاپ کرایا اور کس طرح ایک لاوارث لومڑی کو ۳۰ فٹ گہرے کنویں سے نکالنے کا سامان پیدا کیا۔

اللہ رب العالمین رحمٰن الرحیم نے اس کے شیر خوار بچوں پر رحم کیا اور حضرت ابراہیمؑ کے جملوں کو سچ کر دکھایا۔ ترجمہ: ''اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ ہی مجھے شفا دیتا ہے۔''

اَن پڑھ اسلم مصلّی کی باتوں کا مفہوم یہی کچھ تھا۔ میں نے گائے کو صحیح و سالم دیکھا تو خوشی سے کھل اٹھا اور شکر ادا کیا اور اسلم پر سیدھا سوال داغ دیا۔ ''اسلم سچ بتا، اس عجیب واقعہ کے بعد اگر تم فرشتوں، کراماً کاتبین اور منکر نکیر کے وجود کے بارے میں شک کرو اور لومڑی جیسی حقیر چیز کے مالک خالق اور رب کے وجود سے انکار کرو تو تمھارے احمق پن اور گھامڑ پن کو کیا نام دیا جائے؟ لاوارث لومڑی اور اس کے حقیر بچوں کو بھی اس نے یاد رکھا لیکن ہم اس کو بھلا دیتے ہیں۔ نماز تک نہیں پڑھتے۔''

اسلم مصلّی نے نظریں جھکا لیں اور خجالت بھری آواز میں بولا ''میاں صاحب ہم لوگ وہی کچھ کرتے ہیں جو آپ لوگوں کو کرتے دیکھیں۔ آپ بھی اپنے اسلاف کی راہ گم کر بیٹھے اور ساتھ ہی ہم لوگ بھی دیکھا دیکھی ڈوب گئے۔''

میں نے اسلم مصلّی کی بات میں سچ دیکھا۔ کیونکہ اپنے مورثِ اعلیٰ نواب محمد عبداللہ کی دنیا تیاگ دینے کی بات سن رکھی تھی۔ وہ نوابی چھوڑ کر حافظِ قرآن بنے۔ باپیادہ حج بیت اللہ کی۔ پھر مجھے حضرت رُکن عالم یاد آئے جو میرے دادا کے دادا تھے اور اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے۔ اتنے فیاض تھے کہ ہر عشا کی نماز کے بعد جھولی بھر چاندی کے روپے اشرفیاں اور پاؤنڈ اندھیرے میں ضرورت مندوں کے صحنوں میں بکھیر دیا کرتے۔ وہ ۱۶۵ برس زندہ رہے۔ ان کی اولاد ۶۰/۵۰ افراد سے زیادہ پھلی پھولی اور عقیدت و مروت کے پھول علاقہ بھر کے لوگوں نے ان پر نچھاور کیے۔ اب ہم نے اللہ رب العالمین کو بھلایا تو ہم بھی بھلا دیے گئے۔

اس واقعہ نے بہرحال کئی زاویہ سے ہمیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے یتیم بچے کی گائے کی رکھوالی مافوق الفطرت طریقہ سے کی جس پر حیرت ہوتی ہے۔ لومڑی ۳۰ فٹ گہرائی میں مر جاتی لیکن گائے اس کے بچاؤ کا سبب بن گئی۔ لومڑی کا اس اندھے کنویں میں گر جانا بھلا کس کے علم میں تھا، سوائے اس پاک ہستی کے جس نے اسے پیدا کیا اور اسے دو ننھے منے بچے عطا کیے۔ اس پاک ذات نے فرشتوں کے ذریعے یتیم کی گائے کو پوری احتیاط سے گہرے کنویں میں اتارا اور ہم لوگوں کو سرگرمی سے کنویں کی دیوار توڑ کر گائے کو نکالنے کی ہمت عطا کی۔ نتیجۃً لاوارث لومڑی کو اپنے بچھڑے بچوں سے ملا دیا۔ وہ علی کل شئ قدیر ہے اور کن فیکون کے ذریعے کائنات چلا رہا ہے۔

میں بطور سپاسِ شکریہ بھی امید لگا بیٹھا ہوں کہ حامد رانجھا کی بے لوث خدمت کا جذبہ اور اس کی گائے کے لیے میری تگ و دو میرے لیے نوشتۂ آخرت بن جائے اور اس کے مویشیوں کے گلے دن دگنی رات چوگنی پھلے پھولیں۔ حامد ہاؤس تعمیر ہو اور اس کے بچے پختہ اور خوبصورت مکان کے صحن میں کھیلیں۔ آمین ثم آمین۔

## بچے ہمارے عہد کے

باپ نے بیٹے سے امتحان کے نتیجے کے بارے میں پوچھا تو بیٹے نے جواب دیا ''ہیڈ ماسٹر صاحب کا بیٹا امتحان میں فیل ہو گیا ہے۔''

میں تمہارے نتیجے کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ باپ نے غصے سے کہا۔

''وہ ڈاکٹر صاحب کا بیٹا بھی امتحان میں کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔'' بیٹے نے معصومیت سے جواب دیا۔

بدتمیز! میں کہہ رہا ہوں کہ اپنے نتیجے کے بارے میں بتاؤ۔ باپ نے غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

''تو آپ کون سے علامہ ہیں، جو آپ کا بیٹا پاس ہو جائے گا۔'' بیٹے نے برجستہ جواب دیا۔

(مومنہ خالد، لاہور)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## ''یا اللہ خیر

آج نہ جانے کون سا چاند چڑھائیں گی۔''

دروازے سے اندر داخل ہوتی نند صاحبہ کو دیکھ کر حلیمہ بیگم کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ انجانے وسوسوں میں گھری استقبال کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''السلام علیکم! آپا۔''

اگرچہ باہر سے آپا آئی تھیں لیکن سلام بہرحال حلیمہ ہی کو کرنا پڑا۔

''وعلیکم السلام...... جلدی سے ۱۰/ہزار روپے لا کے دو، مجھے ضرورت ہے۔''

حال احوال پوچھنے کا تکلف کیے بنا اُنہوں نے حکم صادر فرمایا اور خود دھپ سے سامنے بچھی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ یہ دیکھے بنا کہ اُن کی بات نے حلیمہ بیگم کو کس مشکل سے دوچار کر دیا ہے۔

''آئے ہائے، ابھی تک منہ اُٹھائے کھڑی ہو۔ دس ہزار مانگے ہیں میں نے، ۱۰/لاکھ روپے نہیں جو تمہیں یوں سکتہ ہو گیا۔'' حلیمہ بیگم کا گومگو کی کیفیت میں کھڑا رہنا اُنہیں مزید طیش دلا گیا تھا۔

''نہیں آپا...... وہ بات دراصل یہ ہے کہ......'' باوجود کوشش کے حلیمہ بات مکمل نہ کر پائیں۔

''اے بی بی ...... اب یہ مت کہہ دینا کہ رقم نہیں۔ ارے ہمارا بھائی بے چارہ باہر بیٹھا کما کما کر بوڑھا ہو رہا ہے اور یہاں بیگم صاحبہ اللّے تللّوں میں اُڑا دیتی ہیں۔ اگر کبھی غلطی سے ہم بہنیں دو پیسے مانگ لیں تو آئیں بائیں شائیں کرنے لگتی ہیں۔''

آپا بیگم کی باتوں نے حلیمہ بیگم کی رہی سہی ہمت بھی توڑ ڈالی اور وہ خاموشی سے اندر کی طرف بڑھ گئیں۔

''آپا بیگم یہ کل ۷/ہزار روپے ہیں۔ ۵/ہزار آپ لے لیں، ۲/ہزار میں رکھ لوں......؟ سدرہ اور حنا کا بیگ اور یونیفارم لینا ہے اور اب اس ماہ جویریہ کو بھی سکول داخل کروانا ہے۔'' تھوڑی دیر بعد حلیمہ پیسے لے کر واپس آ گئیں اور اب منمناتے آپا بیگم کی منت کر رہی تھیں۔

''آئے ہائے حلیمہ! میرے بھائی نے پیسوں کے ڈھیر لگا دیے تمہارے سامنے لیکن تمہاری بھوک پھر بھی ختم نہ ہوئی۔ میں نے کیا ۵/ہزار روپوں کا اچار ڈالنا ہے جو تم یوں مجھے خیرات کی طرح پکڑا رہی ہو، رکھو انہیں بھی اپنے پاس۔ میں کہہ دوں گی احمد سے کہ تیری بیوی کو ہم سے تعلق داری نبھانا پسند نہیں تو تُو کیوں ہلکان ہوا پھر رہا ہے۔ ہم تو بس ماں جایا سمجھ کر آ جاتے ہیں کہ اپنا خون ہے، پر بی بی جب تمہیں ہم بہن بھائی کی محبت نہیں پسند تو ہم کیوں روز جوتے کھانے تیرے دروازے پر آئیں؟''

مصنوعی افسردگی طاری کرتے آپا بیگم کا کہنا حلیمہ کے اوسان خطا کر گیا۔ احمد سے بات کرنے کا مطلب وہ خوب اچھی طرح سے جانتی تھی۔

''ارے نہیں...... نہیں! آپا بیگم کیسی باتیں کر رہی ہیں...... مجھے کیوں برا لگے گا بھلا، آپ احمد کی ہی نہیں میری بھی آپا ہیں۔''

حلیمہ کے مدہم لہجے نے آپا کو مزید شہہ دی۔ ''رہنے دو بی بی' یہ سب منہ دیکھے کی باتیں ہیں۔ ارے اگر تم نے مجھے بہن سمجھا ہوا ہوتا تو یوں آدھی ادھوری رقم ہاتھ میں نہ پکڑاتیں۔ لاکھوں روپے دبا رکھے ہیں مگر ہم بہنوں کو دیتے جان جاتی ہے تمہاری۔''

آپا بیگم کسی صورت حلیمہ کو بخشنے کو تیار نہ تھیں۔

''خدا گواہ ہے آپا بیگم، میرے پاس ان ۷/ہزار روپے کے سوا ایک چونی بھی نہیں۔ آپ جانتی ہیں کہ عرب ممالک میں اب پہلے جیسی کمائی نہیں رہی۔ یہ روپے اُن ۲۰/ہزار میں سے بچے تھے جو پچھلے ماہ اُنہوں نے بھجوائے۔ آج نئے ماہ کی دس تاریخ ہونے کو آئی، ابھی تک کچھ بھی نہیں بھجوایا احمد نے اور شاید ابھی مزید کچھ دن لگیں گے۔ اِسی لیے میں نے ۲/ہزار کا کہا تھا۔ اگر آپ کو زیادہ ضرورت ہے تو آپ رکھ لیں...... میں تو صرف بچیوں کے خیال سے کہہ رہی تھی۔''

حلیمہ نے بے چارگی سے وضاحت دی لیکن شاید آپا

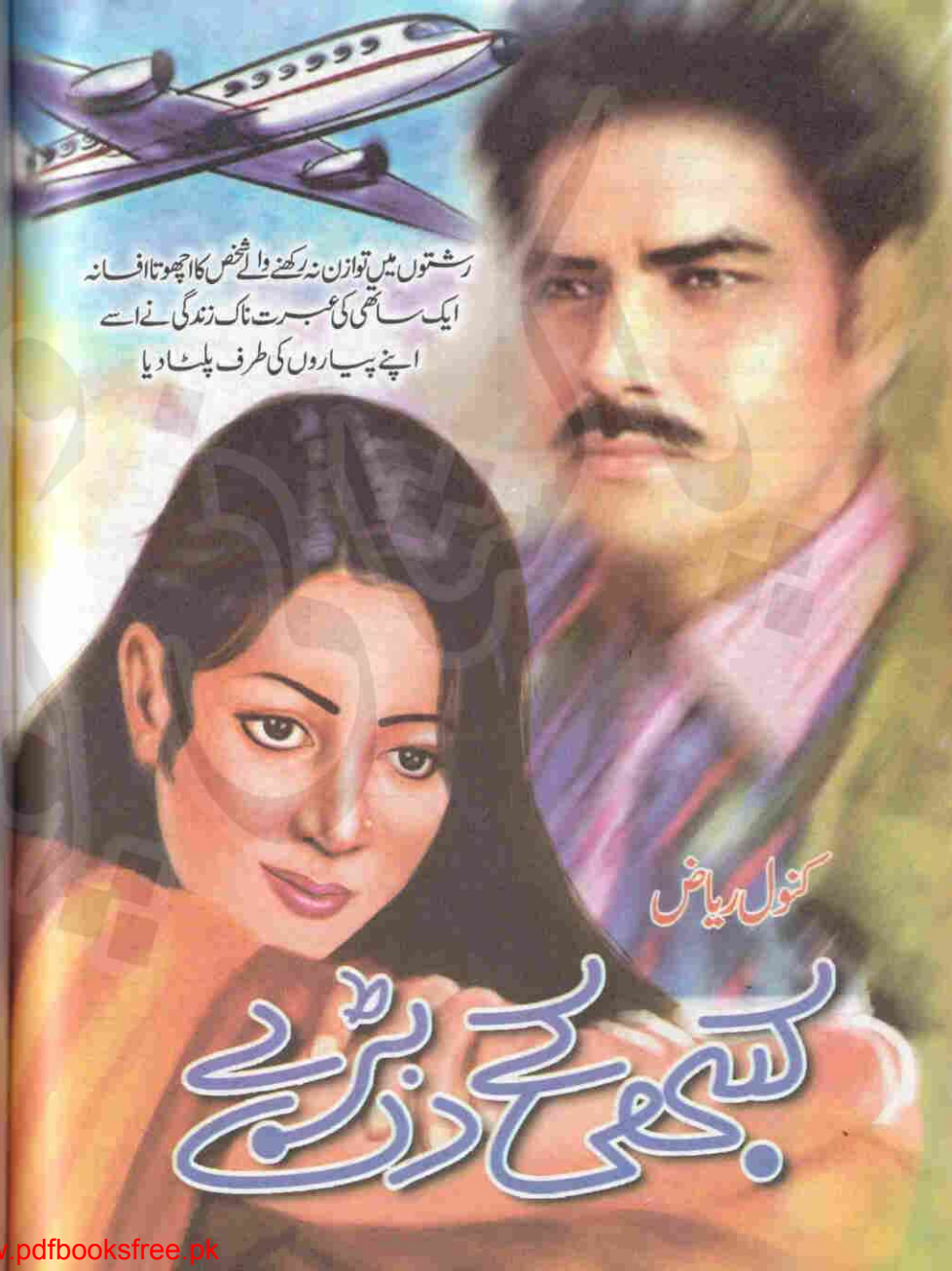



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''آئے ہائے حلیمہ! تمہیں دس بار کہا ہے کہ لڑکی ذات ہیں، اُنہیں اِتنا سر مت چڑھاؤ۔ ارے کل کو بیاہ کر دوسرے گھر سدھاریں گی تو پھر ان کی پڑھائی پہ اتنی رقم جھونکنے کی کیا ضرورت ہے؟ دس دس کر لیں تو گھر بٹھاؤ اُنہیں۔''

آپا بیگم کے ارشادات حلیمہ سننے پر مجبور تھی سو سر جھکائے سننے لگی۔ یہ الگ بات ہے کہ عمل کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

''اچھا اچھا، اب زیادہ مظلومیت منہ پہ طاری کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ لو رکھ لو گھر کے خرچ پانی کے لیے۔''

حلیمہ کے جواب نہ دینے پر اُنہیں تاؤ آ گیا لیکن پھر رقم ملنے کے خیال سے چپ ہو رہیں اور ہزار کا نوٹ حلیمہ کی طرف بڑھاتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان کے شاہانہ انداز پہ حنا کے جی میں آئی کہ ایک بار تو ٹھیک ٹھاک قسم کی سزا دے اپنی پھوپھو کو لیکن پھر ماں کی تنبیہی نظروں سے خائف منہ سیے کھڑی رہی۔ لیکن یہ خاموشی بس آپا بیگم کے گھر سے باہر نکلنے تک ہی تھی، ان کے نکلتے ہی وہ حلیمہ بیگم کے سر ہو گئی ''امی آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ پھوپھو کو سارے پیسے لا کر پکڑا دیے۔ اُنہیں الہام تھوڑی ہوا تھا کہ ہمارے پاس دو، تین ہزار روپے ہیں یا سات ہزار......؟''

حنا کی بات پر حلیمہ بیگم نے ایک پل کو اُسے دیکھا اور کہا ''جب تمہارے ابو خود ہی پیسے پیسے کا حساب اُنہیں دیتے ہیں تو پھر میرے چھپانے سے وہ بھلا کہاں ماننے والی ہیں؟ اُلٹا مزید باتیں سنا جاتیں میری فضول خرچی پہ اور اللے تللوں میں اُڑانے کے طعنے الگ۔'' ماں کی بات نے حنا کو مزید غصیلا کر دیا ''تو آپ اُنہیں کہیں کہ ہمارے روپے ہیں، ہم جیسے مرضی استعمال کریں، وہ کون ہوتی ہیں پوچھ پڑتال کرنے والی۔''

''ہاں تا کہ وہ تمہارے باپ کو ایک کی دس لگا کر بتائیں۔ وہ تو پہلے ہی بہنوں کے کہنے میں آ کر مجھے چھوڑنے کی دھمکیاں دیتے رہتے ہیں پھر تو ایک پل کی دیر نہ لگائیں۔ کہاں جاؤں گی میں اِس کے بعد تم تینوں کو لے کر......؟ اور تم بھی ان معاملات میں دخل اندازی سے پرہیز کیا کرو۔ یوں منہ ماری کی ہو میرے ساتھ اور تمہیں ہر بات میں سوائے اعتراض کے اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ اگر یہی حال رہا تو تمہاری پھوپھیوں نے ابھی سے گھر بٹھا دینا ہے کجا کہ کالج تک پہنچنے دیں تم لوگوں کو۔''

حلیمہ بیگم کے غصے نے وقتی طور پر تو حنا کو چپ کروا دیا لیکن وہ دل میں ابھی بھی اپنی پھوپھیوں سے خائف تھی، جو اُن کے منہ کا نوالہ تک چھین لینا چاہتی تھیں۔ اُس نے بچپن سے ہی ماں کو پھوپھیوں اور باپ کے سامنے گھگیاتے دیکھا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ جہاں وہ خود اُن کی باتوں پر جواب دیتی، وہیں ماں کو بھی عمل پر اُکساتی لیکن پھر حلیمہ بیگم کی ناراضی کے ڈر سے خاموش ہو جاتی۔

''پتا نہیں کب ابو کو یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ وہ یوں دوسروں کی باتوں میں آ کر اپنے خاندان کو کس طرح سے نظر انداز کر رہے ہیں۔'' تاسف سے سر ہلاتے ہوئے حنا مسلسل سوچتی جا رہی تھی۔

☆☆

''سدرہ...... سدرہ، بیٹا دیکھو باہر دروازے پہ کون ہے؟'' دھلے کپڑوں کو تہہ لگاتے حلیمہ بیگم نے سدرہ کو آواز دی۔

''امی یہ منی آرڈر آیا ہے۔''

سدرہ نے ہاتھ میں پکڑی رقم اور منی آرڈر کی رسید ماں کی طرف بڑھائی۔

''ہاں وہ تمہارے ابو کہہ رہے تھے کہ بڑی آپا کا رمیز ایف۔ اے میں اچھے نمبروں سے پاس ہونے پر موٹر سائیکل کی فرمائش کر رہا ہے، اُس کے لیے بھجوائے ہیں۔ کہہ رہے تھے ۴۰ر ہزار روپے ابھی دے دو۔ باقی اگلی بار بھجوا دوں گا''۔

دستخط کر کے پرچہ سدرہ کی طرف بڑھا دیا اور خود رقم گننے لگیں۔

''رمیز صاحب نے ایسا کون سا تیر امارا ہے؟ رو پیٹ کر سیکنڈ ڈویژن لی ہے نواب زادے نے اور میری جو بورڈ میں پانچویں پوزیشن ہے اُس کا کیا......؟''

جب تک سدرہ رسید ڈاکیے کو پکڑا کر واپس ہوئی، حنا



رمیز کی شان میں ٹھیک ٹھاک قصیدہ پڑھ چکی تھی۔

''تمہیں اللہ کا واسطہ ہے حنا، میرا دماغ مت چاٹو۔ جو کہنا ہے اپنے باپ سے کہو جا کر......'' حلیمہ بیگم نے دونوں ہاتھ باندھتے ہوئے غصے سے کہا۔

حنا اُن کے غصے سے خائف ہوئے بغیر فوراً اندر گئی اور کہا ''ان سے تو ایسا کہوں گی کہ رمیز صاحب بس خواب میں ہی بائیک چلانے کا شوق پورا کریں گے۔''

منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی وہ اندر بڑھ گئی۔ جب دس منٹ بعد اُس کی واپسی ہوئی تو ہاتھ میں پکڑا فون ماں کی طرف بڑھاتے ہوئے مسکرا کر بولی ''ابو آپ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔''

مزے سے بازو اِدھر اُدھر جھلاتے اُس نے گویا اپنی ہی بات کا لطف لیا جبکہ حلیمہ بیگم حیرت زدہ نگاہوں سے اسے دیکھتی فون کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''جی...... جی...... جی اچھا...... جی لیکن آپ نے تو کہا تھا کہ وہ پیسے رمیز کو...... جی جی...... جی ٹھیک ہے۔ چلیں جیسے آپ کہیں......''

اُنہوں نے فون بند کر کے حنا کی طرف بڑھایا اور گہری سانس بھر کر بولیں ''کیا کہا تھا تم نے اپنے ابو سے؟''

''کچھ بھی نہیں......'' حنا بٹن دباتے سرسری لہجے میں بولی۔

''تو پھر اُنہوں نے یہ کیوں کہا کہ ۱۵ر ہزار رمیز کو دے دو اور باقی حنا سے پوچھ کر اُس کو خریداری کروا دو۔''

حلیمہ بیگم نے اُلجھن بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''میں نے صرف اِتنا کہا تھا کہ رمیز کے نمبروں سے میرے نمبر اور پوزیشن تین گنا بہتر ہے، اِس حساب سے مجھے آپ تین بائیکوں کے پیسے بھجوا دیں کیونکہ یہ میری عزت کا سوال ہے۔ سارے لوگ کہتے ہیں کہ ابو تمہارے اور پیسے اور تحائف تمہارے عم زادوں کے لیے آتے ہیں۔ کیا تمہارے ابو کو تم لوگوں سے پیار نہیں......؟''

حنا کی بات پر سدرہ نے مسکرا کر گویا اُس کی تائید کی۔ وہ خاموش طبع، دھیمے مزاج کی لڑکی تھی لیکن دل تو آخر اُس کا

کرتا تھا۔

''لیکن اب میں تمہاری پھوپھو کو کیا جواب دوں گی؟'' ایک نئی پریشانی حلیمہ بیگم کے سر پر سوار ہو گئی۔

''کہنا کیا ہے، کہیے گا کہ ابو نے رمیز کے موبائل کے لیے روپے بھجوائے ہیں اور حنا کے کمپیوٹر کے لیے۔''

اپنی بات کے اختتام پر موبائل ہاتھ میں گھماتی حنا تو لاپروائی سے اندر چلی گئی لیکن حلیمہ بیگم کے لیے نئی پریشانی چھوڑ گئی۔ اُنہیں پتا تھا کہ بڑی آپا اِس بات کو آسانی سے برداشت نہیں کریں گی اور ہوا بھی یہی، جبھی فوراً احمد کو فون کھڑکا دیا۔

''احمد دیکھا، تمہاری بیوی نے کیسے تنگ دلی کا ثبوت دیا۔ ارے، جب تم نے رمیز کے موٹر سائیکل کے پیسے بھجوائے تو پھر اُس نے کیوں ۱۵ر ہزار بچے کی ہتھیلی پر رکھے۔ کیا بتاؤں کتنا دِل بُرا ہوا ہے میرے بچے کا۔ دو دِن سے ڈھنگ سے کھانا بھی نہیں کھایا اُس نے......''

آواز میں سوز بھرے آپا بیگم نے احمد کو غصہ دلانے کی ٹھیک ٹھاک کوشش کی لیکن جواب اُن کی توقع کے خلاف تھا جبھی حیرت سے منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''ارے نہیں آپا، حلیمہ کو میں نے خود کہا تھا۔ دراصل میرے پاس ابھی یہی رقم تھی اور حنا کا نتیجہ بھی آپ سب کو پتا ہے کہ کتنا شاندار آیا ہے۔ اِس نے بھی کمپیوٹر کی فرمائش کی تھی بلکہ اب تو اِس کی ضرورت بھی ہے۔ فرسٹ ائیر میں کمپیوٹر جو رکھ رہی ہے، بڑی سمجھدار بچی ہے میری۔ پاس ہونے کا تحفہ لیا بھی تو ضرورت کی چیز ورنہ رمیز کی طرح اگر موبائل وغیرہ لے لیتی یا کپڑے جوتوں پر خرچ کر دیتی تو کمپیوٹر تو پھر بھی مجھے لے کر دینا ہی تھا۔''

احمد کے لہجے میں حنا کے لیے جو محبت تھی، اُس نے آپا بیگم کو گویا کانٹوں پہ لوٹایا۔ وہ ساری عمر بھائی کے کان بھرتی رہی تھیں تا کہ وہ بیوی اور بچیوں سے بدظن رہے اور اُن بہنوں کی ہتھیلی گرم کرتا رہے لیکن اب اِس کل کی لڑکی نے باپ کو نہ جانے کیا گیدڑ سنگھی سنگھائی تھی کہ وہ ساری محبت جو



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کل تک بہنوں اور ان کے بچوں پر لوٹائی جاتی تھی، یک لخت اُس کا رُخ احمد کی اولاد کی طرف ہو گیا۔ یہ ایسا جھٹکا تھا کہ چند لمحوں کے لیے ان سے کچھ بولا ہی نہ گیا جبکہ احمد ان کی کیفیت سے بے خبر الوداعی کلمات کے بعد فون رکھ چکا تھا۔

☆☆

''حنا..... دیکھنا ذرا، دروازے پر کون ہے.....؟''

مسلسل بجتی گھنٹی پر کپڑے استری کرتی سدرہ نے حنا کو مڑ کر آواز دی۔ تھوڑی دیر بعد حنا کی غیر متوقع چیخ سن کر سدرہ اور باورچی خانے میں کھانا پکاتی حلیمہ دہل کر باہر نکلیں۔

''الٰہی خیر..... کیا ہوا حنا؟'' حلیمہ بیگم کی تشویش زدہ آواز اُبھری لیکن پھر وہ ٹھٹھک کر دروازے میں ہی رُک گئیں۔

''ابو آپ.....؟''

خوشی سے چہکتی سدرہ بھی احمد کے گلے لگ گئی۔ حنا پہلے ہی ان کے کندھے سے جھول رہی تھی۔

''ارے میرا بیٹا کیسی ہو؟..... اور جویریہ کہاں ہے.....؟''

اُنہوں نے جویریہ کے متعلق پوچھ کر حلیمہ بیگم کو ورطۂ حیرت میں ڈالا۔ پہلے اُنہوں نے کب ایسی بے صبری کا مظاہرہ کیا تھا؟ برسوں بعد آتے اور آرام کی غرض سے اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ باہر باپ سے ملنے کو بے تاب بچیوں کو وہ ہزاروں بہلاووں سے بہلانے کی کوشش کرتیں۔

''ابو وہ سو رہی ہے۔ سکول نیا نیا جانا شروع کیا ہے ناں تو تھک جاتی ہے، اس لیے آتے ہی سو جاتی ہے۔''

گرمیوں کی لمبی چھٹیوں کے بعد ایک بار پھر سے نئے سرے سے سکول کالج جانا بچوں کے لیے مشکل کام ہوتا ہے۔ جبھی احمد سدرہ کی بات پر ہنس پڑے۔

''اور جناب والدہ محترمہ کیسی ہیں آپ کی.....؟ ہمیں دیکھ کر تو گویا سانس لینا بھول گئی ہیں۔''

حلیمہ کو شرارتی نظروں سے دیکھتے احمد نے بچیوں سے سوال کیا تو حلیمہ جھینپ کر آگے بڑھی۔

''اپنے ابو کو دروازے میں ہی کھڑا کر لیا۔ اندر تو آنے دو اُنہیں، اِتنا لمبا سفر کیا ہے، تھک گئے ہوں گے۔''

## رحم دِلی

ایک صاحب محلے کی کریانے کی دُکان پر چیزوں کی قیمتوں کے سلسلے میں بحث کر رہے تھے۔ پاس کھڑے اُن کے جگری دوست نے سرگوشی کرتے ہوئے بولے:

''یار! سب دُکانوں سے آپ اُدھار لیتے ہیں اور اُدھار آپ نے آج تک چکایا نہیں تو پھر قیمتوں پر بحث کرنے کی ضرورت کیا ہے؟''

''اصل میں یہ دُکاندار بے حد شریف آدمی ہے، میں چاہتا ہوں کہ اِس کا نقصان کم سے کم ہو اِس لیے قیمتیں کم کروا رہا ہوں۔ موصوف نے مسکرا کر جواب دیا۔

(سکندر بھٹہ، ملتان)

حلیمہ کے کہنے پر تینوں باپ بیٹیاں اندر کی طرف بڑھ گئیں۔ اب خوش گپیوں کا نیا دور شروع ہو چکا تھا۔ نہ جانے یہ سلسلہ کتنی دیر تک جاری رہتا کہ حلیمہ نے سدرہ کو آواز دے کر کھانا لگانے کے لیے کہا۔

''ارے امی، آپ نے اکیلے ہی سب کچھ کر لیا، مجھ سے کہہ دیا ہوتا.....'' سدرہ نے باقی کام مکمل دیکھ کر شرمندگی سے کہا۔

''کوئی بات نہیں بیٹا، تمہارے ابو اِتنے عرصے بعد آئے ہیں، تم لوگوں سے باتیں کرنے کو دل چاہ رہا ہوگا اُن کا، اور کام کون سا زیادہ تھا، سب کچھ تیار ہے۔ بس، تم برتن لگاؤ۔''

کھانے کے بعد چائے کا دور شروع تھا جب آپا بیگم کی آمد ہوئی۔ سامنے بیٹھے احمد کو دیکھ کر حیرت کی زیادتی سے وہ گویا گنگ ہو گئیں۔

''ارے احمد..... تم..... اِتنا اچانک.....؟ بتایا ہی نہیں اپنے آنے کا۔ تمہیں لینے ہوائی اڈے آ جاتے.....'' بھائی سے گلے ملتے اُنہوں نے کہا۔

''بس آپا میں نے سوچا اِس بار سب کو حیران کر دوں۔ اِسی چکر میں نہ فون پر آنے کا بتایا اور نہ ہی ہوائی اڈے پہنچ کر اطلاع دی۔'' آپا کے بیٹھنے کے لیے جگہ بناتے احمد نے تفصیل سے جواب دیا۔

''آئے ہائے حنا، سدرہ..... تمہیں عقل نہیں ہے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھوپھو باہر سے آئی ہیں، سلام دُعا ہی کرلیں یا چائے پانی کا پوچھ لیں۔ دیکھ رہے ہو احمد، یہ تربیت کی ہے تمہاری بیوی نے بچیوں کی۔ ارے ہم تو تمہاری عزت کے خیال سے خبر گیری کرتے رہتے ہیں ورنہ تو بچیوں کی بے حسی دیکھ کر دل کڑھتا ہے۔"

حنا اور سدرہ کو باپ کے گرد گھیرا ڈالے دیکھ کر اُنہیں عجب کوفت نے آگھیرا تھا، لہٰذا کچھ اور سمجھ نہ آنے پر اسی بات پر اعتراض کرنا شروع کر دیا۔ مقصد تو صرف احمد کی بیوی کی نااہلی دِکھانا مقصود تھا۔

"نہیں نہیں آپا..... میری بچیاں ایسی نہیں ہیں، یہ تو بس میرے آنے کی خوشی میں....." احمد نے محبت سے حنا کو ساتھ لگاتے بات اَدھوری چھوڑ دی۔

"آپ آئے بھی پورے پانچ سال بعد ہیں نا۔" حنا نے لاڈ سے ابو کے کندھے پر سر رکھتے کہا۔ اِس کے انداز پر احمد گویا نہال ہو گیا جبکہ آپا بیگم کو محبت کا یہ مظاہرہ ایک آنکھ نہ بھایا۔

"آئے ہے اب یوں تو نہ چمٹو باپ کو، بے چارا تھکا ہارا آیا ہے، کچھ دیر آرام تو کرنے دو۔" اُنہوں نے غصے سے حنا کو گھورتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں آپا..... اِن کو کچھ مت کہیں۔ اِن کو دیکھ کر تو میری ساری تھکن دُور ہو گئی ہے۔"

سدرہ کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے احمد نے آپا بیگم کو ٹوکا تو ان کے ساتھ حلیمہ بھی حیران رہ گئیں۔ پانچ سال پہلے کا منظر اُن کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا جب احمد کے آنے پر قدم قدم پر آپا نے بچیوں کو ڈانٹا تھا اور حلیمہ کی بھی سرزنش کرتی رہتی تھیں۔ احمد اُن کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے تھے لیکن اب مسلسل ان کی ہر بات کی نفی کیے جا رہے تھے۔

"اچھا اب غصہ تھوک دیں اور ایک اور حیران کن بات سنیں۔ میں نے کینیڈا کے لیے ویزہ اپلائی کیا تھا، وہ منظور ہو گیا ہے۔ اگلے مہینے میں خاندان سمیت کینیڈا چلا جاؤں گا۔" احمد کی بات سن کر ہر کوئی سکتے میں آ گیا۔

"ہیں..... سچی ابو؟" حنا گویا اُچھل ہی پڑی۔

"بالکل سچ بیٹا..... میں نے کافی عرصے سے درخواست دی ہوئی تھی جو منظور ہو گئی ہے۔ سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ رہائش بھی مل رہی ہے۔ اب میرا بچہ کینیڈا جا کر پڑھائی کرے گا اور وہیں پوزیشن لے گا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

احمد نے حنا کی پوزیشن کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تو حنا نے زور و شور سے سر ہلایا اور بولی: "بالکل ٹھیک ابو..... لیکن جانے سے پہلے میں اپنی دوستوں کو پارٹی دوں گی۔" اس نے اُٹھ کر کہا۔

"ضرور لیکن صرف دوستوں کو ہی کیوں بھئی..... ہم بڑے پیمانے پر دعوت کریں گے اور سارے خاندان کو بلائیں گے، پھر پتا نہیں کب وطن آئیں، ایک بار تو سب مل بیٹھ لیں۔ کیوں آپا، ٹھیک کہہ رہا ہوں نا....."

حنا کے ساتھ پروگرام ترتیب دیتے آخر میں اُنہوں نے بڑی آپا کی رائے لینا چاہی۔ وہ بھی حالات کی تبدیلی کو بھانپ گئی تھیں، جبھی دھیمے انداز میں سر ہلا کر تائید کی۔

احمد نے ان کے انداز اور حلیمہ کی حیرت کو بغور دیکھا اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

"مجھے آپ لوگوں کی حیرت بخوبی نظر آ رہی ہے۔ آپ سب میرے بدلے رویے پر حیران ہیں لیکن اگر فاروق حسن کا حال نہ دیکھتا تو شاید میں بھی ساری زندگی یوں ہی رشتوں کو بے توازن رکھتا۔ اُس نے بھی ساری زندگی اپنے بھائی بہنوں کو ترجیح دی اور اپنی اولاد اور بیوی کو نظر انداز کیے رکھا۔ اب جبکہ ایک حادثے میں وہ اپنی ٹانگوں سے ہاتھ دھو بیٹھا تو اِس کی اولاد نے تو اِس سے نظریں پھیری ہی تھیں، اُس کے بہن بھائیوں نے بھی قطع تعلق کر لیا جن کے لیے ساری زندگی وہ مشین بن کر کام کرتا رہا اور ان کے بچوں کی فرمائشیں پوری کرنے میں لگا رہا۔ اب ایک سرکاری ہسپتال میں لاوارثوں کی طرح پڑا وہ ہر پاکستانی جاننے والے کو جو اِس کی عیادت کو آتا تھا، ایک ہی نصیحت کرتا کہ رشتوں میں توازن رکھو، ورنہ آخری عمر میں خود بے توازن ہو جاؤ گے۔ آپا میں کیسے خود کو فاروق کی جگہ دیکھنا پسند کر سکتا ہوں؟ لہٰذا ابھی سے میں نے واپسی کا سفر شروع کر دیا ہے تاکہ کل جب خدانخواستہ میں زندگی کے کسی موڑ پر تھک کر رُکوں تو مجھے



سنبھالنے، میری تھکن اُتارنے والے سہارے موجود ہوں۔

"تب میری بیٹیاں اپنی معصوم مسکراہٹ سے میری دلجوئی کریں اور میری شریک سفر جسے ساری زندگی میں نے نظر انداز کیا، شاید میری اب توجہ اور محبت پا کر پچھلی زندگی کی اذیت بھول جائے۔ اُس وقت میری تھکن کو اپنے نرم ہاتھوں سے سمیٹ لے، میرے دُکھ پر روئے اور میری خوشی میں خوش ہو۔ اگرچہ مجھے یہ بات بہت دیر سے سمجھ آئی لیکن اب بھی زیادہ وقت نہیں گزرا۔ میں اپنے آج کے عمل سے اپنا کل سنوار سکتا ہوں۔ اپنے بے توازن رشتوں کو توازن بخش کر میں آپ سب کے ساتھ ساتھ اپنے کل کو بھی بچانے کی ایک چھوٹی سی کوشش ضرور کروں گا۔"

یہ کہہ کر دِل میں پختہ عہد باندھے احمد آنے والے کل کی سرشاری میں کھو سا گیا۔

☆☆

"اے حلیمہ..... اگر کوئی کام ہے تو مجھے بھی بتاؤ۔ کہاں اکیلی ہلکان ہوتی پھر رہی ہو.....؟"

دعوت والے دن آپا بیگم کے ساتھ چھوٹی آپا بھی حلیمہ کے پیچھے پیچھے پھر رہی تھیں۔ احمد کے رویے نے انہیں خوب اچھی طرح سے باور کروا دیا تھا کہ اب حلیمہ سے بنا کر رکھنے ہی میں اُن بہنوں کی بہتری ہے۔ جبھی کل تک انہیں پاؤں کی جوتی برابر نہ سمجھنے والی نندیں اب چھوٹی سے چھوٹی بات میں اُن کی رائے لے رہی تھیں اور آگے پیچھے پھر رہی تھیں۔

"نہیں آپا سب کام مکمل ہیں، آپ تکلف نہ کریں۔ آئیں اِدھر ہی بیٹھ جائیں۔"

صوفے پر جگہ بناتے حلیمہ نے اُنہیں پاس بیٹھنے کو کہا۔ قریب ہی دو تین اور رشتے دار خواتین جمع تھیں۔ تھوڑی دیر میں کھانا لگنے کی اطلاع پر ساری خواتین اُٹھ کر باہر چلی گئیں۔

"سنو حلیمہ، باہر جا کر ہم بہنوں کو بھول مت جانا۔ ارے ہماری تو جان اٹکی ہے بچیوں میں! احمد سے کہا بھی تھا کہ سدرہ کا نکاح میرے رمیز سے اور حنا کا چھوٹی کے فرخ سے کر دے۔ کل کو لڑکوں کو بھی باہر بلوا لینا، اپنے لڑکے ہیں، ماموں کا احترام کریں گے۔ باہر کے لڑکوں کا کیا بھروسا.....؟ لیکن اُس نے کوئی خاص بات ہی نہیں کی۔ اب بھی اُسے یاد دہانی کرواتی رہنا۔ اگلی بار جب آؤ تو بچیوں کے نکاح کر جانا، پھر کیس جمع کروانے میں بھی وقت لگے گا۔"

بڑی آپا اب حلیمہ سے اپنے بیٹوں کا مستقبل محفوظ کروانا چاہ رہی تھیں۔ احمد نے تو رشتوں کی بات پر کچھ سال بعد کا کہا تھا اور وہ بھی بچیوں کی مرضی پر منحصر تھا لیکن دونوں بہنیں حلیمہ کے ذریعے سے ہی سہی اقرار سننے کی خواہاں تھیں تاکہ کل کو ان کے بچے بھی کینیڈا جا کر ڈالر کمانے لگیں۔

"آپا آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں۔ احمد نے انکار تو نہیں کیا، بس مناسب وقت کا کہا ہے، جب بچے شادی کے قابل ہوں گے تو پھر ہی رسم وغیرہ کریں گے۔ ابھی تو سارے بچے پڑھ رہے ہیں، اِس طرح ان کی پڑھائی بھی متاثر ہو گی۔"

حلیمہ کی بات پر دونوں بہنوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔ اُن کے چہروں سے اندرونی کیفیت کا اندازہ لگاتے حلیمہ دھیرے سے مسکرا دی۔

"واہ مولا.....! تیری شان ہے۔ ایک وقت تھا کہ یہ بہنیں مجھے کسی گنتی میں نہ رکھتی تھیں اور اب احمد کی سوچ کیا بدلی، ہر کوئی بدل گیا۔ سچ کہتے ہیں، صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ میں نے اور میری بچیوں نے طویل عرصہ اُن لوگوں کی زیادتیوں کو سہتے گزارا اور اب تُو نے انعام کے طور پر ہمارا احمد ہمیں لوٹا دیا تو پھر میں اکڑ دِکھا کر ناشکری کیوں کروں؟ جب مشکل دن ختم ہو گئے تو ان کو دہرا کر خود کو اذیت میں کیوں گرفتار رکھوں؟ مجھے اُن لوگوں سے اچھا سلوک کرنا ہے تاکہ احمد مکمل طور پر ہمارے ہو جائیں اور ان کا بھی دِل نہ دُکھے۔ آخر کو یہی تو احمد کی بہنیں ہی نا۔ ان کے بغیر احمد بھی ادھورے ہوں گے۔ اب اِتنے لمبے عرصے بعد مجھے بنا ہوا احمد نہیں بالکل مکمل چاہیے۔ اِسی لیے ان کے ساتھ محبت کا برتاؤ خود میرے حق میں بہتر ہے۔"

دل میں آئی بدگمانیوں کو دُور ہٹاتے حلیمہ نے محبت سے سوچا اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے، جہاں شوہر اور بچیاں اُن کی منتظر تھیں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

**وہ** فرشتہ نہیں تھیں کہ فرشتہ تو بنی بنائی مخلوق ہے۔ کسی تیار شدہ مال کی طرح۔

بنانے والے نے تخیل کے پردے پر ایک اَن چھوا نقش ابھارا، اُسے خواہش کے سانچے میں ڈھال کر آرزو کے رنگ بھر دیے۔

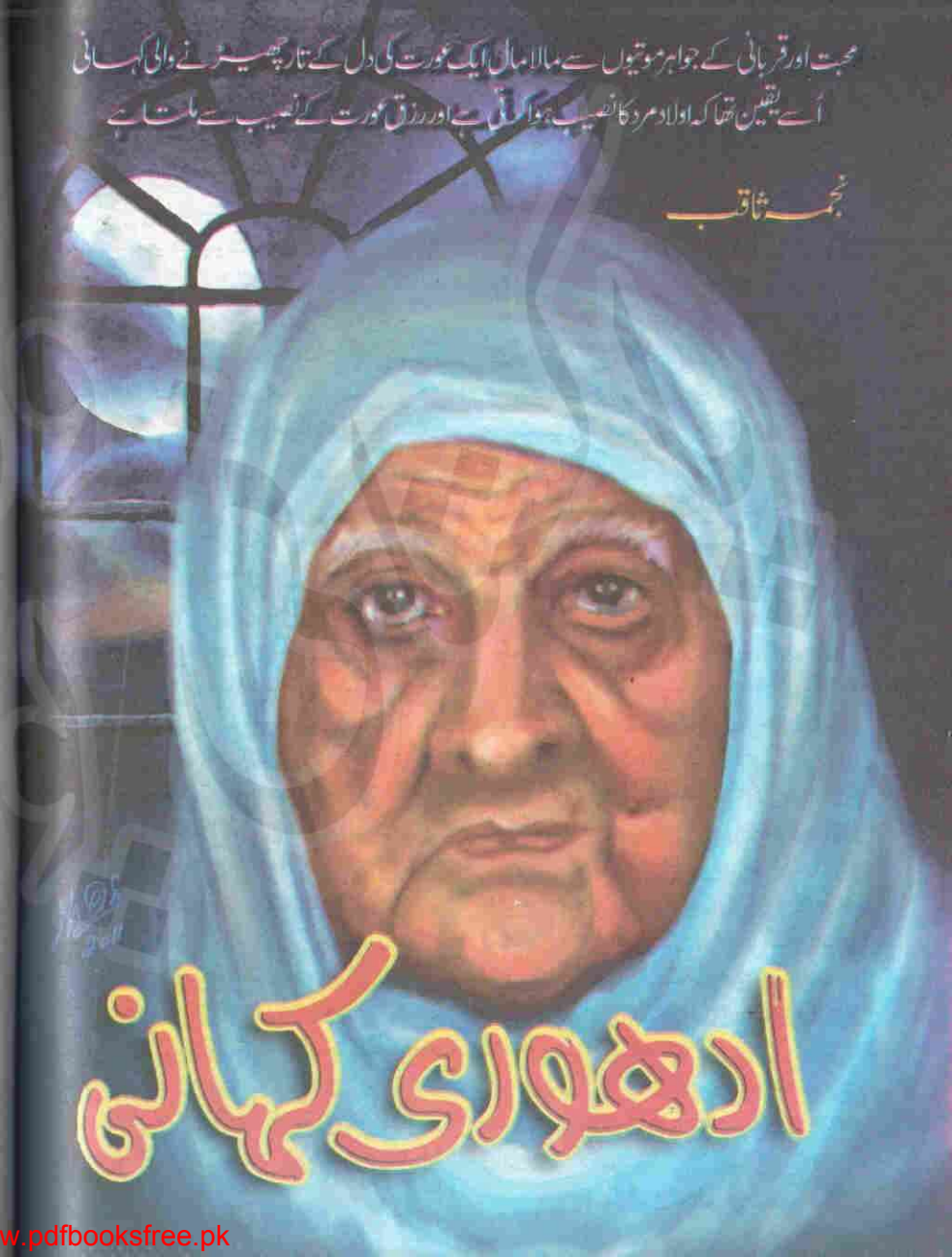

تیار شدہ مال چاہنے والے کے لیے کتنا ہی انمول کیوں نہ ہو، جب تک اس میں تخلیقی عمل کا خون پسینہ شامل نہ ہو، مزہ نہیں آتا۔ کبھی آپ نے ماں اور بچے کے تعلق پہ غور کیا ہے؟

اگرچہ ماں اسے تخلیق نہیں کرتی مگر محض تخلیقی عمل سے گزرنے پہ جو فخر و انبساط اس کے رواں رواں سے پھوٹتا ہے وہی اسے دیگر ہم جنسوں میں ممتاز بنا کر اس کے قدموں تلے جنت تعمیر کرتا ہے۔

فرشتوں کو اللہ نے اس نعمت سے محروم رکھا ہے۔ ''کن فیکون'' کے اس گورکھ دھندے میں عمل کی کسوٹی پہ آزمانے کے لیے خالق کو انسان جیسی مخلوق چاہیے تھی۔

اور وہ اس لوبھی دنیا کی ایک ادنیٰ اکائی تھیں۔

ساری زندگی کسی مزدور کی سی گزاری۔ حالات کی تپتی ردا اوڑھ کے زندگی کی سنگلاخ شاہراہ پر نکلیں تو پاؤں ننگے تھے۔ منزل تلک پہنچنے تک دل فگار اور بدن شکستہ ہو چکا تھا مگر جھولی اخلاص، محبت اور قربانی جیسے جواہر موتیوں سے مالا مال۔

حقیقت میں وہ دنیا کی امیر ترین عورت تھیں۔

چھوٹوں، بڑوں میں یکساں مقبول!!

شکیل کو وہ محبت اور چاہت کا ایسا مرکز معلوم ہوتیں جس کے گرد گرویدہ دلوں کا جمگھٹا سا لگا رہتا ہو۔

یہ ساٹھ یا ستر کی دہائی کی بات ہے۔ ملک میں عورتوں کی غالب اکثریت دفتروں کے بجائے اپنے گھروں میں نوکریاں کرتی تھی جہاں معدودے چند کے سوا باقی کو ہٹلر قسم کی ساسوں سے واسطہ رہتا تھا جو اندرونی اور بیرونی ہر دو میدانوں میں اپنے تئیں خود کو اہل تر پاتی تھیں۔ بڑی روشن اور نکھری صبح تھی جب ساس اماں نے جمال پور روانگی کا اعلان کیا۔

دونوں بہوؤں کے لیے یہ غیر متوقع خبر نہ تھی۔ مہینے آدھ کے بعد اپنے میکے کا چکر لگانا ان کا معمول تھا۔ البتہ جب سے چھوٹی بہو کو بیاہ کر لائی تھیں، یہ وقفہ لمبا ہونے لگا تھا۔ وجہ بہو سے محبتانہ لگاؤ نہیں بلکہ بہت حد تک اس کے پیچھے نگرانی کا مقصد کارفرما تھا۔

شروع دنوں سے اس کا اٹھلاپن انھیں کھٹک رہا تھا۔

بڑی جتنی اجلی، متین اور سبھاؤ والی تھی، چھوٹی اتنی ہی اتاؤلی اور بڑبولی تھی۔

ادھر میکے سے عجیب و غریب خبروں کا تانتا بندھا آ رہا تھا۔ خاندان میں قتل ہوا۔ مقتول چچا کا بیٹا تھا اور قاتل سگے ماموں کی اولاد۔

جانا ضروری ٹھہرا تو بڑی بہو صالحہ خاتون کو لمبا چوڑا ہدایت نامہ تھما کر نکل پڑیں۔

بنیادی طور پر وہ کوئی ظالم ساس نہ تھیں نہ اُن کا روّیہ کسی انتہائی قسم کی سنگدلی یا زیادتی پر مبنی تھا۔ مگر عرصہ تلک ہندو سماج کے بیچ رہتے بستے وہ بہوؤں پہ حکمرانی کو اپنا حق سمجھ کر استعمال کرتی تھیں۔

حالانکہ وہ اپنے وقت کی بڑی وضعدار خاتون تھیں۔

اس زمانے کی وضع داریاں بھی عجیب تھیں۔ سنا کرتے ہیں کہ ان کے والد بزرگوار جن کا شمار علاقے کے چھوٹے موٹے چوہدریوں میں ہوتا تھا، اگلے چار پانچ دیہہ تک میں وہ واحد شخص تھے جنھیں گلستانِ سعدی حکایات و اشعار سمیت ازبر تھی۔

گرمیوں میں شام ڈھلے جب تھکے ہارے کسانوں کو حقے کی نَے یہ علمی خزانے لوٹنے کا موقع ملتا تو رات گئے تک الاؤ روشن رہتے۔ سعدی سے رومی اور رومی سے سعدی تک فکری گھمن گھیریوں میں رات بھیگنے لگتی اور جب نذر محمد جمائیاں روکتے روکتے بے حال ہو جاتا اور جب پگڈنڈیوں پر آوارہ کتے ایک دوسرے کے مقابلے میں بھونک کر چپ ہو جاتے، چوہدری صاحب کو محفل سمیٹنے کا خیال آتا۔ وہ نذر محمد کو اٹھنے کا اشارہ کرتے۔ کسی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فرمابردار مؤکل کی طرح وہ باپ کے پیچھے پیچھے چلنے کا عادی ہوگیا تھا۔ اس کی فرمانبرداری کا اعتراف وہ خود کیا کرتے۔

قابلیت کا یہ عالم تھا کہ وکالت کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کرنے پہ انگلستان کا وظیفہ آرام سے لگ گیا تھا اور فرمانبرداری کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ والد صاحب نے بڑی سہولت سے وظیفے کے کاغذات یہ کہہ کر چولھے میں رکھ دیئے:

''کافروں کے ملک میں کرسٹانوں کے سے اطوار اختیار کر کے میرے سر میں دھول ڈالو گے۔'' تو منہ سے بھاپ تک نہ نکالی۔ حالانکہ یہ معنوی راکھ حقیقی صورت میں ان کے اپنے سر میں ڈالی جا چکی تھی۔

یہ بھی بڑا دلچسپ قصہ ہے۔

نذر محمد جب بھرپور نوجوان تھے۔ ایک روز ننگے سر خانۂ خدا میں داخل ہونے کا اتفاق ہوا۔ صافہ غالباً گھر بھول آئے تھے۔ گلی سے بچے کو لینے دوڑایا اور خود اندر صفوں پہ بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔

بچہ تو واپس نہ آیا، البتہ چوہدری صاحب نماز سے کچھ دیر پہلے مسجد پہنچے تو بیٹے کو ننگے سر دیکھ کر بدکے مگر بولے کچھ نہیں۔ نماز مکمل ہوئی تو اسی بچے کو جو صافہ لے کر آیا تھا، ساتھ کے گھر سے تسلہ بھر راکھ لانے کو کہا اور پھر سب نمازیوں کے سامنے تسلہ بیٹے کے عین سر پر الٹ دیا کہ ننگے سر یہاں بیٹھنے سے بہتر تھا کہ تم سر پہ خاک ڈال لیتے۔

بیٹے پہ کیا گزری اور لوگ کس کس طرح ہنسے ہوں گے۔ یہ ایک الگ قصہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ سب پڑھ کر آپ بھی ہنس دیئے ہوں۔

لیکن بہرحال اس زمانے کی وضع داریاں ایسی ہی ہوتی تھیں اور ''ساس اماں'' ان کی وہ اولاد تھیں جنھوں نے روایات اور پرانی قدروں کو میکے سے ملا بڑھیا جہیز کی طرح سینے سے لگا کر رکھا تھا جس کی دیکھ ریکھ اور تام جھام سے وہ کبھی غافل نہ رہیں۔

تو بات ہو رہی تھی اس روز کی۔

صبح سویرے جب وہ گھر سے نکل گئیں اور گھر گرہستی کی ذمہ داری مکمل طور پر بڑی بہو کے کندھے پر آگئی تو چھوٹی بہو کا دل کچھ نیا کرنے کو ''پھڑکنے'' لگا۔ بڑی بہو صالحہ خاتون کی مرنجان مرنج شخصیت سے اسے کوئی آڑ لینے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔ ویسے بھی ان دنوں اسے سب ''نیا نیا'' سوجتا تھا۔ کئی روز سے دیسی گھی میں تربتر پراٹھا کھانے کو جی چاہ رہا تھا۔ لیکن ساس سے حجاب مانع تھا۔ سب کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھتیں اور وہی کھا کر اٹھتیں جو سب کھاتے۔

دو جے جی نے کچھ کھٹا کھانا چاہا تو میاں رات کے اندھیرے میں چھپا کر لے آئے۔ مگر چھپ چھپا کر کھانے میں وہ مزا کہاں۔ اب ساس اماں گھر سے نکلیں اور یہ نعمت خانے میں آموجود ہوئیں۔ خوب جم کر پراٹھا بنایا۔ ابھی توے سے اتار رہی تھیں کہ حمیدہ بیگم (ساس اماں) جتنی جلدی میں گئی تھیں، اتنی تیزی سے گھر میں داخل ہوئیں۔ وہ کتنا راستہ طے کر کے واپس لوٹی تھیں اور گھر میں کیا رکھ کر بھول گئی تھیں، جو انھیں واپس لے آیا۔

چھوٹی کو اس بات پہ غور کرنے کا موقع نہ ملا۔ ساس کی آواز سن کر یوں بدحواس ہوئی کہ چمٹا ہاتھ سے چھوٹ کر پاؤں پہ آن رہا۔ وہ سی کر کے رہ گئی۔ دیسی گھی کی خوشبو سارے گھر میں سرسرا رہی تھی۔ حمیدہ بیگم تیر کی طرح نعمت خانے پہنچیں۔

''بڑے نام اور چھوٹے درشن۔'' انھوں نے بہو کے اونچی ناک والے میکے پہ طنز کا تیر دے مارا۔

جواباً بولنے کا زمانہ نہ تھا۔ لہٰذا بہو منہ ہی منہ میں کچھ بدبدا کر رہ گئی۔ بڑی بہو جسے سلطنت کی عارضی راجدھانی سونپ کر گئی تھیں، دروازے پہ کھڑی حیرانیاں سمیٹ رہی تھی۔

ساس نے مڑ کر کڑی نظروں سے انھیں دیکھا۔ وہ ندامت کے پانی میں مصری کی ڈلی کی طرح گھلنے لگیں۔ اس وقت ان کی حیثیت ایسے معزول گورنر کی سی تھی جسے حاکم نے غداری کا الزام لگا کر ملک بدری کا حکم سنا دیا ہو۔

اس دن سے ساس اماں نے یہ طے کرلیا کہ چھوٹی اتاولی ہونے کے ساتھ ساتھ ندیدی اور تھڑدلی بھی ہے اور



بڑی اپنی ہزار اچھائیوں کے باوجود ان کا راج پاٹ سنبھالنے کے لائق نہیں۔ تب سے انھوں نے اپنے اور بہو کے بیچ ایک بے نام اجنبیت کی ایسی دیوار کھڑی کرلی جس کی نیو بے معنی ضد اور انجانی نفرتوں سے اٹھائی گئی تھی۔

لطف کی بات یہ کہ دونوں کے درمیان جس تیزی سے فاصلے بڑھے، اس سے کئی گنا تیزی سے صالحہ خاتون کی مقبولیت کا سطح لوگوں میں اونچی ہونے لگی۔

صبح منہ اندھیرے مہترانی دروازے پہ آواز لگاتی۔

''گھر بچوں کی خیر، اس کے صدقے کل عالم کی خیر۔'' جتنی دیر میں وہ کوڑا کرکٹ سمیٹتی، ساس اماں رات کا بچا سالن روٹیوں میں رکھ کے باندھ دیتیں جسے مہترانی کی جھولی میں ڈالتے ہوئے صالحہ خاتون کے نچلے ہاتھ سے کوئی نہ کوئی موہی پھل، کبھی تازہ پراٹھے خود بخود پوٹلی کے ساتھ سرک جاتے۔ سردیوں کے شروع میں رحمتے میراثن چلی آتی۔ ساس اماں دھڑا دھڑ رضائیوں کے ٹانکے ادھیڑ دیتیں۔ روئی نئے سرے سے دھنوائی جاتی۔ لحاف، رضائیاں تگندنے کا کام آنگن کی کھلی دھوپ میں کئی دنوں تک جاری رہتا۔

مٹھی بھر پیسوں اور گندم، چاول کی گٹھڑی سر پر رکھے، میراثن جاتے ہوئے صالحہ بیگم کے کمرے کے دروازے پہ ضرور حاضری دیتی۔ سیما کی قمیص پار سال پھٹ گئی تھی، سی سی کر کام چلاتی رہی۔ اس سال ''اوپرا'' جاڑا آیا ہے، دلائیوں میں دانت بجتے ہیں بی بی اور وہ مصنوعی طور پر دانت بجانے لگتی۔

صالحہ بیگم ''بہشتی زیور'' میں گھریلو طبی ٹوٹکے والے باب کا صفحہ موڑ کر سرھانے رکھتیں اور صندوق میں سے نئی نکور کوٹی اور شال نکالتیں۔ کبھی کھونٹی سے گرم سوٹ کھینچ کر اتارتیں اور بے نیازی سے کتاب اٹھا کر دوبارہ بیٹھ جاتیں۔

میراثن جھٹ پٹ سویٹر، شال بغل میں داب، سوٹ الٹا سیدھا لپیٹ قمیص کے نیچے لاچے کی ڈب میں اُڑس کر یوں کمرے سے نکلتی جیسے برسات کے سخت حبس میں سانپ اپنے بل سے تڑپ کر نکلتا ہے۔ حکیم بیگم سے تعلقات کی نوعیت سب سے جدا تھی۔ دیوار سے دیوار ملی تھی اور چھتوں سے چھت۔ جب وہ نئی نئی بیاہ کر آئیں تو انھوں نے علی الاعلان انھیں اپنی تیسری بیٹی کا درجہ دیا تھا۔

کسی زمانے میں ان کا صالحہ خاتون کی والدہ سے خوب گاڑھا بہناپا رہا تھا جس کی وقعت والدہ صالحہ کی وفات کے بعد کم ہوتے ہوتے نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ اب نئے سرے سے اس کی تجدید کا موقعہ آیا۔ تو ''صالحہ خاتون'' نے اسے نبھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ روزانہ بلاناغہ وہ خالہ کی خیریت دریافت کرنے ہمسایہ میں ضرور جاتیں۔

یہ ایک ایسا معمول تھا جس کی راہ میں آندھی، طوفان، بارش، دھوپ کی گرمی حتیٰ کہ ساس کا کڑا رویہ بھی رکاوٹ نہ بن سکا۔

خالہ کی آئے روز کی بیماریاں، ان کی بہو کی جملہ زچگیاں، بیٹیوں کے رشتوں کے موقع پر مہمانوں کی آمد سے لے کر جہیز کی تیاری اور شادی کے ہنگاموں تک کے سارے مرحلے انھی کی نگرانی اور ذاتی دلچسپی سے طے پاتے رہے۔

تعلقات میں پہلے سے بھی بڑھ کر گرمجوشی تب آئی جب خالہ کا اکلوتا چشم و چراغ ایک حادثے میں زمین کا رزق بن گیا۔ اب ''صالحہ خاتون'' نے چپکے سے ایک اور ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ مہینے میں ایک آدھ مرتبہ ''میاں جی'' گھر کا چکر لگاتے تو چند روپلی فرض کی طرح ہاتھوں میں ضرور تھما جاتے۔ ''صالحہ خاتون'' ممنون ہوتی نظروں کی پروا کیے بغیر وہ نقدی خالہ کی مٹھی میں دبا دیتیں۔ اپنے حصے کے پھل، میوے، کبھی برتن بھر اناج، کبھی گرمی سردی کے ملبوسات دیوار سے اس طرف منتقل ہوتے رہے۔

شدید جاڑے کے دن تھے۔ دھند کے بادل قطرہ قطرہ ٹپک کر در و دیوار پر منجمد ہوئے جاتے تھے۔ کائنات پہ نیم تاریکی کی ملگجی سی چادر تنی ہوئی تھی۔ جب خالہ کے پوتے نے صالحہ بیگم کو میاں جی کی آمد کا سندیسہ سنایا۔ وہ اس وقت موسم کی شدت کی پروا کیے بغیر خالہ کے برآمدے میں بیٹھی مشین پر گھر رگھر رخالہ کے بڑے پوتے کی شلوار



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سی رہی تھیں جسے ماسٹر صاحب نے یہ کہہ کر سکول سے نکال دیا تھا کہ کل بھی بغیر وردی سکول آئے تو بیٹھنے نہیں دوں گا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ نہ تو گھر میں کوئی سفید کپڑا میسر تھا اور نہ ہی جیب میں اتنی نقدی کہ کم از کم کوئی سستا سا سفید کپڑا شلوار کے لیے خرید لیا جائے۔ اس کا بڑا آسان سا حل ''صالحہ خاتون'' نے یہ نکالا کہ اپنا ''شٹل کاک'' سفید برقعہ جو عرصے سے متروک الاستعمال پڑا تھا، کتر بیونت کر سینے بیٹھ گئیں۔ میاں کی آمد کی اطلاع پا کر ہڑبڑا کر اٹھیں۔ آج پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ وہ اُن کی آمد پر گھر سے باہر تھیں۔ چند قدم کا فاصلہ طے کر کے گھر پہنچیں تو میاں اماں کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ ان کے سلام کے جواب میں منہ پھلا لیا۔

''کیسے ہیں؟''

''اچھا ہوں۔'' منہ بدستور پھولا ہوا تھا۔

''کھانا کھائیے گا؟'' انھوں نے پوچھا۔

''کھا چکا ہوں۔'' یہ کہہ کے منہ پھیر اماں کے گھٹنے سے لگ گئے۔

''ہیں.....؟ تو گویا بہت دیر سے آئے بیٹھے ہیں۔'' مجھے بلوا لیا ہوتا۔''

''بی بی! ساس اماں چہک کر بولیں ''تمھیں گھر، میاں کی اتنی فکر ہے تو گھر پر ٹک کے رہو۔ یہ تیرے میرے دروازے پر نہ جھانکتی پھرو۔''

''چھوڑو اماں! اسے اپنی من مانی کرنیاں کرنے دو۔ اب ہم بھی وہی کریں گے جس پہ ہمارا دل چاہے گا۔''

اور اماں نے بھی رخ پھیر لیا۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے باہر نکل آئیں۔ چھوٹی اپنے منے کو اٹھائے سامنے سے چلی آ رہی تھی۔

''آج اندر کیا کھچڑی پک رہی ہے؟ کچھ سن گن ملی؟'' اس نے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''معلوم نہیں اور مجھے کوئی تجسّس بھی نہیں۔'' وہ نعمت خانے کی طرف بڑھنے لگیں۔

''اتنی بے خبر نہ رہا کریں آپا، کہیں کوئی نقصان نہ اٹھا لیجیے گا۔''

اور اس سے بڑا نقصان کیا ہوتا کہ اگلی مرتبہ کے پھیرے میں ''میاں جی'' آئے تو ''مرمردوں کا تھیلا'' سی صغریٰ خاتون ان کے ہمراہ تھیں۔ اماں صدقے واری ہونے لگیں۔

مرد کو گھر کا سکون نہ ملے۔ تو اسے ایسا قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ حکیم بیگم جو اطلاع ملنے پہ بھاگی بھاگی آئی تھیں، یہ سن کر حیرت کی زیادتی سے گنگ ہو گئیں۔ صالحہ خاتون جوں کمرے میں گھسیں لوٹ کر باہر نہیں نکلیں۔ سوچ سوچ کر دماغ ماؤف ہوا جا رہا تھا، قصور کہاں نکلتا ہے؟ غلطی کہاں سے شروع ہوئی۔ کوئی سرا ہاتھ نہ آتا تھا۔ صدمے کی ایسی کیفیت تھی کہ ذہن کام کرنا چھوڑ گیا تھا۔ اماں کی زیادتیوں، دل آزار رویوں پہ انھوں نے مدت پہلے مٹی ڈال دی تھی، وہ ان سے کسی بھی قسم کے گلے کی خوگر نہ تھیں، دل تو میاں کے رویے پہ ٹوٹا تھا۔

جملہ خدمت گزاریوں، وفا شعاریوں کو یک لخت بھول کر اتنا بڑا قدم اٹھا لینا آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ گزری سات آٹھ سال پہ محیط رفاقت بھری زندگی پہ بار بار نظر ڈالتی تھیں اور آنسو پونچھتی جاتی تھیں۔ کہیں پہ کوئی قابل گرفت بات ہاتھ نہ لگتی تھی سوائے اس کے کہ وہ انھیں وارث کے نام پہ کوئی اولاد دینے کی متحمل نہ ہو پائی تھیں، جس کے متعلق وہ ہمیشہ بڑے وثوق سے کہا کرتے۔

''اولاد مرد کا نصیب ہوا کرتی ہے۔ عورت کے نصیب سے رزق ملتا ہے اور وہ الحمدللہ بہت ہے۔''

پھر اب کیا ان کی رائے بدل گئی تھی یا اماں کا کوئی پرانا داؤ چل گیا تھا۔

اماں حقیقت میں بڑی خوش خوش پھرا کرتیں۔ آئے گئے کے سامنے بڑے چاؤ سے نئی دلہن کی رونمائی ہوتی۔ اس کے ظاہری (جس میں بے تحاشا گوری رنگت کے سوا اور کچھ قابل ذکر نہ تھا) اور باطنی محاسن پہ سیر حاصل روشنی ڈالے جانے کے بعد نتیجہ یہ قرار پاتا کہ ''میاں صاحب'' بے



حد خوش قسمت واقع ہوئے ہیں جو اس نعمت غیر مترقبہ کو پا کر دنیا میں جنت کے مزے لوٹ رہے ہیں اور چڑھتے سورج کی پجاری دنیا تائید میں سر ہلاتی تو دیر تک ہلتا ہی رہتا۔

اٹھانے کو تو ''میاں جی'' نے بھی اتنا بڑا قدم اٹھا تو لیا تھا مگر اب بیگم کا سامنا کرنے کا یارا نہ تھا۔ منہ اندھیرے گھر سے نکلتے اور اپنے ڈھیروں نادیدہ کاموں سے فارغ ہو کر شام ڈھلے لوٹتے۔

ہر آنے والے دن کے ساتھ صالحہ بیگم سمجھوتا کرتی گئیں۔ جسے پیا چاہے وہی سہاگن۔ انھوں نے سارے آنسو ایک ہی مرتبہ اپنی اوڑھنی میں بہا کر پونچھ ڈالے اور جس روز ''میاں جی'' نئی بیگم کو ہمراہ لے کر واپس نوکری پہ سدھارے، تب سے کسی نے صالحہ خاتون کو پھر روتے نہیں دیکھا۔ کسی مفتوحہ فوج کی طرح انھوں نے ساس اماں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور روزمرّہ کے کاموں میں یوں جت گئیں گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

''میاں جی'' پھر لوٹ کر نہیں آئے۔ شاید احساس جرم کا کوئی آدھا ادھورا کانٹا ان کے ضمیر میں اٹکا رہ گیا تھا جس کی پھانس انھیں کبھی کبھار چبھتی تھی۔

انھوں نے شہر میں اپنا ذاتی گھر خرید لیا اور وہیں کے ہو رہے۔ نئی بیگم البتہ چھ مہینے سال کے بعد بچوں کے ہمراہ چکر لگاتیں۔ ''صالحہ خاتون'' کھلے بازوؤں ان کا سواگت کرتیں، پتیلے بھر بھر پکاتیں، بچے سیر ہو ہو کھاتے اور دلوں میں پرانی امی کی محبتیں برسات کی خودرو گھاس کی طرح اگنے لگتیں۔ بڑا لڑکا شکیل جو ہو بہو باپ کی تصویر تھا، دادی کی گود سے زبردستی اتر کر ان کی طرف لپکتا، جدھر جدھر وہ جاتیں، چادر کا کونا ہاتھ میں لیے پیچھے پیچھے چلتا رہتا۔

''سودائی ہو گیا ہے تو؟'' دادی اسے کھینچ کھینچ کر گود میں بھرنے کی کوشش کرتیں۔ وہ دیوار پر چڑھتے کیکڑے کی طرح نیچے پھسلتا۔ پھر دادی پوتے میں دیر تک بے نتیجہ جدوجہد ہوتی رہتی۔

نئی امی آلکسی سے پلنگ پر پڑی نظارہ کیے جاتی۔

''بہت تھک جاتی ہوں۔ گھر بھر کا ڈنڈوت اٹھائے رکھنا آسان نہیں۔ کیا ہے جو آپا ہمارے ساتھ چلی جائیں۔'' وہ دبی زبان میں ساس کے کان میں پھونکتی۔

اماں ہڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھتیں ''ایسا ممکن نہیں صغریٰ۔ یہاں بھی تو گھر بار ہے۔''

''تو آپ کی چھوٹی بہو کس مرض کی دوا ہے۔'' نئی دلہن چمک کر کہتیں۔

''اس کا مرض لاعلاج ہے۔ آئندہ ایسی خواہش نہ کرنا۔'' انہی دنوں بڑے میاں بیمار پڑ گئے اور مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

چھوٹی پھر امید سے تھی۔ اس نے میاں سمیت گھر گرہستی علٰحدہ کر لی۔

اماں نے اعتراض کیا تو بیٹے نے گویا تختے پہ آخری کیل ٹھونک دی۔

''آخر بھائی جان بھی تو کبھی کے علٰحدہ رہ رہے ہیں۔''

اماں میں اب وہ پہلا سا دم خم باقی نہ رہا تھا۔ بیمار شوہر سمیت دونوں صالحہ خاتون کے رحم و کرم پہ آن رہے جنھوں نے انھیں یوں اپنے دامن میں سمیٹ لیا جیسے روتے بچے کے لوٹ آنے پہ ماں اسے گود میں بھر لیتی ہے۔

## ذمے داریاں

نوجوان نے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ایک جگہ ملازمت کے لیے درخواست دی تو اِسے بہت سے اُمیدواروں کے ساتھ باقاعدہ تحریری اِمتحان میں بیٹھنا پڑا۔ اُس کے سامنے جو پیپر آیا، اُس میں ایک سوال یہ بھی تھا ''زمین سے سورج کا فاصلہ کتنا ہے؟''

نوجوان اُمیدوار نے جواب دیا ''مجھے صحیح طور پر معلوم تو نہیں کہ زمین سے سورج کا فاصلہ کتنا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ فاصلہ اِتنا ہرگز نہیں ہے کہ یہاں جو ذمے داریاں میرے سپرد کی جائیں گی، اُن کے سلسلے میں سورج کوئی رُکاوٹ ڈال سکے۔

(طارق محمود چوہدری، لاہور)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وقت کب رکا ہے۔ امتدادِ زمانہ نے اگر صالحہ خاتون کے بالوں میں چاندی بھر دی تو ساس سسر بھی بوسیدہ سے بوسیدہ تر ہوتے چلے گئے۔ دونوں کا دل پسند مشغلہ دھوپ میں لیٹ کے بلغم تھوکنا اور بچھڑی اولاد کی یاد میں جی بھر کے آہیں بھرنا تھا۔

سسر دمے کا مستقل مریض، چارپائی پہ پڑا استخوانی ڈھانچہ معلوم ہوتا تھا۔ ساس اٹھ کر بیٹھ جاتیں مگر سہارے کے بغیر چلنے پھرنے سے معذور تھیں۔ پرانا طنطنہ کب کا رخصت ہو چکا تھا۔ اس کی جگہ احساسِ ندامت نے لے لی تھی جو صالحہ بیگم کو پھرکی کی طرح اپنے اردگرد گھومتے، اپنا گھر موت سمیٹتے دیکھ کر روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ ''صالحہ خاتون'' اس طرح بے نیاز رہتیں جیسے سب کچھ ایسا ہی ہونا مطلوب تھا۔

دونوں بڈھے اُن کا وہ نیوکلیس تھے جس کے اردگرد ان کی گردش دن رات کا حساب رکھے بغیر جاری و ساری رہتی تھی۔ جس روز بڑے میاں کی اوپر کی سانس نے نیچے جانے سے انکار کر دیا وہ پھپھک پھپھک کر روئیں۔

فاتحہ پہ منہ موڑے رنگ برنگے موضوعات چھیڑتی عورتوں نے اندر باہر جاتی صالحہ خاتون کو بارہا گفتگو کا موضوع بنایا۔ ''کیسی خدمت کی دیوی ہے۔ اس عالم میں تو اپنی اولاد بھی منہ موڑ لیتی ہے۔ کسی دل موہ لینے والی مٹی سے خمیر اٹھا ہے۔ سب قسمت کے کھیل ہیں بی بی۔ روپ کی روئے کرم کی کھائے''۔ حکیم بیگم نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

اُدھر گول کمرے میں دادا کے پوتے پوتیوں کا موضوعِ سخن بھی یہی ٹھہرا۔ صبا، چھوٹی بہو کی چلبلی صاحبزادی یونیورسٹی میں نئی نئی داخل ہوئی تھی۔ انسان کی شعوری، لاشعوری اور تحت الشعوری کیفیات پہ بحث کرتے ہوئے وہ اس نتیجے پہ پہنچی تھی کہ ''صالحہ خاتون کی جس پارسائی، صبر اور ایثار کا ڈھنڈورا ہر زبان پیٹ رہی ہے، یہ محض ان کی خود ساختہ شعوری کوششوں کو نتیجہ ہے وگرنہ کوئی انسانی فطرت بذاتِ خود اس قدر ٹھہراؤ کی حامل نہیں ہو سکتی۔''

''یہ ان کی مجبوری بھی تو ہو سکتی ہے۔'' پھوپھی زاد حمیرا نے کہا۔

''بہرحال ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور چارہ ہی کب تھا؟''

''جی نہیں یہ سراسر مردانہ تعصب کا شاخسانہ ہے۔ جس دور میں والد صاحب نے الگ گھر بسایا تھا۔ پتی ورتا عورتیں وہی کچھ کیا کرتی تھیں جو بڑی امی نے کیا۔'' یہ چھوٹی امی کی نائلہ تھی۔

خیر سب نے اس کی بات ہوا میں اڑا دی۔ ''تم دادی، پھوپھیوں کی ملی بھگت کو صرف ابا کے کھاتے میں تو مت ڈالو۔''

لو جی نئی بحث کا دروازہ کھل گیا۔

''تم سب اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہو۔'' شکیل بولا۔ میاں جی کی یہ پہلوٹھی کی اولاد صالحہ خاتون سے اتنی ہی قربت محسوس کرتی تھی جتنی اپنی حقیقی ماں سے۔ ''میں تو یہ جانتا ہوں کہ وہ محبت کا ایسا سرچشمہ ہیں جس کی پیداواری صلاحیت ہمیشہ بڑھوتری کے عمل سے گزرتی رہتی ہے۔''

صغریٰ بیگم جو کب سے اماں کو قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں اب اُن کے سر ہو گئیں۔

''ابا کے جانے کے بعد آپ دونوں تنہا ہو گئے ہیں، چل کر ہمارے ساتھ رہیے۔''

''دو تنہا تو نہیں ہوتے۔'' اماں جو تذبذب میں تھیں صالحہ خاتون کا جواب سن کر یکسو ہو گئیں۔

''مجھے یہیں پڑا رہنے دو۔ خیر سے اس گھر سے تمہارے ابا کا جنازہ اٹھا۔ یہیں سے میں سدھاروں گی۔''

اور ٹھیک دو ماہ آٹھ دن بعد وہ سدھا گئیں۔

بیٹے، پوتے ایک مرتبہ پھر اکٹھے ہوئے۔ مہمانوں سے گھر بھر گیا۔ گلی میں تین دن تک دیگیں پکتی رہیں اور ابھی چولھوں کی راکھ اچھی طرح ٹھنڈی بھی نہ ہونے پائی تھی کہ گھر ایک بار پھر خالی ہو گیا۔

''آپا! اب کے میں تمہیں اکیلے نہیں چھوڑوں گی۔'' صغریٰ بیگم جانے کی تیاری کرتے ہوئے بولیں۔



''جی امی! میں آپ کو لے کر ہی جاؤں گا۔'' شکیل نے محبت سے کہا۔

''میں یہاں بہت خوش اور مطمئن ہوں۔'' انھوں نے مسکرا کر بدقت کہا۔

''ہم آپ کو وہاں زیادہ خوش رکھیں گے۔'' شکیل کی بہن عمارہ نے اٹھلا کر کہا۔

''خیر آپا! ہم تمھیں یہاں چھوڑ کے دنیا کا منہ کھلوانے سے تو رہے۔'' صغریٰ بیگم نے قطعی لہجے میں کہا۔ علی الصباح روانگی ہے۔ ضروری چیزیں رکھ لیجیے''۔

اور ضروری چیزیں کیا تھیں، الماری کے نچلے دراز میں چند پرانے سال خوردہ تحفے جو میاں جی کے مہربان دنوں کی یادگار تھے۔ صالحہ خاتون نے کسی متاعِ کی طرح سنبھال کے رکھے ہوئے تھے۔ اسے کھولنے کی کبھی نوبت نہ آئی تھی۔ مگر صالحہ خاتون کی تسلی کے لیے اتنا کافی تھا کہ وہ وہاں موجود ہیں۔

انھیں وہ دن روزِ حشر جتنا لمبا لگا۔ جلے پاؤں کی بلی کی طرح اندر باہر چکراتی پھریں۔ کبھی الماری سے کپڑے نکال کر بیگ میں تہہ لگاتیں، کبھی نکال کر واپس الماری میں رکھ دیتیں۔ الماری کا نچلا خانہ سالوں بعد زور لگا کر کھولا پھر بند کر دیا۔ شام ڈھلے صحن سے برآمدے، برآمدے سے کمرے اور کمرے سے پھر صحن کے اَن گنت چکر لگائے۔ گویا سارے منظر حافظے میں محفوظ کر رہی ہوں۔ دماغ میں پچھلی زندگی کسی ریل کی طرح چل رہی تھی۔ کوئی منظر دوسرے منظر کی جگہ لینے کو تیار نہیں تھا۔ رات گئے جب دماغ خیالات کی یورش سے محشر کدہ بن گیا اور صغریٰ بیگم شکیل کو صبح سویرے اٹھ کر رکشا لانے کی تاکید کرتے ہوئے خواب گاہ میں گھس گئیں تو صالحہ بیگم اندرونی جذبات کے ابال سے گھبرا کر بستر پہ آن رہیں۔ آنسو کا سیلاب تھا کہ تھمنے میں نہ آتا تھا۔ دل الٹا پلٹا سا گویا حلق میں آن پڑا تھا۔ سامنے آدھ کھلی کھڑکی سے سرما کا ٹھٹھرا ٹھٹھرا چاند دکھائی دے رہا تھا۔

تیز ہوا کا جھونکا آیا اور کھڑکی کا پٹ پورا کھل گیا۔

انھوں نے جھرجھری لے کر کمبل ٹانگوں پہ ڈال دیا۔ جس آنگن میں پچھلے کئی سالوں سے دکھ اور سکھ سے شناسائی پائی تھی، اسے چھوڑنے کا تصور سوہانِ روح لگ رہا تھا۔

انھیں لگا جیسے میاں جی نے آج ہی نیا بیاہ کیا ہو۔ کتابِ ہستی کا پرانا باب وہ کب سے پھاڑ کر پھینک چکی تھیں۔ اس پر درج شدہ کسی پرانے سوال، کسی استفسار کا سامنا کرنے کا یارا نہ تھا۔

شدتِ کرب سے آنکھیں موندے وہ خدا سے حساب کرنے لگیں۔ شکر اور شکوے آگے پیچھے اُبلتے رہے۔ درد بڑھتا گیا۔ بالآخر کسی بڑے نرم احساس نے لہولہو دل پہ ہاتھ رکھ دیا۔

غالباً رات کا آخری پہر تھا۔ جب انھوں نے قے کی اور بے سدھ ہو کر پیچھے کو گر گئیں۔ میکہ، سسرال، ساس، میاں جی اور پھر صغریٰ بیگم محتاجی کے عجیب سے احساس کے ساتھ شکلیں بدل بدل کر آنکھ کی پتلیوں پہ تھرکنے لگے اور آخری تارے کے ڈوبنے سے پہلے ساکت ہو گئے۔

صبح منہ اندھیرے صغریٰ بیگم پلنگ کی پٹی پہ ششدر کھڑی تھیں۔ صالحہ بیگم کا اکڑوں وجود پلنگ کے بیچوں بیچ ٹکا ہوا تھا اور بستر پر چند پرانی چوڑیاں، بوسیدہ لمبی لنگن والا پرس، ۶۵ء کے زمانے کی کشمیری کڑھائی والی پشمینے کی چادر کسی ادھوری کہانی کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔

## ذرا ٹھہریئے.....!

شوہر نے بیوی سے کہا ''ابھی تک کھانا تیار نہیں ہوا..... ٹھیک ہے، میں ہوٹل میں جا کر کھا لیتا ہوں۔''

بیوی نے التجا کی ''ذرا پانچ منٹ ٹھہر جایئے۔''

شوہر نے پُرامید لہجے میں پوچھا ''کیا پانچ منٹ میں کھانا تیار ہو جائے گا؟''

''نہیں.....! اتنی دیر میں، میں تیار ہو جاؤں گی۔'' بیوی نے جواب دیا۔

(سعدیہ زاہد، کینیڈا)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہندی ادب سے انتخاب

# اُنگلی میں پھنسی انگوٹھی

اپنے ہی خیالوں میں جینے والی
ایک لڑکی کی کہانی
اسے اپنی خالہ سے بہت نفرت تھی کہ وہ
زندگی کو کسی اور طرح سے جیتی تھی

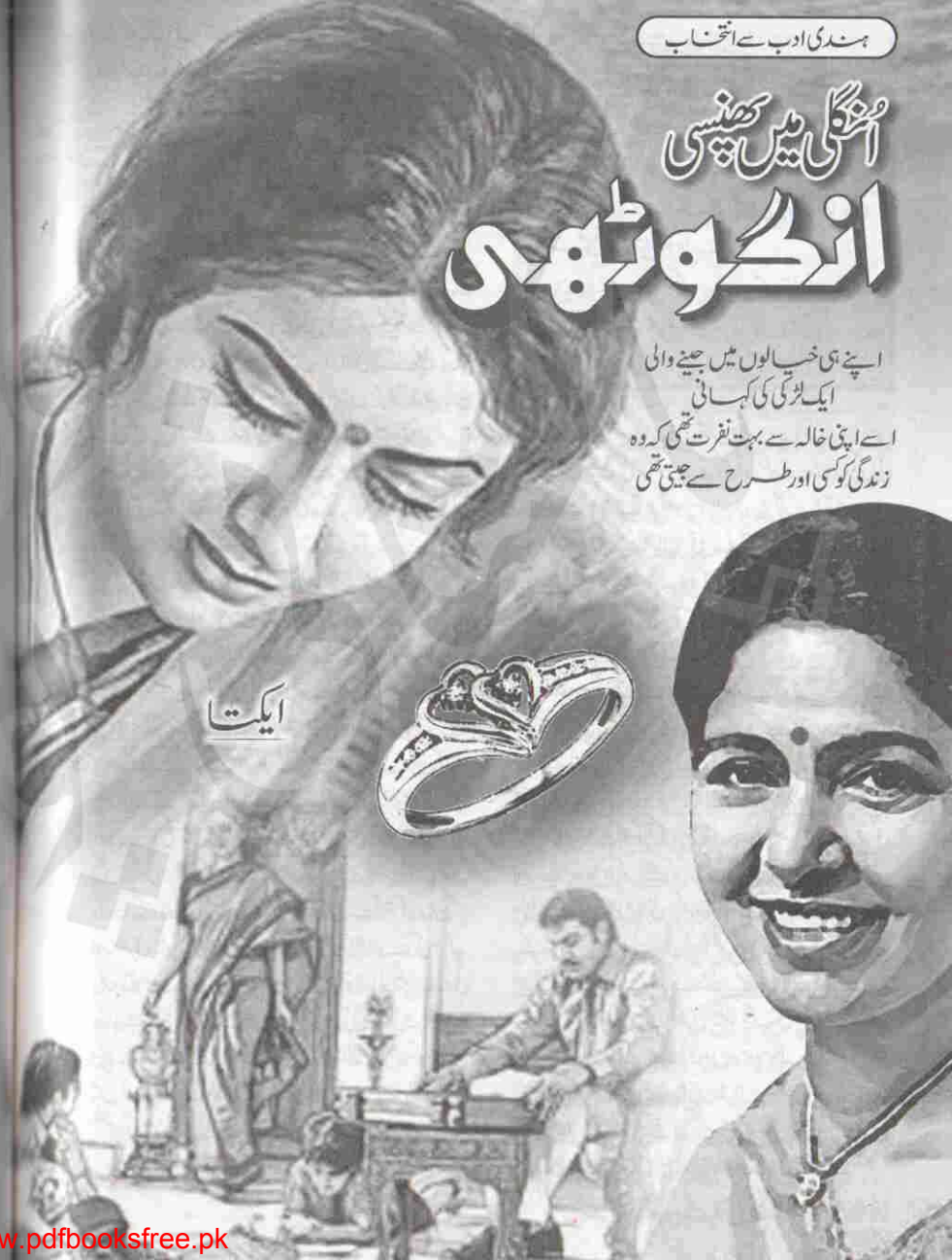

ایکتا

## سکول

سے آتے ہی گوری نے بستہ میز پر پھینکا اور گھوم کر امی کو دیکھا..... ان کے ہاتھوں میں نیلے رنگ کا خط کانپ رہا تھا۔

خط کی سطروں پر گھومتی امی کی آنکھیں بھل بھل بہہ رہی تھیں اور ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ امی کو پریشان دیکھ کر گوری ایک ثانیے کو تو پریشان سی ہوگئی۔ سکول سے گھر آتے ہی سارے دن کی کارگزاری کا احوال امی کو بتانے کی تمنا ایک دم ختم ہوگئی۔ اس نے امی کی پشت پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''کس کا خط ہے امی؟''

''کاویری باجی کا!''

''کیا لکھا ہے؟''

''تمہیں سمجھ نہیں آئے گی گوری؟''

امی نے گہرا سانس لیا اور دونوں ہتھیلیوں سے آنسو پونچھے جس سے دونوں رخسار لال ہوکر تمتمانے لگے۔

خط رکھ کر وہ گوری کے لیے کھانا لینے باورچی خانے میں چلی گئیں۔

اپنے کمرے میں آکر گوری نے لباس تبدیل کرتے ہوئے جب سنگھار میز میں لگے شفاف آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو خود ہی شرما گئی اور شرم سے آنکھیں جھک گئیں۔

''ہونہہ..... میں نہیں سمجھوں گی، امی کا خیال ہے کہ میں ابھی دودھ پیتی بچی ہوں۔''

''گوری! کھانا کھا لو..... ٹھنڈا ہوجائے گا۔'' امی نے بلایا۔ وہ خاموشی سے کھانے کی میز پر بیٹھ گئی۔

''کیوں گوری! آج سکول میں کچھ بھی نہیں ہوا؟'' امی نے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''جو بھی ہوا ہو..... آپ نہیں سمجھ سکیں گی۔'' گوری نے منہ پھلا کر جواب دیا۔

امی کا چہرہ ہلکی سی مسکراہٹ سے کھل گیا تو گوری نے پھر اٹھلاتے ہوئے پوچھا۔

''بتائیں نا امی! کاویری نے کیا لکھا ہے؟''

''گوری! باجی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔''

''جھوٹ! تو اس میں سمجھ نہ آنے والی کون سی بات تھی؟''

''بات تھی..... بات تھی.....''

''بات تھی تو رکھیے اپنے پاس۔'' گوری کا منہ پھول گیا۔ گوری وہاں سے اٹھنے لگی تو پتا نہیں کیا سوچ کر امی نے خط اس کے ہاتھ میں سے دیا۔ خط پڑھے..... یا نہ پڑھے، اس الجھن کے باوجود گوری خط پڑھنے کی خواہش دبا نہ سکی۔ خط کھول کر اس نے کھانے کی میز پر پھیلا دیا۔

کاویری خالہ نے لکھا تھا۔

''آج آنند کی موت کو تین سال گزر گئے ہیں اور میں ان تین سالوں میں ایک دن کے لیے بھی اس سچائی کو تسلیم نہیں کرسکی کہ آیندہ زندگی مجھے آنند کے بغیر تنہا ہی گزارنا ہوگی۔ سچ پوچھو تو اب میں زندہ ہی نہیں رہنا چاہتی اور پھر میرے زندہ رہنے کا مقصد بھی کیا ہے..... کون سا کام ہے جو میرے نہ ہونے سے رک جائے گا؟ میں اب یہ عذاب زیادہ دیر برداشت نہیں کرسکتی۔''

خط امی کی طرف بڑھاتے ہوئے گوری نے انہیں دیکھا۔ وہ ناجانے کن سوچوں میں گم تھیں اور ان کی آنکھوں میں بے یقینی کی سی کیفیت اور جھنجھلاہٹ تھی اور اس میں کاویری خالہ کا مہجور ٹھنڈا سفید چہرہ ڈھلنے لگا تھا۔

''گوری کاویری خالہ کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ جب بھی خالہ کا خط آتا امی کئی دن بے چین رہتی ہیں۔''

گوری کو پتا تھا کہ اگر وہ چاہے بھی تو اس وقت امی سے کچھ نہیں کہہ پائے گی۔ آنند خالو کی موت ان کے بیچ آ کھڑی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ان تین سالوں کے بعد بھی آنند خالو کی لاش گھر کے کسی کونے کھدرے میں پڑی ہے۔ گوری جانتی تھی کہ تمام باتوں کی وجہ کاویری خالہ ہیں مگر وہ اتنی سخت بات کسی سے نہیں کہہ سکے گی۔

گوری کو سکول کا کام کرنے کا کہہ کر امی سویٹر بننے لگیں۔ سلائیوں میں اون کے پھندوں کے ساتھ ساتھ اپنی سوچوں کو خاموشی سے بنتے رہنا امی کی پرانی عادت



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ پورے گھر کے لیے بہت سارے سویٹروں میں امی نے پتا نہیں کتنے دکھ سکھ بُن دیئے تھے۔

شام ہوتے ہی جب نمک کی کان میں چھٹی کا سائرن بجتا تو امی سارے کام ایک طرف رکھ دیتیں۔ گوری اپنی کتابیں کاپیاں الٹی سیدھی رکھ کر نیچے بستی کی طرف کھیلنے کے لیے بھاگتی، شام کے یہ دو گھنٹے گوری کے لیے پورے دن کا حاصل تھے۔ اس وقت اسے قید میں بند کسی راجکماری کی طرح پرانے بنگلے کی چار دیواری سے باہر اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیلنے میں بہت مزا آتا۔

اس روز بندو لاکھ بلانے کے باوجود بچوں کے ساتھ کھیلنے باہر نہ آئی۔ سارے بچے گھر کے آس پاس چکراتے رہے۔ کھڑکی پر پتھر مار کر کھٹکا بھی کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اس کی امی دو تین بار صحن میں آئی بھی اور بچوں کو بھگا کر پھر اندر چلی گئی۔ رنچو نے بتایا کہ آج بندو کھیلنے نہیں آئے گی۔ کیوں کہ آج اس کے گھر مہمان آئے ہیں لیکن ادھر بچے تھے کہ گھر میں داخل ہونے کے لیے بے چین، باورچی خانے سے اٹھتا دھواں اور اس میں رچی گڑ کے چاولوں کی سوندھی سوندھی خوشبو۔ آخر وہ مہمان کون تھا جس کی دعوت کے لیے یہ سامان تیار ہو رہے تھے؟ رنچو نے وہی عنابی جوڑا پہنا جو امی نے اسے پانچ سال پہلے گریو کی پیدائش کے وقت مبارک بادی میں دیا تھا۔ بندو، راگھو، سومی، رکمنی..... سب نہا دھو کر بالوں میں تیل چپڑے اور بال بنائے ہوئے تھے۔

ان سب بچوں نے ان کے گھر کے کچھ اوپر پگڈنڈی کے موڑ پر دیکھا تھا۔ وہ ایک مہمان تھا جسے انھوں نے گھر کے پتا نہیں کس کونے کھدرے میں کس جگہ تخت پر سجا رکھا تھا۔ اسے دیکھنے کے لیے تو سب بچوں کا ٹولا بے چین اور پریشان تھا۔

وہ کوئی بڑا ہی خاص رہا ہوگا۔ کیوں کہ صبح ہی رنچو امی سے ۵۰/ روپے ادھار لے گئی تھی۔ یہ روپے واپس کرنے میں بھی شاید رنچو کو پورا ایک سال لگ جائے گا پھر تو آج یقیناً ان کے گھر میں ضرور گوشت پکے گا اور باسمتی چاول بھی.....

آخر مہمان کی خاطر تواضع بھی تو کرنی ہوگی۔

بندو کے بغیر وہ شام بڑی اداس تھی۔ وہ گوری کی خاص سہیلی تھی۔ سکول سے چوتھی جماعت تک دونوں نے اکٹھے پڑھا تھا اور اب گوری آٹھویں جماعت میں تھی تو بندو کا سکول جانا بند ہوگیا تھا۔ اس وقت تک بندو کا باپ پھاگن مستری زندہ تھا اور اب اسے مرے تین سال ہو چکے تھے۔ پورا سال کھانستے، خون تھوکتے پھاگن کا سینہ چھلنی ہو چکا تھا۔ گاؤں کے دوسرے گھروں میں بھی یہ جان لیوا بیماری ہانپتی رہتی تھی۔ شاید اسی لیے گوری کی امی کا سخت حکم تھا کہ وہ گاؤں کے بچوں کے ساتھ کھیل کود تو سکتی ہے مگر ان کے گھروں میں جا کر کھانا تو ایک طرف چھو بھی نہیں سکتی۔ وہ کھیل پر بھی پابندی لگا سکتی تھیں مگر ان کی مجبوری یہ تھی کہ گھر میں کوئی اس کا ہم عمر بچہ نہ تھا جس کے ساتھ وہ کھیل یا وقت گزار سکتی۔ اس کا من پسند مشغلہ ٹیلے کے اوپر بنے سرکاری بنگلے کا پھاٹک پھاند کر سیدھا نیچے گاؤں کی طرف بھاگنا تھا، جہاں کان کے مزدوروں کی بستی تھی اور وہیں بندو بھی تھی، اس کی خاص سہیلی۔

بستی اور بنگلے کے بیچ کا یہ فرق عبور کرنے میں امی کے پیرا کثر جواب دے جاتے لیکن گوری منٹوں میں ہرنی کی طرح قلانچیں بھر کر بستی جا پہنچتی۔ پہلا گھر بھی تو بندو کا ہی تھا۔

آج جب گوری کھیل سے واپس آئی تو اپنے ہی خیالات میں مگن تھی۔ آتے ہی امی سے سوال کیا۔

''امی! کیا بندو کی امی رنچو کو اس کا شوہر اچھا نہیں لگتا تھا؟''

''نہیں، وہ تو بڑا بھلا آدمی تھا۔ وہ رنچو سے بڑا پیار کرتا تھا۔ جب تک زندہ رہا، اس پر آنچ نہ آنے دی مگر تو ایسے سوال کیوں پوچھ رہی ہے؟''

''امی! کیا شہروں میں رہنے والے یا بڑے امیر لوگ آپس میں ان غریب لوگوں سے زیادہ پیار کرتے ہیں؟''

''نہیں تو..... مگر تو ایسی باتیں آج کیوں کر رہی ہے؟''

''تو پھر رنچو پھاگن کے مرنے کے بعد اتنا خوش



کیوں رہتی ہے؟ گوشت چاول کیسے پکاتی ہے؟ گھاس کاٹتے ہوئے سب سے اچھا اور میٹھا گیت بھی وہی گاتی ہے؟''

''خوش نہ رہے تو چار بچوں کو وہ غریب کیسے پالے پوسے گی؟''

''اب سمجھی امی! کاویری خالہ آنند خالو کے لیے ساری عمر کیسے روتی رہ سکتی ہے۔''

''گوری.....؟''

''ہاں امی! خالہ کے پاس بڑا وقت ہے اور دولت بھی اور روتے رہنے کے لیے فرصت بھی لیکن میں کیا کروں، خالہ مجھے بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ وہ آپ کو کیوں دکھی کرتی ہیں؟''

امی کا چہرہ یہ سنتے ہی ایک دم فق ہوگیا۔ اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ روکنے کے لیے انھوں نے کرسی کا دستہ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ گوری نے اپنے کمرے میں آ کر دروازہ اندر سے بند کیا۔ آج دوپہر سے جو بات اس کے حلق میں کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی، اسے نکال پھینک کر وہ بڑا سکون محسوس کر رہی تھی، چاہے امی پریشان ہوگئی تھیں۔

جیسے کسی تیرتھ کے اردگرد پنڈتوں اور پروہتوں کی بستی بس جاتی ہے، ایسے ہی یہ چھوٹا سا گاؤں نمک کی کان کے اطراف میں بس گیا تھا۔ اکثر مزدور کان میں کام کرتے۔ زمین کے نام پر یہی دو چار پتھریلے کھیت ان کے نام تھے۔ گاؤں کی عورتوں کو بھی کان کے باہر چھوٹا موٹا کام مل جاتا۔ باہر ٹرکوں میں نمک بھرنا..... سرنگیں بنانے کے لیے سوت کی سلیاں بٹنا..... یہ اور ایسے دوسرے چھوٹے موٹے کام عورتوں کو مل جاتے تھے۔ ٹرک میں نمک بھرواتے ہوئے ٹرکوں کے ڈرائیور اور کنڈیکٹر عورتوں سے تھوڑا بہت ہلکا پھلکا مذاق بھی کر لیتے۔ ایک بار تو گاؤں کی ایک مزدور لڑکی کو ایک ڈرائیور اتنا چاہنے لگا کہ اسے بیاہ کر ہی لے گیا۔ اس کی ساتھی عورتیں اس کی قسمت پر رشک کرتیں۔

کان میں گوری کے ابو کا پتا نہیں کیا عہدہ تھا اور وہ کتنا بڑا تھا مگر گاؤں کے سارے لوگ انھیں صاحب جی کہہ کر پکارتے اور گوری صاحب کی بیٹی کے نام سے مشہور تھی۔ مزدوروں اور صاحب لوگوں کے بیچ کا یہ فرق گوری کو کبھی دکھ دیتا اور کبھی سکھ، کبھی اپنائیت کا احساس دلاتا اور کبھی دوری کا درد۔

رات گئے جب کسی خوشی کے موقع پر یا مہینے کی پہلی تاریخ کو جب لوگوں کو تنخواہ ملتی تو بستی میں رات دیر تک ڈھول بجتا۔ گوری سوچتی تھی کہ سارے بچے کشمل کے سوکھے کانٹوں کے الاؤ کے گرد بیٹھ کر گیت گا رہے ہوں گے، گڑ کی چاشنی میں لپٹے چنے کھا رہے ہوں گے۔ اس وقت اس کے پاؤں بنگلے کی باڑ پھلانگنے کے لیے مچلنے لگتے لیکن امی آنکھیں اور فوراً چراغ بجھا کر سو جانے کا حکم دیتیں اور گوری کے تمام خیالات ایک دم اندھیرے میں کہیں ڈوب جاتے۔ ادھر کوئی لوک ٹیلا چڑھ کر اس کی کھڑکی کے باہر تیرتی رہتی۔ گوری ساری رات گھر کے بائیں طرف پہاڑ کی چٹانوں کے چٹخنے اور ڈھنے کی آوازیں سن کر کانپتی، ڈرتی رہتی۔

سخت سردیوں میں موزے اور مفلر پہن کر سکول جانا بہت اچھا لگتا تھا۔ اس کے کپڑے اسے کچھ اور بھی خوبصورت اور دل آویز بنا دیتے۔ لیکن جب گوری کی ہم عمر لڑکیاں اکٹھی ہو کر جنگل کے اس پار لکڑیاں جمع کرنے جاتیں اور امی اسے پڑھنے کا حکم دے کر خود سویٹر بننے بیٹھ جاتیں تو اس کا دل سارا دن اچاٹ سا رہتا۔ کتاب کے بجائے اس کا دل اور اس کی آنکھیں جنگل کی طرف لگی رہتیں۔ پہاڑ کے اونچے حصے پر چیڑوں کے درمیان سروں پر لکڑی کے چھوٹے چھوٹے گٹھر اٹھائے نیچے اترتی ہوئیں بندو، نا گو، کیسری سب اسے آسمان سے اترتی پریاں معلوم ہوتیں۔ وہ دل ہی دل میں منہ بسورتی رہتی کہ وہ بھی بندو کی بہن کیوں نہ ہوئی؟

اگلے دن بھی بندو کھیل میں شامل نہ ہوئی۔ گوری سوچتی رہی۔ ''یہ کیسا مہمان ہے کہ ڈیرا جمائے بیٹھا ہے اور بندو اس کی خدمت میں ایسی کھوئی ہے کہ میرا بھی خیال نہیں۔ ضرور رنچو نے اسے روک لیا ہوگا۔ میرا بھی خیال نہیں کیا، جیسے میں ہوں ہی نہیں..... ہونہہ!''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس روز وہ ٹیلے پر چڑھتے ہوئے بہت تھک گئی تھی۔ وہ دن بھی بڑا خراب تھا۔ گھر واپس آ کر دیکھا سب لوگ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ امی تو لگتا تھا جیسے سن ہوگئی ہوں۔ گوری کے دل میں خیال آیا کہ وہ الٹے قدموں واپس لوٹ جائے..... کہیں بھی چلی جائے۔ اسے بند اور گھٹے ہوئے چہروں سے سخت نفرت تھی۔ وہ کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتی تھی۔ البتہ ابو نے بتایا کہ شہر سے تار آیا ہے کہ کاویری باجی ہسپتال میں ہیں۔ ڈھیر ساری نیند کی گولیاں کھا کر مرنا چاہتی تھیں مگر بچا لی گئیں اور اب ان کی حالت خطرے سے باہر ہے۔

امی کچھ دنوں کے لیے شہر خالہ کے پاس چلی گئیں، گوپو امی کے ساتھ گیا تھا مگر گوری سکول کی وجہ سے امی کے ساتھ نہ جا سکی..... اس کے لیے باپ سے زیادہ بندو کے ساتھ کھیلنے کا خیال خوش کن تھا۔ ان دنوں گوری باپ کا خیال رکھتی۔ کان سے واپسی پر کھانا دینا، کپڑے تبدیل کرانا، یہ سب ذمے داری اب گوری کی تھی۔ ابو جی کے کپڑوں سے بارود اور دھوئیں کی عجیب سی بدبو آتی، یہ اسے اب پتا چلا تھا۔ ایک دن وہ اسے کان کا ایک نیا حصہ دکھانے لے گئے۔ سفید زین کا کوٹ پہنے ابو جی آگے آگے چل رہے تھے۔ سر پر ہیلمٹ، پاؤں میں ربڑ کے بڑے بڑے جوتے، گوری کو بھی یہ سب کچھ پہنا دیا گیا تھا۔ ان کے آگے ڈائنامائیٹ، ڈیٹونیٹر فائبر، ہاتھوں میں کاربائیڈ لیمپ لیے چل رہے تھے۔ نمک کی چھت، نمک کی دیواریں، ان سے رستا پانی، نیچے پانی کی نالی میں پانی بہنے کی آواز۔ گوری دیکھ رہی تھی، تین لمبی لمبی پرچھائیاں، خود اس کی چھوٹی سی پرچھائیں۔

سرنگ میں دھوئیں کی بو۔ ایک موڑ پر اس نے ابو جی کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا تو انھوں نے پوچھا:

''گوری! کیا ڈر لگ رہا ہے؟''

اسے واقعی ڈر لگ رہا تھا اگر چھت ان کے سروں پر آ گری تو.....؟ مگر اس نے خوف چھپا کر ابو جی سے دریافت کیا۔

''کاویری خالہ کیوں مرنا چاہتی ہیں؟''

جب وہ سرنگ سے واپس آ رہی تھی تو لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے سب نمکین لگ رہا تھا اور وہ ایک دوسرا خیال تھوک کے ساتھ نگل رہی تھی: ''یہاں ہر طرف سرنگ میں موت کا خطرہ ہے مگر سب زندہ رہنا چاہتے ہیں..... کاویری خالہ کی خواب گاہ میں سب کچھ خوبصورت ہے، آرام دہ ہے مگر وہ مرنے کی بات سوچتی ہیں۔''

سکول سے آنے اور شام کو کھیلنے جانے کا وقفہ گوری پر بڑا بھاری گزرتا۔ سرنگیں پھٹنے کی آوازیں چٹانوں کے شکستہ ہو کر گرنے کی گڑگڑاہٹ۔ گھر میں اکیلی گوری کو بڑا ڈر لگتا۔ مگر شام کو کھیلتے وقت جب گاؤں کے سارے بچے اکٹھے ہو کر گڈے گڑیاں کھیلتے یا جنگلی پھول چنتے سب اس میں کھو جاتے تو زمین کے اندر مسلسل شکستہ ہونے کا کہرام ان کے کانوں تک نہیں پہنچ پاتا تھا۔

جس دن بندو کا مہمان واپس گیا۔ اس سے اگلے روز بندو، گوری کو پکڑ کر تالاب تک لے گئی۔

''پتا بھی ہے کل کون آیا تھا؟''

''کون آیا تھا؟''

گوری اس کی جنگلی آنکھوں میں آنے والے کا چہرہ ڈھونڈنے لگی۔

''میرا منگیتر آیا تھا۔''

''منگیتر..... وہ کون ہوتا ہے؟''

یہ لفظ گوری کی عمر سے ذرا بڑا تھا، وہ سمجھ نہ سکی۔

''اری! اس سے میرا بیاہ ہوگا..... سمجھی اب۔''

یہ کہتے ہوئے بندو کے گال لال ہو گئے تھے۔

''اوئی بہن!..... کب؟''

یکا یک گوری کو محسوس ہوا جیسے اب بندو اس کی بال برادری سے باہر ہوگئی ہو۔ ان کے بچپن کے پاؤں میں جیسے کسی نے رسی بچھا دی ہو۔ بندو کو کھو دینے کے احساس نے گوری کو روہانسا کر دیا۔

''گوری! تو مت رو! ابھی تو میں ۱۳ر سال کی ہوں، جب ۱۸ر سال کی ہو جاؤں گی تب ہوگا۔''

''تو کیا یہ مہمان تب تک ایسے ہی آتا رہے گا؟''

''ہاں کبھی کبھی آیا کرے گا، امی کہتی ہے کہ جب سے باپو مرا ہے، ہماری زمین پر نہ ہل چلا ہے نہ بیج پڑے..... اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

گوری نے بندو کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔ دونوں کلائیوں میں چاندی کی دو دو چوڑیاں پڑی تھیں۔

''اس نے دی ہیں۔'' بندو نے گوری کی سوالیہ نظروں کا جواب دیتے ہوئے کہا: ''ایک چادر بھی دی ہے گوٹے والی، امی نے صندوق میں رکھ دی ہے۔''

''اور.....؟''

''مجھے پتا نہیں، شاید کچھ روپے بھی دیے ہیں۔ امی کہتی تھیں کہ اب ہم اپنے بیل چھڑا لیں گے جو کنیس پروہت کے پاس گروی رکھے ہیں۔''

''مگر بندو! وہ تجھے کیسا لگا؟''

بندو اس سوال کے لیے بالکل تیار نہ تھی، شاید اس طرف اس کا خیال بھی نہ گیا تھا۔

''پتا نہیں، مگر مجھے تو ڈر لگا تھا۔ معلوم بھی ہے کتنا لمبا ہے وہ..... اور ٹنگڑا بھی، مونچھیں اتنی بڑی بڑی، باپ رے..... بہت سخت چہرہ ہے، باپو جیسا! لیکن امی کہتی ہیں ویسے ہے بہت بھلا، دل کا بھی نرم ہے۔''

گوری، بندو کے منگیتر کے متعلق سوچتے سوچتے ٹیلا چڑھ آئی تھی، اس نے سوچا اس کی بھی شادی ہوگی مگر وہ جس چہرے کا تصور کرتی..... وہ خوبصورت ہوتا اور بندو کے منگیتر کے بالکل برعکس۔

پندرہ بیس دن بعد امی واپس آ گئیں۔ اب وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ خاموش رہنے لگی تھیں۔ سویٹر بنتے وقت ان کے چہرے پر ایسی پُراسرار خاموشی چھائی رہتی کہ جیسے کوئی سادھو عورت تسبیح کا ورد کر رہی ہو۔

کاویری باجی کے خط اب جلدی جلدی آنے لگے تھے۔ امی انہیں پڑھتے ہوئے اندر باہر لرزتی رہتیں۔ وہ سوچتی کاویری خالہ کے پاس بڑا گھر ہے، گاڑی ہے، خوش وخرم رہنے کے لیے تمام سامان ہے، دونوں بچے ہاسٹل



## عہد و پیمان

رابعہ کو یقین تھا کہ شہزاد اُس سے بے وفائی کر رہا ہے، جبکہ شہزاد کا کہنا تھا کہ وہ رابعہ کو بے حد چاہتا ہے۔ ایک دن رابعہ بیمار بن کر لیٹ گئی اور نقاہت بھرے لہجے میں کہنے لگی ''شہزاد مجھ سے وعدہ کرو کہ میرے مرنے کے بعد تم تنہا نہیں رہو گے۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہو ڈیئر..... تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' شہزاد نے اپنائیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

نہیں شہزاد! میرے بعد تم کسی اچھی لڑکی سے شادی کر لینا۔'' رابعہ نے کہا۔

''رابعہ! تم میری زندگی ہو، ایسا مت کہو، میں تمہارے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔'' شہزاد نے آزردہ لہجے میں کہا۔

''میرے تمام نئے سلے ہوئے سوٹ اور جیولری اُسے دے دینا، اسی میں میری خوشی ہے۔'' رابعہ نے دانت پیس کر مگر بظاہر نرمی سے کہا۔

''لیکن رابعہ! تم خود سوچو، تمہارے کپڑے شازیہ کو کیسے پورے آئیں گے؟'' عامر کے منہ سے بے اختیار دل کی بات نکل گئی۔

(کاشف خورشید، ملتان)

میں رہتے ہیں اور انھیں لگتا تھا کہ وہ زندہ رہنا ہی نہیں چاہتیں کیوں کہ ان کے خیال میں کسی کو ان کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے سے اپنے وجود پر اب ان کی گرفت کمزور پڑنے لگی تھی۔ نہ کھانے پینے کی سدھ، نہ پہننے اوڑھنے کا خیال۔ آنند خالو کی یاد میں کبھی گیتا کا پاٹھ، کبھی صدقہ خیرات اور اس کے بعد وہی دنیا سے بے زاری اور خود کو ختم کرنے کی شدید خواہش۔

وہ ایک اور خط تھا جس نے اس دور دراز گاؤں میں آ کر گوری کے دل و دماغ میں ایک جوار بھاٹا پیدا کر دیا تھا۔ وہ خط امی سے چوری چھپے گوری نے پڑھا تھا، اب اسے احساس ہوا کہ امی اس قدر خاموش اور حساس کیوں رہتی ہیں۔ اسے لگتا کہ امی بھی گاؤں کی اس زمین ایسی ہیں، باہر سے چپ مگر اندر سے ٹوٹی پھوٹی۔ ہر وقت خود کو



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کریدتی ہوئی سی۔ خالہ نے لکھا تھا۔

''سب کہتے ہیں دکھ میں تم تنہا نہیں ہو، شاید وہ نہیں جانتے کہ دکھ اور غم تو موت سے بھی زیادہ تنہا کر دیتا ہے۔ موت صرف انھوں نے نہیں جھیلی جنھیں شمشان میں جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ موت تو میں بھگت رہی ہوں۔ مکمل پھوٹی جا کر بھی ثابت وسالم۔ آنند اگر ہمارے لیے سکھ کے سامان چھوڑ کر نہ جاتے تو میرا خیال ہے کہ مستقبل زیادہ بھیانک ہوتا اور میں جانے والے کو الوداع کر کے کمر ہمت کس کر اٹھ کھڑی ہوتی۔ مگر اب کس لیے.....؟ کچھ بھی تو کرنے کے لیے نہیں ہے۔ بچے کہتے ہیں مما مضبوط بنو، کبھی کبھی خط آتے ہیں اور ساتھ ہی ان کی ہنستی مسکراتی تصاویر مگر مجھے لگتا ہے کہ اب میں وہ جگہ نہیں ہوں جہاں وہ واپس آئیں گے۔ لگتا ہے آنند کا لاشہ لیے پھر رہی ہوں۔ دکھ ہی میرا سہارا ہے اور اس غم سے نجات کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ میں خود کو قید حیات سے آزاد کر لوں۔''

گوری کو کچھ سمجھ آئی اور کچھ سمجھ نہ آئی مگر کاویری خالہ پر غصہ بہت آیا۔ امی بھی ان کے جیتے جی کبھی خوش نہیں رہ سکیں گی۔ اچانک اس کے دل میں ایک خیال آیا کیا خالہ ستی ہو رہی ہیں؟ وہ اپنے غصے پر قابو نہ پا سکی اور چلاتے ہوئے بولی ''میں خالہ کو کبھی معاف نہیں کروں گی..... وہ مجھے بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ آپ ان سے کہہ دیں کہ وہ آپ کو خط نہ لکھا کریں۔''

امی اس کا غصہ دیکھ کر گھبرا گئیں اور گوری کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگیں ''نہیں گوری! نہیں باجی تو بڑی اچھی ہیں..... اپنے مذہب پر اٹل۔''

ان ۳ر سالوں میں گوری نے جیسا کاویری خالہ کو دیکھا، اسے یاد کر کے ہی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر سی دوڑ جاتی۔ خالہ ایسی تو نہ تھیں تو کیا موت ان کو بھی چھو کر گئی ہے؟ موت ایسی ہی سرد ہوتی ہوگی جیسی خالہ..... صرف اپنے دکھ میں غرق، سب سے الگ تھلگ، سب سے علیحدہ۔

امی نے ایک روز گوری کو بتایا کہ خالہ بڑی منت سماجت کے بعد گاؤں میں آ کر رہنے کو مانی ہیں۔ گوری کو اس اطلاع سے مطلق خوشی نہ ہوئی۔ بلکہ وہ امی کی طرف سے اور بھی پریشان ہوگئی۔ خالہ آئیں گی تو امی کو اور بھی پریشان کریں گی۔ گھر کی ہر دیوار اور چھپر کے ہر سوراخ سے دکھ جھانکتا نظر آئے گا اور پھر گھر میں نہ ریڈیو بجے گا، نہ گانا سنا جائے گا۔ ابو جی اور امی ایک ساتھ پھولوں کی کیاریوں کے آس پاس نہ گھومیں گے، امی ہر وقت خالہ کے پاس بیٹھی رہیں گی، خاموش اور چپ چاپ۔

گوری کا ذہن سوچتے سوچتے جھنجھنا اٹھا۔ آخر دکھ ہوتا کیا ہے؟ اس وقت اس کی نگاہ مرے سانپ کی کینچلی کے اس چبوترے پر پڑی جو برآمدے کے سرے پر تھی اور چیونٹیوں کی ایک قطار نہ جانے کب سے اسے گھسیٹ رہی تھی۔

امی سے اجازت لیے بغیر گوری بنگلے کی چھوٹی سی دیوار پھاند کر بندو کے صحن میں آ کودی۔ بندو کے گھر میں آج بھی گوشت اور چاول پک رہے تھے۔ اپنے گھر کی اس گھٹن کے بعد گوری کو لگا جیسے باورچی خانے کے اندر باہر اور گھر میں اندر باہر منڈلاتی بدبو ہی شاید سکھ ہے۔ بھوک پھر اس سے چھٹکارا، اس سے آگے سوچنے سے آخر ہوگا بھی کیا؟

گوری سمجھ گئی کہ آج وہی مہمان پھر آ گیا ہے۔ رنچو نے بوتل کا انتظام بھی ضروری کیا ہوگا۔ بندو کے بھائی تو ابھی بچے ہیں، پھر مہمان کا ساتھ کون دے گا۔ کیا پوری بوتل اکیلا ہی پی جائے گا؟ یا پھر..... یا پھر رنچو؟

کچھ روز تو پورا گاؤں رنچو کے یہ نئے تیور دیکھتا رہا۔ رنچو یہی کوئی تیس بتیس کی رہی ہوگی۔ چار بچے جننے کے بعد بھی کسی ہوئی اور چست، درست قد، کاٹھی، سیاہ بال، جنگلی بلی ایسی چوکنی آنکھیں۔ پھاگن کے مرنے کے بعد بڑے سخت دن دیکھے تھے، ٹرکوں میں نمک بھرنے کا کام کبھی ملتا اور کبھی نہیں۔ برسات کے دنوں میں نمک کی کانوں میں یوں بھی کام بند ہو جاتا ہے..... بس مرمت کا کام ہوتا ہے اور یوں عورتیں بے کار ہو جاتیں۔ پانچ جانوں کا کھانا اور تنہا ایک رنچو کی کمانے والی ذات۔ کھینچ تان کر بہت طرح کی چولیں بٹھانی پڑتی تھیں اسے ان دنوں۔ انہی دنوں اس نے دایہ کا کام بھی سیکھ لیا تھا اور جلد ہی اس پیشے میں اسے کمال حاصل ہو گیا، جس کی وجہ سے گزر اوقات ہونے لگی تھی۔ پھر بھی روٹی ملنے پر سر اٹھا کر چلنا دشوار تھا۔

ایک مزدور عورت، سر پر مرد نہیں اور اکڑ کا یہ عالم، اس کی تنی گردن سبھی کو شاق گزرتی۔ دتا سیٹھ تو ہر وقت تاک میں لگا رہتا: ''کب تک گھاس نہیں ڈالے گی سسری..... آج نہیں تو کل..... کبھی تو کچھ ہوگا۔''

تین سالوں تک جب کچھ نہ ہوسکا تو گاؤں کے لوگ خاصے نا امید ہوئے مگر جب ستائیس اٹھائیس سال کا جوان جوائی گھر آ کر رہنے لگا تو لوگوں کے سُن ہوئے کان ایک بار پھر سے پھڑ پھڑانے لگے۔ گاؤں کے مرد کیا نامرد تھے جو اس پردیسی کو پکڑ لائی ہے مگر کوئی کہے بھی تو کیسے؟ آخر بیٹی کا رشتہ دیا تھا اور گاؤں میں داماد یوں بھی تھیتی باڑی میں سہارا بنتے ہی ہیں۔ یہ رسم تو زمانے سے چلی آ رہی تھی، کوئی کہے بھی تو کیا۔ آہستہ آہستہ رنچو کے بارے میں لوگوں میں جو تھوڑی بہت ہمدردیاں تھیں، ان میں طعنوں کا ٹیڑھا پن سر اٹھانے لگا مگر رنچو بھی سب کچھ جان سن کر بھی انجان بنی چلی جا رہی تھی اور ساتھ ساتھ چہرے پر خوب صورتی عجیب انداز میں کروٹ لے رہی تھی۔ پہلے سے زیادہ تپا تپا لگتا تھا اب اس کا جسم اور رنگ۔

اب جب وہ مہمان آتا تو بندو کو گھر میں رکنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی اور پھر وہ الہڑ اس کی خاطر مدارت کرتی بھی کیا۔

ایک روز صبح سویرے بندو گھر آئی اور گوری کو بلا کر کہنے لگی: ''صاحب سے کہو کہ دھلائی کے لیے امی کی جگہ میں آؤں گی۔''

''تیری امی کہاں ہیں بندو!''

''تحصیل گئی ہیں۔''

''کیا اکیلے؟''

''نہیں، وہ گیا ہے ساتھ؟''

''کون..... تیرا ہونے والا؟''

''میرا نہیں، ان کا۔''

''کیا کہہ رہی ہے بندو!''

''اری سچ کہہ رہی ہوں گوری! تم خود دیکھ لینا۔''

بندو کئی ماہ سے جو چاندی کی چوڑیاں پہنے ہوئے تھی، اب وہ اس کے ہاتھوں میں نہیں تھیں۔ شاید رنچو کو پوری آ گئی ہوں، بندو کو تو پہلے بھی ڈھیلی تھیں۔

اس وقت امی اور خالہ پچھلے برآمدے میں تھیں۔ گوری امی کو یہ خبر دینا چاہتی تھی مگر خالہ کی موجودگی میں یہ سب کہنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ یہ ٹھیک ہوا یا غلط، یہ بات اس کی سمجھ سے باہر تھی اور معصوم بندو یوں کھڑی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

''جاؤ پوچھ کر آؤ۔''

بندو نے گوری کو یاد دلایا۔

## ٹوٹی کہاں کمند.....؟

اعلیٰ تعلیم کے موضوع پر مذاکرہ ہو رہا تھا۔ ایک مقرر نے تقریر شروع کی۔

خواتین و حضرات! میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا زبردست حامی رہا ہوں کیونکہ جب میں اسکول کے ابتدائی درجے میں تھا تو مجھ سے کہا گیا کہ اچھی ملازمت کے لیے ہائی اسکول تک پڑھوں۔ جب ہائی سکول تک پہنچا تو مجھ سے کہا گیا کہ گریجوایشن کروں۔ جب گریجوایٹ ہو گیا تو کہا گیا کہ اچھی ملازمت کے لیے کوئی ماسٹر ڈگری ضروری ہے۔ پھر کہا گیا کہ کوئی تمہاری قابلیت کو اُس وقت تک تسلیم نہیں کرے گا، جب تک تم اپنے مضمون میں پی ایچ ڈی نہ کر لو۔

چنانچہ میں نے اپنے مضمون میں پی ایچ ڈی کر لی۔ پھر ملازمت کے لیے نکلا تو پتا چلا کہ ملازمت دینے والے ادارے کو کسی نوجوان کی تلاش ہے۔''

(حافظ خرم عزیز، لاہور)





Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ بے دلی سے اندر گئی۔ امی اور خالہ کے بیچ نا جانے کیا بات ہوئی تھی۔ امی بہت پریشان لگ رہی تھیں۔ گوری دروازے کی اوٹ میں کھڑی رہی۔ امی خالہ کا کندھا ہلا کر کہہ رہی تھیں۔

''دکھ سے باہر آؤ باجی! دولت کی طرح اسے احتیاط سے مت رکھو، یہ کیسا یقین اور کیسا مذہب ہے، کیا کوئی دوسرا تمھاری سوچ کے قابل نہیں ہے۔ اگر تمھیں ان مزدور عورتوں کی طرح زمین کا سینہ چیر کر روزی کمانی پڑتی تو صحیح یا غلط تمھاری خوشیوں اور غم کا انداز دوسرا ہوتا، بے پناہ دولت محافظ کی طرح تمھارے ہاتھ میں ہے اور تم ہو کہ ابھی تک مرے ہوئے کی پوجا کیے جا رہی ہو۔ عذاب کی طرح جھیل رہی ہو یہ دکھ جو حقیقت میں دکھ ہے بھی نہیں۔ تمھارے دل میں بس ایک سنک ہے.....''

امی کہتے کہتے نڈھال سی ہوگئیں۔ کاویری خالہ خاموشی سے انھیں دیکھ رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ جیسے امی میں پہاڑی دیوتا داخل ہوگیا ہو اور خالہ اس کی چمک اور تیزی سے پگھلتی جا رہی ہوں۔

گوری نے آج پہلے بار امی کو بولتے سنا تھا جیسے کان میں آگ کو چھوتے ہی بارود پھٹنے لگتا ہے۔ جب امی خاموش ہوئیں تو گوری نے امی کو دیکھ کر رنچو کی خبر دی۔ امی پر نا جانے کیا اثر ہوا کہ بڑے ہی تھکے اور نڈھال سے لہجے میں کہنے لگیں ''یہی ہونا تھا بندو! اچھا ہی ہوا، بندو! تیرے لیے ہم بہت اچھا سا لڑکا ڈھونڈیں گے، جب امی آجائے تو اس سے کہنا کہ صاحب کے ہاں بلایا ہے۔''

اگلے دن جب شام کو رنچو آئی تو کچھ بھی نہ بدلا تھا، سب کچھ ویسا ہی تھا۔ صرف ماتھے پر ایک بڑی سی گول بندیا چمک رہی تھی۔ ڈبیا میں وہی پرانا لونگ نکال کر اس نے ناک پر سجا لیا تھا۔

''باقی تو سب کو بعد میں دیکھ لوں گی، میں نے سوچا پہلے بیگم صاحبہ کی بندگی بجا لاؤں۔''

امی نے خالہ کو شاید سب کچھ پہلے ہی بتا دیا تھا۔ وہ یک ٹک اس نئی نویلی خوبصورت سہاگن کو تکے جا رہی تھیں۔

کیا سب اتنا آسان ہے؟

صرف چھوڑ دینا ہی سکھ ہے کیا؟

''اری رنچو تو نے یہ کیا، کیا؟''

امی سچ مچ تھکی تھکی سی لگ رہی تھیں۔

''کیا کروں بیگم صاحبہ! وہ بھی تو مرد کا بچہ میرے اوپر ترس کھا کر نہیں آ گیا تھا۔''

''مگر بیٹی کا سہارا کیوں لیا تو نے؟''

''ایسی بھی بات نہیں تھی، میری بندو تو اس کے سامنے بالکل بچھیا لگتی تھی، کیسے دیکھتی اس کا سب کے لیے قتل ہونا۔ وہ بھی کب تک صبر کرتا پھر آپ سے کیا چھپا ہے بیگم صاحبہ! بھوک صرف روٹی کی تو نہیں ہوتی۔''

''مگر رنچو! لوگ تجھے کتنا اونچا سمجھتے تھے۔''

''بیگم صاحبہ! یہ نیک نامی بھی تو ایک بوجھ ہی ہے، کہیں اتار کر رکھ دو تو ایک دم ہلکے ہو جاؤ، اچھی تو میں پھر بھی ہو جاؤں گی، ایک بار چاروں پہیے بس ٹھیک ہو جائیں۔''

''گوری بیٹا! ادھر آنا تو۔''

گوری نے چونک کر خالہ کو دیکھا۔ اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا، سالوں بعد خالہ نے اسے اس بار پیار اور محبت سے پکارا تھا۔ لہجے کی یہ خوش بو اسے بہت ہی اچھی لگی تھی۔

''کیا ہے خالہ!''

''گوری دیکھ تو، یہ انگوٹھی میری انگلی میں بہت تنگ ہے، بہت شدید درد کرتی ہے، شاید ہڈیوں کی گھانٹھیں ان بیس سالوں میں بہت بھاری ہوگئی ہیں۔''

گوری نے انگوٹھی انگلی سے کھینچ کر اتارنی چاہی۔

''ارے یوں نہیں..... یوں نہ اترے گی..... اسے کاٹنا پڑے گا۔ جا کر اندر سے قینچی تو لا۔''

رنچو دروازے سے باہر نکل رہی تھی اور خالہ مسلسل انگلی میں پھنسی انگوٹھی کو گھما کر اتارنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

اُردو ادب میں پانی پہ ایسے نوحے کم ہی لکھے گئے ہوں گے

# پانی

ایک باپ کا ماجرا، جو نہیں جانتا تھا کہ قحط میں پانی ہی نہیں، پیار بھی ارزاں ہو جاتا ہے

ایک قافلے کی داستان جہاں لوگ اور رشتے، ڈال سے پکے پھلوں کی طرح اپنے آپ گرتے جا رہے تھے

نیلم احمد بشیر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# گاؤں

چھوڑنے کو کب جی چاہتا تھا مگر عبدالحئی اور عمارہ مجبور ہوگئے۔ کیسی عجیب بات تھی کہ انھیں اپنا جدی پشتی آبائی گاؤں بے گانہ لگنے لگا، یوں جیسے وہ کسی دشمن کے ساتھ رہ رہے ہوں۔

ویسے تو سالہا سال سے صومالیہ کی دھرتی پہ بارش کی ٹھنڈی میٹھی، حیات آفریں بوندوں نے برسنا چھوڑ رکھا تھا مگر اب کے برس تو ایسا ظالم اور بے رحم قحط پھیلا کہ بڑے بوڑھے کہہ اٹھے ''کم از کم آدھی صدی سے ہم نے کبھی ایسی ویرانی اور وحشت نہ دیکھی۔''

دنیا کے اس غریب ترین ملک کے بدحال، بدنصیب دکھوں کے مارے لوگ دانے دانے کو محتاج ہوگئے۔ پیٹ خالی، زبانیں خشک، ہونٹ پیاسے اور آنکھیں ہر دم آسمانوں کی طرف لگی ہوں تو جینے میں کوئی مزا نہیں رہتا۔ ''مٹی کا پیالہ'' کہلائے جانے والا ملک ''بھوک کا پیالہ'' بن گیا۔ اکثر گھرانوں میں آٹھ دس بچے اور چند بزرگ تھے جو خوراک، پانی، صحت سہولیات کے فقدان کی وجہ سے جان کنی کے عالم میں مبتلا ہوگئے۔

عبدالحئی کی چھوٹی سی جھونپڑی میں بھی ان کے سات بچے اور بیوی، عمارہ کا بوڑھا باپ بدرالدین رہتا تھا۔ اس کی بیوی مر چکی تھی اور جوان بیٹا گاؤں چھوڑ کر اپنی قسمت آزمانے نکل گیا۔ وہ بحری قذاقوں کے ایک ٹولے میں شامل ہو کر ان سے بہت دور سمندروں میں جا بسا۔ کئی کئی ماہ اپنی شکل نہ دکھاتا۔ آتا تو ان کے لیے لوٹ کا سامان لاتا اور فخریہ انداز میں بتاتا ''بابا ہم بداڈنتا دیداہ (Bidadinta Dida) ہیں، سمندر کے سپاہی۔ سمندر ہمارے ہیں اور بدیسی جہازوں کو ہمارے پانیوں میں تیرنے کا کوئی حق نہیں۔ اسی لیے ہم انھیں لوٹتے اور اپنے پیٹ بھرتے ہیں۔''

یہ حقیقت ہے کہ صومالی قذاقوں کی طاقت کمزور حکومت سے کہیں زیادہ ہے۔ اسی لیے انھیں روکنے کی کوئی جرأت نہیں کرسکتا۔ وہ بڑی کامیابی سے جہازوں کو یرغمال بناتے، تاوان وصولتے، سمندروں میں دندناتے پھرتے۔

بدرالدین اکثر بیٹے کو یاد کرکے آنسو بہاتا جس پہ عمارہ چڑ جاتی۔ بھائی بڈھے باپ کو ان کے حوالے کرکے نیازی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے کبھی پلٹ کر خبر نہ لی تھی کہ بہن، اس کا خاندان اور باپ قحط کے عفریت سے کیونکر مقابلہ کرکے زندہ رہنے کی کوشش کررہے تھے۔

عمارہ اور عبدالحئی کو اپنے بچوں کے بھوکے پیاسے رہنے کا غم کھائے چلا جارہا تھا۔ ساتوں بچوں میں ان کی جان تھی اور وہ انھیں حد سے زیادہ پیارے تھے۔ سب سے چھوٹا علی موسیٰ تو ابھی محض چند ماہ کا ہی تھا۔ تیکھے نقوش، بڑی بڑی آنکھوں والا ننھا ان سب کو پیارا لگتا۔ سب اسے گود میں اٹھائے پھرتے۔ نانا بدرالدین بھی اس کا دیوانہ تھا۔ کبھی کبھی لاڈ پیار میں پچکارتے ہوئے اسے اپنے بیٹے کی عرفیت فکوما سے پکارنے لگتا تو عمارہ کے ماتھے پہ تیوری پڑ جاتی۔ وہ دل ہی دل میں پیچ وتاب کھاتی مگر زبان سے کچھ نہ کہتی اور ٹھنڈی سانس بھر کے رہ جاتی۔

اسے دکھ ہوتا کہ علی موسیٰ ایسے وقت پیدا ہوا جب ان کے گھر بندھی واحد گائے کے تھنوں میں دودھ بچا ہے اور نہ ہی اس کی چھاتیوں میں۔ کبھی کبھار تو وہ یہ بھی سوچنے لگتی: ''ہمارے ہاں چھ بچے تو پہلے ہی تھے۔ اگر یہ ننھا علی موسیٰ اس سوکھی، اجڑی، بنجر اور پیاسی دنیا میں نہ آتا تو کیا بگڑ جاتا؟ اس گھر میں پہلے کیا کم منہ تھے کھلانے کو؟''

عبدالحئی کئی برس سے بیکار تھا۔ ایک زمانے میں وہ ہیروں کی کانوں میں مزدوری کرتا تھا۔ تب وہ لوگ روکھی سوکھی کھا کر گزارا کر لیتے۔ ڈی بیئرز (Debeers) نامی یورپی کمپنی نے افریقی کانوں سے ہیرے نکالنے کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ وہ مقامی افراد کو کانوں میں بھیجتے۔ مزدور ناتراشیدہ ہیرے نکالتے، تو کمپنی انھیں ترقی یافتہ ملکوں کے کارخانوں میں بھیجتی جہاں انھیں کیمیائی عمل سے مناسب ساخت کے ہیروں کی شکل دی جاتی اور پھر فروخت کے لیے دنیا بھر میں بھیجا جاتا۔ امیر ملکوں میں بسنے والی حسین انگلیوں اور بلوریں گلاسوں جیسی نازک گردنیں رکھنے والی



نازنینیں جب دلکش آویزوں اور گلوبندوں سے اپنے آپ کو سجاتی، سنوارتی تو انھیں کہاں خبر ہوتی کہ ان چمکتے، دمکتے پتھروں میں محنت کے پسینے اور خون کی کئی بوندوں کی آمیزش رچی بسی ہے۔

عبدالحئی کو دن بھر کی اجرت کے محض دس سینٹ ملتے جس سے گھرانے کا بمشکل گزارا ہوتا۔ ایک روز گھر آتے ہوئے اسے زمین میں گرا ایک ننھا سا ہیرا نظر آیا۔ اس نے قدرت کی طرف سے اسے اپنی خوش بختی کا انعام سمجھ کر اٹھایا اور گھر پہنچ کر عمارہ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ''یہ کیا عبدالحئی؟ ہم اس کا کیا کریں گے؟'' عمارہ نے حیران ہوکر شوہر سے سوال کیا جس کے خوشی کے مارے دانت نکلتے جا رہے تھے۔

''میری جان! یہ تحفہ ہے میری طرف سے، تو اسے سنبھال کے رکھ۔ میں ایک روز اس کی انگوٹھی بنوا کر تیری انگلی میں پہناؤں گا۔ تب تو کتنی پیاری لگے گی۔'' اس نے اپنے سات بچوں کی ماں اور صابر بیوی کو بتایا تو اس کے خوبصورت سلونے نقوش گلاب کی طرح کھل اٹھے۔ وہ جی ہی جی میں جھوم اٹھی مگر جھوٹ موٹ اٹھلا کر بولی ''بھلا یہ کیا بات ہوئی؟ میں اس کا کیا کروں گی؟ یہ تو گوری کے ہاتھوں میں ہی اچھی لگتے ہیں۔ ہم غریب لوگ ہیں، ہمیں تو اناج چاہیے اور بس۔ میں تو دن رات دعا کرتی ہوں کہ آسمان سے خوب پانی برسے۔ ہمارے کنویں، کھیت کھلیان سب کی ویرانی دور ہو اور ہمارے جانور اور بچے پھلیں پھولیں، بھرے پیٹ سے سوئیں۔'' عمارہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

عبدالحئی نے آہ بھری، پھر ہیرا بیوی کو تھماتے ہوئے بولا: ''چل پھر ابھی تو سنبھال اسے! بُرا وقت آیا تو اسے شہر جا کر بیچ دیں گے۔ آخر کام ہی آئے گا نا۔''

عمارہ نے ہیرا ننھی سی پوٹلی میں باندھ ایک محفوظ جگہ چھپا دیا اور سوچنے لگی: ''شاید یہ ہیرا ہمیں ہمارے دکھوں سے نجات دلا دے۔ شاید واقعی ہمیں ایک نئی زندگی دے سکے۔'' اسے لگا ایک قیمتی اثاثہ اس کے ہاتھ آگیا جس کی ہر حالت میں رکھوالی کرنی ہے۔ افسوس وہ دن آتا دکھائی نہ دیا جب عمارہ پیارے شوہر کی لائی ہوئی انگوٹھی انگلی میں پہن کر اتراتی، شوہر کو دکھا دکھا کر لجاتی، سو سو بل کھاتی۔ اب تو دھرتی سے بھوک اگتی اور آسمان سے پیاس برستی تھی۔ ایسے میں ہیرے کا وہ کیا کرتے؟

اب تو گاؤں کے سبھی خاندانوں کا بھوک اور پیاس کے مارے برا حال تھا۔ کیونکہ تالاب سب سوکھ چکے تھے۔ ڈھور ڈنگر دم توڑ رہے تھے۔ سرسبز زمین خشک ہوکر مرجھا چکی تھی اور قحط کا بھوت چاروں طرف ننگا ناچ رہا تھا۔ چاروں طرف سے یہی بری خبریں آرہی تھیں کہ بھوک پیاس کے مارے سیکڑوں بچے مدقوق ڈھانچوں میں تبدیل ہو کر رزقِ خاک بن چکے۔ عبدالحئی اور عمارہ بھی اپنے خاندان کے بارے میں فکرمند تھے کہ اسے کیسے بچائیں گے؟

گاؤں میں اعلان ہو چکا تھا کہ سب لوگ اپنا بچا کھچا سامان اور اشیائے خورونوش سنبھالیں اور دوداب کی طرف چل دیں جہاں اقوام متحدہ کی زیرنگرانی چلنے والا بڑا امدادی پڑاؤ واقع تھا۔ ''دوداب، کینیا؟ اتنی دور، گاؤں سے تو وہاں پہنچنے میں بہت دن لگیں گے۔'' عبدالحئی نے اپنے بھائی مستقیم سے مشورہ کرتے ہوئے کہا۔

''اور کوئی چارہ بھی تو نہیں بھائی! بھوک کے مارے بچے بلک رہے ہیں اور ہم بھی نڈھال ہو چکے۔'' مستقیم نے ہولے سے کہا۔ نقاہت کے مارے اس سے بات بھی نہیں ہو رہی تھی۔ اسے اپنے بچوں اور بیوی کی فکر تھی۔ سبھی پریشان تھے، اس لیے صبح سویرے ہی قافلہ تیار ہوا اور دوداب کی جانب چلنے لگا۔ سننے میں آیا تھا کہ وہ تقریباً ۴۰ دن کی پیدل مسافت پہ ہے۔

ایک پریشان ہجوم ہولے ہولے قدموں سے چلا جا رہا تھا۔ سورج سے آگ برستی تھی اور گرم ہوائیں بار بار رستہ روکنے پہ تلی نظر آتیں۔ اڑتی ہوئی گرم ریت کے ذرے آنکھوں میں سوئیوں کی طرح چبھتے تو کچھ دیر کے لیے اندھا ہی کر دیتے۔ سب کا ایک ہی مقصد تھا..... ہر حالت میں دوداب پہنچنا! بڑھے بیٹوں، بڑے سروں اور



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## نیلم احمد بشیر

اب اپنے والد احمد بشیر کے بجائے اپنے افسانوں سے بھی پہچانی جاتی ہیں۔ ۱۹۹۱ء میں افسانوں کا پہلا مجموعہ ''گلابوں والی گلی'' چھپا۔ دوسرا مجموعہ ''جگنوؤں کے قافلے'' اور تیسرا ''لے سانس بھی آہستہ'' بھی منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ۲ سفر نامے بھی لکھ چکی ہیں۔ ایڈورٹائزنگ کی دُنیا میں ۱۰ سال سے ہیں۔ اس سے پہلے کئی سال امریکہ میں گزرے۔

غیر متوازن جسموں والے بچے کمر پہ لادے اور گود میں اٹھائے ماں باپ سسکتے، تڑپتے، لڑھکتے، ڈھلکتے بس چلے جا رہے تھے۔ کبھی گرتے کبھی اٹھتے اور اٹھ کر پھر ہمت سے چلنے لگتے۔

''وہاں پالک اور گوبھی، بکئی تو روز مل جایا کرے گی نا۔'' عمارہ کے باپ بابا نورالدین نے چلتے چلتے بیٹی سے پوچھا۔ عمارہ نے اثبات میں سر ہلا کر اسے جواب دیا۔

''بیٹی تھوڑا سا پانی تو دے۔'' عمارہ اور اس کے شوہر عبدالحئی کی کمر سے بندھی پانی کی بوتلیں دیکھ کر بوڑھا بولا۔ عبدالحئی نے رک کر بابا کو چند گھونٹ پانی پلا دیا۔

''اور دے بیٹا، بڑی پیاس لگی ہے۔'' بابا نے التجا کی تو عمارہ نے تڑپ کر بوتل شوہر کے ہاتھ سے لی اور بولی:

''کیا کرتے ہو؟ بچوں کے لیے پانی کم پڑ جائے گا۔ ابھی ہمیں اسی پانی پہ چالیس دن جینا ہے۔ بابا کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے۔'' اس نے بے چین ہو کر کہا۔

بدرالدین خاموش ہو گیا۔ اپنی قمیص سے ہاتھ پاؤں پونچھے اور خاموشی سے چلنے لگا۔ تین دن چلنے کے بعد مستقیم کے دو چھوٹے بچے تقریباً حواس کھو بیٹھے۔ وہ اور اس کی بیوی آمنہ انھیں گود میں لیے گرم گرم ریت پر بیٹھ کر رونے پیٹنے لگے۔ لوگ بھی آس پاس کھڑے ہو کر افسوس کر رہے تھے۔ اس اثنا میں گاؤں کا کھیا آ کر بولا:

''دیکھو بھائی مستقیم! اب یہ بچے تو بچیں گے نہیں، ان کی خاطر ہمارا قافلہ رک نہیں سکتا۔ بہتر یہی ہے کہ انھیں یہیں زمین پہ لٹاؤ اور اللہ کے حوالے کر دو۔ دیکھو رسولن اور اس کا شوہر نبی بخش بھی اپنا بچہ خدا کے حوالے کر رہے ہیں۔''

آمنہ اور مستقیم نے گردن گھما کر دیکھا، گاؤں کا لوہار نبی بخش اور اس کی بیوی رسولن اپنے ننھے منھے بچے کو گڑھا کھود کر اس میں اتار رہے تھے۔ رسولن کی حالت بگڑ رہی تھی۔

یہ دیکھ کر عبدالحئی اور عمارہ کے دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیے۔ انھوں نے آس پاس نظریں دوڑائیں، صحرا ننھے ننھے تازہ کھدے گڑھوں سے بھرا پڑا تھا۔ کئی لوگ اپنے جگر گوشے زمین میں دفنا چکے تھے۔ غالباً بہت سے قافلے انہی کی طرح صحرا پار کر کے دوداب گئے تھے۔

''توبہ کتنا مشکل ہے! میں تو شاید ایسا نہ کر سکوں۔ بڑی ہمت ہے آمنہ اور مستقیم کی۔'' عمارہ نے اپنے کمزور، نڈھال بچے سمیٹتے ہوئے ہولے سے کہا اور علی موسیٰ کو سینے سے مزید چپکا لیا۔

ننھی حمدہ اور ابوبکر میں بھی چلنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں دونوں بچے نڈھال ہو کر زمین پر گر گئے۔ عمارہ کے رشتے دار، ابوالحسن اور اس کی بیوی جلیلہ تڑپ کر اپنے بچوں کی طرف بڑھے۔ یہ دیکھ کر انھوں نے ماتھے پہ ہاتھ رکھ آنکھیں بند کر لیں کہ ننھی حمدہ کا سانسوں سے رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ وہ کسی بے جان گڑیا کی طرح ایک طرف لڑھک گئی تھی۔ ابوبکر اکھڑے اکھڑے سانس لے رہا تھا۔

جلیلہ نے شوہر کے ہاتھ سے پانی کی چھاگل کھینچ کر ابوبکر کے منہ میں چند قطرے ٹپکائے مگر وہ یونہی بے حس و حرکت پڑا رہا۔ ابوالحسن کانپتی ہوئی آواز میں بولا: ''جلیلہ پانی بچانا ہے، ان کے لیے، اپنے لیے۔'' اس نے بقیہ بچوں کی طرف اشارہ کیا۔ پھر سوکھی ٹہنیوں کی مدد سے ایک ننھا گڑھا کھود کر حمدہ کو اس میں ڈال دیا۔ ابوبکر نہ مرا تھا نہ جیتا تھا۔

ابوالحسن نے بیٹے کو گود میں اٹھایا تو قافلے میں سے ایک بولا: ''اسے اللہ کے سپرد کرو بھائی..... اور بس اب آگے چلو۔ اس کے حصے کا پانی کام آئے گا۔ ان جانوں پہ ضائع نہ کرو جو عنقریب پھڑ پھڑا کر اپنے قفس سے آزاد ہو جائیں گی۔''

ابوالحسن اور جلیلہ اپنے چار سالہ نیم مردہ پیارے ابوبکر کو صحرا کی تپتی گود میں لٹا آنسو بہاتے آگے بڑھ گئے۔ اس نیم جاں کی سوالیہ آنکھیں کئی دن تک ان کے حواس پر چھائی رہیں۔

قافلے کے لوگ وقفے وقفے سے ڈال پہ پکے پھلوں کی طرح زمین پر گر کر جان کی بازی ہارتے چلے جا رہے تھے۔ عمارہ اور ابوالحسن اپنے بچوں کو یوں آگے ہانک رہے تھے جیسے انہیں موت کے بے رحم پنجوں سے ہر قیمت پر بچا لینے کا عہد کر رکھا ہو۔

''عمارہ بیٹا! ایک بات بتاؤں، یہ صحرا ہمیشہ سے ایسا تھوڑی تھا۔ پرانے زمانے میں یہ سبزہ ہوا کرتا تھا۔ میرے دادا کے پڑدادا نے اپنے پڑدادا سے یہ بات سنی تھی۔ یہاں پھول کھلتے اور سبز جنگلوں میں ہرن قلانچیں بھرتے۔ تتلیاں سرخ گلابوں پہ ڈولتیں اور گائے بھینسوں کے تھن سفید جھاگ اڑاتے دودھ سے بھرے رہتے۔ سب لوگ مکھن اور بالائی کھاتے، اناج سے بھرے رہتے۔''

بابا بدرالدین بولے چلا جا رہا تھا مگر عمارہ کو اس کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے لگا باپ کا دماغ چل گیا ہے۔ اس نے خاندان کی بڑی بوڑھیوں سے سن رکھا تھا کہ انسان کو کھانا نہ ملے تو اس کا اپنا دماغ خود کو کترنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے جھرجھری لی۔

''سچ نانا؟ تو پھر ہماری باری پر یہ صحرا اتنا ظالم کیوں ہو گیا!'' دس بارہ سالہ نواسا محمود نانا سے پوچھنے لگا۔

''بس بارش ہم سے روٹھی، تو ہمارا رزق بھی اٹھ گیا۔ بارش کو مناؤ تو سب ہرا بھرا ہو جائے گا۔'' بابا زور زور سے قہقہے لگا کر بولا: ''اے میری محبوبہ بارش، آ اور مجھے سیراب کر دے، نہال کر دے.....''

عمارہ کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا اور گال پہ جم گیا۔ اس نے حیران ہو کر سوچا ''تو کیا ابھی میرے جسم میں اتنا پانی ہے کہ اس سے آنسو کا ایک قطرہ بن سکے۔ اگر ایسا ہے تو مجھے رونا نہیں چاہیے، میں روئی تو پانی کا ایک قطرہ ضائع ہو جائے گا۔''

''دیکھو بھائیو اور بہنو! ہم سب انتہائی مشکل وقت بلکہ قیامت سے گزر رہے ہیں۔ ہمارے بچے بھوک سے نڈھال ہیں مگر ہمیں اپنے ہوش و حواس کھونا نہیں چاہئیں۔ اپنا پانی بچا کر رکھیں۔ جو بچے اب اتنی سکت نہیں رکھتے کہ آگے جا سکیں، انھیں اللہ کے سپرد کریں اور آگے چلیں۔ ان کے لیے پانی بچائیں جو ابھی جیتے ہیں اور شاید جیتے ہی رہیں۔ میں جانتا ہوں یہ بہت کٹھن فیصلہ ہے مگر ہم سب کو اپنانا ہی ہوگا۔'' قافلے کے سربراہ نے اپنی بچی کھچی طاقت مجتمع کر کے اعلان کیا تو کئی لوگوں نے اپنے نیم مردہ بچے زمین پہ لٹائے اور سینے کوٹ کوٹ کر بین کرنے لگے۔ پھر روتے پیٹتے اٹھے اور بچے چھوڑ کر قدم بڑھانے لگے۔ آہیں، سسکیاں اور گرم ہوائیں مل کر ایک ماتم میں تبدیل ہوئیں اور چاروں طرف افسردگی چھا گئی۔

''ہم دوداب پہنچتے ہی اپنا ہیرا بیچ دیں گے۔ تم فکر نہ کرنا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' عبدالحئی نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز سے کہہ تو دیا مگر فوراً ہی زمین پر گر کے بے سدھ ہو گیا۔ عمارہ تڑپ کر اس پہ جھکی تو اس کا محبوب شوہر مچھلی کی طرح گرم ریت پہ لوٹنیاں لینے لگا۔ عبدالحئی کا چغا پکڑ کر کھینچنا چاہا مگر اسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اب کسی اور ہی طرف جانے والے قافلے میں شامل ہو چکا۔ وہ اب ایسی کٹی پتنگ تھا جو کٹ کر بہت دور جا چکی اور وہ اسے دوبارہ کبھی آسمان میں اڑتے نہیں دیکھ سکے گی۔

پیارے شوہر اور ہم سفر زندگی کا ساتھ چھوٹ جانے پہ وہ سر میں خاک ڈالنا چاہتی تھی مگر قافلے والوں کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ وہ مُردوں کا سوگ کرتے۔ وہ تو بس دوداب پہنچنا چاہتے تھے، سو چلتے چلے گئے۔ عمارہ کو بھی مجبوراً ان کا ساتھ دینا پڑا۔ عبدالحئی نے گزشتہ دس دنوں میں سب سے کم کھایا اور پیا تھا۔ وہ یہی کہتا: ''بچوں کے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے بچانا زیادہ ضروری ہے، میں ٹھیک رہوں گا۔"

خشک روٹیوں کے چند ٹکڑے عمارہ نے اپنی کمر پہ لادے تھیلے میں بچا رکھے تھے۔ چند بوتلوں میں بچا پانی کا خزانہ بھی اس نے کلیجے سے لگا رکھا تھا۔ ان اشیا کے علاوہ اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ بھوکے پیاسے بچے اور بابا بدرالدین لڑھکتے، سسکتے خود کو گھسیٹنے بس چلے جا رہے تھے۔ اسی لمحے ایک گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ بابا نے آسمان کی جانب دیکھا، اقوام متحدہ کا ایک ہیلی کاپٹر سروں کے بالکل اوپر سے گزر رہا تھا۔ سبھی کی آنکھیں اٹھ گئیں۔

ہیلی کاپٹر میں بیٹھے ایک سفید فام شخص نے ان کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ سب سمجھے کہ اب آسمان سے من و سلویٰ ٹپکے گا۔ سوانھوں نے بھی گرمجوشی سے زور زور ہاتھ ہلائے۔ مگر ہیلی کاپٹر آگے گزر گیا۔ ننھے نواسے، رضا نے نانا سے پوچھا "یہ نیچے کیوں نہیں آتے؟ ہمیں روٹی کیوں نہیں دیتے؟"

بابا بدرالدین خاموش رہا۔ عبدالحئی کے گزر جانے سے اب یک دم بہت خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ سوچیں اسے شہد کی مکھیوں کے مانند ڈنک مارنے لگیں۔ وہ سوچتا "کیا ہم سب یونہی بھوکے پیاسے اس صحرا میں مرکھپ جائیں گے؟ گڑھوں کی تہہ میں بیٹھی صحرائی چھپکلیوں اور سانپوں کی غذا بن جائیں گے؟ جہاز میں بیٹھے گورے لوگوں کو تو اوپر سے ہم محض کالے کالے چیونٹے ہی دکھائی دیتے ہوں گے۔"

آخر عمارہ کی زندگی میں بھی وہ دن آ گیا جب بچوں کا اس کے ساتھ گھسیٹنا ممکن نہ رہا۔ تین تو ایسے سوئے کہ پھر صبح اٹھے ہی نہیں! تین نیم مردہ ہو کر بے سکت ریت پہ پڑے رہے۔ قافلے والے مجبور کرنے لگے کہ وہ انھیں سپردِ خدا کر کے آگے چلے ورنہ وہ اسے چھوڑ جائیں گے۔ عمارہ کو توقع نہ تھی کہ وہ بھی اتنی بے رحم، سنگدل ہو جائے گی کہ اپنے جگر گوشوں کو لاوارثوں کی طرح چھوڑ دے۔ پھر علی رضا اور بابا کی خاطر وہ بھی پتھر کی بن گئی اور آگے چل پڑی۔ بابا بدرالدین کو نواسوں کی موت کا افسوس تو ہوا لیکن خودغرضی اس پر غالب آ گئی۔ دل ہی دل میں خوش تھا کہ کھانے والے منہ کم ہو گئے۔ روٹی کے چند ٹکڑے اور پانی کے چند گھونٹ بچ رہیں تو فائدہ ہی ہو گا نا.....

"ٹھیک کہہ رہے ہیں قافلے والے! اب ان زندہ لاشوں کو کیا تکلیف دینی، انھیں اللہ کے سپرد کرو بیٹی اور آگے چلو۔" اس نے عمارہ کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ عمارہ میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ بابا کو کچھ جواب دیتی۔ وہ بے جان بت کی طرح خاموشی سے اٹھی اور صحرا کی ریت میں قدموں کے نشان چھوڑتی بڑھنے لگی۔ سفر ابھی جاری تھا مگر بچوں کی منزل خود ہی قریب چلی آئی تھی۔ "میرے رب کو شاید ان پر رحم آ گیا ہو گا" وہ سوچنے لگی۔ مگر اسے یقین تھا کہ وہ اپنے نیم مردہ بچوں کے پیاسے لب اور ویران و حیران آنکھیں اپنے ذہن کے پردے سے کبھی کھرچ نہ پائے گی۔

کم از کم علی موسیٰ تو زندہ اور اس کے پاس تھا۔ اس نے اسے ہر قیمت پر زندہ بچا لینے کا تہیہ کر لیا۔ وہی اس کے جینے کا سہارا ہو سکتا تھا۔ "اے اللہ میری مدد فرما" وہ علی موسیٰ کے چڑیا جیسے کھلے منہ میں سوکھی چھاتی دیئے دعا مانگنے لگی۔ اس نے علی موسیٰ کے بے شمار بوسے لے لیے۔ کتنا معصوم اور بے بس تھا اس کا ننھا! اس کا اصل اثاثہ اب یہی تھا۔ عمارہ نے حسرت سے آسمان کی طرف دیکھا۔

رات سر پر آ گئی تھی۔ تھکن اور بھوک سے نڈھال لوگ بھی بے سدھ ہو کر سو گئے۔ ٹھنڈی ہوا مہربان تھی، اس نے انھیں دنیا و مافیہا کے احساس سے بے گانہ کر دیا۔ مگر تڑکے ہی صحرا کا مزاج بدلنے لگا۔ گرد کا ایک زبردست طوفان اٹھا اور انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ گرم ہواؤں کے بگولے پھر کر ان پر حملہ آور ہوئے اور انھیں ان کی بے بسی اور کم مائیگی کا احساس دلا گئے۔ عمارہ، علی موسیٰ اور بابا تنکوں کی طرح ادھر اُدھر اڑنے لگے۔ اسی افراتفری میں عمارہ نے دیکھا کہ ریت کے طوفان سے بھی ایک بڑا طوفان ان کے سر پر آ پہنچا اور انھیں حواس باختہ کر کے رکھ دیا۔

قافلے کو ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے گھیرے میں لیا اور ان سے بچا کھچا کھانے پینے کا سامان چھیننے لگا۔ عمارہ نے فوراً روٹی کے بچے کھچے ٹکڑے اور پانی کی ایک بوتل اپنے گھاگرے میں چھپا لی اور خود علی موسیٰ سمیت ایک خیمے میں چھپ گئی۔ ڈاکو اس سے روٹی اور پانی تو نہ لوٹ سکے مگر ایک نے عمارہ کو پامال کر ڈالا۔ بھوک ستائے تو عام لوگ بھی ڈاکو بن جاتے ہیں مگر عمارہ کو تو ظلم و زیادتی کی خبر نہ رہی تھی۔ اس کے لیے ہر چیز بے معنی اور بے حیثیت ہو چکی تھی، اپنی عزت بھی۔

ڈاکو چلے گئے تو کچھ دیر بعد ریت کا طوفان بھی تھم گیا۔ ہواؤں کے جھکڑ کمزور پڑنے لگے۔ قافلے کی عورتیں سرعام لٹ جانے پر احساسِ ذلت سے منہ پر کپڑا ڈال رہی تھیں۔ مگر مردوں کے پاس اتنا جذبہ بھی نہ بچا تھا کہ وہ انھیں تسلی اور حوصلہ ہی دے پاتے۔ وہ بے حس، خاموش اور پتھر بنے کھڑے انھیں دیکھتے اور زبان سے کچھ نہ کہتے۔ بھوک نے ان سے ہر قسم کا احساس اور جذبہ چھین لیا تھا۔

"کوئی بات نہیں، شکر ہے، میں تینوں کے لیے روٹی اور پانی بچا لینے میں کامیاب رہی۔" عمارہ کے دل میں طمانیت بھری لہر اٹھی اور اسے شانت کر گئی۔ اس نے پانی کی آدھی بوتل پیار سے یوں سہلائی جیسے وہ ننھے علی موسیٰ کا پیارا سا بدن ہو۔ وہ والہانہ انداز میں بوتل چومنے لگی اور پھر چند قطرے اپنے منے کے حلق میں ٹپکا دیئے۔ اب تو ہر قطرہ آبِ حیات تھا۔ علی موسیٰ نے آنکھیں کھول کر ماں کی طرف دیکھا تو عمارہ کی جان میں جان آئی۔ وہ کچھ فکرمند تھی کہ علی موسیٰ بھی کہیں اسے اکیلا چھوڑ کر باپ اور بہن بھائی کے پاس تو نہیں چلا گیا۔

"وہ داب کب آئے گا بھائی؟" بابا قافلے والوں سے بار بار پوچھنے لگا۔ کسی نے کوئی جواب نہ دیا کہ کسی کے پاس تھا ہی کہاں؟

"چل تیرا بھائی عباس تو خوب پانی پیتا ہو گا، سمندر میں گھرا رہتا ہے نا۔" بابا اپنے بیٹے کو یاد کرنے لگا۔ "ہائے میرا بیٹا....."

"تیرا بیٹا ایک بحری قذاق ہے بابا، لٹیرا۔ اگر اتنا اچھا ہوتا تو تجھے اور مجھے یوں چھوڑ کر آرام سے نہ رہتا۔ دیکھ ہم کیسے صحرا میں دربدر ہو رہے ہیں۔ مت یاد کر اس خبیث کو۔" عمارہ نے بابے کو ڈانٹ کر سرزنش کی۔

"اچھا یہ بتا..... وہ تو ٹھیک ہے نا؟" بدرالدین نے یک لخت موضوع بدل کر پوچھا۔

"کون..... علی موسیٰ؟" عمارہ نے بھولپن سے سوال کیا۔

"ارے نہیں پگلی..... وہ.....؟"

"اچھا؟ ہاں ہاں....." عمارہ سمجھ گئی کہ بابا کا اشارہ ہیرے کی طرف ہے۔ اس نے گھر سے نکلتے وقت اسے پانی کی ایک بوتل میں ڈال لیا تھا۔ کچھ دیر بعد دیکھ کر وہ تسلی کر لیتی کہ وہ پاس ہی ہے..... کہیں گم نہیں ہوا۔

"بس فکر نہ کر، دوداب پہنچتے ہی ہم اسے بیچ دیں گے۔ تب بہت سی رقم ملے گی۔ اب ہم بس تین ہی ہیں، آرام سے گزارہ ہو جائے گا۔ ہائے میرا بیٹا عبدالحئی..... بیٹے سے بڑھ کر اس نے ہمیشہ میرا خیال رکھا۔" بابا یک دم دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ عمارہ اسے چپ چاپ دیکھتی رہی۔

"وہ اور بچے بھی ہوتے تو ہم سب کتنا خوش ہوتے، خوب کھاتے پیتے۔" بابا بولتا گیا۔ مگر نہ جانے عمارہ کو کیوں لگا جیسے بابا دل سے یہ بات نہیں کر رہا، وہ دل ہی دل میں مطمئن ہے کہ افرادِ خانہ کم ہو گئے۔

"ویسے وہ ہے کہاں؟ حفاظت سے ہے نا؟"

"میرے پاس ہے، تو فکر نہ کر۔" عمارہ نے مختصر جواب دیا اور سوچنے لگی: "میرے اپنے ہیرے ریت میں دفن ہو گئے مگر علی موسیٰ کو میں مشتِ خاک میں تبدیل نہیں ہونے دوں گی، اسے ہر قیمت پہ بچاؤں گی۔" اس کے ننھے، سوکھے، ڈھانچے جیسے بدن کو سینے سے مزید چپکائے ہوئے اسے اپنے اندر طاقت آتی محسوس ہوئی اور وہ نئے سرے سے مضبوط قدم جماتی قافلے والوں کے ساتھ چلنے لگی۔ لیکن قافلے میں شامل بیشتر لوگوں کے چہرے لٹک چکے تھے۔ کہنے سننے کے لیے بھی ان کے پاس کچھ نہ بچا تھا۔ سب کسی ہارے لشکر کے سپاہیوں کی طرح مردہ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قدموں سے چل رہے تھے۔

"ایک گھونٹ پانی تو دے بیٹا، پیاس سے میں مرا جا رہا ہوں۔" بابا بدرالدین نے عمارہ سے کہا تو وہ یوں چونک اٹھی جیسے اس سے دو جہاں کی دولت مانگ لی گئی۔

"پانی...... مگر بابا پانی تو چند گھونٹ بچا ہے۔ وہ میں نے علی موسیٰ کے لیے بچایا ہوا ہے۔" عمارہ تڑپ کر بولی۔

"علی موسیٰ، علی موسیٰ...... کیا تو نے ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے۔ ارے اس نے کہاں بچنا ہے۔ اس چھچھڑے کی خاطر تو مجھے پانی نہیں دے گی۔" بابا غصے سے چیخا۔ "یا اللہ یہ صحرا آخر سمندر کیوں نہیں بن جاتا؟ اسے سمندر بنا دے تاکہ ہم سب پانی پی پی کر مر جائیں...... ہم مر کیوں نہیں جاتے...... اللہ مجھ میں اب پیاس برداشت کرنے کی مزید سکت نہیں...... میں کیوں بچ گیا؟" وہ زمین پر لوٹنیاں لگانے لگا۔

عمارہ اسے خاموشی سے تکتی رہی، ایک لفظ بھی نہ بولی۔

"میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں عمارہ! پانی دے مجھے......" بابا بدرالدین بیٹی کے قدموں میں گر گیا اور رو رو کر التجائیں کرنے لگا۔ "تو اتنی اچھی، رحمدل بیٹی ہوا کرتی تھی۔ کیا ہو گیا ہے تجھے؟"

"نہیں ہے پانی میرے پاس۔" عمارہ صاف جھوٹ بول گئی۔

"تیرا دل اتنا سخت کیسے ہو گیا بیٹی؟"

"بابا رحمدل وہ ہوتا ہے جس کے پاس دینے کے لیے کچھ ہو۔ علی موسیٰ کے علاوہ میرے پاس اب رہ ہی کیا گیا ہے؟" عمارہ آنکھوں میں آنسو بھر کے بولی۔

"۴ ماہ کے بچے کی خاطر اپنے ۷۰ سالہ باپ کو مار دے گی ظالم عورت؟ وہ باپ جس نے تجھے پیدا کیا، پیار کیا، کھلایا، پلایا، پالا، پوسا؟ دے ڈال پانی مجھے...... خدا کے واسطے...... میں مرا جا رہا ہوں۔" بابا اپنی بیٹی کے ہاتھ سے بوتل چھیننے کو لپکا۔

قافلہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ باپ بیٹی دونوں اس واحد بوتل پہ جھپٹ پڑے جس میں محض چند گھونٹ سامانِ حیات مقید تھا۔ اسی کشمکش میں علی موسیٰ کی کمزور گردن کبھی آگے کو لڑھکتی اور کبھی پیچھے کو، مگر عمارہ نے بوتل اپنی مضبوط گرفت سے آزاد نہ ہونے دی۔

"اگر تو نے مجھے پانی نہ دیا تو میں تیرے اس منحوس پلے کا خود گلا دبا دوں گا۔" بابا دیوانوں کی طرح چلاتا ہوا عمارہ کے پیچھے دوڑا مگر نقاہت کے مارے زمین پر گر پڑا اور ہانپنے لگا۔ اس کی آنکھیں کسی نیم جان مینڈک کی طرح باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ وہ آنکھیں کھولے سامنے تکے جا رہا تھا کہ اچانک اسے عمارہ، اپنی بیٹی قریب آتی دکھائی دی۔ تب اس کا میلا بدرنگ گھاگھرا اسے بے حد حسین لگا۔

"آخر میری بیٹی کو مجھ پہ ترس آ ہی گیا۔ اپنے بوڑھے لاچار باپ کو تو کیسے مرنے چھوڑ سکتی تھی۔" بابا مسکرا کر بولا۔

"یہ لے بابا...... سپردِ خدا کیا تجھے میں نے۔" عمارہ نے باپ کی طرف پلاسٹک کی بوتل پھینکی اور علی موسیٰ کو چھاتی سے چپکائے خود دوڑتی ہوئی آگے نکل گئی۔

"چلو دفع ہوتی ہے تو جائے۔ پانی تو دے گئی مجھے۔" بدرالدین نے بوتل ہاتھوں میں یوں تھام لی جیسے کائنات کا سب سے بڑا خزانہ اب اس کی تحویل میں ہو۔ ہانپتے، کانپتے، لرزتے ہاتھوں اور منہ سے کتے کی طرح باہر نکلتی زبان پہ قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بدرالدین نے بوتل کا ڈھکنا کھولا اور اندر جھانکا۔ بے تابی کے باعث اس کے حواس قابو میں نہیں آ رہے تھے۔

"کتیا نے محض ایک ہی بوند چھوڑی ہے۔" وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا۔ کس قدر چمکدار، تابناک، خوبصورت قطرہ تھا وہ! دوسرے ہی لمحے بدرالدین اپنا سر پیٹنے اور بال نوچ نوچ کر زمین پر لوٹنے لگا۔ ساری بوتل اس نے بار بار صحرا کی ریت پہ انڈیل کر تسلی کرنا چاہی مگر قطرہ سالم رہا۔ وہ اسے بار بار بوتل میں ڈالتا تو قطرہ کھنکھنانے لگتا اور چمکتے لشکتے ہوئے اس کی آنکھیں خیرہ کرتا رہا۔ صحرا کی گرم ریت کے بگولے اس کی طرف حیرت سے دیکھتے اور اس کے دیوانے قہقہے سنتے چلے گئے۔





# کرنل کا کوٹ

ایک چالاک بیوی کا ماجرائے عجب
قدرت نے ایسا داؤ کھیلا کہ اس کی ساری چالاکی دھری رہ گئی

رولڈ ڈہیل / صبا شفیق

ڈاکٹر بکسی اور اس کی بیوی نیویارک میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ ڈاکٹر بکسی اوسط آمدنی رکھنے والا ایک دندان ساز تھا۔ مسز بکسی ایک پُرجوش اور زندہ دل خاتون تھی۔ مہینے میں ایک بار جمعے کی شام وہ پینسلوینیہ اسٹیشن سے ریل میں بیٹھتی اور اپنی بوڑھی خالہ کو ملنے بالٹی مور جاتی۔ وہ رات اپنی خالہ کے ساتھ گزارتی اور اگلے دن شام سے پہلے گھر پہنچ کر اپنے شوہر کے لیے شام کا کھانا تیار کرتی۔ شوہر کو اس کے اس معمول پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مسز بکسی کی خالہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باٹلی مور میں رہتی اور اس سے بہت پیار کرتی ہے۔ ڈاکٹر بلاوجہ خالہ اور بھانجی کو اس ماہانہ ملاقات سے محروم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ خصوصاً جب وہ اسے مجبور نہیں کرتی تھی کہ وہ اس کے ساتھ جائے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی بیوی خالہ کے بہانے کرنل سے ملنے جاتی ہے جو ایک نہایت امیر آدمی اور باٹلی مور میں رہتا تھا۔ اس کا کوئی خاندان اور بیوی بچے نہیں تھے۔ وہ ایک نہایت خوبصورت گھر میں اپنے وفادار ملازموں کے ساتھ رہتا تھا۔ جب مسز بکسی وہاں نہ ہوتی تو وہ گھڑسواری اور لومڑی کے شکار سے اپنا دل بہلاتا۔

سال پہ سال گزرتے رہے، مسز بکسی اور کرنل کے درمیان خوشگوار تعلق بغیر کسی رکاوٹ کے قائم رہا کیونکہ وہ بہت کم ملتے تھے۔ سال میں صرف بارہ مرتبہ ملنا اتنا زیادہ بھی نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے سے اُکتا جاتے۔ بلکہ ملاقات کے لیے ایک طویل انتظار انھیں ایک دوسرے کے اور قریب لے آتا۔ کرنل اسٹیشن پر اپنی لمبی گاڑی میں اسے لینے آتا اور اسے دیکھتے ہی جذبات سے بھرپور آواز میں کہتا ''میری عزیزم! شکر ہے تم آ گئی، میں تو بھولنے لگا تھا کہ تم کتنی دلکش ہو۔''

۸/سال اسی طرح گزر گئے۔ یہ کرسمس سے کچھ دن پہلے کی بات ہے مسز بکسی باٹلی مور کے ریلوے اسٹیشن پر نیویارک واپس جانے کے لیے ریل کے انتظار میں کھڑی تھی۔ کرنل کے ساتھ اس کی یہ ملاقات پہلے سے بھی زیادہ خوشگوار رہی۔ اس لیے اس کا مزاج بہت خوشگوار تھا۔ کرنل کا ساتھ اسے ہمیشہ آسمان کی بلندیوں پر لے جاتا تھا۔ کرنل اس کی اتنی مدح سرائی کرتا کہ وہ یقین کرنے لگتی کہ بہت خاص عورت ہے۔ بے پناہ خوبیوں کی مالک..... اس کا دندان ساز شوہر اسے یہ احساس کبھی عطا نہ کر سکا۔ بلکہ اس کے ساتھ تو وہ خود کو ایسا مریض محسوس کرتی جو انتظار گاہ میں خاموش بیٹھ کر ڈاکٹر کا انتظار کرتا ہے۔ وہ اسٹیشن پر کھڑی تھی جب اُس نے کرنل کے ملازم ولکنز کی آواز سنی ''کرنل نے یہ آپ کے لیے بھیجا ہے۔''

سانولے رنگ اور چھوٹے قد کا ولکنز بہت وفادار ملازم تھا۔ اس نے ایک بڑا سا ڈبا مسز بکسی کو پکڑا دیا۔ مسز بکسی انتہائی پُرجوش ہوگئی اور ولکنز سے پوچھا ''کیا اس نے کوئی پیغام بھی بھیجا ہے؟''

ولکنز نے نفی میں جواب دیا اور چلا گیا۔ جیسے ہی ریل آئی، وہ ڈبا لے کر خواتین کے لیے مخصوص کمرے میں چلی گئی اور دروازہ بند کر کے ڈبا کھولا۔ وہ بہت خوش تھی اور اندازے لگا رہی تھی کہ اس میں کپڑے ہوں گے، کوئی زیور..... پرس یا پھر کچھ اور..... پھر اس نے سوچا، وہ آنکھیں بند رکھے گی اور چھو کر اندازہ لگائے گی کہ تحفہ کیا ہے.....؟ کس رنگ کا ہے.....؟ اور اس کی قیمت کیا ہے؟

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ سے ڈبے کا ڈھکن اٹھایا۔ سب سے پہلے ہاتھوں نے ٹشو پیپر کو چھوا۔ پھر اس کا ہاتھ ایک لفافے اور کارڈ پر پڑا۔ اس نے اسے بھی ہٹا دیا۔ اب ہاتھ ایک نرم ملائم چیز پر تھے۔ وہ ناقابل یقین انداز میں خود سے بولی ''اوہ خدا! یہ سچ نہیں ہو سکتا۔''

اس نے فوراً آنکھیں کھولیں اور حیرت سے کوٹ کو دیکھنے لگی۔ پھر ڈبے سے نکالا اور اپنے ساتھ لگا کر دیکھنے لگی۔ کوٹ اتنا خوبصورت تھا کہ لمحے بھر کو اسے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے پہلے اتنی خوبصورت کھال نہیں دیکھی تھی۔ چمکتی ہوئی..... شاندار اور بالکل سیاہ جس میں گہرے نیلے رنگ کی جھلک تھی۔ اس نے جلدی سے لیبل ڈھونڈا۔ کوٹ ایک مہنگی دکان سے لیا گیا تھا۔ وہ کوٹ کی قیمت کا اندازہ لگانے لگی۔ کوٹ چار سے پانچ ہزار ڈالر سے کم نہیں تھا۔

اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ کوٹ پر سے لمحہ کو بھی نظر ہٹائے۔ مگر اسے پہن کر بھی تو دیکھنا تھا۔ اس نے اپنا سادہ لال کوٹ اتارا اور نیا کوٹ پہن کر دیکھنے لگی۔ جب آئینے میں خود کو دیکھا تو مبہوت رہ گئی۔ کوٹ اسے بالکل پورا تھا۔ وہ اس میں کسی ملکہ کے مانند شاندار، نفیس اور حسین لگ رہی تھی۔ کوٹ پہن کر اسے عجیب سی طاقت کا احساس ہوا۔ اسے لگا وہ یہ کوٹ پہن کر جہاں بھی گئی،



لوگ اس کے گرد شہد کی مکھیوں کی طرح اکٹھے ہو جائیں گے۔ وہ اتنی خوش اور پُرجوش تھی کہ اس کے پاس اپنا احساس بیان کرنے کو الفاظ نہیں تھے۔ مسز بکسی نے وہ لفافہ اٹھا لیا جو ابھی تک ڈبے میں پڑا تھا۔ کھولا تو اس میں کرنل کا خط تھا۔ وہ پڑھنے لگی.....

''میں نے ایک بار تمھیں کہتے سنا تھا کہ تمھیں فَر بہت پسند ہے۔ سو میں نے تمھارے لیے یہ خرید لیا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ بہترین ہے۔ میری طرف سے اسے آخری ملاقات کا مخلصانہ تحفہ سمجھ کر قبول کر لو۔ اپنی بعض ذاتی وجوہات کی بنا پر میں آیندہ تم سے نہیں مل پاؤں گا۔ خوش رہو۔ خدا حافظ۔''

کرنل کے خط نے اسے یک دم جھٹکا پہنچایا۔ ساری خوشی کافور ہوگئی۔ جب اوسان بحال ہوئے، تو سوچنے لگی کہ وہ کرنل کو بہت یاد کرے گی۔ پھر اُداسی سے کوٹ کی فَر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ رفتہ رفتہ اس کی اُداسی خوشی میں بدلی اور وہ مسکرانے لگی اور سوچنے لگی کہ کچھ کھو کر ہی کچھ ملتا ہے۔ اس نے خط تہہ کیا کہ اسے پھاڑ سکے۔ اچانک اس کی نظر پشت پر لکھے اس جملے پر پڑی: ''اپنے شوہر سے کہنا تمھاری خالہ نے یہ کوٹ تمھیں کرسمس کے لیے تحفہ دیا ہے۔'' وہ مسکرائی مگر دوسرے ہی لمحے اس کی مسکراہٹ تھم گئی کیونکہ اس کی خالہ اتنی امیر نہیں تھی کہ اسے اتنا مہنگا تحفہ دے سکے اور یہ بات ڈاکٹر جانتا تھا۔ مگر خالہ نے اسے یہ تحفہ نہیں دیا تھا تو کس نے دیا.....؟

کوٹ پانے کی خوشی میں وہ یہ اہم نکتہ تو بھول ہی گئی کہ وہ اپنے شوہر کو کیا بتائے گی، کہ کوٹ کہاں سے آیا؟ گو کہ وہ اپنے کام سے کام رکھتا تھا مگر کسی کی بیوی ہفتہ وار تعطیل منانے کے بعد چھ ہزار ڈالر کا فَر کا کوٹ پہنے واپس آئے تو لازمی بات تھی کہ اس کے شوہر جیسا مَلن آدمی بھی سوال کیے بنا نہ رہتا۔

ایک لمحے کو اسے کرنل پر غصہ آیا کہ اس نے اتنا مہنگا تحفہ کیوں دیا جسے وہ رکھ نہ سکے۔ مگر وہ کوٹ کسی صورت چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ ''مجھے یہ کوٹ رکھنا ہے ہر

### انوکھا سوال

ایک اُمیدوار کا انٹرویو ہو رہا تھا اور اِسے یقین تھا کہ وہ یہ ملازمت ضرور حاصل کر لے گا۔ انٹرویو کے آخر میں انٹرویو لینے والے صاحب نے پوچھا کہ یہ بتائیں ''گاپو جی گاپو جی گم گم کا کیا مطلب ہے؟''

اُمیدوار نے پہلے تو بہت سوچا پھر مایوسی سے بولا ''اِس کا مطلب ہے کہ مجھے یہ نوکری نہیں مل سکتی۔''

(عمران رشید، لاہور)

صورت۔'' وہ آوازِ بلند بولی۔ پھر وہ سوچنے لگی، گھبراؤ مت، خود کو پُرسکون رکھو اور سوچو، تم ایک ہوشیار عورت ہو۔ تم پہلے بھی ڈاکٹر کو بے وقوف بناتی رہی ہو۔ اب بھی بنا لو گی۔ وہ شخص اپنے دائرے سے نکل کر کچھ نہیں دیکھتا اور سوچتا۔ بہت وقت ہے نیویارک آنے میں، آرام سے بیٹھو اور سوچو۔''

ڈھائی گھنٹے بعد ریل نیویارک پہنچ گئی۔ نیا کوٹ ڈبے میں بند اس کے ہاتھ میں تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہی ڈرائیور سے بولی: ''تم مجھے کسی ایسی جگہ لے جا سکتے ہو جہاں سے اشیا گروی رکھ کر قرضہ ملتا ہو۔''

مسز بکسی ڈبا کاؤنٹر پر رکھ کر کھولتے ہوئے کہنے لگی۔ ''میں بہت لاپروا ہوں۔ میرا پرس کھو گیا ہے۔ آج ہفتہ ہے اور بینک بھی بند ہیں۔ مجھے رقم کی اشد ضرورت ہے۔ آپ یہ گروی رکھ لیں اور مجھے بس اتنے ڈالر دے دیں کہ پیر تک میرا گزارا ہو جائے۔ یہ بہت قیمتی ہے مگر میں اس کے بدلے زیادہ رقم نہیں مانگوں گی۔ دکان دار پہلے تو خاموش کھڑا رہا مگر جب مسز بکسی نے کوٹ کھول کر کاؤنٹر پر رکھا تو اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ فَر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا ''یہ بالکل نیا لگتا ہے۔''

مسز بکسی نے کہا: ''ہاں یہ بالکل نیا ہے، کاش میرے پاس کوئی انگوٹھی یا گھڑی ہوتی تو وہ رہن رکھوا دیتی۔ کیا تم اس کے بدلے مجھے صرف ۵۰/ڈالر دے سکتے ہو۔''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دکان دار فوراً بولا ”ہاں! ہاں کیوں نہیں۔“

مسز بکسی بولی: ”شکریہ تم نے میری بہت مدد کی۔ مہربانی فرما کر پیر تک اس کوٹ کا خاص خیال رکھنا۔“

دکان دار نے دراز کھول کر رسید والی کاپی نکالی۔ پھر قلم ہاتھ میں لے کر پوچھنے لگا ”نام پتا کیا لکھنا ہے مادام!“

مسز بکسی بولی ”نام پتا لکھنا ضروری تو نہیں۔“

دکان دار کندھے اچکاتے ہوئے بولا ”مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر آپ کو رسید بہت سنبھال کر رکھنی پڑے گی۔ کیونکہ یہ گم گئی تو جس کو بھی ملی، آپ کے کوٹ کا دعویٰ کرسکتا ہے۔“

مسز بکسی بولی ”تم فکر نہ کرو میں اسے بہت احتیاط سے رکھوں گی۔“

دکان دار پھر بولا ”وہ شے کیا لکھوں جس پر آپ قرضہ لے رہی ہیں؟ یا وہ بھی نہیں لکھنی؟“

مسز بکسی مسکراتے ہوئے بولی ”وہ بھی رہنے دو تو بہتر ہے۔“

دکان دار نے رقم کے آگے ۵۰/ ڈالر لکھا، درمیان سے رسید آدھی آدھی کرلی، پھر آدھی رسید دراز میں رکھ لی اور باقی کا آدھا حصہ مسز بکسی کو پکڑا دیا۔ پھر جیب سے بٹوہ نکالا، پچاس ڈالر نکال کر مسز بکسی کو پکڑائے اور کہنے لگا کہ ۳/ فیصد فی مہینا کے حساب سے سود ادا کرنا ہوگا اس قرض پر۔

مسز بکسی شکریہ کہتی ہوئی دکان سے نکل آئی۔ دس منٹ بعد وہ گھر پر تھی۔ ڈاکٹر بکسی کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ جھک کر اس کی گال پر بوسہ دیا اور کہنے لگی ”ڈارلنگ! تم نے مجھے یاد کیا؟“

ڈاکٹر بکسی نے اخبار رکھا اور گھڑی دیکھتے ہوئے بولا: ”تم آج کچھ دیر سے آئی ہو۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولی ”اُف یہ سست ریل!“ پھر نڈھال کرسی پر گرتے ہوئے کہنے لگی ”مجھے بہت پیاس محسوس ہورہی ہے۔“

ڈاکٹر بکسی اس کے لیے گلاس میں رس ڈالنے لگا۔

وہ اسے دیکھتے ہوئے سوچنے لگی ”کرنل کے مقابلے میں ڈاکٹر کچھ بھی نہیں۔ کرنل ایک شاندار آدمی تھا جبکہ ڈاکٹر ایک بیزار کن آدمی ہے جو ہمیشہ ایک ہی طرح کے کپڑے پہنتا ہے۔“ ڈاکٹر نے گلاس اسے پکڑایا تو وہ پوچھنے لگی کہ تم نے کل رات کیا کیا؟

ڈاکٹر بولا ”میں نے رات دفتر میں گزاری اور اپنے حساب کتاب کی پڑتال کی“۔

مسز بکسی بولی ”اوہو! تم اتنی محنت کیوں کرتے ہو؟ تمھاری سیکرٹری جو ہے مس پلینٹی، اس سے کیوں نہیں کام کرواتے؟“

”وہ کرتی ہے مگر میں پھر بھی نظر رکھتا ہوں۔“ ڈاکٹر بولا۔

مسز بکسی نے گلاس میز پر رکھا اور اپنا پرس کھول کر ناک صاف کرنے کے لیے رومال نکالنے لگی۔ رسید پر نظر پڑتے ہی وہ بولی ”اوہ! یہ تو میں تمھیں دکھانا بھول ہی گئی۔ یہ ٹکٹ مجھے ٹیکسی سے ملا۔ اس پر کچھ نمبر لکھے تھے۔ میں نے یوں اس لیے اٹھا لیا کہ شاید یہ کوئی لاٹری ٹکٹ ہو اور ہمارا انعام نکل آئے“۔ اس نے رسید ڈاکٹر کو پکڑا دی جو اس کا نہایت باریک بینی سے جائزہ لینے لگا جیسے وہ مریض کے دانت کا لیتا تھا۔ پھر وہ بولا ”تم جانتی ہو یہ کیا ہے؟“

وہ بولی ”نہیں میں نہیں جانتی۔“

اس پر ڈاکٹر بولا ”یہ گروی کی رسید ہے۔“

وہ مایوس ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے بولی ”میں تو سمجھی تھی ہم امیر ہونے والے ہیں۔“

اس پر ڈاکٹر بولا ”اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، یہ بہت کام کی بھی ہوسکتی ہے۔“

”وہ کیسے ڈارلنگ؟“ مسز بکسی بولی۔

ڈاکٹر نے اسے گروی رکھنے کا عمل اور اس کے قواعد بتائے اور کہنے لگا کہ جس کے پاس یہ ٹکٹ ہو وہ گروی شدہ چیز کا دعویٰ کرکے اس کا مالک بن سکتا ہے“۔

مسز بکسی بولی ”تم سمجھتے ہو کہ وہ چیز اتنی قیمتی ہوگی



کہ ہم قرض لی گئی رقم واپس کرکے حاصل کرلیں۔“

اس پر ڈاکٹر بولا ”دیکھو! اس رسید پر قرض کی رقم ۵۰/ ڈالر لکھی ہوئی ہے۔ یہ مطلب کہ جس چیز کی یہ رسید ہے وہ ایک بیش قیمت چیز ہے۔ کیونکہ گروی رکھنے والا چیز کی اصل قیمت کا صرف ۱۰/ فیصد قرض دیتا ہے۔ معنی یہ کہ چیز ۵/ ہزار ڈالر یا اس سے بھی زیادہ قیمت کی ہوسکتی ہے۔“

مسز بکسی بولی ”اوہ! میرے خدا، میں یہ سب نہیں جانتی تھی۔“

”اور تم جانتی ہو مزے کی بات یہ ہے کہ اس رسید پر مالک کا نام پتا اور یہاں تک کہ چیز کا ذکر بھی نہیں اور یہ کوئی معیوب بات بھی نہیں۔ عموماً لوگ شرمندگی محسوس کرتے ہیں لہٰذا اپنی اشیا گروی رکھوا کر نام پتا نہیں لکھواتے۔“

مسز بکسی پُرجوش ہوتے ہوئے بولی ”اس کا مطلب ہے کہ ہم یہ رسید دے کر اس بیش قیمت چیز کے مالک بن سکتے ہیں۔“

ڈاکٹر بکسی مسکراتے ہوئے بولا ”بالکل اور اب یہ رسید ہماری ہے۔“

مسز بکسی سختی سے بولی ”نہیں جناب یہ میری ہے۔ کیونکہ یہ مجھے ملی تھی۔“

ڈاکٹر بکسی بولا ”تمھاری ہو یا میری، ایک ہی بات ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ہم جب چاہیں، صرف ۵۰/ ڈالر ادا کرکے وہ بیش قیمت چیز حاصل کرسکتے ہیں۔“

”اُف کتنا مزا آئے گا۔“ مسز بکسی پرجوش ہوکر بولی ”خاص طور پر جب ہمیں معلوم نہیں کہ چیز کیا ہے۔ وہ کوئی انگوٹھی ہوسکتی ہے، کوئی گھڑی بھی یا شاید کوئی نادر اور نایاب شے جو واقعی خزانے کی طرح قیمتی ہو۔“

ڈاکٹر بکسی مسکرانے لگا، بولا ”ہم نہیں جان سکتے کہ وہ کیا چیز ہے، بہرحال انتظار کرتے ہیں۔“

مسز بکسی بولی ”تم رسید مجھے دو میں پیر صبح کو جا کر لے آؤں گی۔“

ڈاکٹر بولا ”نہیں، میرا خیال ہے، بہتر ہوگا اگر میں لے آؤں۔“

”نہیں یہ کام مجھے کرنے دو۔“ مسز بکسی بولی۔

ڈاکٹر کہنے لگا ”یہ گروی رکھنے والے دکان دار بہت چالاک ہوتے ہیں۔ کہیں تمھیں کوئی دھوکا نہ دے ڈالے۔ اس لیے میں پیر کو کلینک جاتے ہوئے خود ہی لے آؤں گا۔“

”مگر یہ ٹکٹ میری ہے، تم کیوں اکیلے سارا مزا لو؟ مجھے جانا ہے پلیز۔“ مسز بکسی بولی۔

ڈاکٹر بولا ”بھئی جو بھی شے ملی، تمہاری ہی ہے، تم اتنا گھبرا کیوں رہی ہو؟“

”نہیں میں گھبرا تو نہیں رہی، بس ذرا پرجوش ہوں۔“ مسز بکسی بولی۔

ڈاکٹر کہنے لگا ”اگر وہ کوئی مردانہ استعمال کی چیز ہوئی جیسے بٹوہ، مردانہ گھڑی وغیرہ تو......؟ کیونکہ صرف عورتیں ہی تو اپنی اشیا گروی نہیں رکھواتیں، مرد بھی تو رکھواتے ہیں۔“

مسز بکسی بولی ”تب میں تمھیں وہ کرسمس تحفہ کے طور پر دے دوں گی۔ مگر کوئی زنانہ استعمال کی چیز ہوئی تو وہ میری ہوگی۔“

ڈاکٹر بکسی بولا ”کیوں نہ ہم دونوں ساتھ چلیں۔“

مسز بکسی ہاں کہنے لگی تھی کہ اچانک اسے یاد آگیا کہ دکاندار کہیں اسے پہچان نہ لے۔ وہ بولی ”نہیں تم ہی لے آنا، اس طرح زیادہ لطف آئے گا جب میں تمھارا انتظار کروں گی۔ مگر کوئی ایسی چیز ہوئی جو ہم دونوں کے استعمال کی نہ ہوئی تو پھر......“

**تلاش**

لڑکے والے: ”ہمیں ایسی لڑکی کا رشتہ چاہیے جو زیادہ کھاتی پیتی نہ ہو، ہمیشہ چپ رہے اور شوہر کی سنے۔“

لڑکی والے: ”ایسی لڑکی تو آپ کو صرف ہسپتال کے آئی سی یو میں ہی ملے گی۔“

(صدف اجمل، فیصل آباد)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈاکٹر سوچتے ہوئے بولا ''یہ تم نے عقلمندی کی بات کی۔ تب میں دیکھ لوں گا کہ وہ چیز ۵۰ر ڈالر میں بھی لینی چاہیے کہ نہیں۔''

مسز بکسی کہنے لگی ''مگر تم نے کہا تھا کہ وہ ایک بیش قیمت چیز ہے۔''

''بالکل ہوگی، تم پریشان مت ہو۔'' ڈاکٹر بولا اور رسید اپنی جیب میں ڈال لی۔

آخرکار پیر کا دن آ ہی گیا۔ مسز بکسی اپنے شوہر کو ناشتے کے بعد دروازے تک چھوڑنے آئی اور اسے کوٹ پہناتے ہوئے کہنے لگی ''ڈارلنگ اتنی محنت نہ کیا کرو۔ ۶ر بجے تک گھر آجاؤ گے نا.....؟ اور ہاں یاد آیا، وہ رسید کہاں ہے؟ وہاں بھی جاؤ گے؟''

ڈاکٹر بولا ''اوہ میرے خدا، میں تو بھول ہی گیا تھا۔ اچھا کیا یاد کروا دیا، میں وہاں سے ہوتا ہوا جاؤں گا دفتر۔''

مسز بکسی اس کی ٹائی سیدھی کرتے ہوئے بولی ''اگر تمھیں لگے کہ وہ کوئی ایسی چیز ہے جو مجھے پسند آئے گی تو تم دفتر پہنچتے ہی مجھے فون کر کے بتا دو گے نا؟''

''اگر تم چاہتی ہو، تو بالکل بتاؤں گا جناب۔'' ڈاکٹر بولا۔

مسز بکسی بولی ''میری خواہش ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز ہو جو تمھارے لیے ہو۔''

تم بہت اچھی ہو میری جان'' ڈاکٹر نے کہا اور اس کے گال تھپتھپا کر باہر نکل گیا۔

ایک گھنٹے بعد گھنٹی بجی تو مسز بکسی اڑ کر فون تک پہنچی۔ دوسری طرف اس کا شوہر ہی تھا۔ اس نے ابھی صرف اتنا ہی کہا تھا، میں لے آیا ہوں کہ مسز بکسی نے پرجوش ہو کر پوچھا '' کیا وہ کچھ اچھی چیز ہے؟ اور کیا میرے لیے ہے؟''

ڈاکٹر بولا ''بالکل تمھارے لیے ہے اور اتنی اچھی اور شاندار چیز کہ تم اسے دیکھ کر مدہوش ہو جاؤ گی۔''

مسز بکسی بولی ''جلدی بتاؤ نہ کہ وہ کیا ہے؟ مجھے تجسّس میں نہ رکھو۔''

ڈاکٹر ہنستے ہوئے بولا ''تم پاگل ہو جاؤ گی اسے دیکھ کر۔ مجھے تو وہ شخص پاگل لگ رہا ہے جس نے ۵۰ر ڈالر کے عوض اسے گروی رکھوایا، چلو بیگم تم اندازہ لگاؤ، وہ کیا چیز ہے۔''

وہ ایک دم بولنے لگی تھی مگر پھر سنبھل گئی اور خود کو سمجھایا کہ ابھی اسے محتاط رہنا ہے، سو کہنے لگی ''وہ کوئی ہار ہے.....''

''نہیں'' ڈاکٹر بولا۔

''کوئی انگوٹھی'' وہ بولی۔

''نہیں تم تو اس کے قریب بھی اندازہ نہیں لگا رہی۔'' ڈاکٹر بولا ''چلو میں اتنا بتا دیتا ہوں کہ یہ کوئی ایسی چیز ہے جسے تم پہن سکتی ہو۔''

''اچھا..... پھر.....'' وہ اداکاری کرتے ہوئے بولی ''کوئی ٹوپی ہے۔''

''نہیں نہیں'' ڈاکٹر ہنسنے لگا۔

مسز بکسی بولی ''مہربانی کر کے مجھے بتا دو کہ وہ کیا ہے؟''

ڈاکٹر بولا: ''میں تمھیں حیران کرنا چاہتا ہوں، اس لیے شام کو آتے ہوئے اسے ساتھ لے آؤں گا۔''

''نہیں میں دفتر آتی ہوں، مجھ سے شام تک صبر نہیں ہوگا۔'' مسز بکسی بولی۔

''نہیں نہیں تم مت آنا، اس طرح میرا معمول کا کام متاثر ہوگا۔'' ڈاکٹر اسے روکتے ہوئے بولا۔

''کوئی بات نہیں، میں کھانے کے وقفے میں آجاؤں گی۔'' مسز بکسی بولی۔

''نہیں نہیں تم نہیں آنا، میں آج اتنا مصروف ہوں کہ کھانے کا وقفہ بھی نہیں کر سکوں گا۔''

''مگر مجھے آنا ہے'' وہ ضد کرتے ہوئے بولی۔

اس پر ڈاکٹر نے کہا ''چلو تم ڈیڑھ بجے آجانا پھر میں چند منٹ نکال لوں گا۔''

پورے ڈیڑھ بجے مسز بکسی کلینک پہنچی۔ ڈاکٹر نے خود کلینک کا دروازہ کھولا۔ وہ اندر داخل ہوتے ہی بولی ''میں بہت خوش ہوں۔''



ڈاکٹر بولا ''تمھیں ہونا بھی چاہیے، تم ایک خوش قسمت عورت ہو۔ پھر اپنی معاون پلٹنی سے بولا ''جاؤ تم بھی جا کر کھانا کھا لو۔''

لڑکی کے جانے تک وہ خاموش رہا، پھر وہ الماری جس میں اپنا کوٹ اور کچھ اور کپڑے بھی رکھتا تھا، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ''وہ اس میں ہے، تم اپنی آنکھیں بند کرو۔''

مسز بکسی نے آنکھیں بند کیں تو الماری کھلنے اور لباس سرسرانے کی آواز سنی۔ جب ڈاکٹر نے اسے آنکھیں کھولنے کو کہا تو اس نے ہنستے ہوئے کہا، مجھ میں ہمت نہیں ہو رہی اور پھر آہستگی سے ایک آنکھ کھولنے لگی۔ اسی لمحے ڈاکٹر بولا ''فر..... خوبصورت اصلی فر.....''

یہ جادوئی الفاظ سنتے ہی اس نے ایک دم پوری آنکھیں کھول دیں اور کوٹ پکڑنے کو آگے بڑھی..... مگر ..... وہاں کوئی کوٹ نہیں تھا۔ شوہر کے ہاتھ میں صرف گردن پر لپیٹنے والا کھال سے بنا ایک چھوٹا سا اسکارف تھا۔ وہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر پیچھے ہٹی اور بولی ''مجھے لگتا ہے میں چیخوں گی، چلاؤں گی۔''

ڈاکٹر بولا ''کیا ہوا؟ تمھیں یہ پسند نہیں آیا۔'' وہ اسکارف اس کے سامنے لہرانے لگا۔

وہ لڑکھڑاتے ہوئے بولی ''ہاں یہ بہت خوبصورت ہے۔''

ڈاکٹر کہنے لگا ''ہاں یہ اعلیٰ معیار کا ہے۔ رنگ بھی بہت اچھا ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں یہ ۳ر سو ڈالر کا ملتا اگر ہم کسی دکان سے خریدتے، لو اسے پہن کر دیکھو۔'' ڈاکٹر نے بڑھ کر اسکارف اس کی گردن میں ڈال دیا اور پیچھے ہٹ کر تعریف کرنے لگا ''بہت اچھا لگ رہا ہے تم پر..... میری عزیزم آج کل ہر کسی کے پاس فر کا اسکارف نہیں ہوتا۔ جب تم بازار جاؤ تو اسے مت پہن کر جانا ورنہ لوگ سمجھیں گے، ہم ارب پتی ہیں اور ہمیں ہر چیز مہنگی بیچیں گے۔''

مسز بکسی بولی ''میں یاد رکھوں گی تمھاری بات۔''

ڈاکٹر کہنے لگا ''اور ہاں اب مجھ سے کرسمس پر تحفے کی توقع نہ رکھنا کیونکہ انھی ۵۰ر ڈالر سے میں نے تمھارے لیے تحفہ لینا تھا جنھیں ادا کر کے میں یہ مفلر لایا ہوں۔ تم گھر جاؤ اور کھانا کھاؤ۔ میں تمھیں خود کھانے پر لے جانا مگر انتظار گاہ میں مریض میرا انتظار کر رہے ہیں۔''

مسز بکسی دروازے کی طرف بڑھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ میں اس گروی والے دکان دار کو قتل کر دوں گی۔ یہاں سے سیدھا دکان جا کر اسکارف اس کے منہ پر ماروں گی۔ اگر اس نے مجھے میرا کوٹ واپس نہ کیا تو میں اسے واقعی قتل کر دوں گی۔ دروازے سے نکلتے ہوئے اس نے ڈاکٹر کی آواز سنی ''میں رات کو دیر سے واپس آؤں گا، شاید ۹ر بجے تک۔''

''ٹھیک ہے۔'' مسز بکسی بولی اور دروازہ زور سے بند کر کے باہر نکل آئی۔

اسی لمحے ڈاکٹر کی معاون مس پلٹنی کھانے سے واپس آگئی۔ اندر داخل ہوتے ہوئے مسکرا کر مسز بکسی سے بولی ''آج کا دن بہت خوبصورت ہے۔''

مسز بکسی نے رُک کر اسے دیکھا، وہ خوشبوؤں میں نہائی ہوئی بالکل ایک ملکہ کی طرح شاہانہ انداز میں چلی آرہی تھی اور اس نے وہی کالا شاندار فر والا کوٹ پہن رکھا تھا جو کرنل نے اسے دیا تھا۔

## فریاد

فقیر نے راستے میں ایک خاتون کو روک کر کہا:

''خدا کے نام پر دس روپے دے دو، ورنہ مجھے ایسا خوفناک کام کرنا پڑے گا جس کے خیال سے ہی میری روح کانپ جاتی ہے، رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور بدن پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔''

خاتون نے دہشت زدہ ہو کر فقیر کو دس روپے دے دیے اور ڈرتے ڈرتے پوچھا:

''بتاؤ..... وہ کون سا کام ہے؟''

فقیر نے جواب دیا ''محنت مزدوری۔''

(ظہیر عباس، ملتان)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باذوق قارئین
خصوصاً اساتذہ اور طلبہ کے لیے

900 روپے میں سالانہ خریدار بنئے

600 روپے کی بجائے

## سالانہ خریداری کوپن

email: subscription@urdu-digest.com
Ph: 0423-7589957

پہلے سے خریدار حضرات اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں

نام _____

پتہ _____

ای میل _____

موبائل نمبر _____ فیکس نمبر _____

سابقہ خریداری نمبر _____

جی ہاں ☐ میں اُردو ڈائجسٹ کا سالانہ خریدار ماہ ..... سے بذریعہ

☐ بک پوسٹ ☐ رجسٹرڈ ڈاک بننا چاہتا ہوں

بک پوسٹ: سالانہ بدل اشتراک 600 روپے

رجسٹرڈ ڈاک: سالانہ بدل اشتراک 750 روپے

بیرون ملک: سالانہ بدل اشتراک 50 $

300 روپے کی اس بچت سے فائدہ اُٹھانے کا طریقہ کار نہایت آسان ہے۔ اس کوپن کو پُر کر کے بمعہ منی آرڈر/ پے آرڈر/ ڈرافٹ منیجر سرکولیشن اُردو ڈائجسٹ سمن آباد لاہور 54500 کے پتہ پر ارسال کر دیجئے۔

اُردو ڈائجسٹ کرنٹ اکاؤنٹ نمبر 800380 بینک آف پنجاب سمن آباد لاہور برانچ کوڈ 110

آن لائن پیمنٹ کی صورت میں آپ ہمیں بذریعہ فون یا ای میل بھی اطلاع دے سکتے ہیں


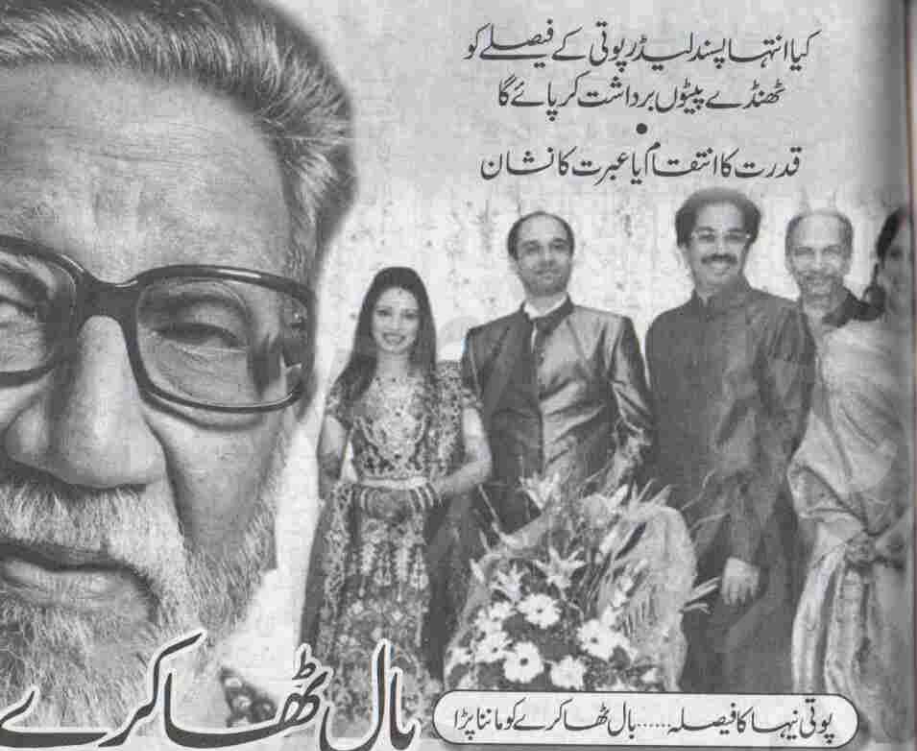

کیا انتہا پسند لیڈر پوتی کے فیصلے کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر پائے گا

•

قدرت کا انتقام یا عبرت کا نشان

پوتی نیہا کا فیصلہ..... بال ٹھاکرے کو ماننا پڑا

# بال ٹھاکرے کے اپنے گھر میں

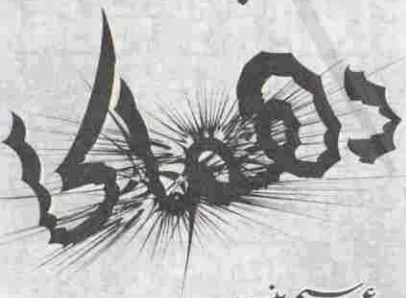

عمر وسیم پنسوتہ

## بدی

بعض اوقات خیر کی کرن نکلتی ہے اور سیاہ تاریک منظر میں سے ایک چھوٹی منی سی صبح کی تخلیق کا باعث بنتی ہے۔ کچھ ایسی صورتحال پچھلے دنوں ہمسایہ ملک بھارت میں وقوع پذیر ہوئی۔

جہاں ۴ دسمبر ۲۰۱۱ء کو انتہا پسند ہندو راہنما بالا صاحب ٹھاکرے کے سب سے بڑے بیٹے ہندو مادیو کی بیٹی نیہا نے گجراتی مسلمان منان سے شادی کر لی۔ نکاح کی تقریب اسلامی طریقے کے مطابق منعقد ہوئی۔ خبر یہ ہے کہ نیہا نے شادی سے قبل باقاعدہ اسلام قبول کر لیا تھا۔ شادی میں نیہا کی والدہ نے مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور بال ٹھاکرے نے بھی شرکت کی۔ ان کے قریبی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوست، جن میں منوہر جوشی، رام کا دام، گوپال سیٹھی اور نیتن سردیسی وغیرہ بھی بھرپور طور پر شریک ہوئے۔ بھارتی ذرائع ابلاغ نے اس خبر کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور ایک پہلو کے لحاظ سے یہ خبر واقعی حیران کن تھی۔ وہ بال ٹھاکرے جنھیں ہندوستان میں ریموٹ کنٹرول اور پاکستان میں دہل ٹھاکرے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کے گھر سے ایسی خبر کا آنا گرم موسم میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ہے۔ بال ٹھاکرے کی پوتی کے شوہر ڈاکٹر منان ایک تو مسلمان اور پھر گجراتی یوں دہرے دشمن ٹھہرے اور اس پر مستزاد منان نے اپنی بیوی کو بھی مسلمان کرلیا۔ خیال رہے کہ بال ٹھاکرے مسلمانوں کے بعد گجراتی نسل لوگوں کو اپنا بڑا دشمن مانتے ہیں۔ یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ بال ٹھاکرے نے شادی قبول کرنے کی اداکاری کی ہے اور پوتی کے فیصلے کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرلیا ہے یا اس خاموشی کے پیچھے اس کا انتقامی ذہن تیزی سے کام کر رہا ہے۔

## بالا صاحب ٹھاکرے کی حقیقت

بال ٹھاکرے ایک متوسط طبقہ کے مراٹھی خاندان میں ۲۳ر جنوری ۱۹۲۶ء کو بمبئی (حالیہ ممبئی) کے علاقے پونا میں بال کیشو سیتارام ٹھاکرے کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک پندرہ روزہ رسالے سے منسلک تھے۔ وہ سماجی راہنما اور ذات پات کے مخالف تھے۔ ۱۹۵۰ء کے عشرے میں ادبی، متحدہ مہاراشٹر تحریک کے روح رواں رہے۔

بال ٹھاکرے نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ممبئی میں ایک رسالے میں مزاحیہ خاکے (کارٹونز) بنانے کے طور پر کیا۔ ان کے بعض خاکے ٹائمز آف انڈیا میں بھی شائع ہوئے۔ انھوں نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر مارمیک نامی ہفت روزہ خاکہ (کارٹون) رسالہ نکالا۔ اس میں انھوں نے غیر مراٹھی گجراتیوں خصوصاً مسلمانوں اور جنوبی ہندوستان سے روزگار کے حصول کے لیے آئے لوگوں کو نشانے کی زد پر رکھا اور یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ممبئی صرف مراٹھی ہندوستانیوں کا ہے۔ یوں انھوں نے اپنے باپ کی طرف سے ورثہ میں ملنے والی صحافت کو مہاراشٹر میں اپنی انتہاپسندی کے لیے استعمال کرنا شروع کردیا۔

## شیوسینا کی بنیاد سے ریموٹ کنٹرول تک

بال ٹھاکرے کے خیالات اور آواز نے جب لوگوں کو متاثر کرنا شروع کیا تو انھوں نے ۱۹ر جون ۱۹۶۶ء کو باقاعدہ شیوسینا کی داغ بیل ڈال دی۔ شروع میں شیوسینا کی منزل صرف مراٹھی ذات کے لوگوں کے حقوق کا تحفظ تھا۔ بعد میں یہ مقصد بڑھتا ہوا ''مہاراشٹر صرف مراٹھیوں کا'' میں تبدیل ہوا (یاد رہے کہ مہاراشٹر ممبئی کی ریاست کو ہی کہا جاتا ہے جواب دو حصوں میں تقسیم ہوگیا ہے۔ اس کی ایک ریاست کا صدر مقام ممبئی ہے۔) ۱۹۸۹ء میں بال ٹھاکرے نے پرانے ہتھیار کے طور پر صحافت کو استعمال کرتے ہوئے شیوسینا کا ترجمان اخبار ''سامنا'' نکالا۔ شیوسینا نے سیاسی طور پر کمیونزم مخالف نظریہ اپنایا اور ایک بڑی انتہا پسند ہندو سیاسی تنظیم بھارتی جنتا پارٹی کے اتحادی بن گئی۔ ان دونوں جماعتوں کا متفقہ ایجنڈا ''ہندو قومیت'' تھا۔ ۱۹۹۵ء کے مہاراشٹر کے ریاستی انتخابات میں انھوں نے حصہ لیا اور ۱۹۹۵ء سے ۱۹۹۹ء تک اقتدار میں رہے۔ انہی دنوں پردے کے پیچھے رہ کر کام کرنے کی سرگرمیوں کی بنا پر بال ٹھاکرے کو ''ریموٹ کنٹرول'' کا نام دیا گیا۔

بال ٹھاکرے کی حرکتوں کی وجہ سے بھارتی الیکشن کمیشن نے ۲۸ جولائی ۱۹۹۹ء کو ۱۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء سے ۱۰ر دسمبر ۲۰۰۵ء تک ۶ر سال کے لیے ان کے انتخاب لڑنے پر پابندی عائد کردی۔ شیوسینا نے تمام غیر ہندوؤں اور بالخصوص مسلمانوں کو جو ۱۹۶۰ء اور ستر کے عشرے میں بنگلہ دیش سے ممبئی آئے تھے، کو ممبئی چھوڑنے کا کہا اور حکم نہ ماننے پر سخت نقصان کی دھمکی دی۔

## خودکش اسکواڈ سے بابری مسجد تک

۲۰۰۲ء میں بال ٹھاکرے نے ہندوؤں کے خودکش اسکواڈ کا اعلان کیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف استعمال



ہوگا۔ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ شیوسینا نے ۴۰ لاکھ مہاجر مسلمانوں کو مہاراشٹر سے نکلنے پر مجبور کیا اور یہ نعرہ بلند کیا کہ یہاں سب سے پہلے ہندو مذہب ہے، اس کے بعد دوسرے مذاہب کے بارے میں سوچا جائے گا۔

۱۱ر نومبر ۲۰۰۹ء کو بال ٹھاکرے نے مشہور بلے باز سچن ٹنڈولکر کے ایک انٹرویو کو جس میں انھوں نے کہا تھا کہ ''ممبئی کا تعلق انڈیا سے ہے اور میں مہاراشٹرین ہوں اور مجھے اس پر بہت زیادہ فخر ہے لیکن میں سب سے پہلے ہندوستانی ہوں'' سخت اور کڑی تنقید کا نشانہ بنایا اور کہا کہ ممبئی سے تعلق رکھنے والا صرف مہاراشٹرین ہی ہوسکتا ہے۔

اسی طرح فروری ۲۰۱۰ء میں فنکار شاہ رخ خان کی فلم ''مائی نیم از خان'' کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا جس کی وجہ سے بھارتی حکومت کو ایک دفعہ پھر ہنگاموں کا خطرہ لاحق ہوگیا۔

اتر پردیش اور بہار سے آئے لوگوں کے بارے میں لکھتے ہوئے ٹھاکرے نے کہا ''ایک بہاری سو بیماری۔'' ۱۱ر جولائی ۲۰۰۶ء کو ممبئی میں ٹرین کو بم سے اُڑانے کی کوشش کو مسلمانوں سے جوڑا گیا۔ اب ثابت ہوچکا ہے کہ یہ شیوسینا اور ہندو انتہا پسندوں کی مسلمانوں کے خلاف سازش تھی۔ سب سے خطرناک و مکروہ عمل شیوسینا اور بھارتی جنتا پارٹی کی طرف سے ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو ایودھیا میں قائم ۱۶ر ویں صدی کی عظیم بابری مسجد کی شہادت تھی اور یوں مسلمانوں کے ساتھ تصادم کو دوبارہ بھڑکایا گیا اور اس طرح کے گھناؤنے ہتھکنڈے اب اکثر استعمال کیے جاتے ہیں۔

## ''ہٹلر میرا آئیڈیل ہے''

بال ٹھاکرے نے اپنی ذہنیت کی بھرپور عکاسی کرتے ہوئے کہا ''میں ہٹلر کی عظمت کو سلام کرتا ہوں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی شرم نہیں آتی، میں اس کے کام کرنے کے تمام طریقوں سے مکمل متفق ہوں کیونکہ وہ ایک شاندار منتظم اور مقرر تھا۔ میں محسوس کرتا ہوں مجھ اور ہٹلر میں بہت ساری چیزیں مشترک ہیں۔ کیا ہندوستان کو ایک حقیقی کی آمر کی ضرورت نہیں جو اصولوں کو ساتھ لیے ہوئے سخت گیر انداز میں حکمرانی کرے؟'' بال ٹھاکرے نے متعدد بار اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ ہاں میں ایک آمر ہوں جس طرح ہٹلر تھا اور بھارت کو اس کی ضرورت ہے۔

پاکستان کے بارے میں اپنی مخاصمت کا اظہار شیوسینا نے آئی سی سی ورلڈ کپ کرکٹ ٹورنامنٹ کے موقع پر کیا۔ پارٹی کے اہم ترین راہنما منوہر جوشی نے کہا کہ اگر پاکستانی ٹیم فائنل میں پہنچی (میچ ممبئی میں ہونا تھا) تو فیصلہ بال ٹھاکرے کریں گے کہ میچ ہوگا یا نہیں۔ یہ تو تصویر کا ایک چھوٹا سا عکس ہے۔ اس کے علاوہ بال ٹھاکرے، شیوسینا اور دیگر انتہا پسند ہندوؤں کی سرگرمیوں اور اہداف ایک الگ باب ہے۔

بال ٹھاکرے کی پوتی نیہا کا یہ فیصلہ اس گھر میں ایک بڑے دھماکے کے طور پہ سنا گیا۔ نیہا جس کا باپ زندہ نہیں ہے، بال ٹھاکرے کی بہت لاڈلی ہے۔ ایک انتہاپسند لیڈر پوتی کے فیصلے سے مات کھا گیا۔ اسے نہ صرف پوتی کو مسلمان لڑکے منان کے ساتھ شادی پہ آشیرباد دینا پڑا بلکہ پوری طرح شادی میں شریک بھی ہوا۔ بال ٹھاکرے کا پہناوا، انداز واطوار، میک اپ اور لباس بذاتِ خود ایک دلچسپ موضوع ہے۔ بھارت میں اب بال ٹھاکرے کی آمریت کے خلاف صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ یہ وہ آمر ہے جس نے لسانیت، ذات برادری، مذہب اور دیگر ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرکے نہ جانے کتنے گھروں کا سکون غارت کیا، کتنے بچوں کو یتیم، کتنی بیویوں کو بے آسرا، کتنی سہاگنوں کے سہاگ اور کتنی ماؤں کے لختِ جگر چھین لیے۔ قدرت نے اب اسی کے گھر سے اس کے نظریات مخالف عمل کے ذریعے مسلمانوں اور گجراتیوں کو نومسلم نیہا کے ساتھ ملا کر ایک نئی صورت حال سے آشنا کیا ہے۔ دنیا کے نزدیک اس کی وجہ بال ٹھاکرے کا اپنی تنظیم کے بعد گھر کے معاملات پر گرفت کم ہونا ہوسکتا ہے۔ مگر بال ٹھاکرے کے مزاج اور طرزِ سیاست سے کچھ بعید نہیں کہ کچھ عرصے بعد وہ اپنی ''بیوہ پوتی'' کے سر پہ ہاتھ رکھے مگرمچھ کے آنسو بہا رہا ہو۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات سے اقتباسات

# کمالِ تقویٰ پیدا کرنے والی ۱۰ باتیں

## جو عمل شریعت کے مطابق ہے، وہ ذکر میں شامل ہے

حافظ افروغ احسن

حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ نے گیارھویں صدی کے شروع میں اکبری دور کی پیدا شدہ بدعتوں، گمراہیوں اور کجرویوں کے خلاف علم جہاد بلند کر کے اس خطے کو دین اور سنت رسولؐ کی نورانی قندیلوں سے منور کیا۔ انہوں نے علمی، فکری، اخلاقی، روحانی اور سیاسی نظام کو اسلام کی تعلیمات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ایک ایسی طاقتور، جاندار اور تاریخ ساز تحریک برپا کی جس کے اثرات معاشرے کے ہر طبقے اور ہر شعبے نے محسوس کیے اور اثر پذیر بھی ہوئے۔

حضرت مجدد نے اصلاحِ حالات کے لیے جہاں درس و تدریس، ارشاد و تبلیغ اور وعظ و نصیحت سے کام لیا، وہیں بذریعہ خطوط اپنے ارادت مند امرا اور سرداروں کو جو صاحبِ اختیار اور اربابِ اختیار تھے، نظامِ حکومت کو اسلام کے بیان کردہ اصولِ عدل و انصاف کے مطابق ڈھالنے کے اہم اور عظیم کام کی طرف متوجہ کیا۔

ذیل میں ہم آپ کے مکتوبات سے چند اقتباس پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں:

### دنیا کیا ہے؟

ہر وہ شے جو تم کو اللہ کی یاد سے غافل کر دے اور غیر اللہ میں مشغول کر دے، خواہ وہ مال و دولت ہو یا جاہ و ثروت یا ننگ و ناموس، یاد رکھو جو چیز دنیا سے متعلق ہے وہ انسان کے حق میں بلائے جان ہے۔ دنیا والے جب تک دنیا میں رہیں، پریشان رہتے ہیں اور مرنے کے بعد انھیں حسرت و ندامت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

(مکتوب نمبر ۱۹۷ بنام محمود پہلوان)

### ذکرِ الٰہی کا مفہوم

یاد رکھو! جو عمل شریعت کے مطابق ہے، وہ ذکر میں داخل ہے، اگرچہ خرید و فروخت ہی کیوں نہ ہو۔ پس تمام کاموں میں شریعت کے احکام کو پیش نظر رکھنا چاہیے، تاکہ ہر عمل ذکر بن جائے۔ ذکر سے مقصد یہ ہے کہ خدا سے غفلت دور ہو جائے۔ جب ہر کام اور ہر معاملے میں احکام شریعت کو مدنظر رکھو گے تو غفلت کا ازالہ ہو جائے گا اور ذکرِ الٰہی کی نعمت حاصل ہو جائے گی۔

(دفتر دوم مکتوب نمبر ۲۵ بنام خواجہ شرف الدین حسین)

### تقویٰ کی حقیقت

بعض علمائے حقیقت و معرفت کا قول ہے کہ جب تک بندہ اپنے اوپر دس چیزوں کو لازم نہ کرے، اس میں تقویٰ کا کمال پیدا نہیں ہو سکتا:۔

(۱) اپنی زبان کو غیبت سے بچائے۔
(۲) بدگمانی سے دور رہے۔
(۳) لوگوں سے مسخری نہ کرے۔
(۴) حرام سے بچے۔
(۵) ہمیشہ سچ بولے۔
(۶) ہر وقت اللہ کے احسانات کا اعتراف کرتا رہے۔
(۷) دولت اللہ کی راہ میں خرچ کرتا رہے۔
(۸) اپنے لیے بڑائی طلب نہ کرے۔
(۹) نمازوں کی حفاظت کرے۔
(۱۰) مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ قائم رہے۔

(دفتر دوم مکتوب نمبر ۶۶ بنام مرزا عبدالرحیم خان خاناں)

### لاہور شہر کی اہمیت

مجدد صاحب کے مرید سردار قتیج خان گورنر لاہور تھے۔ انھوں نے اپنے علاقے میں شرعی احکام کا نفاذ کیا۔ اس پر آپ انھیں مبارک باد دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ کی وجہ سے لاہور میں بہت سے احکام شرعی جاری ہو گئے اور دین کو تقویت حاصل ہوئی۔ میرے نزدیک ہندوستان کے دوسرے شہروں کی نسبت لاہور ارشاد و ہدایت کے لیے مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی لیے اس شہر کی برکت دوسرے شہروں میں بھی سرایت کر جاتی ہے۔ اگر یہاں دین کی اشاعت کی جائے تو دوسرے شہروں میں بھی اس کا اثر مرتب ہوگا۔

(روحانیت کا گلزار کہکشاں صفحہ ۸۷)

### علمائے سوء کی مذمت

> "جو علماء زر، زمین اور زن سے محبت کرتے ہیں، ان کے علم سے دوسروں کو فائدہ تو پہنچ سکتا ہے مگر اُنہیں نہیں"

واضح ہو کہ علماء کے لیے دنیا کی لذتوں کی طرف رغبت کرنا نہایت معیوب ہے۔ جو علماء زر، زمین اور زن سے محبت کریں، ان کے علم سے ممکن ہے دوسروں کو فائدہ پہنچے مگر انھیں کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا۔ اگر ان کی ذات سے دین یا ملت کو کوئی تقویت حاصل ہو جائے تو یہ کوئی قابل قدر بات نہیں۔ کیونکہ کبھی کبھی اللہ ایک فاسق اور فاجر سے بھی اپنے دین کی تائید و حمایت حاصل کر لیتا ہے۔

دنیا پرست علما، پارس کے پتھر کے مانند ہیں کہ تانبا اور لوہا اگر ان سے مس ہو تو سونا ہے مگر وہ خود پتھر ہی رہتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زمانے میں شریعت کے مقابلے میں جو منافقت ہو رہی ہے اور ہر وہ خرابی جو اسلام کی ترویج و اشاعت میں رونما ہے، یہ سب انہی علمائے سوء کی نحوست اور بدبختی کی وجہ سے ہے اور ان کی نیتوں کے فساد کا نتیجہ ہے۔

(مکتوب نمبر ۳۳ بنام ملا جی محمد لاہور)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سیاست میں آنے کی خواہش مند

# ایک سعودی شہزادی

سعودی شہزادی امیرہ کا احوال، وہ اپنے ملک کی خواتین کی زندگی میں بہتری کی خاطر ٹوئٹر استعمال کرتی ہے۔ جس طرح کی وہ باتیں کرتی ہے، دوسرے لوگوں کو ایسی باتوں پہ دھمکیاں ملتی ہیں

نوید انور

اُس وقت جب مشرق وسطیٰ کے بڑے حصے میں گزشتہ چند برسوں سے انقلابی تبدیلیوں کی ہلچل مچی ہوئی ہے، سعودی عرب کا حکمران طبقہ اصلاحات اور ان پر ردعمل کی مخالفت یا حمایت کے بارے میں گومگو کی کیفیت میں ہے۔

ایک طرف جہاں انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والوں نے ملکی قوانین اور اداروں کو سخت سماجی روایتوں کے اثر سے نکالنے کے لیے احتجاج کے لیے سوشل میڈیا کو ذریعہ بنایا ہے تو دوسری طرف قدامت پسندوں نے ''سٹیٹس کو'' میں کسی نمایاں تبدیلی کی مخالفت کا عزم ظاہر کیا ہے۔

ولی عہد سلطان بن عبدالعزیز السعود کی وفات سے قدامت پسندوں کی طاقت میں اضافہ دیکھنے میں آ رہا ہے۔ اسی کے ساتھ بیمار شاہ عبداللہ نے اپنے بھائی وزیر داخلہ شہزادہ نائف جو کہ انتہائی قدامت پسند لوگوں کے

دوست سمجھے جاتے ہیں' کو تخت کا جانشین مقرر کر دیا ہے۔

اس صورت حال سے قطع نظر شاہ کے بھتیجے ارب پتی سعودی شہزادہ الولید بن طلال کی ۲۷ سالہ چوتھی بیوی شہزادی امیرہ التویل نے' حکمران خاندان کے اس گروہ کا حصہ ہوتے ہوئے بھی جو ''سٹیٹس کو'' برقرار رکھنا چاہتا ہے' اپنی سماجی حیثیت کو خواتین کے حقوق کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ امیرہ ٹوئٹر جنریشن کی نمایاں رکن بھی ہے۔

وہ کہتی ہیں کہ ہمیں مساوی حقوق چاہئیں، ہمیں وہ سب کچھ چاہیے جو خدا نے ہمیں دیا ہے۔ یعنی برابر کے شہری کی حیثیت سے احترام اور عزت کی زندگی!

شاہ عبداللہ نے بذاتِ خود خواتین کے حقوق کے لیے کچھ ابتدائی اقدامات کیے ہیں۔ دو سال قبل انھوں نے اس وقت قدامت پسندوں کو ناراض کر لیا جب انھوں نے یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم کا آغاز کیا اور حال ہی میں انھوں نے حکم جاری کیا کہ ۲۰۱۵ء کے بلدیاتی انتخابات میں خواتین ووٹ کا حق استعمال کر سکتی ہیں اور کسی عہدے کے لیے امیدوار بھی بن سکتی ہیں۔ ۲۰۱۵ء تک کی تاخیر کا کسی حد تک مقصد قدامت پسندوں کی ناراضی سے بچنا ہے۔

سلطان کی وفات کے بعد بعض حقوق کے لیے سرگرم افراد اس حوالے سے پریشان ہیں کہ کیا پچھلے چند سالوں کی بہتری خواتین پر پابندیوں کے کئی عشروں کے دوران آزادی کا ایک واحد مختصر عرصہ ہوگی۔ لیکن شہزادی پُر اُمید ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ خواتین پیچھے کی طرف جانا پسند نہیں کریں گی۔ کیا دنیا کے امیر ترین شخص کی بیوی کچھ سالوں میں خود کو سعودی سیاست میں آتا دیکھ رہی ہے۔ شاید ایسا ہی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اگر جو کچھ میں محسوس کر سکوں اور سوچ سکوں اور اس کا اظہار بھی ممکن ہو تو میں سیاست میں آنا پسند کروں گی۔

لیکن ابھی ان کا خیال ہے وہ ولید بن طلال فاؤنڈیشن کی وائس چیئر پرسن کی حیثیت سے خواتین کے لیے زیادہ بہتر کام کر سکتی ہیں۔ یقیناً ایک سعودی شہزادی جس کا خاوند بااثر اور امیر شخص ہو، اصلاحات کی بات دوسرے افراد کی نسبت زیادہ بے خوفی سے کر سکتی ہے۔

اسی طرح کے خیالات کا اظہار خواتین کے حقوق کے لیے کام کرنے والے ایک کارکن نے کیا ''شہزادی جس طرح کی باتیں کرتی ہیں، دوسرے لوگوں کو ایسی باتیں اور کام کرنے پر ہر طرح سے دھمکایا جاتا ہے۔''

حقوقِ انسانی کے لیے سرگرم افراد، خواتین کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کی کہانیاں، امیرہ کے ٹوئٹر اکاؤنٹ تک پہنچاتے اور شہزادی سے درخواست کرتے ہیں کہ ان ناانصافیوں کا جائزہ لیں۔

ستمبر میں امیرہ نے آن لائن اعلان کیا کہ شاہ نے ایک جج کی طرف سے جدہ کی ایک خاتون کو دی جانے والی دس کوڑوں کی سزا کو ختم کر دیا۔ اس خاتون نے خواتین کی ڈرائیونگ پر پابندی قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔

شہزادی کا کہنا ہے کہ ڈرائیونگ پر پابندی کا قانون خواتین کے لیے نقصان دہ ثابت ہو رہا ہے۔ اس نے ایسی بے شمار خوفناک کہانیاں سنی ہیں جن میں ڈرائیور نے خواتین کو جسمانی طور پر ہراساں کیا اور زیادتی کا نشانہ بنایا۔ اس نے کہا کہ بہت سی خواتین ڈرائیور رکھنے کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔

وزارتِ محنت نے حال ہی میں خواتین کے چیمبر آف کامرس کے ایک وفد سے کہا کہ کمپنی کی طرف سے ٹرانسپورٹ کا بندوبست اور مینوفیکچرنگ میں خواتین کی شمولیت بڑھانے کے لیے کوٹہ مقرر کرنے سے متعلق تجاویز سطحی نوعیت کی ہیں۔ اس کے ردِعمل میں امیرہ نے ٹوئٹر پر کہا کہ صنعتوں میں خواتین کی ترقی کو روکنا اور خواتین کے بارے میں کام کرنے والوں کی تجاویز نہ سننا سطحی بات ہے۔ یہ فیصلہ ہمارے منہ پر طمانچے کے مترادف ہے لیکن ہم اپنی کوشش ترک نہیں کریں گے۔ امیرہ نے کہا، اگر رکاوٹیں پیدا کی گئیں تو ہم ان سے نمٹنے کے لیے راستہ ڈھونڈ لیں گے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# بیمار کا حال اچھا ہے

آرٹ بکوالڈ

ممتاز مزاحیہ امریکی کالم نگار کے قلم سے چلبلی تحریر

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ کچھ عرصہ قبل مجھے ٹھنڈ لگ گئی۔ یہ ایسی ہی ٹھنڈ تھی جس کا نشانہ ہر خاص و عام بنتا ہے۔ پہلے میں سوں سوں کرنے لگا، پھر کھانسی آئی اور آخرکار بستر پر لیٹ نڈھال سا بیگم کو تکنے لگا۔

جب بیگم نے کچھ ناراضی، کچھ بے زاری سے نظریں پھیریں، تو میں نے دفتر فون کیا۔ سیکرٹری کو بتایا کہ میری طبیعت کچھ خراب ہے، لہٰذا آج دفتر نہیں آسکوں گا۔

سیکرٹری بولی ''آج کل آٹھ گھنٹے کی بیماری زوروں پر ہے۔ کئی لوگ آٹھ گھنٹے بیمار رہ کر صحت یاب ہو چکے۔ آپ بھی کل بھلے چنگے ہوں گے۔''

میں نے سرشاری سے سوچا کہ میں یہ فارغ وقت بستر پر لیٹے اچھی سی کتاب پڑھنے میں گزاروں گا۔ پھر یاد آیا کہ بیس بال کی دو بہترین ٹیموں کا جوڑ بھی پڑنے والا ہے۔

تھوڑی دیر بعد میری چھوٹی بہن کا فون آیا۔ میں نے اُسے بتایا ''آج کل آٹھ گھنٹے کی بیماری زوروں پر ہے اور میں اسی کا نشانہ بنے گھر براجمان ہوں۔''

وہ متوحش آواز میں بولی ''آپ نے بیماری کی تشخیص تو صحیح کی ہے نا؟ ممکن ہے کہ آپ کو چوبیس گھنٹے والا وائرس چمٹ گیا ہو۔ پچھلے ہفتے اسی نے آپ کے بھانجے کو دو دن لٹائے رکھا تھا۔ آپ کا بخار کتنے درجے ہے؟''

بہن کی بات سن کر محسوس ہوا کہ واقعی مجھے اچھا خاصا بخار ہے۔ میں نے اندازاً ۱۰۲ ڈگری بتایا۔

''اوہو، ارے آپ تو ٹھیک ٹھاک بیمار ہیں۔ یہ وہی چوبیس گھنٹے والا وائرس ہے۔ آپ یخنی پیجیے اور اسپرین لیں، دو دن میں تندرست ہو جائیں گے۔''

میں نے چوبیس گھنٹے بستر پر گزارنے کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا تھا لیکن اس وائرس سے کیسے لڑتا؟ چنانچہ ہتھیار ڈال دیے۔

دس منٹ بعد میری دوسری چھوٹی بہن کا فون آیا ''ارے بھئی، ریڈتھ نے بتایا کہ تمھیں چوبیس گھنٹے والا



## آرٹ بکوالڈ

آرٹ بکوالڈ ۱۹۲۵ء میں امریکہ میں پیدا ہوئے۔ آسٹریا سے آئے ہوئے یہودی گھرانے سے تعلق تھا۔ ''واشنگٹن پوسٹ'' میں کالم نگاری کا آغاز کیا اور بحیثیت مزاح نگار مقبول ہوئے۔ پہلے کالم نگار ہیں جن کا کالم سیکڑوں اخبارات نے ایک ساتھ شائع کرنا شروع کیا۔ عروج کے زمانے میں ''۵۵۰ اخبارات'' بکوالڈ کا کالم شائع کرتے تھے۔ ۱۹۸۲ء میں پلٹزر انعام ملا۔ ۲۰۰۷ء میں چل بسے۔ بکوالڈ کے کالم آج بھی اپنے بے داغ و تیکھے مزاح کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں، جو قاری کو مسکرانے پر مجبور کر دیتا ہے۔

وائرس چمٹ گیا ہے۔''

میں نے کہا ''مجھے نہیں معلوم کہ یہ وائرس ہے یا محض عام بخار!''

''ذرا دیکھو، تمھاری ناک سوں سوں کرنے سے سرخ تو نہیں ہو گئی؟''

''جی ہاں، سرخ تو ہے۔''

''ارے پھر تو تمھیں اڑتالیس گھنٹے والا وائرس چمٹ چکا ہے، یہ اس کی کارستانی ہے۔''

''مگر میری سیکرٹری نے تو کہا تھا کہ یہ آٹھ گھنٹے والا وائرس ہے۔''

''آٹھ گھنٹے والا وائرس دوسرا ہے۔ وہ چمٹے، تو طبیعت ضرور ناساز ہوتی ہے، مگر وہ ناک کو سرخ چقندر نہیں بناتا۔ کبھی کبھی چوبیس گھنٹے والا وائرس بھی ناک لال کر ڈالتا ہے لیکن وہ کھانسی بہت پیدا کرتا ہے۔ اڑتالیس گھنٹے والے وائرس کا کمال یہ ہے کہ وہ چھینکنے، کھانسنے اور پسینہ پسینہ ہونے پہ مجبور کر دیتا ہے۔ مریض کو پھر چار دن بستر پر رہنا پڑتا ہے۔''

''لیکن میں چار دن بستر پر نہیں گزار سکتا۔''

''اب یہ تمھاری مرضی۔ میں تو مشورہ ہی دے سکتی ہوں، چاہو تو اس پر عمل کرو، یا نہ کرو۔''

فون رکھ کر میں مطمئن ہو گیا کہ اب میں اپنی مرضی سے بستر پہ وقت گزار سکوں گا لیکن میری سیکرٹری نے میرے دوست ہیلی کو خبر کر دی کہ ناچیز کی طبیعت خراب ہے۔ ظاہر ہے، اس نے بھی میری خیریت دریافت کرنی تھی۔

موصوف نے بتایا ''مجھے تمھاری حالت کا کچھ کچھ اندازہ ہے۔ اب تم دو ہفتے تک بستر سے نہیں اٹھ سکتے۔ دراصل یہ موسم خزاں کی ٹھنڈ ہوتی، تو تم پانچ، چھ دن میں صحت یاب ہو جاتے۔ مگر تمھیں موسم سرما کی ٹھنڈ لگی ہے۔ اس سے بہ آسانی دامن چھڑانا بڑا کٹھن ہے۔ تم میری بیٹھی آواز سن رہے ہو نا۔ ایک ماہ ہو گیا میرا فلو نہیں اترا!''

''لیکن یہ عین ممکن ہے کہ میرا بخار چوبیس گھنٹے میں اتر جائے۔''

''یہی تو اس کا خطرناک پہلو ہے۔ انسان سمجھتا ہے کہ یہ کافور ہو گیا لیکن ایک ہفتے بعد زیادہ خوفناکی سے بندے کو آ دبوچتا ہے۔''

واشنگٹن میں خبر بڑی تیزی سے پھیلتی ہے، چنانچہ جب میرے دوسرے دوست الفریڈ نے فون کیا، تو اس کا اندازِ تکلم نپا تلا اور براہ راست تھا ''ہیلی نے بتایا ہے کہ تمھیں ناقابل علاج نمونیا چمٹ چکا اور......''

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''یا پھر آٹھ گھنٹے کی بیماری، یا چوبیس گھنٹے کا وائرس، یا اڑتالیس گھنٹے کا مرض یا ایسا فلو جو دو ہفتے میری جان نہیں چھوڑے گا۔ فی الحال میں اگلی رائے کا انتظار کر رہا ہوں۔''

''کس سے؟''

''اپنے ڈاکٹر سے! اس کا کہنا ہے کہ خبر ابھی گھوم رہی ہے، اُسے مزید گھومنے دو۔''

''کون سی خبر؟''

''یہی خبر کہ میں بیمار ہو گیا۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اس نے آج تک کسی مریض کی بیماری کو اتنے روپ بہروپ بدلتے اور اتنی تیزی سے شہر میں گھومتے نہیں دیکھا۔''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رحم دلی کے روح پرور واقعات

# کرو مہربانی

## اہل زمین پر!

رضوان علی شاہ

انسانیت پر پختہ ایمان کر دینے والی مختصر مگر پُراثر جگ بیتیاں

**جب** شگفتہ کو معلوم ہوا کہ اس کا اٹھارہ سالہ بیٹا خون کے کینسر میں مبتلا ہے، تو اس کے غم و اندوہ کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ پھر شگفتہ نے شوہر کے ساتھ یہ تہیہ کرلیا کہ وہ اپنے اکلوتے بچے کی جان بچا کر رہے گی۔

چنانچہ اگلے ایک ہفتے تک والدین بیٹے کو بغرض علاج اسپتال لے کر جاتے رہے۔ صبح جانا ہوتا، تو شام کو واپسی ہوتی۔ گھر واپس پہنچ کر شگفتہ پھر روزمرّہ کے کام مثلاً کھانا پکانا، کپڑے دھونا، صفائی وغیرہ انجام دیتی اور پھر تھکی ہاری بستر پہ پڑ جاتی۔ شدید مصروفیت اور پھر زبردست تناؤ کے باعث تیسرے ہی دن وہ بے حال ہوگئی۔ اس دن شگفتہ نے بمشکل اپنے کام نمٹائے اور لیٹتے ہی نیند کی وادی میں پہنچ گئی۔

اگلے دن اسپتال جانے سے قبل شگفتہ پڑوسن کے گھر پہنچی، حسبِ معمول اُسے چابی دی اور کہا کہ اگر کوئی ماسی نظر میں ہو، تو بتاؤ تاکہ وہ گھریلو کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹا سکے۔ پڑوسن نے وعدہ کیا کہ جیسے ہی اسے کوئی کام کرنے والی ملی، تو اسے ضرور خبر کرے گی۔ شگفتہ پھر شوہر کے ہمراہ اسپتال پہنچ گئی۔ وہ بیٹے کی طرف سے فکرمند تھی ہی، اب یہ خیال اسے دق کرنے لگا کہ شام کو گھر پہنچ کر سارے کام اسے کرنے پڑیں گے۔ دراصل شگفتہ کا شوہر باہر کا کھانا نہیں کھاتا تھا۔ لہٰذا کھانا ہر صورت پکانا پڑتا۔

لیکن اس شام شگفتہ گھر پہنچی، تو گھر صاف ستھرا دیکھ کر حیران رہ گئی۔ لگتا تھا کہ صفائی کی پری دہاں پھر گئی ہے۔ پھر فریج کھولا، تو پتا چلا کہ آج اس نے جو سبزی پکانی تھی، وہ پکی رکھی ہے۔ کمرۂ استراحت میں جو گندے کپڑے پڑے تھے، وہ بھی دھل کر صحن میں لٹکے سوکھ رہے تھے۔ کمرۂ طعام میں میز پر پڑے گلدان میں تروتازہ پھول ان کے منتظر تھے۔ وہیں انھیں یہ اطلاع بھی لکھی ملی کہ میاں مٹھو کو چوری کھلا دی گئی ہے۔

شگفتہ سارا ماجرا دیکھ کر حیرت زدہ تھی، تحریری اطلاع پڑھ کر معلوم ہوا کہ یہ صفائی کی پری دراصل اس کی ہمدرد اور مصیبت میں کام آنے والی پڑوسن ہے۔ چونکہ چابی اسی کے پاس ہوتی تھی لہٰذا پڑوسن نے جب پڑوسیوں کو دکھ میں مبتلا اور بہت مصروف دیکھا، تو ان کی مدد کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ شگفتہ اور اس کے شوہر نے پڑوسن کو بہت سراہا اور دعاؤں سے نوازا۔ اس رات شگفتہ پُرسکون نیند سوئی اور صبح اٹھی، تو تھکن اڑن چھو ہو چکی تھی۔

وہ پھر پڑوسن کا شکریہ ادا کرنے گئی۔ پڑوسن نے بتایا کہ بحیثیت پڑوسی اس کا فرض تھا کہ وہ شگفتہ کے کام آتی اور یہ کوئی اچھنبے والی بات نہیں۔ بعدازاں جب تک کام کرنے والی دستیاب نہیں ہوئی، رحم دل پڑوسن ہی شگفتہ کے گھر بیشتر کام کرتی رہی۔

اس واقعہ کو ایک سال بیت چکا۔ شگفتہ کے بیٹے کا علاج جاری ہے اور وہ روبہ صحت ہے۔ والدین کو اُمید واثق ہے کہ ایک دن ان کی سعی رنگ لائے گی اور وہ صحت یاب ہوجائے گا۔ وہ خصوصاً آج بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں جس نے انھیں بڑے ہمدرد پڑوسیوں سے نوازا جو مشکل وقت میں ہمیشہ ان کے کام آتے ہیں۔

## اجنبی کی مہربانی

پچھلے مہینے لاہور میں مقیم نسرین کو اچانک اطلاع ملی کہ اسلام آباد میں مقیم اس کے ماموں وفات پاگئے ہیں۔ نسرین کا شوہر بیرون ملک مقیم تھا۔ چنانچہ افراتفری میں اس نے اپنے دونوں بیٹوں، چار سالہ فیصل اور چھ سالہ ولید کو ساتھ لیا اور کار لے کر نکل کھڑی ہوئی۔

جب نسرین شہر کے باہر واقع ٹول پلازا پہنچی، تو اس پر انکشاف ہوا کہ وہ گھبراہٹ کی وجہ سے اپنا پرس گھر بھول آئی ہے۔ اسی دوران پیچھے کاروں کی قطار لگ گئی۔ نسرین کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور وہ گھبرا کر ڈیش بورڈ اور گلوبورڈ دیکھنے بھالنے لگی کہ شاید چند سکے مل جائیں اور وہ ٹول ٹیکس ادا کردے۔

ٹول ٹیکس والا حیرت سے اسے تک رہا تھا۔ گھبراہٹ کے مارے نسرین کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوگئے۔ اسی وقت پچھلی کار سے ایک آدمی اترا، ٹول ٹیکس والے کو مطلوبہ رقم دی، ٹکٹ لیا، نسرین کو دیا اور جلدی سے اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ نسرین نے چارو ناچار کار آگے بڑھادی۔

نسرین پھر دیر تک اس آدمی کے متعلق سوچتی رہی۔ شاید اس نے یہ سوچ کر ٹول ٹکٹ لیا کہ ایک بے وقوف ماں خواہ مخواہ دوسروں کا وقت ضائع کر رہی ہے؟ مگر نسرین کو یقین تھا کہ آدمی نے اسے مصیبت میں گرفتار ایک ماں کا خیال کیا، اور مثل فرشتہ اس کی مدد کو آپہنچا۔ بہرحال وجہ جو بھی ہو، نسرین اس کی رحم دلی یاد کر کے آج بھی شکر گزار ہوجاتی ہے۔

## ظاہر پر نہ جایئے

پندرہ سالہ شاہد کو کراچی میں ایک انوکھا واقعہ پیش آیا۔ ہوا یہ کہ وہ لاہور سے اپنے چچا کے گھر چھٹیاں منانے آیا ہوا تھا۔ وہیں اس کے دادا بھی مقیم تھے۔ شام کو کوئی نہ کوئی انھیں وہیل چیئر پر باہر گھمانے لے جاتا۔ چچا کا گھر مصروف سڑک پر واقع تھا لیکن وہاں بنا فٹ پاتھ راہ چلتوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہ تھا۔

ایک شام شاہد اپنے دادا کو سیر کرانے اور تازہ ہوا کھلانے باہر لے گیا۔ وہ باتیں کرتے چلے جارہے تھے کہ اچانک کسی پتھر سے وہیل چیئر کا پہیہ رپٹا اور وہ سڑک پر پہنچ گیا۔ شاہد نے وہیل چیئر دوبارہ فٹ پاتھ پر لانے کی سعی کی مگر دادا کا وزن اتنا زیادہ تھا کہ وہ اسے اٹھانے میں ناکام رہا۔ اب قدرتاً لڑکا گھبرا گیا کیونکہ قریب سے زن کر کے گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ کسی بھی لاپرواڈرائیور کی تیز رفتار کار وہیل چیئر سے ٹکرا سکتی تھی۔

شاہد ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ کیا کرے کہ اچانک ایک بھاری بھرکم آدمی تیزی سے موٹر سائیکل پر قریب سے گزرا۔ آدمی کی گھنی لمبی مونچھوں نے اس کے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چہرے کو خاصا ہیبت ناک بنا رکھا تھا۔ کچھ آگے جا کر اچانک وہ رکا، پلٹا اور آنے والی ٹریفک کی پروا کیے بغیر ان کے قریب آیا اور رک گیا۔ اس نے پھر ایک ہاتھ سے وہیل چیئر تھامی، زور لگایا اور اسے واپس فٹ پاتھ پر رکھ دیا۔

یہ کام انجام دے کر اس نے شاہد کی طرف مسکرا کر دیکھا اور دوبارہ شوں شوں کرتا بائیک دوڑاتا نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ شاہد اس بظاہر خوف ناک نظر آنے والے آدمی کے جذبۂ مدد سے ازحد متاثر ہوا۔ اسے یہ سبق بھی ملا کہ انسان کی محض ظاہری شخصیت دیکھ کر کبھی اسے نہیں جانچنا چاہیے۔

## کوئٹہ کے پشتون نوجوان

ماہ مئی میں اسلام آباد کے رہائشی ۳۰ سالہ حسن اور ۲۵ سالہ خوشبو کی شادی ہوئی۔ انھوں نے پھر پروگرام بنایا کہ بذریعہ ریل ترکی پہنچ کر ہنی مون منایا جائے۔ خوشبو ریل کے سہانے سفر کی بہت دلدادہ تھی مگر وائے قسمت وہ کبھی اس پہ نہ بیٹھ سکی۔ اب اسے معلوم تھا کہ ریلوے کی بری حالت ہے، مگر ان کے پاس اتنا زیادہ وقت تھا کہ ضائع کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔

پروگرام کی رو سے انھوں نے پہلا پڑاؤ کوئٹہ کو بنانے کا فیصلہ کیا۔ وہاں سے پھر وہ بذریعہ ریل ہی ایران جانا چاہتے تھے۔ ریل حسب معمول تاخیر کا شکار ہوگئی۔ مگر اس نے رات دو بجے انھیں کوئٹہ کے ریلوے اسٹیشن پہنچایا۔

اسٹیشن پر کوئی قلی موجود نہ تھا، بہرحال، حسن نے جیسے تیسے اپنے چار بیگ اتار کر پلیٹ فارم پر رکھ دیے۔ جلد ہی اسے پتا چل گیا کہ باہر کوئی ٹیکسی نہیں، نہ کوئی رکشا اور نزدیک ترین اچھا ہوٹل خاصی دور تھا۔ نوبیاہتا جوڑا اس صورت حال کے لیے قطعاً تیار نہ تھا، فوراً پریشان ہوگیا۔ انھیں محسوس ہونے لگا کہ رات پلیٹ فارم پر گزارنی پڑے گی۔ یہ تجربہ نرالہ ہی سہی مگر تلخ اور خطرناک بھی ثابت ہوسکتا تھا۔

اچانک ان کی نظر ایک پٹھان نوجوان پر پڑی جو انہی کے ڈبے میں سفر کر رہا تھا۔ حسن نے اس سے مدد چاہی تاکہ جان سکے کہ کیا آس پاس ٹیکسیوں کا کوئی اڈہ ہے؟ نوجوان نے ٹوٹی پھوٹی اُردو میں بتایا کہ وہ خود دوسری بار کوئٹہ آیا ہے۔ وہ دراصل اپنے مقامی دوست کا انتظار کر رہا تھا جس نے اپنی گاڑی میں اسے لے جانا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ دوست آپہنچا۔ پشتون نوجوان پھر اسلام آبادی جوڑے کی طرف اشارہ کر کے پشتو میں اس سے کچھ باتیں کرنے لگا۔ حسن اور خوشبو ان کی گفتگو نہ سمجھ سکے، مگر نوجوانوں کے انداز سے عیاں تھا کہ موضوع بحث وہی ہے۔

چند منٹ بعد پشتون نوجوان ان کے پاس آیا اور بولا ''میرا دوست پانچ کلومیٹر دور رہتا ہے۔ وہ مجھے چھوڑ کر یہاں آجائے گا۔ وہ پھر آپ کو بھی ہوٹل چھوڑ دے گا۔''

دونوں نوجوان پڑھے لکھے اور مہذب تھے، چنانچہ حسن نے شکریہ ادا کرتے ہوئے ہامی بھر لی۔ آدھے گھنٹے بعد اس کا دوست، جان محمد لوٹ آیا۔ اس کے پاس تیس سال پرانی سوزوکی کار تھی، لیکن وہ بیگ اندر ڈال ٹھسم ٹھسا ہو کر کسی طرح بیٹھ ہی گئے۔ دوران سفر جان محمد نے انھیں اپنے گھر ٹھہرنے کی پیش کش کی مگر وہ اس کے آرام میں مخل نہیں ہونا چاہتے تھے۔

اجنبیوں سے مدد ملنا قسمت کا کھیل ہے۔ درست جگہ اور وقت پر کسی خوش قسمت ہی کو یہ مدد ملتی ہے۔ لیکن ترکی جاتے اور پاکستان واپس آتے ہوئے اس نوبیاہتا جوڑے کو اکثر جگہ ایسے ہمدرد اجنبیوں سے پالا پڑا جو فوراً ان کی مدد کرنے کو تیار ہو جاتے۔ مختلف ممالک میں متفرق زبانیں بولنے والے اجنبیوں کی رحم دلی نے حسن اور خوشبو کو متحیر کیا اور انسانیت پر ان کا ایمان مزید مستحکم ہوگیا۔



قارئین کے مطالعے اور راہنمائی کے لیے خصوصی تحریر

# اِصلاحِ زُبان

اتنی غلطیاں آپ نے کم ہی ایک جگہ درست ہوتے دیکھی ہوں گی

پروفیسر آسی ضیائی

## اغلاط

ا۔ **نے** کے دو غلط استعمال:

(الف) نے کے ساتھ فعل مصدری لانا

مثالیں:

(۱) میں نے تم سے کچھ کہنا ہے۔

(۲) آپ نے ایسا نہ کرنا تھا۔

(۳) اُس نے لاہور تو جانا ہی ہوا۔

(۴) اب ہم نے تم سے بھلا کیا لینا ہے؟

یہ اور اسی طرح کے دوسرے جملے، جن میں نے کے ساتھ فعل مصدری آتا ہے، پنجابی روزمرّہ میں داخل ہیں، بلکہ پنجابی زبان کی قواعد کی رُو سے بھی درست ہیں۔ البتہ اُردو قواعد اور روزمرّہ دونوں کی رُو سے ان کو کسی طرح درست قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ایسے تمام مواقع پر نے کے بجائے کو استعمال ہوتا ہے۔ یعنی، ان جملوں کی صحیح شکل یہ ہوگی:۔

(۱) مجھ کو (مجھے) تم سے کچھ کہنا ہے۔

(۲) آپ کو ایسا نہ کرنا تھا۔

(۳) اُس کو لاہور تو جانا ہی ہے (ہُوا، خلافِ محاورہ ہے)۔

(۴) اب ہم کو (یا ہمیں) تم سے کیا لینا ہے؟

آخری جملے کو اس طرح بھی لکھ سکتے ہیں: ''اب ہم بھلا تم سے کیا لیں؟'' بلکہ ایسے جملوں میں فعل کو مضارع یا مستقبل بنانا بہتر ہوتا ہے۔ مثلاً:

''پھر ہونا کیا تھا؟'' کے بجائے ''پھر ہوتا کیا؟'' فصیح تر ہے۔

اسی طرح ''گاڑی نے یہاں ٹھیرنا ہے۔'' کے بجائے یہ دو جملے صحیح ہیں:

ا۔ گاڑی کو یہاں ٹھیرنا ہے۔

۲۔ گاڑی یہاں ٹھیرے گی۔

اور یہ دوسرا جملہ بہتر ہے۔

بعض دفعہ کو کے استعمال میں کسی قدر الجھن بھی پیش آسکتی ہے۔ مثلاً:

''میں نے تمھیں ۱۰۰ روپے دینے ہیں۔''

اگرچہ اس کی صحیح صورت یہ ہوگی ''مجھ کو تم کو ۱۰۰ روپے دینے ہیں۔'' لیکن اس کو کی تکرار کی وجہ سے یہ مشکل پڑ سکتی ہے کہ یہاں ۱۰۰ روپے دینے والا کون ہے اور لینے والا کون۔ لہٰذا ایسے موقع پر اہلِ زبان کئی دوسری طرح کے جملے بولتے ہیں۔ مثلاً:

ا۔ مجھ کو تمھارے سو روپے دینے ہیں۔

۲۔ میں تمھیں ۱۰۰ روپے کا دین دار ہوں۔

مجھ پر تمھارے ۱۰۰ روپے آتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

☆☆

(ب) نے کے ساتھ حالیہ تمام لانا۔

مثالیں:

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

۱۔ میں نے لاہور دیکھا ہوا ہے۔
۲۔ اُس نے شراب پی ہوئی تھی۔
۳۔ ہم نے بچوں کے لیے بہت سی چیزیں منگوائی ہوئی ہیں۔
۴۔ تم نے یہ کیا تماشا بنایا ہوا ہے؟
۵۔ لڑکوں نے سارے کام کیے ہوئے ہیں۔

اس قسم کے جملے، میری تحقیق کے مطابق، اُردو قواعد کی رُو سے تو غلط نہیں کہے جاسکتے۔ بعض قرائن سے پتا چلتا ہے کہ اب سے کم از کم ڈھائی تین سو سال قبل دہلی یا دوسرے ''اُردو علاقوں'' کے لوگ اس طرح بول لیتے تھے، لیکن جب سے اُردو تحریر میں آئی ہے، ہمیں اس طرح کے استعمال کی کوئی ایک مثال بھی نہیں ملتی۔ اس لیے ہمیں قطعی طور پر کہنا پڑتا ہے کہ نے کے ساتھ حالیہ تمام کا استعمال ازروئے روزمرّہ بالکل غلط ہے۔ مگر اب چند سال سے یہ غلطی اس قدر عام ہوگئی ہے کہ اخباروں، کتابوں، ریڈیو کے نشریوں اور حد یہ ہے کہ اسکول کی نصابی کتابوں میں بھی..... جنھیں بڑے بڑے ''فاضل'' حضرات مرتب کرتے ہیں..... بے تکلّف نے کے ساتھ حالیہ تمام کا استعمال کیا جانے لگا ہے۔ اس ''سیلابِ غلط بیانی'' پر معترض ہونے والا بھی اپنی عافیت اسی میں دیکھتا ہے کہ خون کے گھونٹ پی کر چپ ہو رہے، اور اپنے اوپر ''رجعت پسندی'' کا الزام نہ آنے دے!

بہرحال، ایک ناگوار اور ناگزیر فرض سمجھتے ہوئے ہم عرض کرنے پر مجبور ہیں، کہ مندرجہ بالا جملوں کو اس طرح لکھنا یا بولنا صحیح ہوگا:

۱۔ لاہور میرا دیکھا ہوا ہے۔
۲۔ وہ شراب پیے ہوئے تھا۔
۳۔ ہم نے بچوں کے لیے بہت سی چیزیں منگوائی ہیں۔
۴۔ تم نے یہ کیا تماشا بنا رکھا ہے؟
۵۔ لڑکوں نے سارے کام کر لیے ہیں۔

ان مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نے کے ساتھ حالیہ تمام لانے سے بچنے کے لیے کم از کم پانچ طریقے اہلِ زبان میں مستعمل ہیں۔ گویا، مثلاً ایک جملے:۔

''میں نے کیا ہوا ہے۔'' کی صحیح شکلیں یہ ہوسکتی ہیں:۔

۱۔ میرا کیا ہوا ہے۔
۲۔ میں کیے ہوئے ہوں۔
۳۔ میں نے کیا ہے۔
۴۔ میں نے کر رکھا ہے۔
۵۔ میں نے کر لیا (یا کر دیا) ہے۔

ان میں سے جس موقع پر جو صورت مناسب تر ہو وہی استعمال کی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ نے کے ساتھ ہوا، ہوئے وغیرہ کبھی نہیں آتے۔

☆☆

## ۲۔ نہ ہی

مثال: ''نہ تو آپ خود آئے اور نہ ہی کوئی خط بھیجا۔''

اب سے چند سال پہلے تک اُردو کے اہلِ ذوق ''نہ ہی'' کے اس استعمال پر سخت مکدّر اور منقبض ہوتے تھے۔ مگر اب یہ عالم ہے کہ شاذ ہی کوئی پڑھا لکھا اسے غلط سمجھتا ہو۔ یہاں تک کہ اہلِ زبان ہونے کے دعویداروں میں بھی بے تکلّف ''نہ ہی'' لکھا جانے لگا ہے۔ اگر ''غلط العام'' کے اُصول کی رُو سے دیکھا جائے تو ہمیں اس کو اب درست ہی مان لینا چاہیے۔ مگر اول تو ''**غلط العامِ فصیح**'' کا اطلاق اور ہی حالات پر ہوتا ہے، جو آج موجود نہیں، اور دوسرے یہ کہ ''نہ ہی'' کی غلطی آج بھی صرف تحریر تک محدود ہے۔ بول چال میں یہ صرف اُن غریب کم خواندہ لوگوں کی زبان سے کبھی کبھی نکلتا ہے جو تحریری عبارت کو قولِ فیصل سمجھ کر اس کی تقلید گفتگو میں کرتے ہیں۔ اس کے برعکس، قدیم ترین اُردو تحریر میں بھی ''نہ ہی'' یکجا لکھا نہیں دیکھا گیا۔ ''نہ'' اور ''ہی'' کے بیچ میں کم از کم ایک لفظ ضرور ہوتا ہے۔ شعراء کے ہاں اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً:

۱۔ نہ خدا ہی ملا، نہ وصالِ صنم،
نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے،
(گئے دونوں جہان کے کام سے ہم،
نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے)



۲۔ نہ تو تُو رہا، نہ تو میں رہا،
جو رہی سو بے خبری رہی
(سراج دکنی)

۳۔ نہ تو نامہ ہی، نہ پیغام زبانی آیا
(محزوں دہلوی)

۴۔ پانی ہی اب پئیں گے، نہ کھانا ہی کھائیں گے
(انیس لکھنوی)

درج بالا دوسرا مصرع خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے۔ ''نہ تو تُو رہا، نہ تو میں رہا۔'' میں دوسرا تو آج کل نہیں بولا جاتا۔ یہ قدیم روزمرّہ ہے۔ اب اگر ''نہ ہی'' لکھنا درست ہوتا تو یہ مصرع اس طرح بڑی آسانی سے لکھا جاسکتا اور بڑا برجستہ ہوتا: ''نہ تو تُو رہا، نہ ہی میں رہا.....''

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، ''نہ ہی'' خلافِ روزمرّہ تو ہے ہی، خلافِ قواعد بھی ہے۔ ''ہی'' حرف حصر و تخصیص ہے اور حرفِ تخصیص کے قریب اسم مخصوصہ ہونا ضروری ہے، جس کی تخصیص ''ہی'' کرے۔ لیکن ''نہ ہی'' میں اسم کوئی نہیں، پھر ''ہی'' کس کی تخصیص کرتا؟

ایک دلچسپ موازنے سے مزید وضاحت ہوسکے گی۔ ایسے جملوں میں، جن کی مثالیں اُوپر مذکور ہوئیں، ''نہ'' حرفِ عطف ہے۔ اسی طرح ''یا'' بھی حرفِ عطف ہے۔ مگر ''نہ ہی'' لکھنے والوں کو ''یا ہی'' لکھتے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ حالانکہ اگر یہ جملہ درست ہوتا:

''نہ تو آپ خود آئے اور نہ ہی کوئی خط بھیجا''

تو اس جملے میں بھی کوئی غلطی نہیں ہونا چاہیے:

''یا تو آپ خود آتے اور یا ہی کوئی خط بھیجتے''

کیونکہ پہلے جملے میں ''نہ'' کا استعمال انگریزی حروفِ عطف (Neither - nor) کے مترادف ہے اور دوسرے جملے میں ''یا'' کا انگریزی مترادف (Either - or) ہوگا اور اس طرح۔ ازرُوئے قواعد، ''یا'' اور ''نہ'' ہم مرتبہ ہیں۔ پس جو معاملہ ایک کے ساتھ غلط ہے، وہ دوسرے کے ساتھ کیونکر صحیح ہوسکتا ہے؟

لہٰذا ہم پورے اعتماد اور زور کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ''نہ'' اور ''ہی'' کے درمیان کم از کم ایک لفظ (اسم) لازماً ہونا چاہیے، اور وہ بھی اُس صورت میں جب ''ہی'' کا لانا ناگزیر ہو، ورنہ بغیر ''ہی'' کے بھی جملہ صحیح ہوگا۔ چنانچہ اُوپر کی مثال میں جملے کی صحیح شکل یہ ہوگی:

''نہ تو آپ خود آئے اور نہ کوئی خط بھیجا۔''

اگر کوئی زور دینے کے لیے ''ہی'' لانا ضروری ہو تو اس طرح لکھا جائے گا:

۱۔ ''نہ تو آپ خود آئے اور نہ کوئی خط ہی بھیجا۔''
۲۔ نہ تو آپ خود ہی آئے اور نہ کوئی خط بھیجا۔''
۳۔ نہ تو آپ خود ہی آئے اور نہ کوئی خط ہی بھیجا۔''

جملے کی یہ تینوں شکلیں بالکل درست ہیں، مگر اہلِ زبان کے عام روزمرّہ کے مطابق دوسری شکل سب سے بہتر ہے۔

☆☆

## ۳۔ دوران:

مثال: اس سال کے دوران ملک بھر کے تعلیمی ادارے کم و بیش ۵/ ماہ بند رہے۔

پچھلے چند سال سے ''دوران'' کے ساتھ ''میں'' نہ لانے کا رُجحان اس قدر زور پکڑ گیا ہے کہ اب اکثر لوگوں کو غالباً یاد بھی نہیں رہا کہ کبھی ''دوران میں'' لکھا جاتا تھا مگر غلطی بہرحال غلطی ہی ہے۔ اُوپر کے جملے کی صحیح شکل یہ ہوگی:

''اس سال کے دوران میں ملک بھر کے.....'' الخ

جہاں تک مجھے یاد ہے، ۱۹۵۵ء سے پہلے اس عجیب و غریب رُجحان سے اہلِ قلم بالکل ناواقف تھے مگر یہ جان لینا چاہیے کہ ''دوران'' کے ساتھ ''میں'' اتنا ہی ضروری ہے جتنا ''اثناء'' کے ساتھ مثلاً:

''اِسی اثناء میں ایک غیر معمولی واقعہ ظہور پذیر ہوا۔''

اس جملے کو اس طرح کوئی نہیں لکھتا ''اِسی اثناء ایک غیر معمولی واقعہ ظہور پذیر ہوا۔''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یادش بخیر

علٰحدگی پسندوں کے سامنے ڈٹی دیوار جنرل مشرف نے بے دردی سے ڈھادی

# سردار اکبر بگٹی

ایک ممتاز بلوچ سردار کی شخصیت کے مختلف پہلو اُجاگر کرتی طرح دار یادیں

ظفر جمال بلوچ

یہ ۱۹۷۰ء کا سال تھا۔ انتخابات کے بعد مشرقی و مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کو اکثریت حاصل ہوچکی تھی۔ انہی دنوں ڈھاکا میں اسلامی جمعیت طلبہ (اسلامی چھاترو شنگھو) کا سالانہ اجتماع منعقد ہوا۔ جمعیت کے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ میں بھی ڈھاکا پہنچا۔ شیخ مجیب الرحمن نے اسلام آباد آنے سے انکار کردیا تھا، جبکہ ذوالفقار علی بھٹو نے ڈھاکا قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے والوں کو ٹانگیں توڑنے کی دھمکی دی تھی۔ ملک بے یقینی اور اضطراب کی لپیٹ میں تھا۔

اس زمانے میں مغربی پاکستان سے کئی اخبار نویسوں نے خبروں کی تلاش میں ڈھاکا کا ڈیرے ڈال رکھے تھے جن میں ہارون الرشید بھی شامل تھے۔ میری اُن سے پرانی شناسائی تھی، ایک دن ان سے ملنے ہوٹل چلا گیا۔ کمرے میں پہنچا تو وہ ڈھاکا ہی میں موجود سردار اکبر بگٹی سے فون پر بات کررہے تھے۔ بات کرتے کرتے اچانک ہارون الرشید کی مجھ پر نظر پڑی تو مجھے کہنے لگے کہ کیا تم سردار صاحب سے بات کرو گے؟ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، انھوں نے سردار صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ طالب علم راہنما ظفر جمال بلوچ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں اور ریسیور مجھے تھما دیا۔

میں صورت حال کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھا لیکن اب بات کرنے سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا ریسیور تھامتے ہوئے سردار صاحب کو سلام کیا اور ان سے درخواست کی کہ چونکہ شیخ مجیب الرحمن سے آپ کے پرانے تعلقات ہیں اور وہ آپ پر اعتماد بھی کرتے ہیں لہٰذا ملک کو انتشار اور تباہی سے بچانے کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔ سردار صاحب کہنے لگے کہ بھئی میں تو اسمبلی کا رکن بھی نہیں، میں کیا کردار ادا کرسکتا ہوں۔ میں نے کہا کہ کچھ رکن اور کچھ لوگ رکن گر ہوتے ہیں۔ آپ اسی دوسرے گروہ میں شامل ہیں۔ اس لیے ملک ٹوٹنے سے بچائیں۔

یہ سن کر سردار صاحب خاموش ہوگئے۔ پھر معاً بعد موضوع بدلتے ہوئے مجھے کہنے لگے ”ظفر! تم کیسے بلوچ ہو کہ بلوچ ہوتے ہوئے بھی مودودی صاحب کا ساتھ دے رہے ہو“۔ میں نے عرض کی، یہ موقع نہیں، لیکن کبھی آپ سے ملاقات ہوئی تو بتاؤں گا کہ بلوچ ہوتے ہوئے میں مولانا مودودی کا پیروکار کیوں بن گیا؟

انھوں نے مجھے کوئٹہ یا کراچی میں ملنے کی دعوت دی، جسے میں نے شکریہ کے ساتھ قبول کرلیا۔ یہ میرا سردار اکبر بگٹی سے پہلا رابطہ تھا، لیکن ٹیلی فونی۔

پھر منظر بدلا، قوم کی دعاؤں اور البدر و شمس کی قربانیوں کے باوجود ملک ٹوٹ گیا، کیونکہ مغربی پاکستان کی بیوروکریسی، کچھ جرنیل اور بھٹو جیسے سیاستدان مشرقی پاکستان سے جان چھڑانے کا فیصلہ کرچکے تھے۔ نتیجۃً مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش کا نام ملا، جبکہ مغربی پاکستان پر پاکستان کے نام کی تختی لگاتے ہوئے فوجی جنتا کی طرف سے اُسے ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے کردیا گیا۔ وہ ملک کی صدارتی کرسی سنبھالنے کے ساتھ ہی پہلے عوامی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھی بن گئے۔ یوں انھوں نے جو ”اُدھر تم، اِدھر ہم“ کا نعرہ لگایا تھا، اسے حقیقت میں بدل ڈالا۔

اقتدار سنبھالنے کے کچھ عرصہ بعد جب اُن کی سردار عطاءاللہ مینگل اور غوث بخش بزنجو کے ساتھ ان بن ہوگئی، انہوں نے بلوچستان میں اُن کی حکومت کو ختم کرکے گورنر راج نافذ کیا اور سردار اکبر بگٹی کو وہاں کا گورنر مقرر کردیا۔ ساتھ ہی انھوں نے بلوچستان میں فوجی کارروائی بھی شروع کروادی۔ سردار صاحب کی بلوچستان پر اتنی مضبوط انتظامی گرفت تھی کہ ان کے ہوتے ہوئے نہ تو نیشنل عوامی پارٹی کوئی مؤثر احتجاج کرسکی اور نہ ہی بی۔ایس۔او کی طلبہ قیادت میدان میں نکلی، سبھی نے اپنی سرگرمیوں کو زیرِ زمین منتقل کرلیا۔ جب بلوچستان میں ہونے والی فوجی کارروائی کے خلاف کوئی توانا آواز بلند نہ ہوئی تو اسلامی جمعیت طلبہ نے احتجاج کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں اس زمانے میں جمعیت کا ناظمِ اعلیٰ تھا۔ طے پایا کہ میری طرف سے بلوچستان کا دورہ کرتے ہوئے اس تحریک کا آغاز ہو اور پھر



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے پورے ملک میں پھیلا دیا جائے تاکہ بلوچستان کے لوگوں کو تنہائی کے احساس سے بچایا جاسکے۔

جب بلوچستان جانے کا پروگرام بنا تو میں اچانک علیل ہوگیا، ریل کے ذریعے سفر کرنا عملاً ممکن نہ رہا تو پہلی مرتبہ ہوائی جہاز کے ذریعے کوئٹہ جانے کا فیصلہ ہوا۔ جہاز میں سوار ہوا تو میری نشست سے ۸-۱۰ نشستیں پہلے سردار اکبر بگٹی موجود تھے۔ انھیں بھٹو صاحب نے ملنے کے لیے اسلام آباد بلوایا تھا۔ اب سردار صاحب واپس کوئٹہ جارہے تھے۔ میرا جی چاہا کہ سردار صاحب سے ملا جائے۔ لہٰذا نشست سے اٹھا اور ان کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اپنا نام بتاتے ہوئے جب میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو انھوں نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ان کا حافظہ اتنا تیز تھا کہ سال ڈیڑھ سال قبل ڈھاکا میں ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو انھیں یاد تھی۔ انھوں نے گلہ کیا کہ وعدہ کے باوجود تم ملنے نہیں آئے، میں نے اپنی تنظیمی ذمہ داریوں کا ذکر کرتے ہوئے معذرت کی۔ انھوں نے قبول کرتے ہوئے پوچھا کہ اب کیا پروگرام ہے؟ میں نے کہا کہ بلوچستان کا دورہ کرنا چاہتا ہوں لیکن مجھے نہیں معلوم، آپ وہاں کیا سلوک کریں گے۔

بھٹو صاحب کی حکومت اور خود بلوچستان فوجی کارروائی کے بارے میں انھیں ہمارے موقف اور سرگرمیوں کا پہلے سے علم تھا لیکن اس کے باوجود کہا کہ تم ہمارے مہمان ہو، ضرور آؤ۔ میں نے کوئٹہ پہنچتے ہی اپنی سرگرمیوں کا آغاز کردیا۔ پہلا جلسہ سائنس کالج کوئٹہ میں ہوا، جس میں کھل کر فوجی کارروائی کی مذمت کی اور بھٹو صاحب کے ساتھ ساتھ سردار اکبر بگٹی کو بھی بھرپور تنقید کا نشانہ بنایا اور کہا کہ آج لشکر کشی کے لیے ان کا کندھا استعمال ہوا۔ لیکن جب بھٹو اپنا مقصد حاصل کرلے گا تو بگٹی صاحب کو اقتدار سے یوں نکال باہر کرے گا، جیسے بال مکھن سے نکالا جاتا ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سردار صاحب کا پورے صوبہ میں طوطی بولتا تھا، اور کوئی تنظیم بلوچستان میں عوامی جلسوں کے انعقاد کا سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ کوئٹہ کے ہمارے کامیاب پروگرام کی خبریں دوسرے بلوچستانی شہروں میں پہنچیں تو ہر جگہ مجھے بھرپور عوامی پذیرائی حاصل ہوئی۔ خود سردار عطا اللہ مینگل نے مجھے اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی اور جمعیت کے موقف کی تحسین کرتے ہوئے کہا کہ میں نے آپ کے ذریعے پہلی مرتبہ پنجاب کی آنکھ میں آنسو دیکھا۔ اگرچہ یہ کانی آنکھ کا آنسو ہے۔

سردار اکبر بگٹی صاحب کی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے جس محبت بھرے انداز میں مجھے جہاز میں مہمان بنایا تھا، انھوں نے اپنے الفاظ کی لاج رکھی۔ بلوچستان میں سخت ترین تقریروں کے باوجود نہ میری سرگرمیوں پر کوئی قدغن عائد کی اور نہ ہی میرے خلاف مقدمات قائم کیے۔ جب کہ میں نے اپنی زندگی کی سخت ترین تقریریں بلوچستان میں ہی کی تھیں۔ دوسری طرف پنجاب، سندھ اور سرحد میں میری ہر تقریر پر مقدمہ بھی قائم ہوتا اور اکثر جیل یاترا بھی کرنا پڑتی۔

جب تک سردار صاحب گورنر رہے، میں نے اُن سے ملاقات نہ کی۔ لیکن جب بالآخر بھٹو صاحب سے اختلاف کی بنیاد پر وہ گورنری سے الگ ہوئے تو کوئٹہ جانے کی صورت میں ان سے ضرور ملاقات ہوتی۔ ان کا دسترخوان وسیع تھا، ہر مرتبہ دعوت کا اہتمام کرتے، وہاں پنجاب، پنجابی اور فوج کے حوالہ سے تلخ و ترش باتیں بھی ہوجاتیں۔ خود بلوچستان میں جس طرح فوجی کارروائی کے لیے ان کا کندھا استعمال ہوا، اس حوالے سے بھی کبھار میری طرف سے جسارت سرزد ہوجاتی لیکن ان سے ہمیشہ تعلقات ایک سطح پر برقرار رہے۔

ایک مرتبہ میں نے انھیں مولانا مودودی مرحوم کی لکھی



## ٹائی کا تصور اور رھم

اوریا مقبول جان نے اپنی گفتگو کے دوران ایک نہایت دلچسپ واقعہ یوں بیان کیا۔ اکثر اوقات ہم ٹائی کو صلیب کا نشان سمجھ لیتے اور ہمارے علما بھی یہی کہتے ہیں۔ اُنہیں چاہیے کہ وہ ایک مرتبہ شیانگ سٹی ضرور جائیں، جہاں ٹیروکوٹا سٹی بنایا گیا ہے۔ ٹیروکوٹا مٹی سے بنائے گئے مجسمے کو کہتے ہیں، وہاں مختلف جرنیلوں کے مجسمے قطار کی شکل میں بنائے گئے ہیں۔ یہ مجسمے ۹ یا ساڑھے نو سال قبل مسیح کے بنے ہوئے ہیں۔ اُس وقت نہ حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے تھے اور نہ انہیں صلیب دی گئی تھی۔ اگر صلیب کا ٹائی کے ساتھ کوئی تعلق ہوتا تو پاپائے اعظم ضرور اسے پہنتے۔ یاد رہے کہ ٹائی اُن کے لباس کے حصہ ہے ہی نہیں۔

(ثناء سعید، بہاولپور)

تفسیر تفہیم القرآن کا تحفہ دیا۔ اسے دیکھتے ہی کہنے لگے کہ مودودی صاحب کا قرآن؟ میں نے کہا کہ نہیں اللہ میاں کا قرآن۔ مسکرائے اور شکریہ کے ساتھ تحفہ قبول کرلیا۔

انھی دنوں ان سے مستقبل کی سیاسی حکمتِ عملی کے بارے میں صحافیوں نے سوال کیا تو کہا کہ اگر میں نے اپنی جماعت قائم نہ کی تو جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کروں گا۔ یہ بات اس دور کے اکثر اخبارات میں جلی سرخیوں سے شائع ہوئی۔ بالخصوص روزنامہ مشرق کوئٹہ نے اُسے نمایاں انداز میں شائع کیا۔

سردار صاحب منافقت سے پاک تھے اور اپنا نکتۂ نظر کھل کر بیان کرتے۔ مرکزی حکمرانوں اور فوجی جنتا سے شکایات رکھنے کے باوجود وہ مضبوط پاکستان کے حامی اور علیحدگی پسندانہ سوچ رکھنے والوں کے سامنے ایک مضبوط دیوار کی حیثیت رکھتے تھے۔

جنرل پرویز مشرف نے خودغرضانہ اغراض کی تکمیل کے لیے انھیں بے بسی اور بے کسی کی موت مارتے ہوئے عملاً علیحدگی پسندانہ سوچ کے سامنے ڈٹی ایک دیوار گرا دی۔ آج مشرف صرف سردار اکبر بگٹی مرحوم ہی نہیں بلکہ پاکستان کو متحد رکھنے والی سوچ کا بھی قاتل ہے جس کے ہاتھ جامعہ حفصہ کی معصوم بچیوں کے لہو سے تر ہیں، جس نے چیف جسٹس کی بحالی کی تحریک میں کراچی میں شیطانیت کے ننگے ناچ کو اپنی طاقت قرار دیا، چاہیے تو یہ تھا کہ اپنے جرائم کی بنیاد پر اس کی لاش پھانسی کے پھندے پر جھولتی مگر جمہوریت کے نام نہاد دعویداروں نے این۔ آر۔ او کی صورت میں رشوت قبول کرتے ہوئے اسے سرخ قالین کی سلامی پیش کرتے ہوئے بحفاظت بیرون ملک بھجوادیا۔ سردار اکبر بگٹی کے لواحقین اور پاکستانی عوام اس وقت تک مطمئن نہ ہوں گے جب تک مشرف کو اس کے جرائم کی بنیاد پر کیفر کردار تک نہیں پہنچایا جاتا۔

سردار اکبر بگٹی ایک انسان تھے، ان سے غلطیاں بھی سرزد ہوئیں، اپنے قبیلہ کے لوگوں سے انھوں نے بعض زیادتیاں بھی کیں، ان کے ہاتھوں پر بعض معصوم اور بے گناہ لوگوں کا خون بھی ہے۔ لیکن اب وہ وہاں چلے گئے جہاں جانے والوں کی غلطیوں کو مالک حقیقی کے سپرد کردیا جاتا ہے۔

آج میں حکمرانوں کو گردن گردن تک کرپشن میں لتھڑا ہوا دیکھتا ہوں۔ وہ اپنے اقتدار اور آسایشوں کے لیے کسی بھی دشمنِ ملک و دین کو گلے لگانے پر تیار ہیں، بلکہ لگائے ہوئے ہیں۔ انہیں ملک کی آزادی، سلامتی اور قومی غیرت کی فکر تک نہیں، بلکہ صرف ڈالر سمیٹنے کی حرص نے انھیں اندھا کر رکھا ہے۔ وہ سیاسی قد کاٹھ اور سوچ کے حوالے سے بونے ہیں۔ ان کی موجودگی میں سردار اکبر بگٹی بہت یاد آتے ہیں۔ لوگوں کو ان سے کئی اختلافات ہوسکتے ہیں مگر ان کے دامن پر کرپشن کا کوئی داغ نہ تھا۔ انہوں نے اقتدار سے عزت حاصل کرنے کے بجائے خود اقتدار کو عزت بخشی۔ وہ دوستوں کے دوست اور اپنے لفظوں کا پاس و لحاظ رکھنے والے تھے۔ اس دور میں ایسے انسان ڈھونڈنے سے ہی ملتے ہیں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# پاکستان کی ۴۰ نامور

سیاست سے صنعت و تجارت کی کٹھنائیوں تک وطن عزیز کی

عمر وسیم پنسوتہ

# اور مؤثر خواتین

بااثر و ممتاز نسوانی شخصیات کا اچھوتا تذکرہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# بااختیار خواتین

مصر کی تاریخ میں حتشپوست (Hatshepsut) گزری ہے۔ کتب میں اس کا دورِ حکومت ۱۵۰۸ تا ۱۴۵۸ ق م درج ہے۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ یہی دنیا کی پہلی طاقتور خاتون بھی تھی جو بڑے کمال وتدبر سے مصر پر حکمرانی کرتی رہی۔

کائنات کے اس سفر میں نجانے کتنے نام اور بھی ہوں گے جو تاریخ کے دریچوں میں داخل ہونے سے قاصر رہے اور ان کے بعد بھی بے شمار نام فہرست میں شامل ہوتے چلے آئے۔ ان واقعات، کہانیوں اور سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی روایات نے ہر دور میں اپنا اثر دکھایا۔ قدرت کے کرشمہ ہائے کارساز نے عورت کو زینتِ مردود نیا بنا کر راحت بخشی اور دوسری طرف وجودِ زن نے اس پہلو کو نبھاتے ہوئے اور بھی اس کو نظر انداز کرتے ہوئے طاقت، اختیارات، دولت، سیاست اور موجودہ زمانے میں صنعت وتجارت، کاروبار، سماجی بہبود، ملازمت، ذرائع ابلاغ وغیرہ میں اپنی اثر انگیزی کو نمایاں کیا۔ نہ ماضی، نہ مستقبل، زیرِ مطالعہ مضمون میں آپ حال کی کچھ ایسی ہی پاکستانی خواتین کے بارے میں پڑھ سکیں گے۔ اپنے اپنے شعبے میں اثر ورسوخ رکھتی ہیں نیز ہر شعبے سے ۵/اہم ترین خواتین منتخب کی گئی ہیں۔

## با اثر خواتین

### (۱) ڈاکٹر فہمیدہ مرزا

اسلامی دنیا کی پہلی خاتون سپیکر، تیسری دفعہ منتخب ہو کر قومی اسمبلی میں آئیں۔ الیکشن کمیشن کو فراہم کردہ گزشتہ اثاثوں کی رو سے ۴۸/۷ ایکڑ زرعی اراضی کی مالک ہیں۔ ایک کروڑ ۱۲/لاکھ روپے اس کے علاوہ ہیں۔ مرزا شوگرمل میں شراکت داری، دو گاڑیاں اور ۱۴۴/تولے سونے کی مالکہ ہونے کی حیثیت سے اختیار اور دولت میں بھی سرفہرست ہیں۔ سابق وزیر داخلہ سندھ ڈاکٹر ذوالفقار مرزا کی اہلیہ ہیں، جو کبھی ان کے سہارا تھے لیکن آج کل آزمائش بنے ہوئے ہیں۔

### (۲) حنا ربانی کھر

۱۹/جولائی ۲۰۱۱ء کو پاکستان کی پہلی خاتون وزیر خارجہ منتخب ہوئیں۔ دوسری مرتبہ قومی اسمبلی میں منتخب ہو کر آئیں۔ اس سے پہلے مختلف اہم ذمے داریوں پر فائز رہیں۔ یوں انھیں صرف ۳۳/سال کی عمر میں پاکستان کی کم عمر وزیر خارجہ بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ صوبہ پنجاب کے ضلع مظفر گڑھ کے علاقے کھر غربی سے تعلق ہے۔ ۱۹/نومبر ۱۹۷۷ء کو غلام ربانی کھر کے گھر پیدا ہوئیں۔ لمز لاہور سے بی۔ ایس منیجمنٹ اور یونیورسٹی آف میسا چوسٹس امریکہ سے بزنس مینجمنٹ میں ماسٹر کی ڈگری لی۔ اسلام آباد، لاہور اور مظفر گڑھ میں زمین، پلاٹ اور دیگر اثاثوں کی مالک ہیں۔ عالمی طور پر سیاسی بصیرت سے زیادہ اپنے کپڑوں، زیورات اور عمدہ پرسوں کے انتخاب کی وجہ سے جانی جاتی ہیں۔ شوہر ٹیکسٹائل ملز کے مالک ہیں۔ دو بچے ہیں۔ پولو کا کھیل دیکھنا مشغلہ ہے۔

### (۳) فریال تالپور

پاکستان پیپلز پارٹی خواتین کی صدر، صدرِ پاکستان آصف علی زرداری کی ہمشیر اور قومی اسمبلی کی منتخب رکن۔ دو مرتبہ ۹/سال تک ضلع نواب شاہ کی ناظمہ رہیں۔ ٹنڈو اللہ یار، ضلع حیدرآباد، سانگھڑ میں زرعی زمین، ڈی ایچ اے کراچی میں ایک گھر، گوادر میں پلاٹ، کلفٹن کراچی میں گھر، ۳۲/لاکھ کا کاروبار، ۶۲/لاکھ کی سرمایہ کاری، ۳/گاڑیاں، ۳/کروڑ ۳۷/لاکھ روپے کا بینک بیلنس رکھتی ہیں۔ بے نظیر اور زرداری کے بچوں کی قانونی نگران ہیں۔ پیپلز پارٹی کے طاقتور ترین لوگوں میں شامل ہیں اور آنے والے دنوں میں سندھ کی وزیر اعلیٰ بھی ہو سکتی ہیں۔

### (۴) ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان

پاکستان کی وفاقی وزیر اطلاعات، سیالکوٹ سے قومی اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں۔ دیہاتی لہجے میں بے تکان گفتگو کرنے کے حوالے سے مشہور ہیں۔ فاطمہ جناح وومن میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی۔ اپنا پہلا الیکشن سابق سپیکر قومی اسمبلی امیر حسین کے مقابلے میں الیکشن جیتا۔ ان کے پاس زرعی اراضی، گھر، گاڑی اور تقریباً ۳/کروڑ روپے کی جیولری ہے۔ پہلے مسلم لیگ ق میں تھیں، اب پیپلز پارٹی میں پڑاؤ ہے۔ اقتدار اور طاقت کا حصول مطمع نظر رہا ہے، اس لیے ہر پارٹی میں جگہ بنا لیتی ہیں۔

### (۵) فرح ناز اصفہانی

دھیمے لہجے میں بات کرنے والی فرح، صدرِ پاکستان کی ترجمان اور قومی اسمبلی کی رکن ہیں۔ اپنے شوہر حسین حقانی کی وجہ سے بھی بااختیار سمجھی جاتی ہیں جو امریکہ میں پاکستان کے سفیر رہے۔ امریکہ میں پہلے پاکستانی سفیر مرزا ابوالحسن اصفہانی کی پوتی ہیں۔ آپ کے تمام اثاثہ جات کی کل مالیت تقریباً ۱۳/کروڑ ۴۱/لاکھ سے زائد ہے۔ ایوانِ صدر کے مزاج میں کافی دخیل سمجھی جاتی ہیں تاہم میمو اسکینڈل ان کے لیے بھی خاصا بڑا دھچکا ثابت ہوا۔

## امیر ترین خواتین سیاست دان

### (۶) نزہت صدیق

پاکستان مسلم لیگ ن میں خواتین ونگ کی چیف آرگنائزر، گزشتہ بیس برس سے سیاست میں ہیں۔ ۲۲/دسمبر ۱۹۵۵ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں۔ ان کے سسر شیخ مسعود صادق تحریکِ آزادیٔ پاکستان کے نمایاں راہ نماؤں میں شامل تھے۔ آج کل اسلام آباد میں مقیم ہیں۔ الیکشن کمیشن کو فراہم کردہ گوشوارے کی رو سے ایک ارب پچاس کروڑ روپے کے اثاثہ جات رکھتی ہیں۔ اس اعتبار سے وہ خواتین سیاست دانوں میں سب سے زیادہ دولت مند ہوئیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کاغذات کے مطابق ان کے پاس ذاتی گاڑی تک نہیں۔ مسلم لیگ کے عوامی رابطوں میں شاید اسی لیے کمی رہی ہے۔

### (۷) بیگم عشرت اشرف

ضلع رحیم یار خان کے مضافاتی گاؤں سے تعلق ہے۔ گوجر خاندان کے سیاستدان چوہدری محمد جعفر اقبال کی اہلیہ ہیں۔ ان کی بیٹی زیب جعفر پنجاب اسمبلی کی رکن اور وزیر اعلیٰ پنجاب کی مشیر ہیں۔ مسلم لیگ ن کی رکن قومی اسمبلی ہیں۔ بڑے رہائشی گھر، کمرشل، صنعتی اور زرعی اثاثہ جات کی مالک ہیں جو وراثت میں ملے۔ لیکن انھوں نے صرف ان اثاثوں کی قیمت ظاہر کی ہے جو خود خریدے ہیں۔ لندن میں ۹۰/لاکھ روپے کا رہائشی اپارٹمنٹ ہے۔ ۱۰۰/تولہ سونا بھی رکھتی ہیں جس کی مالیت ایک کروڑ سے زائد ہے۔ وراثتی اثاثوں کی حیثیت سے پاکستان کی امیر ترین خواتین میں دوسرے نمبر پر ہیں۔

### (۸) بیلم حسنین

پیپلز پارٹی کی ایم این اے ہیں۔ آپ کی غیر منقولہ جائیداد تقریباً ۲۲/کروڑ روپے ہے۔ ۲/کروڑ ۱۰/لاکھ روپے کی سرمایہ کاری کی رکھی ہے۔ ۸۰/تولے سونا، ۴/گاڑیاں اور کئی بینک اکاؤنٹس کی مالکہ ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی خواتین ونگ کی کوآرڈینیٹر ہیں۔ سعادت حسنین خان ان کے شوہر ہیں۔ بنیادی طور پر ملتان کے زمین دار خاکوانی خاندان سے تعلق ہے۔ والدہ کی وجہ سے سیاست میں آئیں۔ دوسری مرتبہ قومی اسمبلی کی رکن بنیں۔





Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## (۹) عطیہ عنایت اللہ

مسلم لیگ ن کی لاہور سے رکن قومی اسمبلی ہیں۔ تقریباً ۴ کروڑ ۷۹ لاکھ ۴۲ ہزار روپے مالیت کی غیر منقولہ جائیداد رکھتی ہیں۔ لاکھوں روپوں کے حصص، قومی بچت کی سکیموں، ایک کار، ۸ ہزار کے زیورات، ۱۰ کروڑ ۷۸ لاکھ روپے کے فکسڈ ڈیپازٹ اور کئی اکاؤنٹس کی مالکہ ہیں۔ طویل عرصے سے سیاست میں ہیں اور خواتین سے متعلق کئی سرکاری منصوبوں کی بانی ہیں۔

## (۱۰) شیری رحمان

انگریزی صحافی کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ بے نظیر بھٹو کے ساتھ سیاست میں آئیں اور مارچ ۲۰۰۸ء سے مارچ ۲۰۰۹ء تک پاکستان کی وزیر اطلاعات رہیں۔ میڈیا پر سختی نہ کرنے کے اپنے موقف پر ڈٹے رہنے کی وجہ سے وزارت کو خیر باد کہنا پڑا۔ تعمیر مائیکرو فنانس بینک کے صدر اور چیف ایگزیکٹو ندیم حسین ان کے شوہر ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ان کی اور شوہر کی غیر منقولہ جائیداد ۹ کروڑ ۵۸ لاکھ ۹۰ ہزار اور منقولہ تقریباً ۴ کروڑ ۷۹ لاکھ ۴۲ ہزار روپے ہے۔ ان کے پاس چھ گاڑیاں ہیں جن کی مالیت ایک کروڑ ۲۵ لاکھ ۵۵ ہزار روپے کے لگ بھگ ہے۔ نیز ۱۹۰ تولے سونے کے زیورات، نقدی اور غیر ملکی کرنسی کے علاوہ تقریباً ۷ کروڑ روپے بھی رکھتی ہیں۔ ان پر تقریباً ۲۰ کروڑ ۸۰ لاکھ روپے کا قرض بھی ہے۔ پچھلے ماہ انھیں امریکہ میں نیا سفیر مقرر کیا گیا۔

## کاروباری دنیا

## (۱۱) نسرین قصوری

ماہرِ تعلیم، ۱۹۷۵ء میں بیکن ہاؤس سکول کا آغاز ایک کمرے سے کیا۔ اب سکول کی شاخیں انڈونیشیا، بنگلہ دیش، ملائیشیا، پاکستان، اومان، فلپائن، تھائی لینڈ، متحدہ عرب امارات اور برطانیہ میں ۸۱ ہزار طلبہ کی تعلیم کے لیے سرگرداں ہے۔ ۲۰۰۲ء میں درمیانے طبقے تک سکول کی تعلیم پہنچانے کے لیے ''دی ایجوکیٹر'' کا آغاز کیا۔ اس وقت ایجوکیٹر اور بیکن ہاؤس کی شاخوں میں ۱۹ لاکھ ۵ ہزار طلبہ وطالبات زیرِ تعلیم ہیں۔ ۲۰۰۲ء میں ڈسکوری سینٹر، بیکن ہاؤس نیشنل یونیورسٹی، ٹی۔این۔ایس بیکن ہاؤس اور ۲۰۰۳ء میں پریمیئر بس سروس شروع کی۔ ۲۰۰۴ء میں لاہور میں چائلڈ ڈویلپمنٹ سینٹر، ۲۰۰۵ میں بیکن انرجی لمیٹڈ اور پریمیئر ٹریڈنگ سروس کا آغاز کیا۔ نسرین قصوری کوئین میری کالج فار وومن، نیشنل کالج آف آرٹس، ایجوکیشن ایڈوائزری بورڈ پاکستان، پاکستان چیپٹر آف دی ورلڈ وائیڈ فنڈ اور کئی دیگر اداروں کے بورڈ کی رکن ہیں۔

## (۱۲) سیدہ حنا بابر علی

آپ کی اصل پہچان پیکیج (Packages) کی کنزیومر پراڈکٹس ڈویژن کی سربراہ کے طور پر ہے، جو مضبوط مالی ادارہ ہے۔ پاکستان میں گتا سازی اور پیپر مارکیٹنگ میں پہلے نمبر پر ہے۔ پیکیج کے جاپانی موٹر ساز کمپنی مٹسوبشی اور دیگر بڑے اداروں کے ساتھ شراکتی کاروبار ہیں۔ حنا نے یونیورسٹی آف مشی گن سے لٹریچر میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کر رکھی ہے۔ شاعری کا شوق ہے۔ ۹ سال کی عمر میں شاعری شروع کی۔ پہلا شاعری مجموعہ ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔

## (۱۳) روشانے ظفر

نوبل انعام یافتہ بنگلہ دیشی ڈاکٹر محمد یونس کے گرامین بینک کے کام سے متاثر ہوکر پاکستان میں ۱۹۹۶ء میں کشف فاؤنڈیشن کی بنیاد رکھی۔ ممتاز وکیل اور سیاست داں، ایس ایم ظفر کی صاحبزادی ہیں۔ ۱۰ ہزار امریکی ڈالر اور ۱۵ ہزار صارفین کے ساتھ آغاز کیا اور اب اس ادارے کی ۱۵۲ شاخیں ہیں۔ اب تک ۲۰ کروڑ ۲۰ لاکھ امریکی ڈالر کے ذریعے ۳ لاکھ ۶ ہزار خاندانوں کو



مستفید کر چکی۔ روشانے ظفر پاکستان مائیکرو فنانس نیٹ ورک، متعدد این۔جی۔اوز اور نیٹ ورکس مثلاً وومن ورلڈ بینکنگ، پاکستان مائیکرو فنانس نیٹ ورک، کاروانِ کرافٹس کے بورڈ کی رکن ہیں۔ اقوامِ متحدہ کے ایڈوائزری گروپ کی فنانس سروسز کی رکن ہیں۔

## (۱۴) آمنہ تاثیر

پنجاب کے سابق گورنر سلمان تاثیر مرحوم کی بیوہ، اپنے خاوند کے بعد ان کے تمام کاروبار کی مالک ہیں۔ درجِ ذیل چار بڑی کمپنیاں ان کی ملکیت ہیں:

First Capital Securities Corp.

Worldcall Telecom Ltd.

Peace Pakistan Ltd.

Media Times.

ان کمپنیوں کی چیف ایگزیکٹو ہونے کے باعث قومی سطح پر اہم مقام رکھتی ہیں۔ سوشل تقریبات کی روح رواں رہی ہیں۔

## (۱۵) سلطانہ صدیقی

آئی ٹیلی ویژن نیٹ ورک (ہم ٹی۔وی) کی ۲۰۰۴ء سے چیئرپرسن اور موبل پروڈکشن پرائیویٹ لمیٹڈ کی مالکہ ہیں۔ طویل عرصہ پاکستان ٹیلی ویژن میں پروگرام منیجر اور سینئر پروڈیوسر کے طور پر فرائض انجام دیے۔ سندھ گریجوایٹس ایسوسی ایشن وومن ونگ، میڈیا وومن جرنلسٹس اینڈ پبلشرز آرگنائزیشن کی سربراہ ہیں۔ سندھ مدرسۃ الاسلام کے بورڈ آف گورنر کی رکن ہیں۔ صدارتی ایوارڈ برائے حسنِ کارکردگی (۲۰۰۷ء۔۲۰۰۸ء) سمیت مزید چھ مختلف ایوارڈز حاصل کر چکی۔ کہا جاتا ہے کہ سلطانہ صدیقی نے عورت ہونے کے باوجود صنفِ نازک کو بدنام کر دیا۔ اس سے پہلے عورتوں پر اتنے بے باک ڈرامے نہ تو لکھے گئے اور نہ ہی بنائے گئے کہ جن سے عورت کا تقدس مجروح ہوا۔

## سماجی بہبود

## (۱۶) بلقیس ایدھی

وطنِ عزیز کی معروف ترین سماجی کارکن۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پیدا ہوئیں۔ بنیادی تعلیم کراچی میں پائی۔ ایک نرس کے طور پر عملی زندگی کا آغاز کیا۔ عبدالستار ایدھی سے شادی کے بعد ایدھی فاؤنڈیشن کی شریک چیئرپرسن بن گئیں۔ شوہر کے ساتھ مختلف منصوبوں پر کام کر رہی ہیں۔ خدمت میں اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر ہلالِ امتیاز حاصل کر چکیں۔

## (۱۷) فرحت ہاشمی

مشہور مقررہ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد میں تدریس سے پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا۔ مرحوم صدر فاروق احمد لغاری کے زمانے میں ان کے دروسِ قرآن کی شہرت صدارتی محل سے نکل کر بااثر طبقات کی خواتین تک پہنچ گئی۔ ۱۹۹۴ء میں الہدیٰ انٹرنیشنل کا آغاز کیا، یوں اسلام آباد کے بعد دیگر شہروں میں بھی ان کے دروس کے سلسلے جاری ہوئے۔ خواتین میں قرآن فہمی اور اسلامی تبلیغ کے حوالے سے اہم مقام رکھتی ہیں۔ یونیورسٹی آف گلاسگو برطانیہ سے اسلامک سٹڈیز میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔

## (۱۸) سمیحہ راحیل قاضی

پاکستان کی سب سے بڑی مذہبی سیاسی جماعت، جماعت اسلامی کے وومن کمیشن کی سربراہ اور سابق امیر جماعت، جناب قاضی حسین احمد کی صاحب زادی ہیں۔ خواتین کے مسائل اور مختلف ملکی و عالمی معاملات پر عالمانہ گفتگو کرنے میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے خاندانی نظام کو درپیش مشکلات پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ قومی اسمبلی کی سابق رکن ہیں۔ فی الوقت مختلف ملکی و غیر ملکی تنظیموں اور این۔جی۔اوز کے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساتھ مختلف منصوبوں پر کام کر رہی ہیں۔ کئی کتابوں کی مصنفہ بھی ہیں۔ بیٹھک سکول اور دیگر کئی فلاحی اداروں سے منسلک ہیں۔ دیہی پنجاب کے سب سے بڑے سکول نیٹ ورک، غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ (۴۳۰۰۰ طلبہ) کی ڈائریکٹر ہیں۔

## (۱۹) سیما عزیز

ماہرِ تعلیم ۱۹۸۸ء میں ''کیئر فاؤنڈیشن'' کی بنیاد ایک سکول سے رکھی جس میں جلد ہی طلبہ کی تعداد ۲۵۰ ہو گئی۔ فاؤنڈیشن کی بنیاد رکھنے کا مقصد اُن طلبہ کو تعلیمی عمل سے گزارنا تھا جو کسی بھی وجہ سے سکول نہیں آ سکتے تھے۔ اب اِس فاؤنڈیشن کے ۲۲۵/اسکول ہیں جن میں ایک لاکھ ۵۰/ہزار سے زائد طلبہ علم کی روشنی پا رہے ہیں۔ اِن کی دوسری پہچان سرینا انڈسٹریز کی مینجنگ ڈائریکٹر اور سیفم کی ایگزیکٹو ڈائریکٹر کے طور پر بھی ہے۔ ''بریزے'' اِن کا مشہور برانڈ ہے۔ اپنے بھائی کے ساتھ کیئر فاؤنڈیشن کا آغاز کیا اور اپنی پوری صلاحیتیں اِس منصوبے کی کامیابی کے لیے بروئے کار لائیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ سیما عزیز اپنے شوہر عابد عزیز، دو بیٹیوں اور ایک بیٹی کے ساتھ لاہور میں مقیم ہیں۔

## (۲۰) نگہت ہاشمی

مشہور مذہبی دانشور۔ ایم۔اے اسلامیات، عربی، ایجوکیشن ہیں۔ ایم۔فل ٹیچر ایجوکیشن کی ڈگری بھی رکھتی ہیں۔ لاہور میں بحیثیت اسلامیات لیکچرار پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۹۶ء میں النور انٹرنیشنل کی بنیاد رکھی۔ آپ کا مقصد نئی نسل میں قرآن وسنت کا فہم پیدا کرنا تھا۔ آج النور کے پاکستان کے ۱۷ بڑے شہروں میں کیمپس واقع ہیں جن میں لاہور، فیصل آباد، ملتان اور بہاولپور شامل ہیں۔ قرآن کے متعلق ۱۹/کتابیں شائع ہو چکیں۔ قرآن مجید کو جدید تقاضوں کے مطابق تفسیر کی صورت میں پیش کرتی ہیں۔ قرآن کی تعلیم کو عام کرنا زندگی کا مقصد ہے۔



## نجی ملازمت

## (۲۱) مشرف حیٔ

بہترین منتظمہ ہیں۔ پاکستان کی پہلی خاتون جنھوں نے کسی ملٹی نیشنل ادارے میں بطور مینجنگ ڈائریکٹر اعلیٰ سطح پر کام کیا۔ مختلف بڑے اور بین الاقوامی اداروں کی چیف ایگزیکٹیو رہیں۔ ان دنوں پاکستان میں لوریل برانڈ کے لیے کام کر رہی ہیں۔ آپ پاکستان کی سب سے مہنگی منیجر (تنخواہ تقریباً ۳۰/لاکھ روپے ماہانہ) خیال کی جاتی ہیں۔ یونی لیور آف پاکستان، سٹی بنک پاکستان اور کنزیومر بنکنگ کی چیف ایگزیکٹیو رہ چکی ہیں۔

## (۲۲) شفقت سلطانہ

ممتاز بینکار۔ تعلق کراچی سے ہے۔ صوبہ سندھ میں قائم فرسٹ وومن بنک کی تیسری صدر ہیں۔ پہلے اسی بینک میں مختلف نوعیت کی اہم ذمے داریوں پر فائز رہیں۔ یونائیٹڈ نیشن ڈویلپمنٹ پراجیکٹ کی طرف سے ۲۰۰۳ء میں سرٹیفکیٹ آف ایکسی لینس حاصل کیا۔ یو۔بی۔ایل سے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۸۹ء میں برانچ منیجر کے طور پر وومن بنک میں ملازمت شروع کی۔ پرل کانٹی نینٹل ہوٹل راولپنڈی کی پہلی خاتون منیجر ہونے کا بھی اعزاز حاصل کیا ہے۔

## (۲۳) شمشاد اختر

آپ بھی مشہور بینکار ہیں۔ دسمبر ۲۰۰۵ء میں پاکستان سٹیٹ بینک کی پہلی خاتون گورنر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ورلڈ بینک کا MENA آپریشن چلا رہی ہیں۔ ۱۹۹۰ء میں ایشیائی ڈویلپمنٹ بینک سے منسلک ہو گئیں۔ ۲۰۰۴ء میں جنوبی ایشیائی ڈیپارٹمنٹ کی سربراہ مقرر ہوئیں۔ ۲۰۰۶ء اور ۲۰۰۷ء میں ایمرجنگ مارکیٹ گروپ کی طرف سے بطور ایشیئر بیسٹ نامزد کی گئیں۔ ۲۰۰۸ء میں ایشین وال سٹریٹ کی طرف سے دس اعلیٰ ترین خواتین میں ان کا شمار کیا گیا۔ آپ نے ہارورڈ یونیورسٹی سے پوسٹ ڈاکٹریٹ کی تعلیم حاصل کر رکھی ہے۔

## (۲۴) آمنہ سیّد

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی مینجنگ ڈائریکٹر۔ ۱۹۷۹ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے کام کا آغاز کیا اور مختلف حیثیتوں سے کام کرتے ہوئے ۱۹۸۶ء میں یہ ادارہ چھوڑ دیا۔ ۱۹۸۸ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی نے چیف ایگزیکٹیو آف پاکستان کی پیشکش کی جو انھوں نے قبول کر لی۔ پہلی پاکستانی خاتون ہیں جو اس اعلیٰ عہدے پر پہنچیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی لندن سے ایڈوانس مینجمنٹ کی تعلیم حاصل کی ہے۔ ان کے نزدیک پاکستان میں ایسا کوئی نجی تعلیمی ادارہ نہیں جہاں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی کتاب موجود نہ ہو۔

## (۲۵) جہاں آرا

کراچی میں قائم پاکستان سافٹ ویئر ایسوسی ایشن، PASHA کی صدر۔ مارکیٹنگ، کمیونیکیشن اور انٹرایکٹو نیو میڈیا کا ۲۰ سالہ تجربہ رکھتی ہیں۔ مشرقِ بعید، ہانگ کانگ، متحدہ عرب امارات اور پاکستان میں خدمات انجام دیں۔ اِن دنوں "Take Back The Tech" کے نام سے ٹیکنالوجی سے آگاہی کے لیے مہم چلا رہی ہیں۔ سیمینار، ورکشاپ اور دیگر سرگرمیوں میں بھی متحرک ہیں۔ آپ کا سافٹ ویئر ہاؤس پاکستان میں انفارمیشن ٹیکنالوجی سے آگاہی اور فروغ کے سلسلے میں اہم مقام رکھتا ہے۔

## ادب

## (۲۶) بانو قدسیہ

اُردو کی ممتاز افسانہ نگار اور ناول نگار امر بیل جیسے خوبصورت افسانوں، ٹی وی ڈراموں اور راجہ گدھ نامی ناول سے شہرت ملی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے کیا۔ پھر نامور ادیب اشفاق احمد سے شادی ہوئی۔ کالج کے جریدے سے لکھنے کا سفر شروع کرنے والی بانو قدسیہ اب تک ۲۸/کتابیں تحریر کر چکی۔ تحریریں اثر پذیری میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ آپ کو ۲۰۰۳ء میں ستارۂ امتیاز اور ۲۰۱۰ء میں ہلالِ امتیاز سے نوازا گیا۔ ناول راجہ گدھ سول سروس کے نصاب میں شامل ہے۔ پی ٹی وی کے لیے طویل دورانیے کے یادگار کھیل لکھے۔ اشفاق احمد اور بانو آپا کی جوڑی کو اردو ادب کی مثالی جوڑی مانا جاتا ہے۔

## (۲۷) رضیہ بٹ

ناول نگار اور کہانی نویس۔ اب تک ۵۰/سے زائد ناول تصنیف کیے ہیں۔ ان میں سے چھ، سات ناولوں پر فلمیں بنی جنھیں مقبولیت ملی۔ فکشن نگاری میں خاص مقام حاصل ہے۔ پاکستان کی خواتین میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی ناول نگار ہونے کا اعزاز رکھتی ہے۔ دسویں جماعت میں اُردو میں ۱۰۰/فیصد نمبر حاصل کیے، جس پر اُستاد خاتون نے کہا، اگر میرے بس میں ہوتا تو ایک سو نمبروں میں سے ایک سو پچاس نمبر دے دیتی۔

## (۲۸) عمیرہ احمد

دورِ جدید کی نامور مصنّفہ۔ آپ سیالکوٹ میں پیدا ہوئیں۔ ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ اور دیگر رسائل سے لکھنے کا سفر شروع کیا۔ اب تک ۲۶/سے زائد مختلف ناول، کہانیاں، ریڈیو اور ٹی۔وی ڈرامے لکھ چکی ہیں جبکہ ۴/مزید تصانیف پر کام کر رہی ہیں۔ گورنمنٹ مرے کالج سیالکوٹ سے انگریزی میں ایم۔اے کیا۔ ''پیرِ کامل'' نامی ناول سے شہرت پائی۔ ۲۰۰۵ء سے مسلسل ایوارڈز حاصل کر رہی ہیں۔ اب تک مختلف شعبہ جات میں ۱۸/ایوارڈ حاصل کر چکی۔

## (۲۹) نوشی گیلانی

ممتاز شاعرہ بہاولپور کی صحرائی زمین میں جنم لیا گویا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ریگستان میں نخلستان کا ظہور ہوا۔ اب تک شاعری کے ۶ مجموعے شائع ہوئے جو انگریزی زبان میں بھی منتقل ہو چکے۔ برطانیہ میں بھی مقبول ہیں۔ شعری مجموعے اپنی مثال آپ ہیں۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے ایم۔اے اُردو اقبالیات ولٹریچر میں کیا۔ آپ کی شاعری سب سے زیادہ نوجوان نسل میں مقبول ہے۔

## (۳۰) پروین شاکر

نوجوان نسل میں مقبول ایک اور منفرد شاعرہ۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۹۴ء کو اس دنیا سے کوچ کر جانے والی پروین شاکر اپنی دل پذیر شاعری کی بنا پر آج بھی بڑے حلقے میں ہر دلعزیز ہیں۔ شاعری کی ۵ کتابیں، ایک مجموعہ ''ماہِ تمام'' اور کتاب ''کفِ آئینہ'' بھی تحریر کی۔ آپ کو پرائڈ آف پرفارمنس ایوارڈ بھی دیا گیا۔ استاد اور سرکاری نوکری کرنے کے ساتھ ساتھ اُردو شاعری کرتی رہیں۔ اس نامور شاعرہ نے تقریباً ۴۲ برس کی زندگی پائی۔ چھوٹی عمر میں شاعری شروع کر دی تھی۔

## ذرائع ابلاغ (میڈیا)

## (۳۱) نسیم زہرا

ممتاز صحافی۔ دنیا ٹی۔ وی کے شعبہ حالاتِ حاضرہ کی ڈائریکٹر ہیں۔ پالیسی میٹرز کے نام سے ایک پروگرام کرتی ہیں۔ قومی سلامتی اور جنوبی ایشیا میں ترقیاتی حکمتِ عملی ان کا خاص موضوع ہے۔ اسلام آباد میں ایک نجی ادارے ڈویلپمنٹ اینڈ ریسرچ کنسلٹنٹ کی حصہ دار ہیں۔ ایشیا سوسائٹی، ہارورڈ یونیورسٹی کے ایشیا سینٹر اور واشنگٹن یونیورسٹی کے ایک سکول کی فیلو ممبر ہیں۔ صدرِ پاکستان کی ایڈوائزری کمیٹی برائے فارن پالیسی میں ۲۰۰۰ء تک کام کیا۔ ۲۰۰۵ء میں اقوام متحدہ کے اصلاحات کے پروگرام کی خاص نمائندہ رہیں۔ قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم۔ بی۔ اے کر رکھا ہے۔

## (۳۲) عاصمہ چوہدری

مشہور میزبان (اینکر پرسن) اسلام آباد میں پیدا ہوئیں، وہیں سے ماسٹر تک تعلیم پائی۔ ۲۰۰۳ء میں بہترین پروگرام ویژن کا پی ٹی وی اور تیزی سے ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے ۲۰۱۱ء میں بہترین خاتون میزبان کا ایوارڈ حاصل کیا۔ حکومت امریکہ کی وزارتِ خارجہ سے متعلق ڈاکومنٹری پروڈکشن اور فلم میکنگ میں بھی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ دنیا ٹی۔ وی پر ''ان سیشن'' کے نام سے پروگرام کرتی ہیں۔ دس سال قبل جنگ اخبار میں بطور سب ایڈیٹر کام شروع کیا۔ جیو کے پروگرام ''پارلیمنٹ کیفے ٹیریا'' سے مقبولیت پائی۔

## (۳۳) انجم انصار

مدیرہ اور لکھاری۔ راولپنڈی میں پیدا ہوئیں اور فرسٹ ائیر سے لکھنے کا آغاز کیا۔ بی۔ اے، بی۔ ایڈ تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد صحافت کے میدان میں ایسی اُتریں کہ طنز و مزاح، انشائیہ، کالم، افسانہ، ناول، ریڈیو فیچر، ڈرامے، ٹی۔ وی سیریل، اسلامی مضامین اور سفر ناموں یعنی ہر طرف قلم آزمایا۔ طنز و مزاح پر ۹ سمیت ۱۶ کتب کی مصنفہ ہیں۔ گزشتہ ۲۲ سال سے ماہنامہ پاکیزہ کی مدیرہ ہیں۔ بطور مدیرہ بے حد پسند کی جاتی ہیں اور قارئین کے مزاج میں کافی دخیل ہیں۔ تحریروں اور گفتگو میں زندگی کی خوبصورتی، اللہ سے محبت اور اچھے پہلوؤں کو اُبھارتی ہیں۔ نئے لکھنے والیوں کی تحسین کرتی ہیں، اسی وجہ سے ہم عصر مدیروں کی نسبت زیادہ مقبول اور مؤثر ہیں۔

## (۳۴) مہر بخاری

نوجوان میزبان۔ بہت کم عرصے میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوئیں۔ صحافت میں بطور میزبان آئیں اور تیز، شوخ اور نوک جھوک والے لہجے کی وجہ سے مقبول ہو گئیں۔ ''کراس فائر'' کے نام سے دنیا ٹی۔ وی پر پروگرام



کرتی ہیں۔ لاہور سے تعلق ہے۔ یونیورسٹی آف واٹر لو کینیڈا سے بزنس اور اکنامکس میں تعلیم پائی۔ سما ٹی۔ وی میں بہترین میزبان، پروڈیوسر اور سٹار پرفارمنس آف ایئر کا ایوارڈ حاصل کیا۔ خبروں کی دنیا میں خبر بننا ان کا شغل ہے۔ سکینڈلز بھی پیچھا کرتے ہیں۔ احتیاط اور توازن ان کی پیشہ ورانہ عمر بڑھا سکتا ہے۔ ۱۸ نومبر ۲۰۱۱ء کو اسلام آباد میں کاشف عباسی (ٹی وی میزبان) سے شادی کے بندھن میں منسلک ہوئیں، یوں کوچۂ صحافت ہی شوہر کا گھر ٹھہرا۔

## (۳۵) عاصمہ شیرازی

ٹی وی میزبان۔ اسلام آباد میں پیدا ہوئیں۔ ۲۰۰۱ء سے میڈیا میں کام کر رہی ہیں۔ آج کل سما ٹی۔ وی چینل پر ''فیصلہ آپ کا'' کے نام سے پروگرام کرتی ہیں۔ ۲۰۰۱ء میں جیو ٹی۔ وی سے پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا۔ مقبولیت ملی تو اے۔ آر۔ وائی سے منسلک ہو گئیں۔ جولائی ۲۰۱۰ء میں سما ٹی۔ وی سے منسلک ہوئیں۔ بار بار چینل بدلنے سے شہرت اور ساکھ، دونوں متاثر ہوئے ہیں۔

## ہم کسی سے کم نہیں

## (۳۶) میجر جنرل شاہدہ ملک

پاک فوج کی افسر۔ ۵ مارچ ۱۹۴۶ء کو وزیر آباد کے نواحی گاؤں ناظم آباد میں پیدا ہوئیں۔ پاکستان کی پہلی تین ستارہ جنرل ہیں۔ پاکستان فوج کی میڈیکل کور میں ۱۹۷۰ء میں طلائی تمغا حاصل کیا۔ ۱۹۷۲ء میں میجر جنرل اسد سے شادی ہوئی۔ اس وقت راولپنڈی میں فرائض انجام دے رہی ہیں۔ خبریں یہ بھی ہیں کہ لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے پر ترقی پا جائیں گی، یوں یہ ایک اور بڑے اعزاز پر فائز ہوں گی۔

## (۳۷) نفیسہ صادق

عالمی شہرت یافتہ سفارت کار۔ ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی سے میڈیسن آف ڈاکٹر کی ڈگری لی۔ پاکستان میں متعدد اہم مقامات پر اہم ذمے داریاں ادا کیں۔ ۲۰۰۲ء میں کوفی عنان کے ساتھ اقوام متحدہ میں ایشیا کے لیے ایچ۔ آئی۔ وی۔ ایڈز کی خصوصی نمائندہ رہیں۔ اقوامِ متحدہ میں کسی بھی خاتون کو سب سے بڑے عہدے پر رہنے کا اعزاز صرف آپ کو حاصل ہے۔ آج کل یو۔ این سیکرٹری جنرل کی سپیشل ایڈوائزر ہیں۔ کئی مقالہ جات تحریر کیے۔ اقوامِ متحدہ کے سب سے بڑے فنڈ کی سربراہ بھی رہیں۔ ۲۰۰۰ء میں مارگریٹ سنگر ایوارڈ اور ۲۰۰۲ء میں ورلڈ سٹیزن شپ ایوارڈ بھی حاصل کیا۔

## (۳۸) بشریٰ اعتزاز

ممتاز وکیل۔ پاکستان کرکٹ بورڈ خواتین کی چیئر پرسن، مشہور سیاستدان اور وکیل اعتزاز احسن کی اہلیہ ہیں۔ اعتزاز احسن کے کاروبار میں بھی شریک ہیں۔ ۲۰۰۷ء میں چلنے والی عدلیہ تحریک میں عملی حصہ لیا۔

## (۳۹) شازیہ احمد

افسر پاک فضائیہ۔ آپ کو پاک فضائیہ کی پہلی خاتون سکواڈرن لیڈر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اپنی کمانڈ میں دیگر خواتین افسروں کی راہنمائی کر رہی ہیں۔ ایک ماہر جنگی پائلٹ ہیں۔

## (۴۰) حنا طاہر

پاک فضائیہ کی پائلٹ۔ یکم اپریل ۲۰۰۳ء میں فضائیہ سے منسلک ہوئیں۔ ساڑھے تین سال تربیت کے بعد دسمبر ۲۰۰۶ء میں گراجیوئیٹس افسر بنیں۔ اس کے بعد خود کو بطور جنگی پائلٹ ثابت کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ ڈاکٹر بننے کی خواہش تھی لیکن اب پاکستان کی پہلی ماہر خاتون جنگی پائلٹ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# محاوروں کا پوسٹ مارٹم

محمد غیاث الدین حامد

ہماری قومی زبان اُردو بہت ہی پیاری زبان ہے۔ یہ اپنے اندر مختلف زبانوں کے الفاظ محاورے، حکایتیں اور نصیحتیں سمیٹے ہوئے ہے۔ ہم اپنی زندگی میں مختلف مواقع پر مختلف محاوروں کا استعمال کرتے ہیں جن سے درست صورت حال فوراً سمجھ آ جاتی ہے۔ ذیل میں چند محاوروں کا برجستہ استعمال اور ان کا پس منظر پیش خدمت ہے۔

## ''میں کمبل کو چھوڑوں کمبل مجھے نہ چھوڑے''
## یا ''یہ شخص تو بالکل کمبل ہوگیا۔''

اس محاورے کو اس وقت استعمال کرتے ہیں جب کوئی شخص زبردستی آپ کا وقت ضائع کرے اور پیچھا نہ چھوڑے۔ تب کہتے ہیں کہ یہ شخص تو بالکل کمبل ہوگیا۔ اس محاورے کا پس منظر بیان کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ ایک دوست نے دوسرے دوست سے کہا ''وہ دیکھو دریا میں کمبل بہ رہا ہے، میں ابھی اسے نکال کر لاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ جب وہ اس کمبل کو پکڑنے میں کامیاب ہوگیا تو دیکھا کہ وہ کمبل نہیں ریچھ ہے۔ اب ریچھ نے اس شخص کو پکڑ لیا۔

جب دریا کے کنارے کھڑے دوست نے آواز دی ''کمبل کو چھوڑو۔ تم دریا سے باہر نکل آؤ۔''

اس دوست نے جواب دیا ''میں تو کمبل کو چھوڑ دوں، کمبل مجھے نہیں چھوڑ رہا۔''

## ''گربہ کشتن روز اوّل''

یہ محاورہ ہے تو فارسی زبان کا، لیکن اُردو زبان بولنے والے بھی اسے استعمال کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ دو دوستوں کی شادی ایک ہی وقت میں ہوئی۔ کچھ عرصے بعد ایک دوست دوسرے کے گھر آیا۔ دونوں دوستوں نے ایک دوسرے کے حالات معلوم کیے۔ مہمان دوست نے کہا ''میری تو بہت اچھی گزر رہی ہے۔ میری بیوی ہر بات مانتی اور میرا خیال رکھتی ہے، میں بہت خوش ہوں۔''

دوسرے دوست کے حالات برعکس تھے۔ میزبان نے مہمان دوست سے اس کی خوشحال زندگی کا راز معلوم کیا تو مہمان دوست نے بتایا ''شادی کے بعد پہلے ہی دن میرے کمرے میں ایک بلی گھس آئی۔ میں نے غصے میں تلوار نکالی اور بلی کو ہلاک کر دیا۔ میری بیوی نے جو بلی کی ہلاکت دیکھی تو خوفزدہ ہوگئی کہ یہ شخص بہت تیز مزاج کا ہے۔ اسی دن سے وہ میری ہر بات مانتی ہے۔''

میزبان دوست نے کہا ''یہ تو کوئی مشکل کام نہیں، ایسا تو میں بھی کر سکتا ہوں۔''

یہ تمام گفتگو میزبان دوست کی بیوی چھپ کر سن رہی تھی۔ جب رات کو اس کے شوہر نے وہی عمل دہرایا یعنی خود ہی کمرے میں بلی چھوڑی اور غصہ دکھا کر اسے ہلاک کر دیا تاکہ بیوی پر رعب پڑ سکے۔ لیکن یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا کہ بیوی بالکل متاثر نہیں ہوئی، بلکہ شوہر سے کہنے لگی ''گربہ کشتن روز اوّل۔'' یعنی بلی مارنی تھی تو پہلے ہی روز مارتے، اب میں تمھیں جان چکی ہوں۔ اس بلی کی ہلاکت اور تمھارے غصے کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔''

## ''کولہو کا بیل''

یہ محاورہ ایسے شخص کے لیے استعمال کرتے ہیں جس میں سمجھ بوجھ کی کمی ہو یا قوت فیصلہ نہ ہو اور وہ دن رات کام میں بھی لگا رہے۔ آج کا دور، مشینی دور ہے۔ ہر کام مشینوں کے ذریعے ہوجاتا ہے۔ مشینی دور سے پہلے دیہات میں زیادہ تر کام جانوروں سے لیا جاتا تھا۔ کھیت میں ہل چلانے، کنویں سے پانی نکالنے، تیار فصل کو منڈی تک پہنچانے اور چاول کو دھان سے علیحدہ کرنے کے لیے بھی بیل سے کام لیا جاتا تھا۔ غرض بہت سے کاموں میں بیل کی مدد اور طاقت سے انسان فائدہ اٹھاتے تھے۔ اسی طرح بیجوں سے تیل نکالنے کا کام بھی بیل ہی انجام دیتے۔ جس جگہ تیل نکالا جاتا اُسے کولہو کہتے ہیں۔ یہ لکڑی کی چکی کی طرح ہوتا ہے۔

اس میں بیج بھرنے کے بعد ایک موٹی سی گول چکنی لکڑی کے ساتھ بیل باندھ کر چکر لگوائے جاتے ہیں۔ بیل کی مدد سے اس کا درمیانی حصہ گھومنے لگتا ہے جس کی وجہ سے بیج پس جاتے اور ان سے نکلنے والا تیل ایک نالی سے گزرتا ہوا برتن میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ بیل کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی ہے تاکہ گول گھومنے کی وجہ سے اسے چکر نہ آئیں۔ بیل صبح سے شام تک اس کے گرد چکر لگاتا رہتا ہے اور یہی اس کا کام ہے۔ بیل اپنی دانست میں میلوں کا سفر طے کرتا اور اس بات سے بے خبر ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی محدود جگہ پر چکر لگا رہا ہے۔

## ''بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا''

بلی ہر شہر، ہر گلی اور محلے میں ملتی ہے۔ اسے کسی کے گھر داخل ہونے کے لیے اجازت کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ بلی کسی بھی گھر میں موقع پا کر سامنے رکھی شے کھا لیتی ہے، لہٰذا لوگ بلی کی پسندیدہ چیزیں اس کی پہنچ سے

### ذہانت

استاد نے شاگرد سے کہا ''کوئی مثال دے کر بتاؤ کہ سردیوں میں چیزیں سکڑتی اور گرمیوں میں پھیلتی ہیں۔'' شاگرد نے کہا ''جناب گرمیوں میں چھٹیاں پھیل کر ڈھائی تین مہینے اور سردیوں میں سکڑ کر دس پندرہ دن کی ہوجاتی ہیں۔''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دور رکھتے ہیں۔

آج کے دور میں لوگوں کو ریفریجریٹر کی سہولت میسر ہے لیکن پہلے لوگ اشیائے خورونوش کی حفاظت کے لیے باورچی خانہ کی چھت کے درمیان ایک ڈوری، رسی یا زنجیر کی مدد سے جالی دار ٹوکری نما برتن باندھ دیا کرتے جسے چھینکا کہتے تھے۔

جو سامان بھی بلی یا بچوں کی پہنچ سے دور رکھنا ہو، اسے ''چھینکے'' پر رکھ دیا جاتا۔ یہ چھینکا باورچی خانے کے بیچوں بیچ یعنی چاردیواری کے وسط میں ہوتا، لہٰذا بلی اس تک پہنچنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ البتہ بلی کے علم میں ہوتا کہ اس کی پسندیدہ شے چھینکے میں موجود ہے اور کوئی صورت نہیں کہ وہ اس تک پہنچ سکے۔ ایسے میں اگر اتفاق سے چھینکا خود بخود ٹوٹ جائے اور کھانے پینے کا سامان خود بخود بلی کے سامنے آگرے تو یہی کہا جائے گا کہ یہ چھینکا بلی کی قسمت یا نصیب سے ٹوٹا ہے یعنی ''بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔''

## ''ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور کھانے کے اور''

زمین پر بسنے والے جانوروں میں سب سے بڑا جانور ہاتھی ہے۔ جسامت کے لحاظ سے بھاری بھرکم، طاقت کے لحاظ سے بھرپور، سونڈ کے لحاظ سے الگ اور پھر بڑے سفید دانت۔ یہ دانت ہاتھی کی خوب صورتی بڑھانے کے علاوہ ہاتھی کے کسی کام نہیں آتے۔ البتہ منہ کے اندر والے دانت غذا چبانے کے کام آتے ہیں۔ یعنی منہ کے اندر والے دانت کھانے کے اور باہر والے دانت دکھانے کے۔ جب کوئی شخص اندر سے کچھ اور ہو اور ظاہر کچھ اور کرے تو ایسی صورت میں یہ محاورہ بولا جاتا ہے۔

## ''بندر کا انصاف'' یا ''بندر بانٹ''

یہ محاورہ ایک چھوٹ سی کہانی کی وجہ سے مشہور ہے۔ بچوں کے لیے لکھی گئی اس کہانی میں بتایا گیا ہے کہ ایک دن ایک بلی کو کسی جگہ روٹی پڑی ملی۔ اسی وقت دوسری بلی نے اسے اٹھا لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں میں لڑائی شروع ہوگئی۔ ایک کہتی ''میں نے اسے پہلے دیکھا ہے۔'' دوسری کہتی ''میں نے اسے پہلے اٹھایا ہے۔'' ابھی ان دونوں بلیوں میں لڑائی جاری تھی کہ وہاں سے ایک بندر کا گزر ہوا۔ بلیوں کو آپس میں روٹی کے لیے لڑتے دیکھ کر بندر سارا ماجرا سمجھ گیا۔ پھر بھی نزدیک آکر بلیوں سے پوچھا کہ وہ کیوں لڑ رہی ہیں؟ بلیوں نے ساری صورت حال بندر کو بتادی اور فیصلہ بندر پر چھوڑ دیا۔

بندر نے کہا ''روٹی دونوں بلیوں کو آدھی آدھی ملے گی۔'' بلیاں اس فیصلے پر راضی ہوگئیں۔ بندر نے روٹی کے دو ٹکڑے کیے، لیکن جان بوجھ کر ایک ٹکڑا بڑا اور دوسرا ذرا چھوٹا توڑا۔ پھر ترازو میں تول کر بلیوں سے کہا ''یہ ٹکڑے تو برابر نہیں، لہٰذا بڑے ٹکڑے میں سے میں تھوڑی سی کھا لیتا ہوں تاکہ دونوں ٹکڑے برابر ہو جائیں اور تم دونوں میں برابر تقسیم ہوں۔'' یہ کہہ کر بندر نے بڑے ٹکڑے کو کھانا شروع کردیا اور کچھ زیادہ ہی کھا گیا۔

پھر دونوں ٹکڑوں کو ناپ تول کر دیکھا اور کہا ''اب دوسرا ٹکڑا بڑا ہوگیا، لہٰذا اسے کھا کر پہلا ٹکڑا برابر کرنا ہوگا۔'' لہٰذا بندر نے دوسرا ٹکڑا اٹھا کر اسے کھانا شروع کردیا اور پھر زیادہ کھا گیا۔

پھر دونوں ٹکڑوں کو تول کر اندازہ کیا اور بولا ''اب وہ ٹکڑا بڑا ہوگیا ہے، لہٰذا پھر اس کو کھا کر برابر کرنا پڑے گا۔'' یوں بندر ٹکڑے برابر کرنے کے بہانے پوری روٹی کھا گیا اور دونوں بلیاں بندر کی شکل ہی دیکھتی رہ گئیں۔

بلیاں اگر آپس میں نہ لڑتیں تو بندر فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ یہ تھا ''بندر کا انصاف'' یا ''بندر بانٹ۔''

جب کوئی شخص فیصلہ یا انصاف کرنے کے دوران اپنے فائدے کا خیال رکھے یا زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرے تو اس موقع پر کہتے ہیں کہ ''یہ ہے بندر کا انصاف!''

مدیر محترم!

پرچہ یہاں انگلستان میں تاخیر سے ملتا ہے لہٰذا آج پڑھ پائی۔ آسمانیوں سے بھرا بابا اشفاق احمد اور ۱۲۱سی کا گڈریا شمارہ ستمبر میں پڑھنے کا موقع ملا۔

مضمون کیا ہے، عقیدت سے سرشار، محبوب کی محبت میں گندھا ایک انمول پھول ہے جو اس عہد کے بے پناہ انسانوں کے چرنوں میں آخری تحفہ کے طور پر چڑھایا گیا۔ سطر سطر شرینی اور لفظ لفظ شکر کے دانے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایسے چیلے کا روپ دھار چکے جو اپنے گرو کو لقمہ لقمہ کرکے کھا جاتا ہے۔ (یہ اشفاق صاحب کے الفاظ ہیں جو آپ نے اپنے مضمون میں نقل کیے ہیں۔ ص ۵۶)

اشفاق صاحب کی شخصیت تھی ہی ایسی کہ ہر دل کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بلاامتیاز نسل و طبیعت بھاتی۔ عباس صاحب! آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ کو ایک ''بابے'' کا درشن ہی نہیں بلکہ قرب حاصل ہوا۔ یہ سعادت ہر کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔ اشفاق صاحب کسی اور مذہب میں ہوتے تو شاید مہاتما کہلاتے اور ہر گرو مہاتما کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔

اشفاق صاحب سے ملاقات کی شدید خواہش تھی لیکن یہ آرزو اب حسرت میں تبدیل ہو چکی۔ البتہ ان کی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا، ڈرامے دیکھے اور زاویہ سے لطف اندوز ہوئے۔ زاویہ ایک ایسا پروگرام تھا جس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میں جو مغرب کی دانش گاہوں کی بھٹی میں عقلیت پرستی اور دلیل پسندی کی تربیت حاصل کرتی رہی، بہت حد تک قائل ہو گئی تھی کہ مشرقیت کی روحانیت ایک بے عمل علم ہے جو زندگی کی جدوجہد سے فرار سکھلاتا ہے۔ میرے نزدیک مغربی علم زیادہ بہتر تھا کیونکہ انسان ترقی کی اس معراج پر اس سے پہلے کبھی نہیں پہنچا تھا۔ مجھے لگا کہ سائنس صحیح کہتی ہے کہ حواس خمسہ کے علاوہ کوئی حقیقت نہیں۔ طبیعات سب کچھ ہے مابعد طبیعات کچھ نہیں۔

لیکن دل و دماغ کہتے ہیں کہ یہ دنیا حواس خمسہ تک محدود نہیں۔ آخر ایٹم کو ہم حواس خمسہ کے ذریعے نہیں پہچان سکتے۔ مواصلاتی لہریں کسی مشین کے ذریعے ہی وصول ہو سکتی ہیں۔ خلا کا علم ایک کمال درجہ کو پہنچا ہے اور اس کا مکمل سہرا سفید فام اقوام کو جاتا ہے۔ کبھی علم فلکیات پر غور کیجیے، عجیب مظاہر ملتے ہیں کہ جن کو عقل سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں تک کہ سائنس دان بھی مانتے ہیں کہ ایک بہت بڑی طاقت ہے جو اتنی بڑی کائنات کو قابو میں رکھے ہے۔ یہ کائنات ہمارے اندازے سے بہت وسیع اور حیرت انگیز ہے۔

میں نے سنا ہے کہ اشفاق صاحب بھی طبیعات میں دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ کوئی انہونی نہیں، آخر کو بہت سارے سائنسدان کٹر مذہبی تھے، جیسے ڈارون نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی کتاب بائبل کے لیے چیلنج ثابت ہوگی۔ وہ تو ایک مذہبی آدمی تھا۔ شاید اشفاق احمد کو علم تھا کہ طبیعات کے ذریعے بھی مابعد طبیعات میں داخل ہو سکتے ہیں۔

اب تو سفید فام اقوام بھی اپنے غرور کے پندار سے نکل رہی ہیں۔ وہ تسلیم کرتی ہیں کہ دو طرح کے علم پہلو در پہلو چلتے رہے ہیں۔ مشرق میں روحانیت کی تربیت پر توجہ دی گئی جبکہ اہل مغرب نے عقلیت کو اپنا شعار بنایا۔ عقل کے بغیر علم نہیں اور علم کے بغیر آگاہی نہیں۔ آخر کو گوتم بدھ نے بھی تو کہا ہے، گیان، دھیان اور نروان یعنی علم اور روحانیت کا ایک سمبندھ ہے جس کا اشفاق احمد کا علم تھا۔ اب اہل مغرب روحانیت کی کھوج میں نکلے ہیں کیونکہ خالی سائنس انسان کو مشین بنا دیتی ہے۔ اپنے تجربے سے میں نے سیکھا ہے کہ انسان کسی بھی حال میں مشین نہیں بن سکتا۔ انسان کو بلا امتیاز نسل و رنگ و لسانیت ایک بابے کی ضرورت رہتی ہے۔ ہر قوم ایک بابے کی تلاش میں ہے جو اس کی آتما کو پرماتما سے ملا دے۔

یہ عمل صدیوں سے جاری ہے۔ ذرا مذاہب پر غور کیجیے! سارے مذاہب ایک خالق کائنات کی وجود کی گواہی دیتے ہیں۔ تمام مذاہب تخلیق و مقصد انسان کی اساس پر قائم اور آتما کو پرماتما تک سفر کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ بس انداز جدا جدا ہیں لیکن پیغام کلید اکائی ہے اور شاید یہی روحانیت ہے۔ شاید اسی لیے بابے متعصب نہیں ہوتے۔ بابا میرے نزدیک ہر خاص و عام کے لیے ہے، وہ کسی خاص مذہب کی ملکیت نہیں ہوتا۔ مثلاً بابا فرید کا ذکر گرو گرنتھ صاحب میں ملتا ہے اور درگاہ اجمیر شریف سب کے لیے کھلی ہے۔ یاد رکھیے کہ صدیوں تک مسلمانوں نے مساوات کا سبق دیا۔ چاہے وہ ہندوستان ہو یا اندلس و سلطنت عثمانیہ جہاں یہودی خود کو یورپ کے مقابلے میں زیادہ باوقعت پاتے تھے۔

جہاں تک میرا خیال ہے، اشفاق صاحب متعصب نہیں تھے۔ آپ نے اپنے مضمون میں اشفاق صاحب، گوتم بدھ اور ژونگ کے حوالہ جات کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ روحانیت میں تعصب کے قائل نہیں تھے۔

سائنس دانوں کو بھی اب خدا اور بابوں کے ضرورت



پڑنے لگی ہے۔ ٹیسٹ ٹیوب بے بی بنانے والے بھی تسلیم کرتے ہیں کہ جہاں ان کی ٹیکنالوجی (علم نہیں) ناکام ہو، وہاں سے خدا کی قدرت شروع ہوتی ہے۔ گویا ''میں نے اپنے ارادوں کی شکست سے خدا کو پہچانا'' (حضرت علیؓ)۔ ماہرین فلکیات عموماً خدا کی حقیقت سمجھنے کے لیے آسمان کا رخ کرتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے وقت کی حقیقت کا خدا کی ذات سے ایک تعلق ہے۔ خدا زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ خلا میں جا کر ہم بھی زمان کے پابند نہیں رہتے کیونکہ کشش ثقل سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں، خلا میں سفر کرنے والے سائنس دانوں کی عمر رک جاتی ہے۔ حیات بعد الممات کا بھی تو یہی تصور ہے۔ اسی واسطے سائنس دانوں میں بھی بابے پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ بابے آپ کو ڈسکوری چینل پر بھی نظر آئیں گے اور سائنٹفک امریکن میں بھی ان کی تحریریں ملیں گی۔ اشفاق صاحب کا کہنا تھا کہ بابا ہونے کی شرط ڈاڑھی یا چغا پہنا نہیں بلکہ آسانیاں عطا کرنا ہے۔ اس کسوٹی کے تحت وہ سائنس دان بھی بابا ہے جس نے اینٹی بائیٹک دریافت کی کیونکہ اس کی دریافت نے لاکھوں لوگوں کو آسانیاں عطا کی ہیں۔ وہ سائنسدان بھی بابا ہے جو جسمانی اعضا کی پیوندکاری کر کے لوگوں کو سہولت عطا کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سائنس اور روحانیت میں رشتہ ہے اور اسے مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔

اہل مغرب کا روحانیت کا سفر ان کی اقدار سے شروع ہوتا ہے۔ اس کی پہلی منزل کٹھن ہے یعنی اپنی کمزوریوں اور کج روی کا ادراک اور پھر اعتراف۔ ادراک کے بنا اعتراف یوں ہے جیسے علم بنا ٹیکنالوجی! یعنی نری معلومات جو روح سے یکسر خالی ہو۔ جیسے گوگل جو علم میں بے مثل ہے لیکن اس کا علم تب تک بے کار ہے جب ایک صاحب عقل اس تک رسائی نہ حاصل کرے۔ پاپائے روم نے مسلمانوں سے معافی مانگ کر اس سیڑھی پر پہلا قدم رکھ دیا۔ اشفاق صاحب نے ہمارے سابقہ مشرقی پاکستان کے بھائیوں سے معافی مانگ کر (ص ۵۶) ایسی ہی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا۔ ہمارے بنگالی بھائی غدار نہیں تھے، ٹیکسٹ بک والے اپنی تصحیح کر لیں۔ انگلستان میں بنگالی بھائی ہمیشہ بہت محبت سے ملتے ہیں۔ بنگالی بھائی اور بہنیں اُردو بولنے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ اُردو سے کیسے نفرت کر سکتے ہیں؟ میں ہمیشہ اپنے سابقہ ہم وطنوں سے اپنی قوم کی طرف سے معافی مانگتی ہوں اور ہمارے بنگالی بھائی معاف بھی کر دیتے ہیں۔ اللہ نے انھیں بہت بڑا دل دیا ہے۔

اہل مغرب کو بھی اپنی کوتاہیوں کا احساس ہو رہا ہے۔ اکثر اوقات میری ایسے بابوں اور بابیوں سے ملاقات ہوتی ہے جو انگریزی میں ایسا رس گھولتے ہیں گویا کہہ رہے ہوں ''آؤ جی! بسم اللہ، جم جم آؤ، بڑی دور کے دیس سے آئے ہو۔ اس دیس کے بابے تو بڑے پہنچے ہیں۔ ہمیں ان کے قصے بتلاؤ۔ ہمارے لیے ان کے درشن کرنے کی پرارتھنا کرو۔''

ایسے بابے اور بابیں پاکستان کو سیلاب ہو یا ہیٹی کا زلزلہ، دان کرنے کے سے آگے ہوتے ہیں اور انعام کے وقت غائب۔ اشفاق احمد نے سدا ایسے ہی بابوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کو کہنا درست ہے کہ بابے ہمارے اردگرد ہیں، صرف دیدہ ور چاہیے۔

ہم بہت خوش قسمت تھے کہ ہمیں ایک بابا ملا۔ میرا جیسا مغرب زدہ انسان بھی انھیں مانتا، باتیں سنتا اور ان کی قدر و منزلت جانتا تھا۔ اشفاق احمد کی کمی کبھی پوری نہیں ہو پائے گی۔ لیکن امید ہے کہ ان کا لگایا ہوا درخت اپنی چھاؤں سے لوگوں کو امن و محبت کی آسانیاں عطا کرتا رہے گا۔

اختر عباس صاحب! آپ کے مضمون کا اختتام آب دیدہ کر گیا۔ بانو آپا تو مسلمان ہونے کے ناتے رحمتوں کا بندھن ایک جنم میں نبھا گئی ہیں۔ جہاں تک اشفاق احمد کا اس دارفانی سے کوچ کرنے کا معاملہ ہے تو وہ کچھ ایسے ہے ؎

پھر ملیں گے لیکن ایک وقفہ کے بعد

بہت ساری نیک تمناؤں کے ساتھ

**ذکیہ خلیل احمد**



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ترقی و خوشحالی کا سہل نسخہ

# تعلیمی اصلاحات

## وقت کی اہم ضرورت

پروفیسر شوکت فاروق

ملک میں پھیلی غربت، مہنگائی، بے روزگاری، دہشت گردی، کرپشن، بجلی و گیس کی کمی اور سیلاب و زلزلے کی تباہ کاریوں نے ہر کسی کو پریشان کر رکھا ہے۔ غور کریں تو ان تمام مسائل کی اصل وجہ جہالت اور غربت کی ظلمت ہے جسے صرف اور صرف تعلیم کی روشنی سے دور کیا جا سکتا ہے۔ اگر قوم اگلے ۱۰ر برس میں تعلیم یافتہ ہو جائے، تو پاکستان ایک ترقی یافتہ، پُرامن اور متحد ملک بن سکتا ہے۔ یہ صرف انتھک محنت، ایمانداری اور تنظیم کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

### منزل کا حصول

ہمارے تمام مسائل کا حل تعلیم اور صرف تعلیم سے جُڑا ہونا چاہیے جو تمام افراد کو بلاامتیاز، لازمی، معیاری اور یکساں مہیا کی جائے۔ اس سے ملک کا ہر فرد قوم کی ترقی میں برابر کا شریک ہو کر اپنی زندگی بھی بہتر بنا سکتا ہے۔ چنانچہ تعلیم کے میدان میں درج ذیل فوری تعلیمی اصلاحات کی ضرورت ہے:

(۱) ابتدا سے میٹرک تک تعلیم اُردو میں دی جائے۔ ان کے علاوہ حساب، سائنس، کمپیوٹر، نجی کاروبار کی ترغیب اور مختلف زبانوں کی سکھلائی پر خاص توجہ دی جائے۔

(۲) انٹر تک تعلیم کو لازمی کر دیا جائے تاکہ ثانوی تعلیم میں ہم عالمی معیار حاصل کر سکیں۔

(۳) جو طلبا و طالبات میٹرک کے بعد تعلیم جاری نہیں رکھ سکتے، ان اور دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبا کے لیے بھی لازمی اور مفت ۲ر سالہ فنی تعلیم کا اہتمام ہو۔

(۴) تعلیمی بجٹ کو فوراً قومی پیداوار (جی ڈی پی) کے ۶ر۲ فیصد سے بڑھا کر ۵ر فیصد کیا جائے جو اقوام عالم کی اوسط شرح ہے۔ اس تعلیمی بجٹ کو مندرجہ ذیل کاموں پر صرف کیا جائے:

☆ تعلیم سے محروم ۲ر سے ۳ر کروڑ اسکول جانے والے بچوں کے لیے نئے اسکولوں کا قیام۔

☆ اساتذہ اور والدین کی تربیت، بالخصوص ماں کی جو تعلیم یافتہ اور صحت مند معاشرے کی بنیاد رکھے۔

☆ کسانوں کی تعلیم و تربیت جس سے ان کی اپنی معاشی بہتری آئے نیز آبادی کی بڑھتی ہوئی خوراک کی ضروریات بھی پوری ہو سکیں۔

☆ تعلیم یافتہ ہنرمند افراد کی تیاری جو معیاری اور کم لاگت کی اشیا تیار کر سکیں۔

☆ وکلا اور ججوں کی تربیت جو سستا اور تیز انصاف مہیا کریں۔

☆ عوام دوست، چاق چوبند پولیس کے لیے تعلیم و تربیت کی خاص سہولیات۔

☆ تمام پیشہ ور، اعلیٰ عہدے داروں اور کاروباری حضرات کے لیے اپنے متعلقہ شعبوں میں ریفریشر/ تربیتی کورسز کا اجرا۔

☆ عوام کو زیادہ سے زیادہ رضاکارانہ سماجی خدمات انجام دینے کے لیے تیار کرنا اور اس مقصد کے لیے مراکز کا قیام۔

میری تمام پاکستانی شہریوں بالخصوص نوجوانوں، خواتین اور ریٹائرڈ بزرگوں سے درخواست ہے کہ وہ آئندہ الیکشن میں بھرپور حصہ لیں اور صرف اس جماعت کے امیدواروں کو ووٹ دیں جن کا اولین ایجنڈا تعلیم اور تعلیمی اصلاحات کا نفاذ ہو اور اس سیاسی جماعت کے راہ نماؤں سے یہ سوال لازمی پوچھے جائیں کہ:

(۱) کیا آپ کے منشور میں تعلیم اولین ترجیحات میں شامل ہے؟

(۲) کیا آپ نے کبھی تعلیم سے متعلق کوئی پالیسی بنائی یا اس کی حمایت کی یا کوئی اور خدمات اس کے لیے انجام دی ہیں؟

(۳) کیا آپ نے کبھی تعلیمی میدان میں وسائل یا سرمایہ کاری بڑھانے کی تجویز دی یا اس سلسلے میں خدمات انجام دیں؟

(۴) آپ شعبۂ تعلیم میں کیا اصلاحات لا سکتے ہیں جس سے پاکستانی عوام کا معیارِ زندگی بہتر ہو سکے۔



گوشۂ قارئین

## آئیے! بات کرتے ہیں

# ہم سیکھنے میں اتنے نالائق کیوں ہیں؟

### نہ سیکھنے کی وجوہات

ہمارے عوام و خواص سیکھنے میں کچھ نالائق ثابت ہوئے ہیں۔ قائدین اور خواص تو خیر جان بوجھ کر نہیں سیکھتے۔ ان کا یہ دانستہ عمل جہالت، نالائقی اور مجبوری نہیں بلکہ ذاتی مفاد، ذہنی بددیانتی اور قوت و اختیار سے لازوال محبت کی وجہ سے جنم لیتا ہے۔ قائدین سمجھتے ہیں کہ وہ تو پیدا ہی قیادت و سیاست کے لیے ہوئے ہیں۔ لیکن عوام اپنی غلطیوں اور ماضی و حال کے کھلے تضادات سے کیوں نہیں سیکھتے، یہ ایک بڑا اور بنیادی سوال ہے۔ وجوہ جو میری سمجھ میں آئیں، وہ چار ہیں۔

پہلی یہ کہ عوام کو ان قائدین نے تعصّبات کے جال میں جکڑ رکھا ہے۔ تعصّب کی بیماری انسان کا ذہن ماؤف کر دیتی ہے۔ اسے نظر سچ آ رہا ہوتا ہے لیکن تعصّب اسے دیکھنے نہیں دیتا۔ تعصّب ایسی بیماری ہے کہ قرآن حکیم میں اللہ رب العزت نے اس سے بچنے کی خاص تاکید کی ہے۔

دوسری بڑی وجہ عوام کے ذہنوں میں بٹھایا جانے والا خوف ہے۔ قائدین اپنے مقلدین میں خوف پیدا کر دیتے ہیں تاکہ وہ اُن کے ساتھ وابستہ رہیں اور صحیح یا غلط نظریات کی پروا کیے بغیر ریوڑ سے علیحدہ نہ ہوں۔ خوف کا جذبہ بھی سوچنے سمجھنے اور درست فیصلہ کرنے میں بڑی رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ انسان سبق سیکھ کر ماضی کی غلطیوں سے چھٹکارا حاصل کرنا بھی چاہے تو قائدین کا پیدا کردہ خوف تبدیلی کی خواہش کو روبہ عمل نہیں ہونے دیتا۔

عوام میں نہ سیکھنے کی تیسری وجہ مایوسی ہے۔ ایک تاثر پھیلا دیا جاتا ہے کہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ انسان کے بدلنے، سیکھنے اور بغاوت سے کچھ نہیں بدلے گا۔ بدلے گا تو زیادہ سے زیادہ چہرہ بدلے گا، حالات نہیں بدلیں گے۔

چوتھی وجہ عوام کی سادہ لوحی، اُن کی مجبوریاں اور بے بسی ہے۔ وہ سیکھنا چاہیں بھی تو اس کا اظہار نہیں کر سکتے۔ گھٹ گھٹ کر مرتے ہیں لیکن سیکھنے کے نتیجے میں تبدیلی کا کوئی راستہ کھلا نہیں پاتے۔ اول تو راہبر ہی نہیں ملتا اور اگر میسر آ بھی جائے تو کچھ دیر کے بعد وہی راہ زن بن جاتا ہے۔

مسئلے کا حل کیا ہے؟ ماہرین نفسیات و تعلیم بتاتے ہیں ''سیکھنے سے مراد رویوں کی تبدیلی ہے۔'' گویا عوام کے رویے تبدیل ہوں گے اور نتیجے میں معاشرتی، معاشی اور سیاسی ماحول بدل گیا تو ہم کہیں گے، عوام نے سیکھ لیا اور رویوں میں تبدیلی تعلیم و تربیت کے ذریعے ہی آ سکتی ہے۔

پروفیسر ملک محمد حسین۔ جوہر آباد

### اچھائی دیکھیں، اچھائی پھیلائیں

مشہور چینی فلسفی کنفیوشس کہیں سے گزر رہا تھا کہ چند افراد نے اس کی طرف انگلیاں اٹھائیں، کسی نے اس کے لباس کی طرف اشارہ کیا، دوسرے نے جوتوں کی طرف، کسی نے ہیئت کذائی کی نشاندہی کی۔ کنفیوشس ان سے کہنے لگا ''میرے بچو! جب تم اپنے ہاتھ کی ایک انگلی سے کسی کی طرف اشارہ کرتے ہو تو تمھارے اسی ہاتھ کی تین انگلیاں تمھاری طرف اشارہ کرتی ہیں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہمارا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ ہم عادتاً بحیثیت قوم اپنی غلطیوں اور دوسروں کی حماقتوں سے نہیں سیکھتے۔ لوگوں کے عبرت ناک انجام اور بدعملیوں و بداعمالیوں سے بھی نہیں سیکھتے۔ یہ ہماری عادت بن چکی ہے۔

اس تاریکی سے نکلنے کا راستہ یہ ہے کہ اچھائی سیکھیں اور اچھائی پھیلائیں۔ چنانچہ آج اور ابھی نئی زندگی کا آغاز کر دیجیے۔ پروفیسر سید شبیر حسین شاہ زاہد۔ ننکانہ صاحب

## سوچ مثبت رکھیے

ایک وجہ یہ ہے کہ ہماری سوچ مثبت نہیں۔ سوچ مثبت ہو جائے تو علامہ اقبالؒ جیسے ڈاکٹر اور جناب ڈاکٹر عبدالقدیر خان جیسے بہت سے محسن پیدا کر سکتے ہیں۔

تیمور لنگ اگر حقیر چیونٹی سے سبق سیکھ سکتا ہے، حضرت جنیدؒ بغدادی اخلاص کا مفہوم حجام سے سیکھ سکتے ہیں، تو ہمارے لیے تو حضور پاک ﷺ کی سیرت کھلی کتاب ہے۔

ریاض احمد رانا۔ ایبٹ آباد

## خود احتسابی کی عدالت

انسان کی جبلت ہے کہ وہ اپنی غلطیاں تسلیم کرنے کے باوجود خود کو حق پر سمجھتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے گرد و پیش کو اچھی طرح سمجھ نہیں پاتے۔ گویا جاگتے ہوئے بھی سوتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں سوتے کو جگانا آسان مگر جاگتے کو جگانا مشکل کام ہے۔ یہی حال ہمارا بھی ہے۔ ہم میں مستقل مزاجی کا بھی فقدان ہے۔ جب کوئی حادثہ یا واقعہ پیش آئے، تو ہم پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ لیکن جوں جوں وقت گزرے، اثر کم ہوتا جاتا ہے۔

زندہ رہنے اور کامیاب زندگی گزارنے میں بڑا فرق ہے اور ہم یہی فرق فراموش کیے بس جیتے جا رہے ہیں۔ اس خرابی کا ایک حل یہ ہے کہ خود احتسابی کی عدالت قائم کیجیے۔ احساس کی اس عدالت میں اپنا محاسبہ کیجیے اور کوشش کی جائے کہ ہر روز کچھ نہ کچھ ضرور سیکھ لیں۔

ناجیہ ملک۔ چناری آزاد کشمیر

## ذرائع ابلاغ کی طاقت

ہم میں سے اکثریت نے خود کو انا کے خول میں بند کر رکھا ہے۔ ہم محنت سے جی چرا کر یہ سوچتے ہیں کہ بس کسی طرح ''شارٹ کٹ'' کے ذریعے ڈھیر ساری دولت آ جائے اور ہم عیش و عشرت کی زندگی گزاریں۔ ہمیں یہ سوچ مذہبی و سیاسی راہنماؤں کے اعمال ناموں کی وجہ سے ملی ہے۔

بحیثیت مسلمان و پاکستانی قوم ہمیں جو سیکھنا چاہیے، وہ ہم نہیں سیکھتے۔ جو نہیں سیکھنا چاہیے، وہ ہم سیکھ رہے ہیں۔ نجات کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ سوچ تبدیل کرنے کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔ نیز عوام اپنے ووٹ کی طاقت سے منصف و باعمل اور اچھے کردار کے حامل لوگ منتخب کر کے اقتدار میں بھیجیں تاکہ ہم ان سے واقعی کچھ سیکھ سکیں۔ محمد معین الدین سیالوی۔ میانوالی شہر

## دماغ زنگ آلود نہ ہونے دیں

خالق کائنات اللہ نے انسان کو تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال کیا ہے۔ جس نے بھی نعمتوں کی قدر کی، ڈھنگ سے قرآن و سنت کے نور سے راہنمائی لی اور رسول پاک ﷺ کی سیرت کو رول ماڈل بنایا، تو نہ صرف زنگ آلود دماغ کو سوچنے سمجھنے عمل کرنے پر آمادہ کیا، بلکہ نئی نئی ایجادات کا سہرا بھی انھی مقدس ہستیوں کے سر پر بندھا۔ ہم بھی اسی راہ پر چلتے ہوئے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد مزمل احسن شیخ۔ لاہور

## دنیا کی کایا پلٹ دینے والے لوگ

واقعات کی کوکھ سے اچھے پہلو چننا اور کامیابی کا راستہ تلاش کرنا ہی انسان کا کام ہے۔ ''ہم سیکھنے میں بہت برے ہیں'' کا راگ الاپنے والے تن آسان، کام چور، سہل پسند، بدعنوان اور نکمے ہی ہوں گے، ورنہ جرأت و استقامت کے پہاڑ اور بہادری و جوانمردی کے کوہ گراں کے سامنے کوئی کام ناممکن نہیں۔ ''ہم سیکھنے میں برے ہیں'' والا جملہ سہل پسندوں کی اختراع ہے۔ ورنہ باشعور لوگ واقعات سے سبق حاصل کرتے، ہمت و عزم کی ساتھ کامیابی کا راستہ تلاش کر کے آگے بڑھتے اور دنیا کی کایا پلٹ دیتے ہیں۔ حق کا صحیح استعمال ووٹ کی صورت



میں کیجیے...... اچھے اوصاف کے حامل دیانتدار لوگوں کو آگے لانا ہم سب پر فرض اور قرض بھی ہے۔ جس دن ہم اقتدار کی بھاگ دوڑ کے لیے اچھے حکمران منتخب کرنے میں کامیاب ہو گئے، اسی دن ہم میں سے ہر ایک کی لغت سے یہ جملہ خود بخود مٹ جائے گا۔

حمزہ خان۔ کراچی

## سبق سیکھ کر کل اچھا بنائیے

مشہور کہاوت ہے کہ انسان تجربات اور غلطیوں سے سیکھتا ہے۔ مگر ہم بحیثیت قوم اس بات سے قدرے دور ہیں۔ حالانکہ ماہ و سال الوداع کہتے ہوئے یہ سبق دے جاتے ہیں کہ ہم اپنے آپ کو گزرتے وقت کی روشنی میں بہتر بنا سکتے ہیں۔ عطاء الرحمٰن شرقپور روڈ تحصیل و ضلع شیخوپورہ

## انا کا خول توڑ ڈالیے

سیکھنا ایک مسلسل عمل ہے لیکن کوئی نئی بات سیکھنے کے لیے آدمی کو اپنی ذہنی و فکری بندشوں سے نکلنا پڑتا ہے۔ بدقسمتی سے ہم نے پاکستانی عوام میں بات سننے، اختلاف برداشت کرنے اور تحقیق کی عادات پروان ہی نہیں چڑھنے دی۔ اسی لیے ہمارے دانشور اور عام لوگ بھی تحقیق و تنقید کے اصولوں سے نا آشنا اور جذباتیت کا شکار ہیں۔ ہمیں ہر وقت اور ہر شخص سے سیکھنے کی عادت اپنانا ہو گی اور اس کے لیے اپنی انا کے خول سے نکلنا ہو گا۔

محمد عمر قریشی۔ اسلام آباد

## ہر واقعے میں سبق پنہاں

اس دنیا میں وقوع پذیر ہونے والا ہر واقعہ میں عقل مند کے لیے ایک سبق پنہاں ہے۔ عقل و فراست کے حامل افراد انھی سے سبق سیکھتے ہیں۔ مگر صد افسوس، پاکستانیوں کی اکثریت سبق نہیں سیکھتی اور غلطیاں دہرانے کی مرتکب ہوتی ہے۔

آئیے! آج سے ہم سب اللہ کو حاضر ناظر بنا کر یہ مبارک عہد کریں کہ ہم اپنی اور دوسروں کی غلطیوں سے سبق سیکھیں گے۔ اگر ہم حتی المقدور اس عہد پر قائم رہے، تو ہمارا معاشرہ ایک عظیم مثبت تبدیلی کے ساتھ ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو جائے گا۔

خواجہ عثمان احمد۔ لاہور

ایک شخص، ایک تحریک، ایک عہد
جس نے اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے
عالم عرب کو جھنجھوڑا اور عالم اسلام کو پکارا
ایک نئی تاریخ نہیں بلکہ حقیقی تاریخ اپنے لہو سے رقم کی
اس تاریخ کی پرتیں دیکھیے، زیر نظر کتاب میں
حسن البناؒ شہیدؒ
ایک مطالعہ
مرتبین
عبدالغفار عزیز، سلیم منصور خالد
صفحات ۵۶۰
قیمت غیر مجلد ۲۸۰ روپے
مجلد ۳۵۰ روپے
اہل خانہ، دوستوں، ساتھیوں اور مغربیوں، کے تاثرات، مکالمات، مشاہدات،
اور اس عہد کے لمحات کا پیغام، ۱۳۵ اہل نظر کی ۴۰ سدا بہار تحریریں
روشن ضمیروں کو روشن تر کرتا ہے اور نشانِ منزل کی نشان دہی کرتا ہے۔
منشورات
منصورہ، ملتان روڈ لاہور۔ فون: 35425356-35434909 فیکس: 042-35434907
manshurat@hotmail.com



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# مشورہ حاضر ہے

اُردو ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ، آپ بھی اِن مشوروں کا حصہ بن سکتے ہیں
چھوٹے چھوٹے مسئلوں کے چھوٹے چھوٹے حل اکثر زندگی آسان کر دیتے ہیں

صغیرہ بانو شیریں

## شہد کا جادو

مجھے شہد اچھا نہیں لگتا لیکن لوگ بہت تعریف کرتے ہیں۔ قہوہ میں ڈال کر پیتے ہیں۔ شہد پینے کے فوائد بتائیے۔
میری بہن کے پیٹ میں اکثر درد رہتا ہے۔ وہ کالج میں برگر وغیرہ کھاتی ہے، شاید اس لیے درد ہو جاتا ہے۔ کوئی اچھا سا نسخہ بتائیے جس سے وہ ٹھیک ہو جائے۔
فرحان نذیر۔ ساہیوال

شہد ہمارے پیارے رسول ﷺ کو بہت مرغوب تھا۔ قرآن پاک کی سورہ النحل اور سورہ محمد میں شہد کا ذکر ہے۔ فرمان خداوندی کے مطابق شہد میں شفا ہے۔ بڑھاپے میں کمزوری، بلغم کی زیادتی، جوڑوں میں درد جیسی بے شمار تکالیف لاحق ہو جاتی ہیں۔ جو لوگ باقاعدگی سے شہد استعمال کرتے ہیں، صحت مند رہتے ہیں۔ شہد، سر سے لے کر بالوں تک قوت بخش ہے۔ اس جدید دور میں چہرے کے ماسک میں بھی شہد شامل کیا جاتا ہے۔ آپ شہد ضرور کھائیے، آپ کو اچھا لگے گا۔

تھوڑے سے شہد پر تقریباً ڈیڑھ چمچہ پسی ہوئی دار چینی چھڑک کر کھانے سے بدہضمی دور ہوتی ہے۔ تیزابیت نہیں ہوتی، کھانا ہضم ہوتا ہے لیکن اسے آپ کھانے سے پہلے لیجیے۔ سردی کے موسم میں دار چینی کا چھوٹا سا ٹکڑا لے کر دو پیالی پانی میں ابالیے، پھر ایک پیالی پانی میں ایک بڑا چمچہ شہد ملائیے۔ دار چینی کا یہ قہوہ آپ کو سردی سے محفوظ رکھے گا۔ گلا ٹھیک ہوگا۔ الائچی، پودینہ، سونف پانی میں ابال کر قہوہ پینے سے بھی پیٹ ٹھیک رہتا ہے۔ اسی طرح پودینہ کے دس بارہ پتے ایک پیالی پانی میں ابالیے، چھان کر ایک چمچ شہد ملائیے۔ پینے سے طبیعت بشاش ہو جائے گی، پیٹ کے کئی امراض بھی ٹھیک ہوں گے۔ گرم پانی میں شہد ملائیے اور لیموں کا تھوڑا رس ڈال کر پی لیجیے۔ کھانے کے بعد سبز چائے پینے سے کھانا ہضم ہو جاتا ہے۔ اس میں آپ لیموں ڈال سکتے ہیں۔ بہن سے کہیے کہ برگر وغیرہ کھانا چھوڑ دے، گھر سے ہلکا پھلکا کھانا ساتھ لے جائے۔

## چہرے اور بالوں کے لیے

میرا چہرہ بہت خشک ہے اور سردی میں اکڑ جاتا ہے، جھریاں پڑ جاتی ہیں۔ میں ۲۰ برس کی ہوں۔ سب مذاق اڑاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ بال جگہ جگہ سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ کسی طرح ٹھیک نہیں ہو رہے۔ کیا کروں؟
ثمینہ احمد۔ لاہور

ڈاکٹر سے پوچھ کر وٹامن تجویز کرائیے۔ آجکل میتھی مل جاتی ہے، پکا کر کھائیے۔ اس کے پتے توڑ کر دھو کر انہیں باریک پیس کر بالوں کی جڑوں میں لگائیے۔ آدھ ایک گھنٹے بعد سر دھو لیجیے اور گیلے بالوں میں لیموں کے رس کے پانچ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قطرے چوتھائی چمچ تیل ملا کر بالوں کی جڑوں میں لگائیے۔ میتھی کے پتوں کا لیپ چہرے پر بھی پندرہ بیس منٹ کے لیے لگا سکتی ہیں۔ پھر منہ دھو کر گلاب کا عرق لگا کر سو جائیے۔ میتھی کے پتے چہرے کی تازگی کے لیے مفید ہیں، جھریاں بھی ختم ہوجاتی ہیں۔ اس طرح گھیکوار کا گودا چہرے پر لگا سکتی ہیں، اسے بھی بالوں کی جڑوں میں لگا کر آدھ گھنٹہ بعد سر دھو سکتی ہیں۔ بالوں میں تیل ضرور لگائیے۔ چقندر کا تیل بالوں کے لیے بہت مفید ہے۔ دو چقندر پتوں سمیت لیں۔ چقندر کے گول گول قتلے کاٹ کر تیل گرم کر کے اس میں ایک ایک قتلہ ملائیں۔ جب خوب کالا ہو جائے، اتار کر دوسرا قتلہ ڈالیں۔ آخر میں پتے بھی ڈال دیں۔ تیل ٹھنڈا ہونے پر چھان کر یہ تیل لگائیں۔ چقندر کا تیل بالوں کو بڑھاتا، خشکی دور کرتا ہے۔ گاجر کا رس کچھ دن روزانہ پئیں اور اس میں بھی چقندر کا ایک بڑا ٹکڑا شامل کرلیں۔

## کام مکمل نہیں ہوتے

میرے ۳ر بچے ہیں۔ ساس سسر ساتھ رہتے ہیں۔ میں صبح ۱۱ر بجے سے رات ۱۱ر بجے تک کام میں لگی رہتی ہوں، کام پھر بھی ختم نہیں ہوتا۔ کوئی ایسا مشورہ دیں جس سے کام کرنا آسان ہوجائے اور میں بھی آرام کرسکوں۔

(کرن خالد۔ لاہور)

بی بی! کام کو صحیح طریقہ سے کیا جائے تو سب کام ہوجاتے ہیں۔ میری ایک ملنے والی لڑکی کے ۲ر بچے ہیں۔ میاں بینک میں ملازم اور ساس بیمار رہتی ہیں۔ وہ صبح نماز کے وقت اٹھتی ہے۔ واشنگ مشین میں کپڑے دھونے کے لیے ڈالتی ہے، چائے کا پانی رکھتی ہے، نماز پڑھ کر قرآن پاک کی تلاوت کرنے کے بعد کپڑے مشین سے نکال کر پانی میں صاف کر کے سوکھنے کے لیے مشین میں ڈال دیتی ہے، چائے بناتی ہے، ساس کو بسکٹ اور چائے کی پیالی ٹرے میں رکھ کر دیتی ہے، خود اپنے شوہر کے ساتھ چائے پیتی اور بچوں کا لنچ بکس تیار کرتی ہے جس میں کباب کا سینڈوچ اور بسکٹ ہوتے ہیں۔ دوبارہ چائے کا پانی رکھ کے انڈے تل کر سلائس کے ساتھ سب کا ناشتا بناتی ہے۔ بچے تیار ہوتے ہیں، اتنے میں وہ خود بھی تیار ہوجاتی ہے۔ ناشتا میز پر لگاتی، کپڑے تار پر پھیلاتی، برتن سمیٹ کر دھو کر رکھنے کے بعد اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ خود بھی اسکول میں پڑھاتی ہے۔ سکول سے آکر روٹی پکاتی اور کھانا شام کو ہی بنا کر فریج میں رکھ دیتی ہے۔ وہ کہتی ہے میرے پاس تو وقت ہی وقت ہے۔ شام کو گھومنے بھی جاتی ہے۔ استری بھی کرتی ہے۔ آپ بھی وقت کی تقسیم کریں۔ پہلے زمانے میں فریج، مائیکرو ویو، واشنگ مشین نہیں ہوتی تھی، پھر بھی خواتین سارے کام کرتی تھیں۔ سلائی، کشیدہ کاری بھی شامل کرتیں۔ آپ کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ آپ صبح دیر سے اٹھتی ہیں۔ صبح صبح اٹھیے، ۱۱ر بجے تک بہت سارے کام نمٹا لیں گی۔ ہمت کریں۔ گھڑی دیکھ کر کام کریں۔ وقت کی قدر کریں۔ دو چار دن مسئلہ ہوگا، پھر آپ عادی ہوجائیں گی اور آرام بھی کرسکیں گی۔

## موٹاپا

میری دو بہنیں ہیں۔ شادی کے بعد ان کا جسم بھدا ہوگیا اور بچے ہونے کے بعد تو عجیب سی لگتی ہیں۔ میری بھی شادی ہوگئی ہے۔ آپ سے صرف یہ پوچھنا ہے کہ کوئی ایسا ٹوٹکا ہے جس کے استعمال سے حمل کے دوران کوئی بھی مسئلہ لاحق نہ ہو اور بچے کی پیدائش کے بعد موٹاپا نہ آئے۔

(بیگم جلال۔ وہاڑی)

پنجاب میں خواتین عام طور پر موٹی ہوجاتی ہیں، خصوصاً پیٹ بڑھ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے، زچگی کے بعد وہ خوب کھاتی پیتی اور کام کاج نہیں کرتیں۔ بنگال میں خواتین چھریرے بدن کی دکھائی دیتی ہیں اور ہندوستان میں بھی پیٹ،



کمر اور کولہوں پر چربی نہیں چڑھتی۔ کھانے پینے میں احتیاط کرتی ہیں۔ کراچی سے قاری سعید صاحب نے اس سلسلہ میں ۲ر ٹوٹکے بتائے۔ بے شمار خواتین نے عمل کیا اور وہ موٹاپے کا شکار نہیں ہوئیں۔ بادام کا تیل اپنے سامنے نکلوائیں کیونکہ خالص تیل ہی اچھا رہتا ہے بازاری نہیں۔ تیسرے چوتھے ماہ سے حمل کے دوران ۱۰ر قطرے بادام کا تیل، آدھا کپ دودھ میں ملا کر صبح شام پینے سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ بچہ ٹھیک رہتا ہے اور حمل کے دوران کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔

اسی طرح ۲ر چمچ گندم ۲ر کلو پانی میں خوب اُبال لیں۔ پھر گندم نکال کر یہ پانی بوتل میں رکھ لیں۔ بچہ پیدا ہونے کے بعد یہی پانی پئیں۔ ختم ہوجائے تو دوبارہ بنالیں، پیٹ بالکل نہیں بڑھے گا۔ اس میں کوئی بھی نقصان نہیں۔ آپ محسوس کریں گی کہ آپ کا جسم پھولے گا نہیں۔ آپ دُبلی پتلی رہیں گی۔ یہ ٹوٹکا ہندوستان کے علاوہ بیرون ملک بے شمار خواتین نے استعمال کیا اور وہ بالکل چھریرے بدن کی رہیں۔ آپ بھی استعمال کریں۔

## نیاز بو

ہمارے ہاں نیاز بو کے پودے ہیں۔ ان کا کیا فائدہ ہے اور ہم اسے کس جگہ اگانا چاہیں تو کیسے لگائیں۔

(رومانہ۔ راولپنڈی)

بی بی! نیاز بو کے پودے بہت مفید ہیں۔ ہندو تلسی کی پوجا کرتے ہیں، اس پودے کو متبرک مانتے ہیں۔ یہ پودا خودرو ہے۔ اس کا بیج کسی طرح بھی زمین میں چلا جائے، پودے پر پھول آئیں گے۔ پھر سوکھ کر ان میں چھوٹے چھوٹے کالے بیج نظر آئیں گے، یہی بیج ہوا میں اڑ کر جہاں جہاں گرتے ہیں، پودے نکل آتے ہیں۔ ان بیجوں کو ہاتھ میں لیکر ہتھیلی سے مسل کر گملے میں یا زمین میں ڈالیں گی تو چند دنوں میں ننّے منے پودے نکل آئیں گے۔ نیاز بو کی خوشبو بہت پیاری لگتی ہے۔ اس کے تازہ پھولوں کا گلدستہ بنائیے۔ پانچ چھ پھولوں والی ٹہنیاں توڑ کر گلدان میں یا گلاس میں رکھئے۔ کیڑے مکوڑے اور مچھر غائب ہوجائیں گے۔

نیاز بو کے پتے بہت سے امراض میں کام آتے ہیں۔ اس کے نرم و نازک پتوں کی چٹنی دل کو طاقت دیتی ہے۔ مٹھی بھر پتے لیں، ذرا سا نمک، کالی مرچ، ہری مرچ ڈال کر چٹنی پیس لیں۔ کھانے کے ساتھ یہ چٹنی استعمال کریں۔ بہت مفید ہے۔ آپ اس چٹنی کو سلائس کے ساتھ بھی کھا سکتے ہیں۔ دو تین پتے نیاز بو، ایک دو کالی مرچ کے ساتھ چبانے سے صحت ٹھیک رہتی ہے۔ اردو ڈائجسٹ کے بہت سے قارئین نے نیاز بو کی چٹنی بنا کر کھائی اور انہیں بہت فائدہ ہوا۔ اعصابی دباؤ بھی نہیں رہا اور وہ کام کاج کے قابل ہوگئے۔ آپ بھی اس کی چٹنی بنا کر کھائیے۔ گھر والوں کو دیجئے۔ آپ اسے سلاد میں بھی شامل کرسکتی ہیں۔

## آنکھ کے اوپر دانہ

چند ماہ سے میری آنکھ کے اوپر دانہ نکل آتا ہے جس سے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ دوا بھی کھاتا ہوں مگر یہ مسئلہ جلد ختم نہیں ہوتا۔ یہ کیسے ٹھیک ہوگا؟

ندیم احمد۔ کوہاٹ

اسے گوہانجنی کہتے ہیں۔ یہ دانہ بہت تنگ کرتا ہے۔ جیسے ہی درد محسوس ہو، اسی وقت ہتھیلی پر شہادت کی انگلی رگڑ کر دانے پر بار بار لگائی جائے تو دانہ بڑھتا نہیں بلکہ ختم ہوجاتا ہے۔ اسی طرح لونگ کا پھول نہیں بلکہ لونگ کی ڈنڈی کسی صاف جگہ گھسا کر بڑی احتیاط سے دانے کے اوپر لگائیں۔ آنکھ میں نہ جائے، ورنہ جلن ہوگی۔ اس سے دانہ جل جاتا ہے۔ بار بار دانے نکلیں تو املی کا بیج گھسا کر لگانے سے دانے ختم ہوجاتے ہیں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قصہ کوئز دراصل اہم تاریخی واقعات سے ایسے دلچسپ قصوں کا انتخاب ہے جن کا مطالعہ پڑھنے والوں کو بڑے کاموں پر اُکساتا اور زندگی کو بامقصد بنانے کا شعور عطا کرتا ہے۔ دلچسپی، معلومات اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ، اس کی ۳ بنیادی خوبیاں ہیں۔ ان قصوں کو بہ غور پڑھیں اور ہر قصے کے آخر میں دیے گئے ۲ سوالات سے اپنی ذہانت کو پرکھیں۔ درست جواب ہمیں بھجوا دیجئے۔ درست جواب دینے والے زیادہ ہوئے تو قرعہ اندازی کی جائے گی اور دو خوش نصیبوں کو ''اردو ڈائجسٹ'' کے ۶ رشماروں کی انعامی و اعزازی ترسیل کے علاوہ وحی شاہ کی شاعری کی ۲ خوبصورت کتابیں دی جائیں گی۔ پہلے کوئز کا انعام پانے والے خوش نصیب قرار پائے ہیں: ۱۔ سید مرتضیٰ علی واسطی (اسلام آباد) ۲۔ محمد سعید (لاہور)

جوابات بھیجنے کا پتہ: **مدیر ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ** G-III 325، جوہر ٹاؤن لاہور

پچھلے ماہ کے درست جوابات ارسال کرنے والے قارئین کے نام یہ ہیں:

محمود منور خان (سرگودھا)، عبدالماجد مغل (کراچی)، محمد فاضل قریشی (راولپنڈی)، راجعہ شہزاد/ فائزہ عمار (کوٹ رادھا کشن)، فرہاد علی وبروی (کراچی)، محمد جہانگیر قریشی (آزاد کشمیر)، شرافت خان (کراچی)، محمد یونا مجاہد (میاں چنوں)، محمد اقبال (آزاد کشمیر)، پروفیسر محمد ظریف خان (کراچی)، ڈاکٹر خالد سیف اللہ خان (لاہور)، احسان اللہ (فیصل آباد)، طیبہ وقار (راولپنڈی)، محمد خلیل چودھری (جہلم)، خالد حسن (لاہور)، ابوعلی عبدالوکیل (بہاولنگر)، محمد حمزہ قادری (حیدر آباد)، محمد عرفان (لاہور)، محمد خالد سلیم (ملتان)، شہاب الدین خان (ایبٹ آباد)، خواجہ عثمان احمد (لاہور)، سائرہ یاسمین (لاہور)، مصباح الامین (گوجرانوالہ)، سعد علی طارق (جہلم)، محمد یونس (پتوکی)، زرنگار (شیخوپورہ)، محمد سلیمان (اسلام آباد)، ماریہ فاروق (ضلع نکانہ)، عائشہ فاروق (ضلع نکانہ)، منور سعید خانزادہ راجپوت (بے نظیر آباد)، ستارہ اعزاز (لاہور)، پروفیسر محمد طاہر (سرگودھا)، محمد امیر حمزہ (گجرات)، مسز انوار بیگ (اسلام آباد)، فصیحہ خالد (جہلم)، خالد محمود قریشی (جہلم)

## قصہ کوئز1

ملک میں شدید قحط سالی تھی۔ گرمی کا موسم پورے شباب پر تھا۔ فصلیں پکنے کے قریب تھیں۔ سواریوں اور سامان ڈھونڈنے کا انتظام کرنا دشوار تھا۔ ان حالات میں شام کی سرحدوں پر قیصر نے اپنی فوجوں کے ساتھ مسلمانوں پر حملے کی تیاریاں شروع کر رکھی تھیں۔ اس سرزمین کی بہ ظاہر سب سے بڑی قوت اسلام کے نام لیواؤں کو یکسر ختم کر دینے کے درپے تھی۔ مسلمانوں کو احساس تھا کہ اس موقع پر کمزوری دکھانے کا مطلب اپنی بساط کو الٹ دینا ہے۔ چنانچہ تمام مسلمانوں نے پورے جوش و جذبے کے ساتھ جنگ کی تیاری شروع کی۔ مال و اسباب کی فراہمی میں ہر ایک نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر حصہ لیا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے بڑی بڑی رقمیں پیش کیں۔ غریب صحابہؓ نے اپنی دن بھر کی کمائی نظر کی، عورتوں نے اپنے زیور اتار کر دے دیے۔ جو کچھ نہ کر سکے وہ اس ملال سے روتے رہے کہ وہ کیوں کچھ نہ کر سکے۔ ایثار و قربانی کی ایسی مثالیں پوری اسلامی تاریخ میں کہیں اور نہیں ملتیں جو اس موقع پر نظر آئیں۔

(الف) بتائیے، تو یہ کون سی جنگ کی تیاری تھی؟

(ب) کون تھا جو اپنے گھر کا سارا سامان اُٹھا لایا اور کہا ''یارسول اللہؐ میں اپنے گھر میں صرف اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت چھوڑ آیا ہوں؟''

☆☆

## قصہ کوئز2

میں نے کہا ''میں پینٹر بنوں گا۔''

میرے والد نے کہا ''نہیں تم پینٹر نہیں بن سکتے۔''

میں نے کہا ''بنوں گا.....''

باپ نے کہا ''ہرگز نہیں.....'' مجھے خیال آیا کہ میرا باپ بات کا پکا ہے، وہ جس بات پر اڑ جائے اس سے ہٹتا نہیں۔ اگلے ہی لمحے مجھے خیال آیا کہ، آخر میں بھی تو اسی باپ کا بیٹا ہوں، مجھے کسی بھی طرح اپنے باپ سے پیچھے نہیں ہونا چاہیے..... بس پھر کیا تھا، میں نے اپنا حتمی فیصلہ سناتے ہوئے کہا ''میں پینٹر بنوں گا اور میں پینٹر بن گیا۔''

(الف) یہ بات جس شخصیت نے اپنی خودنوشت سوانح عمری میں لکھی، اس کا نام کیا ہے؟

(ب) پوری دنیا کو جنگ کے جہنم میں دھکیل دینے والی اس شخصیت کا تعلق کس ملک سے تھا؟

☆☆

## قصہ کوئز3

''میرے ہاتھ کو غور سے دیکھو، ہاتھ کی پانچوں انگلیاں اگر ایک دوسرے سے علیحدہ ہوں تو کس قدر کمزور ہوتی ہیں، لیکن اگر ان انگلیوں کو باہم ملا دیا جائے تو یہ مُکہ بن جاتا ہے۔ یہ مُکہ بڑے سے بڑے دشمن کے دانت توڑ سکتا ہے۔'' مُکے کے حوالے سے یہ مخصوص لب و لہجہ تحریک پاکستان کے ایک نامور قائد کا ہے جنھیں شہید کر دیا گیا۔

(الف) آپ ان کے نام کے علاوہ یہ بھی بتائیے کہ انھیں کس شہر میں شہید کیا گیا؟

(ب) قاتل کا نام کیا تھا؟

☆☆

## قصہ کوئز4

جنگ کریمیا زوروں پر تھی اور خبریں آ رہی تھیں کہ اس جنگ میں زخمی ہونے والوں کی خبر گیری ٹھیک سے نہیں ہو رہی۔ اس نے وزیر جنگ کو لکھا کہ میں زخمیوں کی دیکھ بھال کے لیے اپنی خدمات پیش کرنا چاہتی ہوں۔ اسے اجازت دے دی گئی اور وہ اپنی ۳۸ ساتھی نرسوں کے ساتھ کریمیا کی جانب چل پڑی۔ روز و شب آرام اور کسی توقف کے بغیر وہ زخمیوں کی دیکھ بھال کرتی، کام میں مصروف رہتی، ہسپتال کی صفائی کرتی، مریضوں کے بستروں تک جا کر انھیں حوصلہ دیتی اور ان میں زندگی کی اُمنگ پیدا کرتی۔ اس کی کوششوں کے باعث زخمیوں میں شرح اموات ۴۲ فیصد سے کم ہو کر ۲ فیصد تک آ گئی۔

(الف) درد مند دل رکھنے والی اور مریضوں کی زندگی کا پیغام دینے والی یہ خاتون کون تھی؟

(ب) اُس کا تعلق کس ملک سے تھا؟



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نوید اسلام صدیقی

# مطالعے کی میز پر

آیئے..... اکتابوں کی صحبت میں کچھ وقت گزاریئے

یہ کالم آپ کو کتابوں پر تبصرے سے کافی مختلف لگے گا۔ اس میں کتاب اور صاحب کتاب دونوں کا تذکرہ رہے گا اور ہر بار غور و فکر کے لیے کچھ موتی آپ کی نذر کرتے رہیں گے

## قرآن کریم ایک مسلسل معجزہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم چوہدری، مکہ مکرمہ میں ام القریٰ یونیورسٹی اور گلاسگو یونیورسٹی، برطانیہ سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ کتابوں کی تلاش میں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، دمشق، بغداد، قاہرہ، ڈبلن، پیرس، میونخ اور لندن کے کتب خانوں تک جا پہنچے۔ فروری ۲۰۰۷ء میں سرگودھا یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا منصب سنبھالا۔

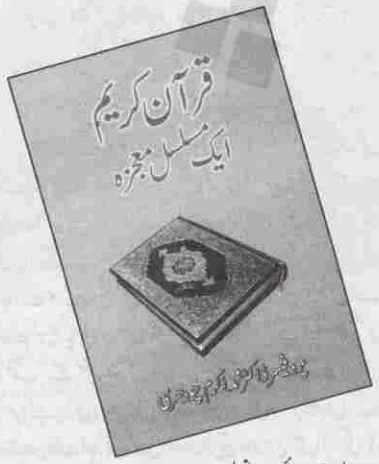


ڈاکٹر صاحب نے ریڈیو پاکستان سرگودھا کے لیے قرآن کریم کے موضوع پر چار تقاریر ریکارڈ کرائیں۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی کی جامعہ عابد میں قرآن کی مجالس میں متعلقہ موضوعات پر تقاریر کیں۔ انہی تقاریر کے مواد کو ترتیب نو کے بعد کتاب کی صورت میں مرتب کیا گیا جس کا نام: ''قرآن کریم ایک مسلسل معجزہ'' ہے۔ لکھتے ہیں:

''یہ ۱۹۸۴ء کے اواخر کا ذکر ہے کہ میں اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے سپروائزر پروفیسر ڈاکٹر حسن محمد باجودہ کی خدمت میں حاضر ہوا، جو اس وقت ام القریٰ یونیورسٹی، مکہ مکرمہ کے کلیۃ اللغۃ العربیہ میں صدر شعبہ عربی زبان ہیں۔ میں نے آنجنابؐ کے فرمان ''لاتنقضی عجائب القرآن ولاتخلق عن کثرۃ الردّ قاتلوہ'' (قرآن کریم کی محیرالعقول چیزیں کبھی ختم نہ ہوں گی اور یہ کتاب اپنے پڑھنے والوں کو اکتاہٹ کا شکار نہیں ہونے دے گی لہٰذا تم اسے پڑھا کرو) پر بات کرتے ہوئے اپنی رائے دی۔ استاد محترم نہایت ہیجانی کیفیت میں کھڑے ہوگئے اور مجھے بازو سے پکڑ کر جناب راشد راجح وائس چانسلر، ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ کے پاس لے گئے اور مخاطب ہوتے ہوئے کہنے لگے ''میں نے آپ کو کہا نہیں تھا کہ قرآن کریم اترا تو بطحا کی وادیوں میں، اسے پڑھا اہل مصر نے اور سمجھا برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں نے۔ سنو یہ نوجوان قرآن کریم کے بارے میں کیا کہتا ہے۔''

وائس چانسلر صاحب (بعد میں مملکت سعودی عرب میں ایک عرصہ وزیر تعلیم بھی رہے) کے استفسار پر میں نے اختصار کے ساتھ عرض کیا کہ دنیا کی سبھی زبانیں امتداد زمانہ اور مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ بدل جاتی ہیں۔ ان زبانوں کی صرف ونحو، انشاء، اسالیب بیان اور لفظ اور معنی کے باہمی تعلق کی نوعیت میں تبدیلی آجاتی ہے۔ الفاظ کے معانی بسا اوقات اس قدر بدلتے ہیں کہ چند صدیوں میں وہ بالکل الٹ مفہوم دینے لگتے ہیں اور یہ تطور دلالی (Semantic Extension) زبانوں میں وقوع پذیر ہونے والا قانون قدرت ہے۔ لیکن اسے کتاب اللہ میں استعمال ہونے والے ذخیرہ الفاظ نے توڑا ڈالا۔ جہاں قانون فطرت ٹوٹتا اور خرق عادت کا کوئی مظاہرہ سامنے آتا ہے، اگر وہ نبی کے ہاتھ سے ہو تو ہم اسے معجزہ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ زبانوں میں وقوع پذیر اسی قانون قدرت کو قرآن کریم کے الفاظ اور اسالیب صدیوں سے توڑتے چلے آئے ہیں کہ قرآنی الفاظ نے گزشتہ چودہ صدیوں میں اپنے مفاہیم نہیں بدلے، لہٰذا قرآن کریم ایک مسلسل معجزہ ہے۔''

میں نے سلسلہ کلام میں عربی اور دیگر زبانوں کی کچھ مثالیں بھی عرض کیں۔ وائس چانسلر صاحب میری گفتگو سننے کے بعد مسکراتے ہوئے مجھے فرمانے لگے:

ترجمہ: (تم سے پیشتر) یہ بات مجھے کیوں نہیں سوجھی؟ جس پر میں نے ان سے بھرپور معذرت کی۔ دونوں اساتذہ کرام نے میری جی بھر کر مدح و توصیف کی اور حوصلہ بڑھایا۔

میں مکہ اور گلاسگو یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتا رہا ہوں۔ گلاسگو یونیورسٹی میں شعبہ عربی اور شعبہ اسلامیات ۱۶۲۱ء میں قائم ہوئے۔ یہ وہ عرصہ ہے، جب جہانگیر اور نور جہاں لاہور کے شاہی قلعے میں کبوتر اڑایا کرتے تھے۔ دوسری طرف اہل مغرب کا یہ حال تھا کہ وہ یونیورسٹی آف گلاسگو میں اسلامی کتابیں اکٹھی کر رہے تھے۔ کیمبرج اور آکسفورڈ اس سے بھی پہلے کی یونیورسٹیاں ہیں۔ یہ تین یونیورسٹیاں ۱۴۵۱ء میں بنیں: یونیورسٹی آف ایڈنبرا، یونیورسٹی آف سینٹ ریورس اور یونیورسٹی آف گلاسگو۔ تب سے اہل مغرب مسلمانوں کا مقابلہ کرنے اور ان پر اپنے غلبے کو طول دینے کے لیے، اسلامی کتابیں اکٹھی کرنے میں مصروف عمل تھے۔ وہ کتابیں، جو مجھے مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، دمشق اور بغداد حتیٰ کہ قاہرہ میں نہ مل سکیں، جو عالم اسلام اور عالم عرب کا علمی و ادبی مرکز سمجھا جاتا ہے، مجھے ڈبلن، پیرس، میونخ اور لندن وغیرہ میں دستیاب ہوگئیں۔ اپنے علمی ورثہ کو یورپ میں دیکھ کر علامہ اقبال یوں خون کے آنسو روئے تھے:

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اِک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مسلم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

(شائع کردہ اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ ۳۔ کورٹ سٹریٹ لوئر مال لاہور۔ قیمت ۱۵۰ روپے)

## حجاز ریلوے، عثمانی ترک اور شریف مکہ

نسیم احمد نے اپنے عنفوان شباب کے زمانہ طالب علمی ساٹھ کی دہائی میں ترک تاریخ پر قلم اٹھایا اور سولہویں صدی کے نامور امیر البحر خیرالدین پاشا باربروسہ کے عسکری کارناموں کی تاریخ لکھی تو مصطفیٰ کمال اتا ترک کے دست راست اور جانشین اس وقت کے وزیراعظم ترکی جناب عصمت انونو نے اُن کی اس کاوش کو بے حد سراہا۔

بعدازاں وہ اسلامی تاریخ کے نقوش زریں کی تلاش میں سرزمین اندلس تک جا پہنچے۔ غرناطہ کے جاذب نظر محالتی حسن اور الحمراء کے تعمیراتی فن سے متاثر ہوکر آرٹ اینڈ آرکیٹیکچر کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ماہر تعمیرات (Architect) بن گئے۔ تاہم اسلام کی عسکری تاریخ اور مسلم امہ کے عروج و زوال سے ان کا رشتہ منقطع نہ ہوسکا۔

حجاز ریلوے کی صحرانوردی کرتے ہوئے وہ بہت دور تک آگے نکل گئے اور اپنے محسوسات کو قرطاس ابیض پر لے آئے۔ آپ نے ''حجاز ریلوے عثمانی ترک اور شریف مکہ'' کو قلمبند کرکے اس کو حقائق و واقعات کے ساتھ تاریخ کی لڑی میں پرو دیا ہے۔

قدیم زمانے میں دمشق سے مدینہ منورہ کا سفر اونٹوں پر ۲ ماہ میں لیتا تھا۔ خاص طور پر موسم حج میں شتربانوں کے کارواں کٹھن مراحل سے گزر کر حجاز مقدس جاتے۔ چنانچہ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عثمانی سلطان عبدالمجید نے بلادِ مقدسہ کو دمشق سے ملانے کے لیے حجاز ریلوے پر غور وخوض شروع کیا۔ جون ۱۹۰۱ء میں جنوبی اردن میں درعا سے اس کی تعمیر کا آغاز ہوا۔

حجاز ریلوے لائن انجینئرنگ کا مثالی شاہکار تھا۔ اپنے

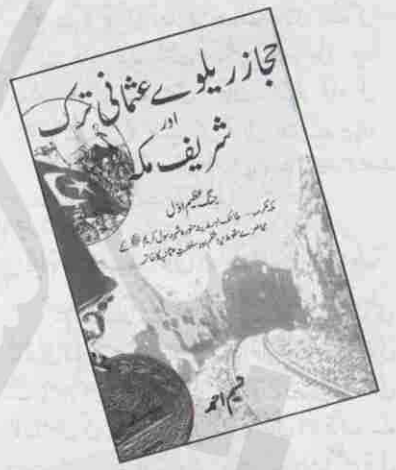


طویل پھیلاؤ میں وادیاں، پہاڑ، برساتی دریا، ندی نالے، دشت صحرا اتار چڑھاؤ، گھاٹیاں اور کھائیاں..... ان سب میں تواتر و تسلسل کے ساتھ ریلوے لائن بچھانا قابلِ قدر کارنامہ ہے۔

ٹرمینل کی عمارت کا نقشہ ایک بڑے مقدس شہر کے ریلوے اسٹیشن کے طور پر بہت خوبصورتی کے ساتھ بنایا گیا۔ حجاز ریلوے کے باضابطہ افتتاح ستمبر ۱۹۰۸ء تک اس کی صرف ایک منزل تیار ہو پائی تھی۔ راستے میں جگہ جگہ چھوٹے بڑے ۷۶ ریلوے اسٹیشن بنائے گئے۔ ۲۸ اگست ۱۹۰۸ء کو حجاز ریلوے مدینہ منورہ پہنچی۔ یکم ستمبر ۱۹۰۸ء کو مدینہ منورہ میں حجاز ریلوے کا باضابطہ طور پر افتتاح ہوا۔ دمشق سے مدینہ تک ریلوے لائن کی لمبائی ۱۳۲۰ کلومیٹر تھی۔

حجاز ریلوے کے آغاز سے لے کر ۱۹۱۴ء (۱۳۳۲ھ) میں پہلی جنگِ عظیم تک اس پر ۴۵ لاکھ عثمانی گولڈن پونڈ کی خطیر رقم صرف ہوئی۔ پہلی عالمی جنگ نے ۱۹۱۴ء میں یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکی کی شمولیت سے مکہ تک توسیع دینے کے منصوبے مؤخر کرنے پڑے۔ مصنف نے سلطنتِ عثمانیہ کی حالتِ زار، سلطان عبدالحمید ثانی اور ''انجمنِ جوانانِ ترک''، شریف مکہ حسین بن علی، شریف مکہ اور عثمانی ترکوں میں باہمی خلفشار کے ابواب کے تحت تاریخی ریکارڈ تفصیل سے پیش کیا ہے۔

اگست ۱۹۱۴ء میں برطانیہ کے لارڈ کچنر کو وزیر جنگ بنا دیا گیا۔ یہی کچنر خلافت عثمانیہ کو تباہ، وحدت عرب کو پارہ پارہ کرنے اور برطانوی عمل داری کو روبہ عمل لانے کا مرکزی کردار بنا۔ میز پر پھیلا مشرقِ وسطیٰ کا نقشہ اس کے ذہن سے نکلی سازش کو عرب ریاستوں کی حد بندی کی مجوزی لکیروں سے نمایاں کر رہا تھا۔

اس کا ابتدائی آغاز عالم اسلام کے مرکزی مقام حجاز سے کیا گیا۔ پوری اسلامی دنیا کی توجہ کا مرکز بنانے کے لیے قرعہ فال حسین بن علی شریف مکہ کے نام نکلا۔ لارڈ کچنر نے شریف مکہ کے نام اپنے پیغام میں عندیہ دیا کہ اب برطانیہ عثمانی ترکوں کے بجائے عربوں کو اسلام کے محافظ کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہے۔

برطانیہ نے عثمانی اقتدار کے خاتمے کے بعد حسین بن علی کو پورے بلادِ عرب کا بادشاہ بنانے کا وعدہ کیا۔ ۹ مئی ۱۹۱۶ء کو برطانیہ اور فرانس نے روس کے ساتھ مل کر ایک خفیہ کنونشن میں طے کیا کہ سلطنت عثمانہ کے حصے بخرے کر کے اس کا شیرازہ منتشر کر دیا جائے۔ چنانچہ دس جون ۱۹۱۶ء کو مکہ، طائف، جدہ اور حجاز کے تمام علاقوں میں بغاوت کا اعلان حسین بن علی نے کر دیا۔ ۱۶ نومبر ۱۹۱۶ء کو حسین بن علی نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔

برطانوی ٹی۔ ای لارنس کا کہنا تھا کہ ریلوے لائن تباہ کیے بغیر مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اس مقصد کے لیے اسے سونا، توپیں، گولہ بارود اور چند انگریز مشیروں کی ضرورت تھی۔ ریلوے لائن کو پھر باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ڈائنا مائیٹ سے جگہ جگہ سے اڑا کر ختم کر دیا گیا۔

ترکی کے اندر علیحدہ سازشوں کا سلسلہ جاری تھا۔ وہاں کمال پاشا اقتدار پر قابض ہوگیا۔ اس نے یورپی



اندازِ معاشرت پر استوار ترک قوم پرستی کی بنیاد پر کمال حاصل کیا اور اپنے لیے اتاترک کا نام چنا۔

۲۴ جولائی ۱۹۲۴ء کو لندن میں برطانوی سیکرٹری خارجہ لارڈ کرزن نے کہا ''ہم نے ترکی کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس کی روحانی طاقت یعنی ''خلافت و اسلام'' کو ختم کر دیا۔ اب وہ اپنی سابقہ شناخت و عظمت کو کبھی بحال نہیں کر سکتا۔

(شائع کردہ: الفیصل ناشران و تاجران کتب، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۲۸۷۔ قیمت: ۲۵۰/- روپے)

## قرآن حکیم، آسان ترجمہ اور تفسیر

یہ ۱۹۹۷ء کی بات ہے جب الیکٹریکل انجینئر، شکیل زاہد کو خیال آیا کہ بارہ تا بیس سال کی عمر کے لڑکے، لڑکیوں کے لیے آسان زبان میں ترجمہ و تفسیر قرآن پاک تحریر کیا جائے۔ دراصل انھوں نے مشاہدہ کیا تھا کہ بیشتر لڑکے، لڑکیاں حفظ قرآن تو کر لیتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب مقدس میں کیا فرمایا ہے۔

شکیل زاہد صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ بے شک قرآن پاک عربی میں پڑھنا مفید ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اسے بے سوچے، سمجھے پڑھا جائے۔ قرآن پاک

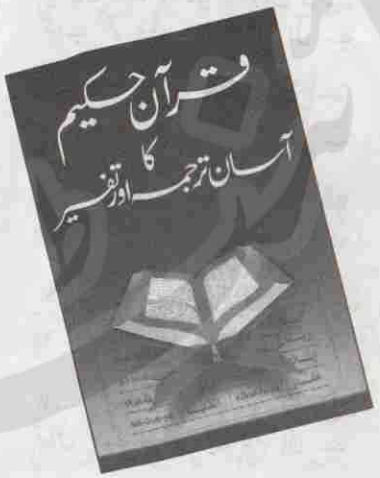


بنیادی طور پر انسان کو ہدایت دیتا اور زندگی گزارنے کا صحیح راستہ دکھاتا ہے۔ لیکن جب انسان کو مقدس الفاظ سمجھ ہی نہ آئیں، تو ہدایت کیسے ملے گی؟ چنانچہ یہی حقیقت مدِنظر رکھ کر انھوں نے فیصلہ کیا کہ آسان فہم زبان و بیان میں تفسیر کلام پاک لکھی جائے۔ لڑکے لڑکیوں کے لیے اس قرآن مجید کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں جن میں مفسّر صاحب نے سورۃ فاتحہ تا سورۃ نساء کی تفسیر لکھی ہے۔ دیگر سورتوں کی تفسیر زیرِ قلم ہے۔ ان جلدوں کے مطالعے سے علم ہوتا ہے کہ مصنف نے جس نیک کام کا بیڑا اٹھایا تھا، خلوص نیت، محنت اور خوش سلیقگی کے باعث اللہ تعالیٰ نے اس میں برکت عطا فرمائی اور ایک نادر و مفید تفسیر سامنے آئی۔

شکیل صاحب نے حقیقتاً ہر آیت کے معنی قابلِ فہم اور بڑے دل نشین انداز میں تحریر کیے ہیں، یوں کہ ایک عام لڑکا، لڑکی بھی یہ جان جاتا ہے کہ ایک آیت کے بنیادی مطالب نزول کیا ہیں اور وہ بنی نوع انسان کو کیسا پیغام دیتی ہے۔ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ آسان انداز میں لکھنے کے باوجود صاحبِ تفسیر نے وہ علمی آن بان برقرار رکھی ہے جو اس عظیم کتاب کے شایانِ شان ہے۔ نوخیز بچے بچیوں کے لیے قابلِ مطالعہ تفسیر تحریر کرنا بڑا کٹھن مرحلہ تھا اور شکیل صاحب داد و تحسین کے مستحق ہیں کہ وہ اس امتحان پر پورے اترے۔

قارئین خصوصاً لڑکے، لڑکیوں کے والدین سے راقم کی پرزور اپیل ہے کہ اپنے گھر میں زیرِ تبصرہ کتاب ضرور رکھیں۔ یہ بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھلانے والی اور تاریکی میں مثل روشنی ہے۔ یہ دینوی زندگی کی تعمیر سکھاتی ہے، تو ایمان بھی مستحکم کرتی ہے۔ اس میں اتنی قوت و صلاحیت ہے کہ نئی نسل کے منہ زور ارکان کو راہ راست پر لے آئے۔

کتاب سادگی کا مرقع ہے۔ کاغذ بہت عمدہ، طباعت معیاری ہے۔ مصنف نے سعی کی ہے کہ تفسیر میں کوئی غلطی جانے نہ پائے۔ ان سب خوبیوں کے باوجود قیمتی کتاب کی قیمت انتہائی کم رکھی گئی ہے۔

(شائع کردہ: ادارہ قرآن حکیم، پی۔ او بکس نمبر ۵۰۰، لاہور
قیمت: ۱۵۰ روپے)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

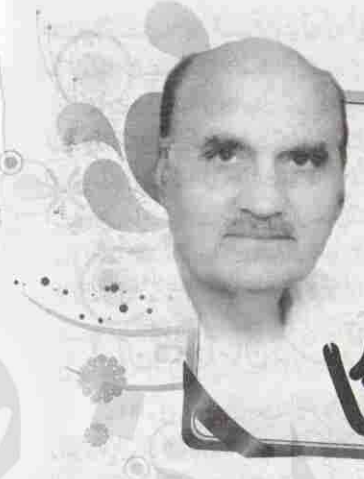

# حوالہ میری پسند کا

مرتب: جمیل یوسف

## جمیل یوسف

۲۲ دسمبر ۱۹۳۸ء کو چکوال میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۱ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے تاریخ اور پھر ۱۹۶۳ء میں اُردو میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۶۲ء میں بطور لیکچرار گورنمنٹ کالج رحیم یار خان میں تقرری ہوئی۔ ۱۹۶۳ء میں مقابلے کا وفاقی امتحان (CSS) پاس کیا، جس کے نتیجے میں مختلف سرکاری ملازمتوں میں رہے اور خلافِ طبیعت ماحول میں زندگی گزاری۔ اب عرصے سے ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں اور کتاب و قلم کے سہارے زندہ ہیں۔ شعر و ادب کا چسکا بلکہ لپکا بچپن سے ہی ہے۔ ابھی آٹھویں جماعت میں ہی تھے کہ دیوانِ غالب کا بیشتر حصہ حفظ ہو گیا۔ اقبالؒ کی بہت سی نظمیں زبانی یاد ہو گئیں۔ فیض کا مجموعہ نقشِ فریادی دو دن میں ازبر ہو گیا۔ شعر و سخن سے شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ مشاعروں میں ایک مرتبہ سننے سے شعرا کا کلام یاد ہو جاتا تھا۔ ابھی ساتویں جماعت میں تھے کہ نظمیں اور غزلیں اخبارات میں شائع ہونے لگیں۔ شاعری میں موجِ صدا، گریزاں، غزل میں سرِ شاخِ بیاں، نثری ادب میں ادبی مضامین، باتیں کچھ ادبی، کچھ بے ادبی کی۔ حفیظ جالندھری سفرنامہ جل پری کے دیس میں اور تاریخ و سوانح میں بابر سے ظفر تک سرسید احمد خان اور مسلمانوں کی تاریخ نامی کتب کے مصنف ہیں۔

چمکتی دھوپ گئی، عکسِ شام باقی ہے
ترے جمال کا موسم تمام باقی ہے

یہ تیری زلف کا سایہ یہ مہرباں آنکھیں
شراب ختم ہوئی، دورِ جام باقی ہے

تمہاری یاد سے زندہ ہیں سب حسیں منظر
فرازِ کوہ پہ ماہِ تمام باقی ہے

بھٹک رہی ہے ہوا میں تیری جواں خوشبو
فضا میں تیری نظر کا خرام باقی ہے

نظر اُٹھا کے محبت سے تو نے دیکھا تھا
وہ وقت ٹھہر گیا وہ شام باقی ہے

ہمارے عہدِ محبت سے کیا رہا باقی
اُداس کرنے کو بس ایک نام باقی ہے

## میر تقی میر

(۱۷۲۲ء-۱۸۱۰ء)

نام: محمد تقی
تخلص: میر
تعلق: اکبر آباد، دہلی

میر تقی میر کو خدائے سخن کہا گیا ہے۔ سودا، مصحفی، غالب، ذوق، داغ، حالی سب نے اِن کو اُستاد تسلیم کیا ہے۔ بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق کا قول ہے ''اگر دنیا کے ایسے شاعروں کی فہرست تیار کی جائے جن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا تو میر کا نام اس فہرست میں داخل کرنا پڑے گا۔'' میر بلاشبہ اُردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔

دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا
جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا

ہر قدم پر تھی اس کی منزل ایک
سر سے سودائے جستجو نہ گیا

سب گئے ہوش و صبر و تاب و تواں
لیکن اے داغِ دل سے تو نہ گیا

دل میں کتنے مسوّدے تھے ولے
ایک پیش اس کے رُوبرو نہ گیا

سبحہ گرداں ہی میر ہم تو رہے
دستِ کوتاہ تا سبو نہ گیا

## درد

(۱۷۲۰ء-۱۷۸۵ء)

نام: خواجہ میر
تخلص: درد
تعلق: دہلی

میر حسن کی رائے ہے ''میر درد کا کلام، اگرچہ مختصر، مگر مثلِ کلام حافظ شیرازی، سراپا انتخاب ہے۔'' مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں: ''تلواروں کی آبداری شعروں میں بھر دی ہے۔''
اثر لکھنوی رقم طراز ہیں ''ان کے پاکیزہ کلام کے مطالعہ کے لیے پاکیزہ نگاہ درکار ہے۔''
اسلوب نہایت سادہ اور اثر انگیز ہے۔

قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دُور نہ تھا
پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا

باوجودے کہ پروبال نہ تھے آدم کے
وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور
شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن
میں جو پوچھا تو کہا خیر، یہ مذکور نہ تھا

درد کے ملنے سے اے یار بُرا کیوں مانا
اس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# مصحفی

(۱۷۴۹ء-۱۸۲۴ء)

نام: شیخ غلام ہمدانی
تخلص: مصحفی
تعلق: دہلی

مصحفی کے کلام میں لطافت اور احساس جمال رچا بسا ہے۔ بہت زود گو تھے۔ مشہور ہے کہ اپنی غزلیں بیچا کرتے تھے۔ اسلوب میں سادگی اور پُرکاری ہے۔

گر ابر گھرا ہوا کھڑا ہے
آنسو بھی تُلا ہوا کھڑا ہے

حیران ہے کس کا ، جو سمندر
مدت سے رُکا ہوا کھڑا ہے

ہے موسمِ گل ، چمن میں ہر نخل
پھولوں سے لدا ہوا کھڑا ہے

شمشاد برابر اس کے قد کے
دہشت سے بچا ہوا کھڑا ہے

تُو آ کے تو دیکھ در پہ تیرے
کیا سوانگ بنا ہوا کھڑا ہے

تیرا ہی ہے انتظار اس کو
ناقہ تو کَسا ہوا کھڑا ہے

اے جان نکل ، کہ مصحفی کا
اسباب لدا ہوا کھڑا ہے

# غالب

(۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء
۱۵ فروری ۱۸۶۹ء)

نام: میرزا اسداللہ خان
تخلص: غالب
تعلق: آگرہ، دہلی

غالب کو عظیم شاعر مانا گیا ہے۔ مشہور نقاد عبدالرحمٰن بجنوری نے دیوانِ غالب کو ہندوستان کی الہامی کتاب کہا ہے۔ اس کتاب کے جتنے مختلف ایڈیشن اب تک شائع ہوئے ہیں اور اس کی جتنی شرحیں لکھی گئی ہیں، اردو میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر ، سو جگر میں خاک نہیں

مگر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے
وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیرِ جلوۂ گل ، رہگذر میں خاک نہیں

بھلا اُسے نہ سہی ، کچھ مجھی کو رحم آتا
اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں مے کش
شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں

ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں



آنکھیں توجہ چاہتی ہیں!
✓ کیا آپ اپنی بیماری کی نوعیت کو سمجھنا چاہتے ہیں؟
✓ کیا آپ پریشان ہیں کہ لینز والا اپریشن کروائیں یا صرف شعائیں لگوالوں؟
✓ کالا موتیا کیا ہے اور کیا اس کا علاج ہو سکتا ہے؟
✓ آنکھ کا اپریشن کیسے کیا جاتا ہے؟
✓ شوگر آنکھوں کو کیا نقصان پہنچاتی ہے؟ اس سے بچاؤ کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟
✓ بچوں کو عینک کیوں لگتی ہے؟ کیا عینک اُتر سکتی ہے؟ لیزر سے عینک اُتارنے کا اپریشن کیسے کیا جاتا ہے؟
✓ کیا آپ کو لیزر لگوانے کا مشورہ دیا گیا ہے اور آپ کو سمجھ نہیں آ رہی کہ لگوائیں یا نہ لگوائیں کیونکہ لوگ کہتے ہیں کہ لیزر نقصان دہ ہوتی ہے؟
✓ آپ نے اپریشن کروایا اب آپ کو کیا احتیاطیں کرنی چاہئیں؟
اپنے سوالوں کے جواب جاننے کے لئے مندرجہ ذیل Website کا مطالعہ کریں
www.drasifkhokhar.com
آنکھوں کی بیماریوں سے متعلق اردو زبان کی واحد ویب سائٹ
ڈاکٹر آصف کھوکھر آئی سرجن
ایم بی بی ایس (پنجاب) ایم سی پی ایس (آئی) ایم اے (علوم اسلامیہ)
انچارج شعبہ امراض چشم ثریا عظیم ہسپتال لاہور
آئی سرجن لاہور میڈی کیئر انسٹیٹیوٹ آف آفتھیلمالوجی لاہور
Free Helpline
اپنے سوالوں کے جواب پوچھیے
Cell: 0333-4102266
Email: drasifkhokhar@hotmail.com
آپریشن لاہور میڈی کیئر جیسے جدید ترین آئی ہسپتال میں کیئے جاتے ہیں
Vitreoretinal Surgery
✓ آنکھ کے پردے کے اکھڑ جانے (Retinal Detachment) کا آپریشن
✓ آنکھ کے اندر خون جمع ہو جانے (Vitreous Hemorrhage) کا آپریشن
✓ Macula کو پہنچنے والے نقصان کے علاج کیلئے ہونے والے آپریشن
Phaco Surgery
✓ بغیر ٹیکے اور بغیر ٹانکے سفید موتیا کا علاج
✓ قریب اور دور کی نظر بیک وقت صحیح کرنے والا Multifocal لینز
Laser Surgery
✓ ذیابیطس اور دیگر بیماریوں سے Retina کو پہنچنے والے نقصان کا بذریعہ لیزر علاج
✓ Excimer لیزر کے ذریعے Epi-LASIK آپریشن کی مدد سے عینک سے نجات
✓ کالا موتیا کا Argon، Yag اور Diode لیزر کی مدد سے علاج
✓ سفید موتیا کے آپریشن کے بعد بننے والی جھلی کا بذریعہ Yag لیزر علاج
Corneal grafting surgery
✓ سری لنکا سے عطیہ شدہ آنکھیں منگوا کر قرنیہ کی پیوندکاری
148- آصف بلاک، مین بلیوارڈ، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور فون 042-37495073

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

# چمنِ خیال

## سروے کے عمدہ موضوعات

ماہِ دسمبر ۲۰۱۱ء کا سرورق، لے آؤٹ، ڈیزائننگ اور مواد سب کچھ بہترین تھا۔ کسی ایک موضوع پر مختلف معروف شخصیات و عام قارئین کی رائے والے سلسلے اور سروے اچھے ہیں، جاری رکھیئے۔ موضوعات بہت عمدہ چنے جاتے ہیں۔ ایک مضمون ''اُردو زبان کا محسن..... ڈاکٹر جان گل کرسٹ'' بغرضِ اشاعت پیش خدمت ہے۔

(آپ کا بھجوایا ہوا مضمون چند سال پہلے شائع ہو چکا ہے۔ مضمون بہرحال بہت اچھا تھا۔) (رانا محمد شاہد۔ بورے والا)

## اپنا سا لگا

گزشتہ کئی برس سے اُردو ڈائجسٹ کا قاری ہوں۔ گزرے دو تین ماہ سے اُردو ڈائجسٹ اپنا سا لگ رہا ہے۔ مضامین کا انتخاب اور ان کی ڈیزائننگ بہت بھا رہی ہے۔ درس و تدریس میرا پیشہ ہے۔ اب تو اُردو ڈائجسٹ نے مجھے بھی لکھنے پر آمادہ کر دیا۔

(محمد اشرف ندیم۔ ۱۴۹ مراد حاصل پور)

## پروف ریڈنگ میں بہتری

پرچے کے دیگر مشمولات ہر اعتبار سے قابلِ رشک ہیں۔ کوشش فرمائیے کہ اشعار کی صحت پر کوئی انگلی نہ اُٹھا سکے۔ پروف ریڈنگ کافی بہتر ہوئی ہے، پھر بھی بہتری کی گنجائش موجود ہے۔

(سید ریاض حسین زیدی صدر ادب سرائے ساہیوال)

## ادبی شخصیات پر مضامین کی فرمائش

عرصہ دراز بعد اُردو ڈائجسٹ، دسمبر ۲۰۱۱ء کا شمارہ ملا۔ یہ دیکھ کر نہایت مسرت ہوئی کہ آپ لوگ اُردو زبان کے فروغ کی خاطر جہاد کر رہے ہیں۔ آپ کی کوششیں قابلِ ستائش و تقلید ہیں۔ شمارہ ہر لحاظ سے مکمل اور نہایت دلچسپ و معلوماتی ہے۔

اگر ممکن ہو تو ادبی شخصیات پر بھی تحریریں شامل کریں

(حفیظ کلیم۔ لاہور)

## اُردو کا ریڈرز ڈائجسٹ

اُردو ڈائجسٹ بالکل ہی بدل گیا ہے۔ پہلے وہ صحیح معنوں میں ''اُردو ڈائجسٹ'' تھا، اب ماشاء اللہ ''ریڈرز ڈائجسٹ'' ہو گیا ہے۔ جناب میری عمر اس وقت ۸۰/ برس کے قریب ہے۔ تب سے اُردو ڈائجسٹ پڑھ رہا ہوں جب جوان تھا، یعنی تقریباً ۵۰/ سال سے۔

(امین اللہ خان۔ اسلام آباد)

## تعلیم پر ویب سائٹیں

اُردو ڈائجسٹ کا کئی سال سے خاموش قاری ہوں۔ اب اپنی خوشی اور پسند کا اظہار کرنے کے لیے خاموشی توڑ رہا ہے۔ میں ایک استاد ہوں، اس لیے شعبۂ تعلیم سے متعلقہ ویب سائٹوں کے متعلق معلومات درکار ہیں۔ میں نے ''ونگ لائن پر کون پہنچاتا ہے'' پر تبصرہ پڑھ کر منگوائی تھی۔ کتاب اچھی لگی۔

(قیصر عباس۔ روڈی بھکر تحصیل کلورکوٹ)

## دل کو تسلی دے لی

مجھے بڑی تکلیف ہو رہی ہے کہ اُردو ڈائجسٹ نکھر رہا ہے اور آپ کے نمبر بڑھ رہے ہیں۔ یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لی ہے کہ کوئی مسئلہ نہیں، جو نہی غلطی کریں گے نمبر کاٹ لیں گے۔ شمارہ دسمبر اس قدر جاذب اور خوبصورت تھا کہ دل خوش ہو گیا۔ سچی بات یہ ہے کہ اب یہ ریڈرز ڈائجسٹ کے مقابلے کی چیز بنتی جا رہی ہے۔ اللہ نظرِ بد سے بچائے اور پاکستان اور اہلِ پاکستان کے لیے مفید بنائے۔

(ظفر جمال بلوچ۔ لاہور)

## اُردو نیٹ پہ

اکثر دوستوں کی رائے تھی کہ دردل پہ دستک بہت اچھا اضافہ ہے، آپ اس میں ناغہ نہ کیجیے گا۔ ونگ لائن پر آپ کا ایک لیکچر یوٹیوب پہ بھی دیکھا۔ اُردو ڈائجسٹ بھی یوٹیوب پر دیکھا۔ اُردو کو نیٹ پر لا کر بہت احسان کیا ہے۔

(فلک شیر۔ بچیکی، شیخوپورہ)

## رضا علی عابدی کا انٹرویو

بچپن سے اردو ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں۔ رسالے کے موضوعات بے حد جاندار ہیں۔ اس ماہ رضا علی عابدی کا انٹرویو بے حد پسند آیا۔ اسد علی خان اور یعنی حبیبی کا انٹرویو بھی پڑھا، اچھا تھا۔

(عظمیٰ اجمل۔ باغبانپورہ، لاہور)

## خوبصورت سرخیاں اور ٹائٹل

میں تو ابھی نیا نیا خریدار بنا ہوں۔ پرچہ دیکھ کر ابھی خوش ہو رہا تھا۔ کہانیوں کے خاکے دیکھ رہا تھا کہ تعریف سنیئے کس کو اچھا کیوں لگا۔ میرے ساتھی محمد مہدی حیات نے پرچہ دیکھا بلکہ کھینچ لیا۔ پھر انھوں نے کہا کہ میرے نام بھی VP کروا دیں۔ پہلے وہ مجھ سے لے کر پڑھتے تھے۔ کہتے ہیں ناک نقشہ اور تحریریں دونوں تازگی لیے ہوئے ہیں۔ اس بار نہ صرف سرورق بے حد خوبصورت تھا بلکہ اس کی سرخیاں بہت توجہ لے رہی تھیں۔

(غلام عباس۔ دریام والا، ضلع جھنگ)

## جلد بندی ٹھیک رہی

مجھ سمیت گھرانے کے دیگر افراد بھی رسالے کے خاموش قاری ہیں۔ جو باتیں طبیعت پر گراں گزریں، وہ عرض کرتا ہوں، اصلاح کی التماس ہے۔

(۱) چند ماہ رسالے کی جلد تھی ہی نہیں صرف اوراق کا مجموعہ معمولی گوند کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ ان کا مطالعہ کرنا اور سنبھالنا انتہائی مشکل کام تھا۔ اس ماہ ٹھیک رہا۔

(۲) سلسلہ وار کہانی، ''مونٹی کرسٹو کا نواب'' ادھوری چھوڑ دی گئی۔

(مصنف صاحب مصروف ہو کر انکاری ہو گئے ہیں، اس لیے معذرت)

(۳) ڈاکٹر اعجاز قریشی صاحب پی ایچ ڈی کرنے جرمنی ایسے گئے کہ پھر لوٹ کر آئے ہی نہیں۔ ان کی سوانح عمری کا کیا بنا؟

(۴) عالمی سیاست پر تبصرہ، مشورہ حاضر ہے، سوانح عمریاں و شخصیات پہ تحریریں، ہماری پسندیدہ تحریریں ہیں۔ ہمارے اس عریضہ کو اپنے صفحات میں جگہ دے کر شکریہ کا موقع دیجیے گا۔

(سلطان احمد۔ سانگھڑ)

## تفاسیر پہ جامع مضمون

اُردو ڈائجسٹ کا آغاز اللہ کے فرمان سے ہوتا ہے۔ قرآن پاک کا پہلا اُردو بامحاورہ ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادرؒ کا ہے۔ اس سے پہلے حضرت شاہ رفیع الدینؒ کا تحت اللفظ ترجمہ قریباً ۱۲۰۰ھ میں مکمل ہو گیا تھا، لیکن چھپا بعد میں۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ والا ترجمہ ۱۲۰۵ھ میں شائع ہوا۔ یہ ترجمہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کا نظر ثانی شدہ اب بھی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھپ رہا ہے۔ اس کے ساتھ تفسیر حضرت شیخ الاسلام شبیر احمد عثمانی کی ہے۔ عام طور پر لوگ اس ترجمے کو حضرت شیخ الہند کا ترجمہ ظاہر کرتے ہیں جو کہ مناسب نہیں۔ اگر اس ترجمہ کے ساتھ حضرت شیخ الہند کا مقدمہ پڑھا جائے تو صورت حال واضح ہو جاتی ہے۔

جن حضرات نے ترجمہ اور تفاسیر پر اپنی زندگیاں وقف کیں، ان میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور امین احسن اصلاحی کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ قرآن پاک کی تفاسیر پر جامع مضمون چھپ جائے تو بہت نیکی کا کام ہوگا اور نوجوان نسل کو راہنمائی میسر آئے گی۔

(ڈاکٹر محمد رمضان مرزا۔ لاہور)

## صوبائی حکومت کے کرنے کے دو کام

ملتان روڈ لاہور کی مرکزی اور اہم سڑک ہے۔ ٹھوکر نیاز بیگ سے سکیم موڑ تک آٹھ دس کلومیٹر دو رویہ سڑک موجودہ وزیر اعلیٰ کی ہدایت و نگرانی میں مکمل کی گئی۔ میرا خیال ہے، سڑک کی قسمت جاگے میں ۲۲ سال سے زائد کا عرصہ لگا۔ سڑک بے حد اچھی بنی ہے۔ اس کی عمر ۵۰ سال تو ضرور ہونی چاہیے۔

اب صوبائی حکومت مہربانی کر کے مزید ۲ کام ضرور کرے۔ اس پر پانی نہ کھڑا ہونے دے اور دوسرے جگہ جگہ سڑک پہ پتھر رکھ کر درمیان میں واقع ڈرین عبور کرنے کے خطرناک اور جان لیوا رجحان کی حوصلہ شکنی کرے۔ جس طرح روزٹریکٹر سے سڑک کی صفائی کی جاتی ہے، اسی طرح سڑک پہ جگہ جگہ رکھے پتھر اور سلیب روزانہ اٹھا دینے چاہئیں۔ یہ خوفناک حادثوں کا باعث بن رہے ہیں۔ اگر اس کو نہ روکا گیا تو اگلے مرحلے میں لوگ اپنی اپنی سہولت کے مطابق ڈرین کی دیوار توڑ لیں گے۔ کئی جگہوں پر لوگ اوپر لکڑیاں رکھ کر اسے عبور کرتے ہیں۔ بے شک بند لگتے ہیں، مگر اچانک سڑک پر اترتے ہیں تو کسی نہ کسی حادثے کا باعث بنتے ہیں۔

(محمد ادریس۔ حسن ٹاؤن، لاہور)

## آئیے بات کرتے ہیں

اردو ڈائجسٹ ہر مضمون نیا اور تازہ لگا۔ ہم سوچتے تھے کہ اچھے اُردو لکھاری شاید ختم ہو گئے ہیں۔ اس ماہ پروف کی غلطیاں بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تھوڑی اور توجہ کی ضرورت ہے۔ لگتا ہے کوئی مناسب پروف ریڈر مل گئے ہیں۔ ''آئیے بات کرتے ہیں'' اچھا سلسلہ ہے۔ میگزین کی ہر تحریر کچھ سوچنے پہ عمل پر اکساتی ہے۔

(فوزیہ عباس۔ اسلام آباد)

## ہر صفحے پر محنت

نیا شمارہ انتہائی دیدہ زیب ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ہر صفحے پر محنت کی گئی ہے۔ امید ہے کہ یہ معیار برقرار رہے گا۔ سیاسی شخصیات کے علاوہ سائنسدانوں، فنکاروں یا زندگی کے دیگر شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والی شخصیات کے انٹرویو بھی شائع کیجیے۔

(غضنفر علی۔ کراچی)

## مزید محنت قابل قدر ہے

اُردو ڈائجسٹ ہماری زندگیوں میں شامل ہے۔ پہلے ہمارے والدین پڑھتے تھے، اب ہم۔ بچوں کو البتہ اُردو سے اتنا لگاؤ نہیں جتنا ہمیں تھا۔ لیکن پچھلے دنوں بیٹی کو جب او۔لیول کی تیاری کے لیے، استانی نے اُردو ڈائجسٹ پڑھنے کو کہا تو دل بہت خوش ہوا، کہ چلو کسی بہانے تو بچے اس ''مخزن'' سے مستفید ہوں گے۔ اور کیا یہ اختر عباس وہی ہیں جو ہمارے ٹین ایج کے زمانے میں ''پھول'' کے ایڈیٹر ہوا کرتے تھے، اور اختر بھیا کے نام سے لکھتے تھے؟ اور نئی نسل کے لیے ان کی ۱۳-۱۴ کتابیں آچکی ہیں۔ بہرحال کچھ بھی ہو، ہمارے اُردو ڈائجسٹ کو تو چار چاند لگ گئے ہیں، خوبصورتی اور معیار میں۔ اور ہاں ایک مشورہ بھی، ہمارا پسندیدہ کالم ''مشورہ حاضر ہے'' کے صفحات ذرا بڑھا اور ''حوالہ میری پسند کا'' کے صفحات بے شک ذرا کم کر دیجیے۔ رسالے کی نئی ترتیب بھی زبردست تھی۔

(صوفیہ اسلام۔ ولایت آباد، ملتان)



## ۲۵ کمپنیوں کا تعارف

پرچہ بہت معیاری اور نوجوانوں کے لیے بہت اچھا ہے۔ کیریئر کونسلنگ شروع کر کے اچھا کیا گیا ہے۔ نیا انداز بہت اچھا لگا۔ بزرگوں کے ساتھ نوجوانوں میں بھی مقبول ہو رہا ہے۔ پہلے تو نوجوان اسے ہاتھ کم ہی لگاتے تھے۔ پاکستان کی ۲۵ بہترین کمپنیوں کا تعارف عمدہ رہا۔

(حمزہ۔ کراچی)

## کامیاب لوگوں کے انٹرویو

پرانا قاری اور ادیب ہونے کے ناتے مشورہ دینے کا حق رکھتا ہوں۔ دنیا اور پاکستان کے کامیاب لوگوں کے واقعات اور انٹرویو زیادہ شاملِ اشاعت کریں۔

(مشتاق احمد ورک۔ آڈٹ آفیسر، فیصل آباد)

## وصی شاہ کا فوٹو خوب صورت لگا

اُردو ڈائجسٹ پہلے بھی اپنی ہمہ صفت خوبیوں کی بنا پر منفرد تھا۔ اب موجودہ زمانے کے مطابق مرد و زن، بچوں، بوڑھوں کی روح کو پالش کرتا اور نکھارتا ہے۔ سوچ کے نئے نئے زاویے اجاگر کرتا ہے۔ بلھے شاہ والا مضمون دلچسپ تھا۔ ''حلق تک بھری تلخی'' نے تو دکھی کر دیا۔ وصی شاہ کا فوٹو بے حد خوبصورت لگا۔

(ریاض احمد رانا۔ سکندر آباد، ایبٹ آباد)

## میرا محسن رسالہ۔ کہاں میں کہاں نکہت گل

آپ یقیناً خوش نصیب ہیں کہ ''اُردو ڈائجسٹ'' جیسے عہد ساز رسالے کے مدیر بنے۔ اُردو ڈائجسٹ بھی خوش بخت ہے کہ اسے بہت منجھا ہوا ادیب، راست فکر دانشور اور تجربہ کار اور ''صحیح العقیدہ'' مدیر مل گیا۔ امید ہے آپ کی راہنمائی میں یہ شاندار رسالہ ادب، فکر اور تہذیب کی منزلوں کی طرف رواں دواں رہے گا۔

''اُردو ڈائجسٹ'' میرا محسن رسالہ ہے۔ میں ۱۹۶۳ء میں جناح اسلامیہ کالج سیالکوٹ میں بی۔اے کا طالب علم تھا، جب میرے تین طبع زاد طنزیہ، مزاحیہ مضامین اس میں شائع ہوئے۔ الطاف صاحب سیالکوٹ تشریف لے گئے، ملاقات ہوئی، انھوں نے مضامین کی تحسین فرمائی اور مجھے ۹۰ روپے کا چیک دیا۔ اس رقم سے میں نے بی۔اے کا امتحانی داخلہ بھجوایا تھا۔ اس حوالے سے الطاف حسن قریشی صاحب کی میرے دل میں بڑی قدر و منزلت ہے اور میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔

میں نے بے سروسامانی کی حالت میں ۱۹۶۴ء میں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں ایم۔اے اُردو میں داخلہ لے لیا۔ الطاف صاحب نے مجھے ''اُردو ڈائجسٹ'' میں جز وقتی ملازمت عطا کر دی۔ یوں ایم۔اے کی تکمیل ہو گئی اور آئندہ کامیابیوں کا دروازہ کھل گیا ورنہ

کہاں میں کہاں یہ نکہتِ گل
نسیم صبح تیری مہربانی

(ڈاکٹر عبدالغنی فاروق۔ لاہور)

## متفرق خطوروای میلو

دردِ دل پہ دستک پڑھ کر میں اشک بار ہو گیا۔ مولائے کریم ہر بیٹی کی عزت و آبرو محفوظ رکھے۔ آمین اور ہم بڑوں کو سوچنے سمجھنے کی توفیق دے۔

(پروفیسر محمد ظریف خان۔ کراچی)

۱۹۹۴ء میں میرے ہمسائے سول انجینئر نے اُردو ڈائجسٹ کا شمارہ پڑھنے کے لیے دیا۔ اس وقت سے پڑھ رہا ہوں۔ اُردو ڈائجسٹ کی ویب سائٹ پہ تمام مضامین کو موجود دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

(انجینئر انعام اللہ)

اُردو ڈائجسٹ کو فیس بک پر دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ ویب پر پڑھ کر مزا آیا۔

(اعجاز خان خوری)

آپ کا ڈائجسٹ بہت زبردست ہے۔ ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق مضامین پڑھ سکتا ہے۔ اپنا اچھا کام جاری رکھیں۔

(بانیہ طالب)

میں کمپیوٹر ٹیچر ہوں اور لائبریری سے لا کر اُردو ڈائجسٹ پڑھتا ہوں۔ یہ بہت معلوماتی ہوتا ہے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تحریروں کا معیار بہت اچھا ہے۔ (فواد بشیر)

آن لائن آنے کی کوشش اچھی لگی۔ بیرونِ ملک لوگوں کو بہت فائدہ ہوگا۔ ایک درخواست ہے "مشورہ حاضر ہے" کتابی شکل میں شائع کردیں۔ ہمیں بہت آسانی ہوگی۔
(مینا عثمان)

اُردو فورم کا تصور بہت زبردست ہے۔ اس سلسلے میں اُردو ڈائجسٹ کو پی ٹی وی سے مل کر کام کرنا چاہیے۔ وصی شاہ صاحب کے آنے سے فورم مضبوط ہوگا۔
(رابعہ عرفان)

عرصہ دراز بعد اُردو ڈائجسٹ پڑھنے کا موقع ملا۔ اتنا قلبی سکون ملا کہ بتانا مشکل ہے۔ ہر پہلو پہ اتنے پُرمغز مضامین پڑھنے کو ملے کہ اب ارادہ ہے کہ ہر مہینے اسے پڑھا کروں۔
(ارشاد فخرالدین۔ اوسلو، ناروے)

اُردو ڈائجسٹ کو انٹرنیٹ پر دیکھ کر اچھا لگا۔ اس کا فونٹ بہتر بنائیے۔
(پروفیسر وسیم عامر)

میں پاکستان کی پہلی نسل سے تعلق رکھتا ہوں۔ پاکستان کے بارے میں چند سوالات ہیں۔ اگر اجازت دیں تو آپ کو فون کرلوں۔ (جی ضرور!)
(تحسین حمیدی۔ کینیڈا)

میں نے مڈل سکول کے بعد اُردو ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا۔ کئی سال یہ ہمارے گھر آتا رہا۔ اب میں ۲ بچوں کی ماں ہوں۔ اُردو ڈائجسٹ دوبارہ باقاعدگی سے پڑھنا شروع کیا۔ میں چاہتی ہوں کہ بچے بھی اس کے مطالعہ کی طرف راغب ہوں کیونکہ اُردو زبان سے ہی ہماری بقا وابستہ ہے۔
(تزئین جاوید)

ویب سائیٹ پر آنے کی مبارک باد۔ اس کے علاوہ عرض ہے کہ ان لوگوں کی داستانوں کو جگہ دیں جنھوں نے غربت سے سفر شروع کرکے اپنی ہمت اور حوصلے کے ذریعے اچھا مقام حاصل کیا۔ انہیں شائع کریں اور ویب سائیٹ پر بھی رکھیں۔ (پرویز اسلام۔ امریکہ)

میرا مارچ کا اُردو ڈائجسٹ سندھ میں ہونے والی شدید بارشوں اور سیلاب کی نذر ہوگیا، کیا مجھے دوبارہ مل سکتا ہے؟ (ضرور مل جائے گا۔)
(محمد جمیل۔ میرپور خاص)

میں پچھلے ۳۴ سالوں سے نیوجرسی امریکہ میں رہائش پذیر ہوں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اُردو پڑھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ اُردو لغت میرے لیے بہت فائدہ مند رہی۔
(محمد آر۔ شریف۔ نیوجرسی، امریکہ)

میں نے اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے میڈیا سٹڈیز میں ماسٹرز کیا ہے۔ اگر مجھے آپ کے ادارے میں کام کرنے کا موقع ملے تو بہت خوشی ہوگی۔ مجھے آپ کے الفاظ اچھی طرح یاد ہیں کہ اگر انسان محنت کرے اور اپنے کام سے مخلص ہو تو وہ ضرور کامیاب ہوتا ہے۔ یہ نصیحت میرے کام آئی اور میں نے نمایاں پوزیشن حاصل کی۔
(عائشہ ولایت۔ بہاولپور)

اُردو ڈائجسٹ ایسا نیا سلسلہ شروع کرسکتا ہے جس کے ذریعے سکولوں کے طالب علموں کو ترغیب دی جائے کہ وہ معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے والے اداروں کے ساتھ رضا کار کی حیثیت سے وابستہ ہوں۔ ہمارے نوجوانوں کو ہر وقت منفی باتیں سننے کو ملتی ہیں۔ اس سے نوجوانوں کو مثبت پہلوؤں کو دیکھنے کا موقع ملے گا۔ رضا کار طالب علموں کو کسی دیہی سکول میں اساتذہ کے ساتھ منسلک کیا جاسکتا ہے۔ یا انھیں کسی فلاحی ادارے کے ساتھ کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ (اویس بیگ۔ راولپنڈی)

میں گزشتہ ۴۰ سال سے اُردو ڈائجسٹ کا قاری ہوں۔ ۱۰ سال کی عمر سے اسے پڑھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ پچھلے ۲۰ سال سے آسٹریلیا میں مقیم اور ڈائجسٹ باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میری تحریریں اُردو ڈائجسٹ میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ڈائجسٹ کی تحریریں بے حد معیاری ہیں۔ اُردو سوسائٹی آسٹریلیا کا جنرل سیکرٹری ہوں۔ اس کے زیرِ انتظام ہر سال یہاں عالمی مشاعرہ ہوتا ہے۔
(طارق مرزا۔ سڈنی، آسٹریلیا)



# اُردو ڈائجسٹ کے برقی (ای) سفر کے ۴۰ دن

قریباً ایک لاکھ سے زاید صفحات دیکھے گئے.....

ویب ٹیم، اُردو ڈائجسٹ

ہم نے پچھلے شمارے سے اُردو ڈائجسٹ کے برقی (ای) سفر کی روداد بیان کرنا شروع کی تھی۔ یہ رہی پہلے ۴۰ دنوں کے سفر کی مختصر روداد:

| | ۱۲ر نومبر تا ۳۰ر نومبر ۲۰۱۱ء | یکم دسمبر تا ۲۰ر دسمبر ۲۰۱۱ء |
|---|---|---|
| کل صفحات دیکھے گئے | 362,058 | 682,998 |
| نئے وزیٹر | 2200 | 3,883 |
| کل وزیٹر | 2993 | 5,224 |
| ویب سائٹ پر موجود رہنے کا وقت اور افراد | | |
| ۱۵ر منٹ سے ۲۹ر منٹ | 233 | 380 |
| ۳۰ر منٹ سے ایک گھنٹہ | 203 | 291 |
| ایک گھنٹے سے زیادہ | 133 | 177 |

یوں مجموعی طور پر قریب ایک لاکھ سے زائد صفحات دیکھے گئے.....!

اسی دوران میں ۱۶ دسمبر کے حوالے سے خصوصی مضامین بھی ویب سائٹ پر خاص طور پر شامل کیے گئے اور ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ صرف اس روز ہماری ویب سائٹ پر آنے والے منفرد افراد کی تعداد 466 رہی، جواب تک کے ای سفر میں سب سے زیادہ ہے، بلکہ عام دنوں میں آنے والے افراد سے تقریباً دوگنا۔ اس سے ہمارا یہ یقین کہ پاکستانی قوم بحیثیت مجموعی اپنی تاریخ کو نہیں بھولی، مزید پختہ ہوگیا۔ مجموعی وزیٹرز کی تعداد دیکھی تو یہ جان کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ ہم رہتے ہیں پردیس..... پر بھولے نہیں ہیں دیس.....!

سرزمین امریکہ سے دیکھے جانے والے صفحات کی تعداد 64,228 تھی، جبکہ پاکستان کی 35,500 ! اس کے فوراً بعد سب سے زیادہ وزٹ بالترتیب جرمنی، برطانیہ اور سعودیہ سے ہوئے۔ امریکہ اور دیگر ممالک میں رہنے والے پاکستانی اور ان کے اہل خانہ کبھی بھی اپنی زبان سے دور نہیں رہنا چاہتے، انہیں وہاں اپنی مادری زبان کی قدر و قیمت کا اندازہ ہم سے بہتر ہوتا ہے، اور ایک ہم ہیں کہ خیر..... بات نکلی تو پھر دور تلک جائے گی!

ای ای سفر میں ہم اب آتے ہیں سماجی رابطے کی سب سے بڑی ویب سائٹ، فیس بک کی طرف۔ آپ ہمیں فیس بک پر تلاش کرسکتے ہیں: www.facebook.com/urdudigest.pk

لیجیے جی! فیس بک کے اعداد و شمار کچھ اس طرح رہے:

کل افراد، جنھوں نے ہمیں پسند کیا: 1242

اور ماہانہ بنیادوں پر active members کی تعداد 1802 ہے جو کہ خوشی کا باعث ہے۔ ان میں سے 166 ایسے ہیں جنھوں نے دوسرے دوست احباب کی profile سے ہمیں like کیا۔ سو اردو سے محبت کرنے والوں کو ہم یہ پیغام بھی دیں گے کہ اگر آپ فیس بک استعمال کرتے ہیں تو ضرور اپنے دوستوں کو ہماری ویب سائٹ اور فیس بک کے page سے متعارف کرائیے۔

فیس بک پر کی جانے والی posts کو مجموعی طور پر 91,873 مرتبہ دیکھا اور قریباً 800 پر تبصرہ بھی کیا گیا۔

فیس بک پر ہمارے likes میں اکثریت پاکستان کی اور دوسرے نمبر پر بھارت ہے۔ اس کے علاوہ سعودی عرب، امریکہ اور متحدہ عرب امارات بھی ہیں۔ خوشی کی بات تو یہ ہے کہ بنگلہ دیش سے بھی متعدد likes کیے جاچکے ہیں۔

آخر میں اپنے معزز قارئین کو یہ بھی بتانا چاہیں گے کہ آپ کسی بھی مشہور سرچ انجن جیسے google یا bing وغیرہ سے بھی urdu, urdu digest, لکھ کر ہمیں انٹرنیٹ پر ڈھونڈ سکتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان ۴۰ دنوں میں قریب 1717 مرتبہ جب سرچ انجن میں urdu تلاش کیا گیا تو وہ تلاش انہیں urdudigest.pk تک لے آئی۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# امتیاز الرحمٰن کی بات کی لذت

## درِ دل پہ دستک

اختر عباس



**بنجر** اور خشک صحرا کو سبز کرنے والے آدمی کے نام پہ قائم سنٹر کا آڈیٹوریم مہمانوں سے بھرا تھا۔

پنجاب یونیورسٹی کی بارونق حدود اسی سنٹر کی خوب صورت گنبد والی عمارت سے شروع ہوتی ہیں۔ شیخ زید (۱۹۱۸ء-۲۰۰۴ء) ابوظہبی کے امیر تھے اور متحدہ عرب امارات کے پہلے صدر، ۷ ریاستوں کے حکمرانوں نے انھیں ۳۰ سال اس منصب پر فائز رکھا۔ ہر ۴ سال بعد ان کا انتخاب ہوتا رہا۔ اپنے عہد میں انھوں نے ابوظہبی کے لوگوں کے لیے صحرا کی تپتی ریت جیسی زندگی کو آسان کر دیا۔ نہریں بنائیں، ادارے، سکول، کالج، یونیورسٹیاں، ہسپتال اور یہ سب کچھ عام لوگوں کے لیے تھا۔ ان کے لیے جن کے پاس ۶۲ء سے پہلے کچھ تھا ہی نہیں۔ نہ آس، نہ امید، نہ خواب، نہ خیال۔ بھوکی آنکھوں میں خواب بھی کہاں اترتے ہوں گے۔

عام لوگوں کی رسائی ان کے گھر تک تھی جہاں وہ لوگوں کی باتیں سنتے، شکایات اور مشوروں پہ کان دھرتے اور انھیں اپنے منصوبوں میں شامل کر لیتے۔ انھوں نے پہلی بار عوام کو یہ حق اور اطمینان دیا کہ اگر ان کا ریاست میں علاج ممکن نہ ہوا تو دنیا کے کسی بھی خطے اور حصے میں حکومت ان کے علاج کی ذمے دار ہوگی۔

افریقا اور یورپ کے علاوہ ایشیا میں بسنے والے سیکڑوں یتیم بچے ایسے تھے جن کے سر پر شیخ زید نے دستِ شفقت رکھا، ان کی سرپرستی کی۔ ان کو پالا اور قدرت نے اس خدمت پہ ان کو بار بار نوازا۔ ایک سادہ، کم پڑھے لکھے صحرائی بدو نے لاکھوں لوگوں کی زندگیاں بدل کر خطے کی تاریخ بدل دی۔ آج اس کا تذکرہ لندن سکول آف اکنامکس کے شیخ زید سینٹر سے لے کر دنیا بھر میں شیخ زید سنٹرز، ہسپتالوں، ان ہوائی اڈوں سے جڑا ہوا ہے، جو اُن کے نام پر تعمیر کیے گئے۔

عوام سے سچی محبت ہو، ان کی خدمت پیشِ نظر رہی ہو تو زندگی اور طرح کا سلوک کرتی ہے۔ تب علاج کے لیے ملک سے باہر جانے پہ افواہوں، مبارکوں اور نامناسب خواہشوں کا سیلاب نہیں آتا، شیخ زید بھی ۱۹۹۹ء میں بیمار ہوئے اور متحدہ عرب امارات، جہاں ہمارے صدر صاحب علاج کے لیے گئے تھے اور ۱۲ روز بعد واپسی پر ایک انوکھے ایس ایم ایس کی گردش نے ان کا استقبال کیا تھا ’’جوک آف دی ایئر، صدر زرداری نے کہا ہے کہ میں قوم کی دعاؤں سے صحت یاب ہو کر آیا ہوں۔‘‘

ہسپتال میں داخل شیخ زید بن سلطان النہیان کو ابوظہبی کے ۱۵ لاکھ لوگوں کے دستخطوں سے ایک خط دیا گیا جس پر لکھا تھا، آپ کی محبتوں اور خدمتوں کا شکریہ۔

آڈیٹوریم میں جاری پروگرام کے شرکاء اور مہمانوں کا شکریہ ادا کرنے کا فرض مجھے سونپا گیا۔ وہاں حکومتِ پنجاب کے سیکرٹری ایجوکیشن اسلم کمبوہ، نظریۂ پاکستان فاؤنڈیشن کے سیکرٹری، ممتاز ماہرِ تعلیم ڈاکٹر رفیق احمد، فکرِ اقبال کے مصور اسلم کمال اور شیخ زید میں مقیم استاد اور طلبہ کے مشیر ڈاکٹر اشتیاق گوندل تھے۔ یہ سب معتبر لوگ دیہی پاکستان میں بے لوث اور بے پناہ کام کرنے والے غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ کے ۳۵۴ سکولز میں کئی ہفتوں پر مشتمل ’’اقبال‘‘ کے حوالے سے جاری تقریبات اور مقابلوں کے ۳۰۰ سے زاید طلبہ و طالبات کے فائنل مقابلوں کے مہمانان خصوصی جو لاہور میں منعقد ہو رہے تھے۔

مہمانان اپنی اپنی نشستوں پر حیرت سے ملک کے طول و عرض سے آئے ان بچوں کو دیکھ اور سن رہے تھے۔ گاؤں سے تعلق رکھنے والے اکثر بچوں کی غربت ان کے چہروں پر نہیں لباس پر تھی۔ چہرے البتہ صلاحیتوں کے اظہار کے بعد، اطمینان سے روشن تھے۔ کسی نے کہا اقبال کا ذکر تو ان کے اپنے گھر والوں نے اتنے سالوں میں اس قدر نہیں کیا ہوگا جس قدر ان بچوں نے اپنے شاعر، راہنما اور قائد کو محبت بھرے لفظوں اور رنگ رنگ کے لہجوں میں پورے یقین اور خلوص سے یاد کیا ہے۔ بیت بازی کا فائنل مقابلہ تو گھنٹہ بھر چلا ہوگا۔ پتا چلا تو میں حیرت سے دنگ رہ گیا کہ فائنل میں آنے والے بچوں نے اقبال کے پندرہ پندرہ سو اشعار یاد کر رکھے تھے، ان کو کوئی کیسے ہرا سکتا تھا۔ انسان خود اندر سے ہار ماننے پہ آمادہ نہ ہو تو باہر والے اکثر ہرا نہیں پاتے۔

بلوچستان کے سنگلاخ پہاڑوں میں قائم زیارت اور لورالائی کے غزالی ٹرسٹ سکولز کے بچے ہی نہیں، خیبر پختونخواہ سے آنے والے بچے بھی اپنے مشکل لہجوں اور اُردو کے آسان لفظوں سے سب کو متوجہ کیے ہوئے تھے۔ اقبال کے اشعار پر سکولز کے بچوں اور ان کے اساتذہ نے جو ٹیبلوز تیار کیے ہوئے تھے ان پہ کتنی دیر تالیاں بجتی رہیں۔

تالیاں تو تب اور بھی بجیں جب ایک مہمان امتیاز الرحمٰن نے ان بچوں کی صلاحیتوں اور ذہانتوں کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں انعامات سے نوازا۔ ۴۲ سالہ امتیاز کا تعلق بے شک رائے ونڈ سے ہے مگر وہ سالوں سے دبئی میں مقیم تھے۔ خداترس اور سادہ لوح حاجی مقبول کے صاحبزادے نے پروگرام کے بعد جو کچھ کیا اور کہا اس پہ تالیاں اب تک بج رہی ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے ’’دبئی میں تھا تو دوست آتے اور نائٹ کلب لے جانے پہ اصرار کرتے۔ بہت کوفت ہوتی۔ اللہ سے التجا کی، مولا ایسا بوجھ نہ ڈال جو اٹھا نہ سکوں اور سر اٹھا کر تجھے بتا نہ سکوں۔ مولا نے ایسی آسانی کی کہ اب جدہ اور مکہ میں ہوں۔ دوست آتے ہیں تو ایک ہی فرمائش ہوتی ہے حرم کی زیارت کرا دو۔ اب سچے نبیؐ کے گھر لے چلو اور میں خوشی اور خوش بختی کے احساس سے لرزاں انھیں لیے لیے پھرتا ہوں اور اپنے بختوں پہ ناز کرتا ہوں۔‘‘

مانگنے سے کیا کیا نہیں مل جاتا۔ طواف ٹریول کے نام سے لاہور کے بڑے ٹور آپریٹر میں شمار ہونے والے امتیاز الرحمٰن نے ایک ایسی بات بتائی جس کی لذت اب تک کم ہونے میں نہیں آئی۔ جب اللہ نے کرم کیا تو میں نے اپنے بزنس میں ایک نئے پارٹنر کا اضافہ کر لیا۔ یہ پارٹنر اس قدر بابرکت تھا کہ پہلے سال کے آخر پہ اس کا حصہ ایک کروڑ بنا اور میں نے پوری دیانت داری سے اس امانت کو اس پارٹنر کے پسندیدہ کاموں پر لگانا شروع کر دیا۔ کون جان سکتا تھا کہ یہ پارٹنر کوئی اور نہیں ہمارا تمھارا اور خود اس کا اپنا رب تھا اور تب امتیاز الرحمٰن نے بلوچستان اور خیبر سے آئے سارے بچوں کے اخراجات ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اقبال سے محبت کرنے اور اسے دوبارہ سے یاد کرانے والے غزالی سکولز کے ایک استاد، ایک پرنسپل اور ایک ڈی۔ایم۔ایس (۳۵ اضلاع میں کام کرانے والے ڈسٹرکٹ مینیجر سکولز) کو ہر سال اپنی طرف سے عمرہ کرانے کا اعلان کیا۔ وہ یتیم اور مستحق بچے جن کے سر پہ ہاتھ رکھنے کی اللہ کے رسولؐ نے خود ترغیب دی، غزالی میں پڑھنے والے ایسے بچوں کے لیے ایک شاندار بورڈنگ سکول بنانے کا اعلان کیا۔ وہ بھی یہیں لاہور کے نواح میں۔ ٹرسٹ کے سینٹرل آفس کے لیے وحدت روڈ پر ۱۲ مرلے کے پلاٹ کا تحفہ اس سے الگ تھا۔

کس قدر عجیب اتفاق تھا کہ متحدہ عرب امارات کے ایک صاحبِ دل کے بنائے ہوئے سنٹر میں اس کی وفات کے سات سال بعد بیٹھے لوگوں میں ایک اس کی روایت کو پھر تازہ کر رہا تھا۔ لوگوں کے نام اور شکلیں اچھی بری نہیں ہوتیں۔ ان کی قائم کردہ روایات اچھی یا بری ہوتی ہیں اور اچھی روایتیں تو ہوتی ہی اپنانے کے لیے ہیں۔ لوگ بے وجہ بری باتوں اور روایتوں کے پیچھے بھاگتے ہلکان ہوتے ہیں اور آخری دم خالی ہاتھ چلے جاتے ہیں۔

سوچتا ہوں اگر زندگی سے کم وسیلہ، مستحق اور یتیم و نادار



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لوگ نکل جائیں تو حکمرانوں اور صاحبانِ خیر کے علاوہ کتنے لوگ ہیں جو ان کی خدمت کی سعادت سے محروم ہو جائیں کہ مولا رزق اور وسائل کا ایک نمایاں حصہ لوگوں کو بھیجتا ہی اس لیے ہے کہ وہ انھیں دے آئیں جن کے پاس نہیں ہے اور ڈھیروں اجر پائیں۔ اَجر بھی اتنا کہ اگر دل ایمان سے خالی بھی ہو تو بھی مولا اس کی دُنیا روشن اور نام بلند کر دیتا ہے۔ اس کے بینک دولت سے بھر دیتا ہے۔ ہاں آخرت کا وعدہ تو بے شک اچھی نیت کے ساتھ اچھے اعمال والے ایمان والوں سے ہے اور اللہ سے زیادہ کون ہے جو اپنا عہد پورا کرتا ہو۔

شیخ زید کی والدہ شیخا سلامہ نے بھی ایک بار تب اپنے بیٹوں سے عہد لیا تھا جب خاندان میں سگے رشتے بھی اقتدار کے لیے گردنیں کاٹنے کی دوڑ میں بار بار شریک ہو رہے تھے ''اے بیٹو.....! حکمرانی کے لیے ایک دوسرے سے نہ لڑنا، باہم خون نہ کرنا۔'' بیٹے اچھے تھے، جنھوں نے ماں کی بات کی لاج رکھی اور پھر آنے والی کئی دھائیاں ایک دوسرے کو دنیا سے رخصت کرنے پہ زور نہیں لگایا۔

کتنا اچھا ہو کہ ہر عہد کی مائیں اپنے اپنے بیٹوں سے عہد لیتی رہیں، وعدوں کی لوریاں سُناتی رہیں، جیسے امتیاز الرحمن کی صالح فطرت ماں نے اپنے بیٹے کو لوری دیتے کہا ہوگا ''بیٹا! جب جب اللہ آسودگی دے تو ان کو ضرور دیتے رہنا جو کم آسودہ ہوں۔ انہی کو دینے سے وجود باقی رہتا ہے۔''

غربت امارت میں بدل جاتی ہے۔ صحرا سرسبز ہو جاتے اور زندہ انسان مٹی اوڑھ کر سو جاتے ہیں۔ اَن ہونیاں ہوتی اور دم بخود کر جاتی ہیں۔ پھر سب کچھ بھول جاتا ہے مگر کچھ باتیں اور یادیں زندہ رہتی ہیں۔

کچھ لوگ بھی زندہ رہتے ہیں، چاہے ۸۶ سال کی عمر میں صحرا کنارے اپنے ہی نام پر بنائی کسی پختہ مسجد کے صحن میں دفن ہوں یا کسی سرسبز وادی میں انسانوں کے ہجوم کے بالکل پاس، قطار اندر قطار قبروں میں سے کسی بے نام قبر میں سوئے ہوں۔

یقین مانیے، میرا کسی بے نام قبر میں جانے کا بالکل ارادہ نہیں۔ قبریں ہی کچی نہیں ہوتیں، یادوں کا معاملہ بھی ان کچی قبروں جیسا ہوتا ہے۔ کاش کہنا بے یقینی ہے اور میں بے یقینی پہ یقین نہیں رکھتا۔ تو اے مولا! میں پورے یقین سے آرزو مند ہوں کہ تجھے اپنے کاموں اور کاروبار کا حصہ دار بناؤں۔ بے شک یہ مشکل بلکہ خاصا مشکل کام ہے۔ اتنے ڈھیر سے پیسے ان کے لیے نکالنا، جن کو آپ جانتے بھی نہ ہوں، جن سے کوئی فائدہ، کوئی آس امید بھی نہ ہو، مگر کیا کروں دوسروں کے ناموں سے بنے سنٹروں میں بیٹھنا، ان کے بارے میں سوچنا، پھر ان کے لیے تعریف بھرے لفظ اور جملے سوچنا، کافی تکلیف دہ ہے۔ یقین نہ آئے تو ایک لمحے کو تصور کیجیے کسی بنجر اور خشک صحرا کو سبز کرنے والے، کسی بڑے شاندار تعلیمی ادارے بنانے والے، کسی ہسپتال بنا کر لوگوں کے دکھوں کو چننے والے، کسی کے آنسوؤں کو پونچھنے والے، کسی کی بے خواب آنکھوں کو خواب دینے والے کا نام مٹا کر اپنا لکھنے کی آرزو کس قدر طاقتور اور خوشی دینے والی ہوتی ہے مگر اس کی قیمت کافی زیادہ ہے۔ مجھے جو ایک اَن دیکھے پارٹنر کو کبھی ایک کروڑ کا حصہ دینا پڑے تو دل تو بند ہی ہو جائے مگر کیا کروں، دل میں ایک خواہش اِس عالم میں سانس لیتی ہے کہ جیسے کوئی زندگی سے پیار کرے اور سانس روکنا اور سانس توڑنا نہ چاہے، تو زمانہ چاہے کہ اے میرے رب کسی روز میں بھی تجھے اپنے ساتھ بٹھا سکوں، تیری خوشی پا سکوں۔ امتیاز الرحمن کوئی انوکھا تو نہیں کہ چپ چاپ تجھے اپنا لے، اپنا بنا لے۔

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو اِدھر بھی

اِتنی بڑی کائنات میں بے بسی کا بھی کوئی مقام، کوئی مرتبہ تو ہوگا، بڑی کام نہ کر پانے والوں سے بھری اِس دُنیا میں کتنے ہی مجھ ایسے انسان ہوں گے کہ اچھی باتوں اور اچھی یادوں کے تذکرے ہی اُنہیں شاداب رکھتے ہوں گے، مگر مولا! تُو میری اِن نم آنکھوں کے درد سے بھی تو آگاہ ہوگا کہ جو سوچتی ہیں کہ جن سے کچھ نہیں ہوتا، کیا وہ اچھے لوگوں اور اچھی باتوں کے تذکرے کی اس لذت سے بھی محروم رہیں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## پاکستان کا سب سے بڑا پرائیویٹ ویلفیئر ٹرسٹ، فوجی فاؤنڈیشن

اپنے کثیر الجہتی بہبود کے کاموں کے وسیع نیٹ ورک کے ذریعے

قومی تعمیر کے عمل کو توانائی بخشتے ہوئے فوجی فاؤنڈیشن:

- پاکستان بھر میں تقریباً 9 ملین سابق فوجیوں کی خدمت کے لئے علاج معالجے اور تعلیم کے 291 منصوبے چلاتا ہے۔
- مختلف ویلفیئر پراجیکٹس کو کامیابی سے چلانے کے لئے اپنی کل سالانہ آمدنی کا 80% (تقریباً 4 ارب روپے سے زائد) استعمال کرتا ہے۔
- 51000 سے زائد طلبا میں سالانہ (تقریباً) 129 ملین روپے بطور وظائف تقسیم کرتا ہے۔
- سال 2010-2009 میں قومی خزانے میں 48.36 ارب روپے بطور ٹیکس، لیویز اور ڈیوٹیز جمع کرائے۔

فوجی فاؤنڈیشن

سابق فوجیوں کی بہبود کا پرائیویٹ ٹرسٹ

KENAD

Courtesy www.pdfbooksfree.pk